



سلام  
میں  
میں

# پاکیزہ

مئی 2015

عکاس  
میراج رحمان

نگہت سیمال اور رفاقت جاوید کے ناول کی پیرائے افسانہ  
”شادی مبارک“ ویشان رسال کی شادی کا احوال  
مستاک آفاقی جذبے کو منور کردار میں بیان کرتی چشم کشا تحریریں

Monthly **PAKEEZA**

REGD. NO. SS-12

MAY 2015 PRICE RS. 60/=

# سلسلہ مبارک

اداریہ

مکمل ناول

مدیرہ 15

مجھے کچھ کہنا ہے

228 زمر نعیم

آریہ وفا

خصوصی مضمون

منی ناول

شاؤن میسجس میسجس عذرا رسول 43

88 زاہدہ پروین

چمکنا کاپیٹول

سلسلہ وار ناول

افسانے

نگہت سیما 16

ایک بار وفا

رفاقت جاوید 142

برائے خلیفہ

51 تنزیلہ زاہرہ

ایا کاپیٹول

75 ناہیدہ فاطمہ حسنین

قرض

ناولت

107 عقیلہ حق

ولیاز

54 نبیلہ ابراراجا

مترجمہ دل

135 رفعت شبانہ

مان

116 صائمہ اکرم

چلو ہم سب ساتھ چلتے ہیں

163 فرح طاہر

پرندہ

176 ام ایمان

نارنگی

197 نیلم احمد بشیر

جواڑو

205 سعدیہ رئیس

محبت رنگ ہے آریا

223 ارجمند عقیل

ای جہان

پبلشر پروپرائٹر: نیشنل رسول، مقام: اشاعت: گراؤنڈ فلور، 63 فیروز ایکسپریس، ٹیفس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: امین حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی





### خصوصی مضامین

- 261 پاکیزہ بہنیں برائے مبارک
- 267 شائستہ زریں پرفچی

### مستقل عنوانات

- 274 مدیرہ بہنوں کی محفل
- 286 پاکیزہ دہری عظمیٰ آفاق سعید
- 290 جلت رنگ انجم انصار
- 294 میں اکثر ننگن ہوں صغریٰ زیدی
- 296 خوش فاقہ پاکیزہ بہنیں
- 298 سندیہ پاکیزہ بہنیں
- 300 روحانی مشورے ادارہ
- 302 ہومیوپیٹک

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi

Postal Address: Box No. 662, G.P.O., Karachi-74200

Phone (021)35865313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgrp@hotmail.com







ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جب سیر و تفریح کا دورانیہ طویل ہو جائے یا کہیں گھومتے ہوئے دیر ہو جائے تو بالآخر ہم تھکن سی محسوس کرنے لگتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اب ہماری ہمت جواب دے گئی ہے اس لیے آگے نہیں جاسکتے۔ اسی طرح ہم عمر کے ایک حصے پر پہنچ کر یہی سب کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ یہ احساسات کسی فرد واحد کے نہیں ہیں، ہر کے ایک حصے میں ہم سب اس مقام کو پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن جو چیز ایک فرد کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے وہ اس مقام پر پہنچنے کے بعد کاروبار عمل ہے۔

کچھ لوگ اس لیے بیٹھ جاتے ہیں کہ دم لے کر آگے چلیں گے اور پھر تازہ دم ہو کر نئے ولولے کے ساتھ سفر کا آغاز کرتے ہیں اور کچھ لوگ بالکل ہی تھک جاتے ہیں اور ہمت ہار بیٹھتے ہیں کہ بس بہت ہو چکا۔ اب تو آرام کا وقت ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو مکان کے احساس کے باوجود بس چلتے رہتے ہیں اور آج آپ سے یہی پوچھنا ہے کہ آپ کا شمار کس میں ہے۔ یاد رکھیں آپ زندگی کو جتنا زیادہ بوجھ محسوس کریں گے اتنی ہی زیادہ مکان کا احساس ہوگا۔

جب آپ زندگی کو بوجھ محسوس کرنے لگیں، ہمت ہارنے لگیں تو نئے سیارے تلاش کیجیے جو ہر موڑ پر آپ کے منتظر ہیں۔ کسی دوست، کسی نغمے، کسی پھول، کسی بچے کی پیاری مسکراہٹ کی شکل میں آپ ساری مکان بھول کر ایک نئے ولولے کے ساتھ تازہ دم ہو سکتے ہیں۔ آزمائش شرط ہے۔ اور آپ نے ابھی بہت کچھ کرنا ہے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی۔ جی ہاں! اپنے آپ کو بیکار یا فارغ نہ سمجھیں۔

مدیر  
انجم انصار

# اعتبار و فنا

نگہت سیا

مہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا۔۔۔ گنگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک ہر ایک سے وزن سی کیفیت محسوس ہو کر رہی ہے۔۔۔ کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سمجھاتی تک نہیں دیتی۔ اسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جیسے نہیں رہے اور وہ ہر وقت نرہکتا رہتا ہے۔

مگر خونہ کو سنبھال کر سواران رکھنا ہی محبت کا اصل ہفت فارہ ہے۔۔۔ لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس سے وزنی کیے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے۔۔۔ اور بن لیا جائے۔۔۔ کہ محبت کا اولیٰ ذمہ افسار ہے۔۔۔ اور وفا کیے غم ہے وہیں کھیلے ہیں۔۔۔ جس گلسن میں افسار ک بیج ہونا چاہا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جہی ہوئی ہے  
چراغ آگھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تے ہوئے ہیں  
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جہتی دھوپوں کا کوئی حصہ  
کہان کا ذکر سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رکے ہوئے ہیں

Copyright © 2015 by All Rights Reserved

—







تب ہی فون کی بیل دوبارہ ہوئی رواد جو متوجش سا کھڑا تھا ایک دم اچھل پڑا۔ اسکرین پر وہی نمبر تھا۔ فون آن کرتے ہی اس کے لبوں سے نکلا۔

”کیا... کیا کہہ رہے ہو تم ظفری؟“ غیر ارادی طور پر اس کی آواز بلند ہوئی۔

دوسری طرف ظفری ہولے سے ہنسا تھا۔

”وہی جو تم نے سنا میری جان کہو تو پھر دُہرا دوں۔ عظام تمہارا بھائی نہ کسی کزن تو ہے ناں۔ اب یہ نہ کہنا کہ تمہارا کزن بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہو اور یہ بھی کہ وہ تمہیں بہت پیارا ہے تو تم یقیناً نہیں پا ہو گے کہ اسے کوئی نقصان پہنچے۔ اب اگر میری بات سمجھ میں آگئی ہے تو۔“

”عظام تمہارے گھر میں ہے؟“ اس نے جیسے یقین دہانی چاہی۔

”کہو تو بات کروادوں؟“ دوسری طرف سے ظفری نے کہا تو اس نے مرکز بابا کی طرف دیکھا جو پریشانی سے

اسے دیکھ رہے تھے۔

”لیکن وہ تمہارے گھر کیوں اور کیسے ہے؟“ اس نے اپنی آواز اتنی آہستہ کر لی کہ بابا نہ سن سکیں۔

”کیوں اور کیسے کا جواب تو یہاں آؤ گے تو مل جائے گا بس یوں سمجھ لو کہ جی چاہا کہ مل بیٹھ کر گپ لگائیں۔ کچھ

تم ہمیں جانو کچھ ہم تمہیں جانیں۔“

”لیکن اگر مجھے یہ جاننے میں دلچسپی نہ ہو تو؟“ اس کی آواز ہنوز آہستہ تھی۔

”تمہیں نہ ہو تو مجھے تو دلچسپی ہے ناں کہ تم مجھے اچھی طرح جان لو یقیناً تمہیں میرے گھر کا ایڈریس معلوم نہیں

ہوگا۔ ایڈریس سمجھ لو۔ میں عظام کے ساتھ تمہارا منتظر ہوں۔“

اس نے ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا۔ وہ چند لمحے یونہی ریسیور ہاتھ میں تھا اسے الجھا، الجھا سا بیٹھا رہا۔ وہ

ظفری کی اس ساری گفتگو کا مطلب ابھی تک سمجھ نہیں پایا تھا۔ ظفری کیوں چاہتا تھا کہ وہ اس کے گھر آئے اور عظام

کہاں ملا اسے اور وہ اس کے گھر کیوں گیا۔

”کیا بات ہے رواد کس کا فون ہے؟ عظام تو ٹھیک ہے ناں۔۔۔۔۔ جواد کی طبیعت کہیں پھر خراب تو نہیں ہو گئی؟“

انہوں نے بے چینی سے پوچھا تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور ریسیور کریڈل پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”جی بابا عظام ٹھیک ہے۔“ بابا کو جواب دے کر وہ پھر سوچ میں کھو گیا۔

عظام بھلا خود اس کے گھر کیوں جائے گا اور اگر ظفری اسے خود کسی بہانے اپنے گھر لے گیا ہے تو کیوں۔۔۔۔۔ کیا

مسئلہ ہے آخر۔۔۔۔۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ظفری کے ساتھ نہ اس کی دشمنی تھی نہ دوستی۔ بس سلام دعا کی حد تک ہی

واقفیت تھی۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ وہ بابا کو ساری بات بتا دے۔ ظفری کی باتوں نے اسے بہت الجھا دیا تھا لیکن

پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ارادہ منطوی کر دیا۔ وہ پہلے ہی بہت تھکے ہوئے اور اپ سیٹ لگ رہے تھے۔

”رواد تم کچھ پریشان لگ رہے ہو کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے؟“ بابا کی نظریں اسی پر تھیں۔

”نہیں بابا۔۔۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔

”میں بس کچھ حیران ہو رہا ہوں۔ عظام، جواد کے پاس سے ہو کر ایک اور یونیورسٹی فیلو کے ہاں چلا گیا ہے اور

وہ مجھے بھی بلارہا ہے کہ کچھ دیر اکٹھے بیٹھتے ہیں۔ ہماری اس سے کوئی دوستی ہی نہیں بس کبھی کبھار سلام دعا ہو جاتی ہے۔“

انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔

”کبھی انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ عظام بھی مجبور ہو گیا ہوگا۔ انکار نہیں کر پایا ہوگا۔ تم بھی پٹے جاؤ، جلدی آ جانا۔“

”جی بابا۔“ اس نے جھک کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ ”میں جلدی آ جاؤں گا انتشار اللہ۔“  
 ”یہ یونیورسٹی فیلو کون ہے، کیا نام ہے اس کا؟“ کسی خیال کے تحت انہوں نے پوچھا۔  
 ”ظفری نام ہے اس کا اور ام سے ایک سال سینئر ہے۔“

”کیسا لڑکا ہے؟“ وہ پھر پریشان ہونے لگے تھے۔  
 ”بابا، آپ تو ایسے سوال کر رہے ہیں جیسے میں کوئی اسکول جانے والا بچہ ہوں اور مجھے کوئی انٹرا کر لے گا یا۔۔۔“  
 ”اٹا پتا تو ہوتا چاہیے ناں بیٹا۔ کوئی مسئلہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ مجھے بھی تو تنہا ہی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹی۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہوگا بابا آپ ریلیکس رہیں۔“ اس نے انہیں تسلی دی اور ان کے مزید سوالوں سے بچنے کے لیے تیزی سے کمرے سے باہر نکلا۔

”کیا خبر ظفری جھوٹ بول رہا ہو۔ یونہی بے وقوف بنا رہا ہو۔ جست فارایہ دھچ۔ اس طرح کی حرکتیں تو وہ کرتا ہی رہتا ہے۔“ پورج کی سیر حیاں اترتے، اترتے وہ آخری سیر می پر رک گیا اور پاکٹ سے فون نکال کر اس نے جواد کا نمبر ملایا۔  
 ”ہیلو جواد، عظام کا کیا پروگرام ہے؟“

”عظام تو کافی پہلے چلا گیا تھا۔ ابھی تک گھر نہیں پہنچا کیا؟ شاید راستے میں شاپنگ وغیرہ کے لیے رک گیا ہو۔“  
 ”نھیک ہے آنے ہی والا ہوگا میں فون کر لیتا ہوں اسے۔“ اس نے مزید بات کیے بغیر فون بند کر دیا وہ جواد کو پریشان نہیں کرتا چاہتا تھا کیونکہ عظام آج اپنا فون گھر پر ہی بھول گیا تھا۔

”اس وقت کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ خدا بخش نے گیٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں چاچا۔ ہو سکتا ہے دیر ہو جائے بابا کا خیال رکھیے گا وہ مجھے کچھ اپ سیٹ سے لگ رہے ہیں۔“ خدا بخش کو تاکید کرتا ہوا وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”وہ کب اپ سیٹ نہیں رہتے۔ انہیں تو شوق ہے اپ سیٹ رہنے کا۔“ خدا بخش بڑبڑایا لیکن رواد نے اس کی بڑبڑاہٹ نہیں سنی اور گیٹ سے گاڑی باہر نکال لے گیا۔

☆ ☆ ☆

ظفری کا گھر ڈھونڈنے میں اسے وقت نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی گیٹ کے باہر ہی ایک طرف پارک کر کے اس نے نکل دی۔ انٹرکام پر اس کا نام پوچھ کر گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ ڈرائیو سے پرتمن گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں عظام کی گاڑی بھی تھی یعنی ظفری نے جھوٹ نہیں بولا تھا اور عظام یہاں ہی تھا۔

”آؤ۔۔۔ آؤ رواد حسن۔“ ظفری نے گیٹ کے قریب آتے ہوئے اس کا پورا نام لے کر استقبال کیا۔  
 ”زہے نصیب۔“ اس نے ہاتھ سے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

”میں اس کا مطلب نہیں سمجھا ظفری؟“ آگے چلا ہوا وہ ظفری کے قریب آیا۔

”مطلب بھی سمجھا دیں گے میری جان اندر تو آؤ۔“

ظفری نے مصافحہ کرنے کے بجائے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ لان کے پاس سے گزر کر لمبی ڈرائیو دے میں ہی چلتے ہوئے کارز تک آئے تھے جہاں ایک اور دروازہ تھا۔ ظفری کا گھر کافی بڑا تھا۔ لان بھی وسیع تھا۔ ظفری نے دروازہ دھکیلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ آؤ اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہوا سا منے ہی صوفے پر عظام بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر

بھی اکبھن اور بیزاری تھی اور وہ کچھ حیران سا اسے دیکھ رہا تھا۔

”عظام۔“ وہ تیر کی طرح اس کی طرف بڑھا۔

”تم ٹھیک ہونا؟“

”اچھی طرح ٹول کر دیکھ لو۔ ہم نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا سب ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔“ ظفری بائیں آنکھ کا کونارا ہا کر مسکرایا۔

اس نے عظام کو ٹھیک دیکھ کر اطمینان بھری سانس لی۔ ”یہ کیسے وہ ہم راستے بھر سٹاتے آئے تھے۔ کبھی سوچتا واپس چلا جائے اور بابا کو بھی ساتھ لے آئے۔“ بھی پاپیس کے متعلق سوچنے لگتا۔

”بیٹھو یار۔“ ظفری کا انداز بے تکلف تھا۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم کے گھر کے اندر کھٹنے والے دروازے سے اندر چلا گیا تو اس نے عظام کے قریب بیٹھتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔

”یہ سب کیا ہے عظمیٰ؟ تم یہاں کیسے آئے اور یہ ظفری کیا باتیں کر رہا ہے کچھ عجیب سی۔ کیا اس نے تم سے بھی کچھ کہا؟“

”نہیں۔“ عظام نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تو خود الجھا ہوا ہوں۔ ظفری مجھے بائیں میں ملا تھا۔ شاید وہ بھی کسی دوست سے ملنے گیا تھا وہاں کہہ رہا تھا کہ وہ کسی دوست کے ساتھ آیا تھا۔ دوست کو اچانک جانا پڑ گیا۔ اگر میں اسے اس کے گھر ڈراپ کر دوں تو وہ شکر گزار ہوگا۔ میں تو اسے گھر کے باہر ہی اتار کر جا رہا تھا لیکن اس نے اندر آنے اور چائے پینے کے لیے اتنا اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا بلکہ شرمندہ ہوا اس کے اتنے اصرار پر کہ وہ اتنے خلوص سے کہہ رہا ہے اور میں انکار کر رہا ہوں۔ بس تب سے اب تک بٹھا رکھا ہے۔ انھنے ہی نہیں دے رہا۔ پہلے کھانے کے لیے اصرار کرتا رہا جب میں نے بتایا کہ جواد کے پاس کھانا ہے تو پھر چائے کے لیے روک لیا لیکن تم یہاں کیسے؟“

”مجھے ظفری نے فون کر کے بلایا ہے کہ عظام بھی ادھر ہے تم بھی آ جاؤ کچھ دیر مل کر کپ لگائیں گے۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا ظفری۔۔۔“ اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ وہ عظام کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا ظفری کا جو بھی مقصد تھا سامنے آ ہی جاتا تھا کچھ دیر بعد۔ ظاہر ہے اس نے صرف گنٹ شپ کے لیے تو دھمکی دے کر نہیں بلایا تھا۔

”مجھے کچھ گڑبگ رہی ہے رومی۔ آخر ظفری کو اچانک ہم دونوں پر کیسے پیارا آ گیا۔ وال میں ضرور کچھ کا ہے۔“

”ہم کوئی لڑکیاں نہیں ہیں یار۔“ رواد نے عظام کو تسلی دی۔ ”یونہی اس کا دماغ خراب لگتا ہے مجھے۔ ایڈ وچر کا شوقین امیر زادہ ہے۔ کوئی ایڈ وچر ہوگا اس کے ذہن میں۔ ویسے تم پریشان مت ہو۔ میں بابا کو بتا کر آیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔“

تب ہی ایک ملازم فرے میں جوس کے دو گلاس رکھے اندر آیا۔

رواد نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پر رکھ دیا جبکہ عظام نے نفی میں سر ہلادیا۔ ملازم نے گلاس ٹیبل پر رکھ دیا اور خود باہر چلا گیا۔

”میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا ہوں عظمیٰ؟“ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد رواد نے پھر عظام کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں چننا چاہیے۔“ عظام نے کہا۔

”ارے، ارے ایسے ایسے کچھ کھائے پیے بغیر چلے جائیں گے آپ دونوں۔“ ظفری نے اندر قدم رکھتے



ہوئے عظام اور واحد کی طرف باری باری دیکھا۔ اس کے پیچھے ایک ملازم نرائی دھکیلتا ہوا آ رہا تھا۔  
 ”سوری دوستو! وہ ماں جی نے کچھ دیر کے لیے اندر روک لیا تھا۔ کوئی ضروری بات تھی۔“ اس نے سینئر نیبل کے پاس رک کر جوس کے بھرے ہوئے گلاسوں پر نظر ڈالی۔

”ارے بھئی یہ جوس ایسے ہی پڑا ہے۔ زہر تو نہیں ملایا میں نے۔“

”میں پہلے ہی پی چکا ہوں۔ مزید کوئی خواہش نہیں۔“

”اوہ ہاں۔“ ظفری نے جوس کا ایک گلاس خود اٹھا لیا اور واحد کو اشارہ کیا۔ واحد نے بے دلی سے گلاس اٹھا کر چند گھونٹ لیے اور پھر نیبل پر رکھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے ظفری کی طرف دیکھا۔

”ظفری پلیز۔۔۔ اب اصل بات بتاؤ اس سب سے تمہارا کیا مقصد ہے؟“

”اتنی بے صبری بھی کیا۔۔۔ پہلے کچھ کھانی تو لو۔“

اس نے سودب کھڑے ملازم کو اشارہ کیا تو اس نے نرائی سے ٹیشیاں اٹھا کر ان کی طرف بڑھا میں۔

”پلیز ظفری میں ابھی کھانا کھا کر گھر سے نکلا ہوں۔ مطلب کی بات کرو۔“ واحد بہت بے چین اور مضطرب تھا۔

”خیر تمہاری مرضی، ویسے مجھے افسوس ہوگا کہ تم پہلی بار میری گھر آئے اور بغیر کچھ کھائے پیے چلے جاؤ گے۔“ اس نے کندھے اچکائے اور عظام کی طرف دیکھا۔

”تم تو کچھ لو عظام۔“

”نہیں شکریہ۔“ عظام نے بھی نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے بھی جواد کے ساتھ کھانا کھایا تھا بتایا تو تمہیں مزید کی گنجائش نہیں ہے۔“

ظفری نے ملازم کو نرائی واپس لے جانے کا اشارہ کیا اور واحد کی طرف کچھ دیر گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔  
 ”میں جانتا ہوں کہ تم یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہے ہو کہ میں نے اس طرح تمہیں کیوں بلایا ہے تو پہلو تمہاری بے چینی دور کیے دیتا ہوں۔۔۔ ویسے ایک ٹپ چائے کی گنجائش تو ہوگی نا؟“ وہ ایک دم اٹھا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر ملازم کو آواز دے کر چائے لانے کے لیے کہا اور پھر مڑتے ہوئے کارٹر نیبل پر پڑی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ میرے فادر ہیں ممتاز سومرو۔ ایم این اے ہیں۔“

”تو کیا صرف یہ بتانے کے لیے بلایا ہے تم نے؟“ واحد کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

”نہیں۔“ ظفری اس کے لہجے میں ہلکے سے طنز کو محسوس کر کے مسکرایا۔ ”ہو سکتا ہے تمہیں پہلے سے اس کا علم ہو

ممتاز سومرو کوئی معمولی نام تو نہیں ہے۔ بس تم سے ایک گزارش تھی۔“

وہ ہونے، ہولے چلتا ہوا صوفے پر آ کر بیٹھ گیا واحد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم۔“ ظفری نے اس کی طرف انگلی اٹھائی اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ ”آئندہ

میرے یا میرے دوستوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرو گے۔ ہم یہ نیورسنی میں کیا کرتے ہیں، کیسے رہتے ہیں تمہارا اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے اور دوسری بات آئندہ تم مجھے رتی کے آس پاس دکھائی نہیں دو گے۔“

”کیا مطلب؟“ واحد نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں نے کوئی مشکل بات نہیں کی ہے جس کا مطلب تمہاری سمجھ میں نہ آئے پھر بھی سمجھائے دیتا ہوں۔ میں

ہرگز برداشت نہیں کروں گا آئندہ اگر تم مجھے رتی سے بات کرتے نظر آئے۔ اس لیے کہ رتی، ظفیری سومرد کے دل کو بھاگتی ہے اور کوئی دوسرا اس سے بات کرے یہ مجھے قبول نہیں ہے۔“ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

”نہیں باتیں کر رہے ہو ظفیری۔ وہ ہماری کھاس فینو ہے۔ آئنا سنا، بات چیت تو ہوتی رہتی ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کبھی اس سے بات ہی نہ ہو۔“

ظفیری نے عظام کی طرف توجہ ہی نہیں دی اور رواجہ کی طرف تیز نظروں سے دیکھتا ہوا جیسے غرایا۔

”تم نے میری بات سمجھ لی ہے تاں رواجہ؟“

”اگر تمہاری بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو کیا کرو گے تم مار دو گے مجھے؟“ رواجہ کی نظریں ظفیری پر تھیں۔

”نہیں۔“ ظفیری مسکرایا۔ ”تمہیں نہیں..... تمہارے پیروں کو۔ تمہارا یہ کزن، تمہارا باپ اور.....“

ظفیری نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ رواجہ کا دل ایک لمحے کو ڈوب سا گیا تھا۔ ظفیری اس کی سوچ سے زیادہ مکار تھا۔

”تم ایک دفعہ مر کر آزاد ہو جاؤ گے ہر فکر سے جبکہ ظفیری اپنے دشمنوں کو پل، پل مار کر.....“

”ظفیری پلیز کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ عظام نے گھبراہٹ سے ٹوکا۔

”دھمکی دے رہے ہو ظفیری؟“ رواجہ کی نظریں ابھی تک اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

”صرف دھمکی نہیں۔“ وہ کھڑا ہو گیا اور ہولے، ہولے چلتا ہوا کارز ٹیمپل کے پاس رک گیا اور ممتا ز سومرد کی تصویر والا فریم اٹھا کر انگلیوں سے اس کی نامعلوم گرد و صاف کی اور مسکرایا۔ ”میں جو کہتا ہوں اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔“ اس نے تصویر واپس ٹیمپل پر رکھ دی۔ رواجہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”تم نے اپنی بات کر لی اب ہم چلیں؟“

”ارے چائے تو پی لو، مینو یار۔“ اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن عظام بھی کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف دیکھا۔

”یہ بات تم یونیورسٹی میں بھی کہہ سکتے تھے اس ذرا سے کی ضرورت نہ تھی۔“

”ہوں..... کہہ تو سکتا تھا۔“ اس کے لبوں پر پھر دل جلانے والی مسکراہٹ ابھری۔ ”لیکن ہاسٹل میں تمہیں دیکھ کر اچانک خیال آیا کہ چلو تمہیں اپنا گھر دکھا دوں اور تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تم آئے تو اپنی مرضی سے ہو لیکن میری مرضی کے بغیر جانیس سکتے۔ چاہو تو کوشش کر کے دیکھ لو۔“

تب ہی اندرونی دروازے پر ایک ملازم کا چہرہ نمودار ہوا۔

”سائیں۔“

”کیا ہے؟“ ظفیری نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”مٹھا سائیں آئے ہیں۔ بڑی بی بی جی آپ کو اندر بلا رہی ہیں۔“

”اوہ۔“ ظفیری نے ہونٹ سکپڑے۔ ”اچھا مہمانوں کو خدا حافظ کہہ کر آتا ہوں۔“

”مٹھا سائیں صرف تھوڑی دیر کے لیے آئے ہیں۔“ ملازم نے مزید کہا اور سر جھکا کر دروازے سے ہی واپس چلا گیا۔

”میرے ماموں ہیں۔ سکندر سومرو ایم پی اسے ہیں۔ مٹھا سائیں کے نام سے مشہور ہیں۔ ملتان سے آئے ہیں۔ لاہور کے اطراف بھی ان کی کافی زمینیں ہیں۔ ان کا قیام زیادہ تر لاہور میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھار کراچی بھی آجاتے ہیں۔“ اس نے غائبانہ تعارف کروایا اور باہر کھٹنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ رواجہ اور عظام اس

کے ساتھ ہی باہر نکلے۔ برآمدے میں کھڑے، کھڑے اس نے چوکیدار کو گیت کھولنے کا اشارہ کیا اور باری، باری دونوں سے ہاتھ ملایا۔

”ظفری یہ روں کا بار ہے۔ دوستی کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔“

دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ عظام اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

”اگر عظام کے ساتھ جانا چاہو تو میرا ڈرائیور تمہاری گاڑی گھر پہنچا دے گا۔“

”نو ٹھیکس۔“ رواد کا لہجہ سپاٹ تھا اور چہرے سے شجیدگی پھلک رہی تھی۔

”میری بات یاد رکھنا رواد، میں دوبارہ بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔“

اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ رواد کو اس کی انگلیاں اپنے کندھے میں چبھتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔

”اوکے ہائے۔“ اس نے رواد کے کندھے سے ہاتھ اٹھایا اور واپس مڑ گیا۔ رواد نے برآمدے کی

سیرھیاں اترتے ہوئے عظام کو جانے کا اشارہ کیا۔ عظام کی گاڑی گیت سے باہر نکل گئی تو وہ بھی گیت سے باہر نکل

کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور ایک سرسری سی نظر اپنی گاڑی کے ساتھ پارک بی ایم ڈبلیو پر ڈالی۔ گاڑی کے

ساتھ ہی ایک شخص کلاشکوف اٹھائے کھڑا تھا۔ یقیناً وہ ظفری کے ناموں کا گارڈ ہوگا اور یہ گاڑی بھی یقیناً انہی کی

ہوگی۔ اس نے گاڑی کا لاگ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر غیر ارادی طور پر گارڈ کی طرف

دیکھا۔ گارڈ اسے ہی دیکھ رہا تھا اس کے اندر ایک خوف کی لہری دوڑ گئی۔ وہ شخص شکل سے اتنا خوف ناک نہیں لگ

رہا تھا اس کی مونچھیں قدرے گھنی تھیں اور وائیں رخسار پر ایک بڑا سیاہ مسہ تھا۔ گارڈ نے اس کے چہرے سے

نظریں ہٹائی تھیں۔ اور اب دوسری طرف دیکھ رہا تھا اس نے خوف سے جھرجھری سی لی اور بہت تیزی سے گاڑی

روڈ تک لایا۔ اس کے اندر کوئی انجانا سا خوف جاگ اٹھا تھا۔ بار بار آنکھوں کے سامنے سیاہ مسہ والا چہرہ آ رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر اس نے ایکسی لیرینر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ پیچھے سڑک خالی تھی لیکن وہ گاڑی اس طرح بھگ رہا

تھا جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔

\*\*\*

”تھا یقین کہ آئیں گی یہ راتاں کبھی“

سنہری ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال بناتے ہوئے ہوئے، گنگنا رہی تھی۔ گنگنا تے ہوئے اس

نے مڑ کر بجل کی طرف دیکھا جو اپنے بند پر کروٹ کے بل لیٹی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بہت خوش ہو سنہری“ بجل نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں۔“ سنہری نے امیگر برش ٹیبل پر رکھا۔ ”بہت خوش ہوں۔ بہت امیر لوگ ہیں کیا بتاؤں جو، کل ڈھونڈ

کے فٹشن میں کس بے دردی سے پیسہ لٹایا انہوں نے۔ بیچارہ ظہور تو نوٹ سینٹے، سینٹے تھک گیا تھا اور اماں کی تو

باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گجرات ہے جو جب سے لاہور سے آئے ہیں پہلی بار ایسے دل والے لوگوں کے ہاں محفل

لگی۔“ اس نے آئینے پر تنقیدی نظر ڈالی اور اسٹول پر بیٹھ کر اسے تفصیل بتانے لگی۔

انہیں مکش اقبال کے اس گھر میں شفقت ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ دس مرے کا یہ ڈبل اسٹوری گھر

اس فلیٹ سے ہزار ہا درجے اچھا تھا اور سنہری تو بہت خوش تھی۔ بجل بھی خوش تھی کہ یہاں اسے اپنا ایک الگ بندروم

مل گیا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر دو بندروم تھے ایک تو شاہجہان بیگم نے سنبھال لیا تھا کہ گھنٹوں کی تکلیف کی وجہ سے ان کے

لیے سیرھیاں اترنا چڑھنا عذاب تھا۔ موراں ہمیشہ ہی ان کے کمرے میں سوتی تھی۔ دوسرے بندروم میں ظہور سے



کے ساتھ شیدا لبا بھی سیٹ ہو گیا تھا۔ شاہجہان کے باقی بندوں نے سرونت کو ارڑ سنبھال لیا تھا۔ شاہجہان نے کارپٹ ڈلو کر زمینی بستر لگوا دیے تھے یوں الگ جگہ کے کرایے سے بچت ہو گئی تھی۔ فرسٹ فلور پر تین بیڈروم تھے۔ سب سے چھوٹا بیڈروم جل نے لے لیا تھا جبکہ ما سٹر بیڈروم میں چینیلی اور کرن تھیں۔ شاہجہان کی بات چیت لاہور میں کسی سے چل رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید کچھ دنوں میں ایک دولڑکیاں اور آجائیں تو وہ بھی، سٹر بیڈروم میں چینیلی اور کرن کے ساتھ ہی کھپ جائیں گی سو سنہری کے اصرار کے باوجود شاہجہان نے سنہری اور موتیا کو جل کے بیڈروم کے ساتھ والا بیڈروم دیا تھا۔ دو دن تک سنہری کا منہ پھولا رہا تھا۔

”یہ اماں بھی بس صوب سے زیادہ ہماری دشمن ہیں۔“ سنہری کو گھٹے کرنے کی عادت تھی۔ اب بھی وہ موتیا سے نہ جانے کس بات پر نفا ہو کر جل کے کمرے میں تیار ہونے آگئی تھی۔

”کیا تم واقعی خوش ہو سنہری؟“ جل اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ہاں مجھے ہمیشہ سے ایسے ہی اسی طرح کے جگھے میں رہنے کا شوق تھا۔ فلیٹ میں میرا دل نہیں لگتا تھا اور وہاں لاہور میں تنگ گلیوں، بوسیدہ بالکونیاں، ایک جیسے گھر، پرانے سانچور وہ..... دل ادب گیا تھا میرا۔“

”نہیں، میرا مطلب گھر سے نہیں تھا میں۔“ جل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنی بات اسے سمجھائے۔ ”دراصل تم اس روز کہہ رہی تھیں ہاں کہ تم اس زندگی سے خوش نہیں ہو۔ تبدیلی چاہتی ہو کسی فیکٹری میں مزدوری کر لو گی اور۔“

”مزدوری..... تو بہ، تو بہ۔“ سنہری نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”ہم سے نہ ہوئی مزدوری۔“ پھر وہ ہولے سے ہنسی۔ ”لو بھلا کہاں سنہری اور کہاں مزدوری“ وہ انھی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر نزاکت سے گھومی اس کا ٹخنوں تک لبا فراک گھومنے سے پھیلا تو وہ کسی تھلی کی طرح گئی اسے۔ یوں ہی ہاتھ پھیلائے گھومتے، گھومتے وہ پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور خود کو آئینے میں تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔ جل کے سپاٹ چہرے پر نہ بھر کے لیے نہ قابل فہم سا تاثر ابھرا۔

”موتیا صحیح ہی کہتی۔ اسے ایسے دور سے پڑتے رہتے ہیں جتنا آج وہ بیزاری کا اظہار کر رہی ہے کل اسنے ہی شوق سے محفل میں گا اور ناچ رہی ہوگی۔“

”سنہری اپنی زندگی سے مطمئن ہے۔ سب ہی مطمئن ہیں۔ سنہری، اماں، ظہور، چینیلی، کرن، موتیا بس ایک میں ہی بے سکون ہوں لیکن پہلے تو ایسی بے سکونی نہ تھی پھر اب کیوں..... کیا اس روز جو سنہری نے کہا تھا اس کی باتوں نے مجھے بے سکون کر دیا ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔“ شاید اندر کہیں گھبراہٹوں میں کسی خواندہ کی کوئیل پتھر ملی زمین سے سرٹکا لئے اور مٹوانے کو بے تاب ہو رہی تھی۔

”آج مہندی کا ٹنکشن ہے۔“ سنہری نے اسے اطلاع دی۔ ”آج تو کئی بڑے منکر ز بھی آرہے ہیں۔ وہاں میں نے کسی کو کہتے سنا تھا۔“

”اچھا۔“ جل نے اس کے پر جوش سچے کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر سے بات کا سراو ہاں سے ہی جوڑا۔ ”لیکن سنہری تم تم تو کسی با عزت ذریعے سے روزی کمانا چاہتی تھیں۔ تاہنے گانے کے علاوہ کچھ اور کرنا چاہتی تھیں۔“

”ارے بھو تم ابھی تک اس کی باتوں کو یاد رکھے ہو۔“ موتیا نے اندر داخل ہو کر کہا۔ ”یہ تو اس طرح کی باتیں سیکڑوں بار کہتی ہے اور بھول جاتی ہے۔“

لیکن وہ تو نہیں بھولی تھی وہ تو اس روز سے جب سے سنہری نے زندگی تبدیل کرنے کی بات کی تھی مسلسل سوچ رہی تھی کیسے، کس طرح زندگی میں کوئی مثبت تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ سیکڑوں بار اس نے اپنے آپ کو ملاست بھی کی تھی، اگر سنہری ایسا سوچ سکتی ہے تو اس نے ایسا کیوں نہیں سوچا اب تک۔ وہ تو سنہری کے مقابلے میں زیادہ باشعور تھی۔ اس نے تعلیم حاصل کی تھی مگر معمولی ایسی لیکن اس تعلیم نے اسے شعور دیا تھا پھر بھی اس کے دل میں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ زندگی کا یہ رنگ ذھنگ جسے معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بد با بھی جاسکتا ہے۔

”جو تم اس کی باتوں پر وہیان مت دیا کرو۔ یہ تو رات کی کہی بات صبح تک بھول چکی ہوتی ہے۔“ موتیا نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر کہا اور اس کے پاس بی بیڈ پر بیٹھ گئی اور سنہری کی طرف دیکھا۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟ اماں تمہیں نیچے بلا رہی ہیں۔ اپنے کمرے سے تو یوں شوں شوں کرتی ہوئی نکلی تھیں جیسے منٹوں میں تیار ہو جاؤ گی حالانکہ میں نے کہا بھی تھا کہ بس دو منٹ کی بات ہے۔ ہاں ہی رہ گئے تھے بنانے۔“

”میں تو تیار ہوں بس یونہی ذرا دیکھ رہی تھی۔“ اس نے ٹیبل سے پرفیوم کی بوتل اٹھا کر خود پر اسپرے کیا اور ناک چڑھا کر خوشبو سونگھی۔

”اللہ جو تم کتنی مری، مری ہی خوشبو خریدتی ہو۔“

”مجھے لاسٹ خوشبو ہی پسند ہے۔“ جل نے آہستگی سے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ سنہری کو بہت تیز خوشبو پسند تھی اتنی تیز کہ بعض اوقات اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔

”چلو۔“ ایک بار پھر پرفیوم چھڑک کر اس نے موتیا کی طرف دیکھا۔

”نہیں، مجھے نہیں جانا تم جاؤ۔ تمہارے ساتھ چنبیلی اور کرن جائیں گی۔“

”تو تم پھر اتنی تیار کیوں ہوتی ہو؟“ سنہری نے سر سے لے کر پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ سنہری سے بارڈر والی جامنی سازی میں قیامت ڈھا رہی تھی۔

”مجھے بھی کہیں جانا ہے کسی کے ساتھ۔“ اس نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”کہاں.....؟“ کبھی کبھی سنہری بالکل انجان بن جاتی تھی۔ جیسے ننھی ”چوپٹی“ ہو ہر بات سے بے خبر۔

”تم تو جیسے جانتی نہیں ہو۔“ موتیا ہمیشہ ہی اس کے انجان بن جانے پر جل جاتی تھی۔

”اوہ اچھا۔“ پھر جیسے کچھ سمجھنے کے سے انداز میں اس نے ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ جل کے دل میں جیسے کسی نے کوئی سوئی چھو کر نکالی تھی۔ اس نے بہت تکلیف محسوس کی اور اذیت سے اس کا رنگ بدلا حالانکہ یہ سب نیا تو نہیں تھا۔ موتیا اور سنہری، چنبیلی اور کرن کو سیکڑوں بار ہی اس نے تیار ہو کر کسی کے ساتھ جاتے دیکھا تھا لیکن آج سے پہلے اس نے ایسی تکلیف محسوس نہیں کی تھی۔ آج تو ایسی اذیت ہو رہی تھی جو رگوں کو کاٹتی تھی۔ کیا سنہری جس تبدیلی کی خواہاں تھی وہ بدلاؤ اس کے اندر ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا جو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ موتیا نے پریشانی سے اس کی پیشانی کو چھوا۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”کہاں ٹھیک ہو؟ کیسا پیلا رنگ ہو رہا ہے۔“ موتیا کی نظریں اسی پر تھیں۔

”سر میں ذرا درد ہے اور کچھ نہیں۔“

”پتا نہیں کیوں ہر وقت اتنا پڑھتی رہتی ہو۔ درد تو ہوتا ہی ہے ناں حالانکہ اب نہ کوئی امتحان دینا ہے تم نے نہ اسکول کانچ جاتا ہے کہ استادوں کے ذریعے پڑھنا پڑے..... کیا ہے ان کتابوں میں آخر؟“ موتیا نے بیڈ پر بھری

کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

”موتیا!“ بھل نے ایک دم موتیا کے ہاتھ تھام لیے۔ ”سنو تم اماں سے کہو ناں مجھے کالج میں داخل کروادیں۔“

مجھے بی اے کرنا ہے۔“

”اماں ہم سے زیادہ تو تمہاری مانتی ہیں جو... کیا تم نے خود اماں سے نہیں کہا؟“ موتیا کو بھل سے بہت محبت تھی۔

”نہیں۔“ بھل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اماں نے ادھر لانا دھور میں ہی کہہ دیا تھا کہ بس جتنا پڑھ لیا کافی ہے۔“

”دراصل اماں نے تمہارے لیے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔“ موتیا مسکرائی۔

”کیا...؟“ اس کا دل لمحہ بھر کو کانپ سا گیا۔ کانٹوں میں سنہری کی باتیں گونجنے لگیں کہیں اماں نے اس کا

سودا کسی بہت بڑے رئیس سے تو نہیں کر دیا۔

”اماں تمہیں ایکسٹریس بنانا چاہتی ہیں اور انہوں نے یہ تب ہی سوچ لیا تھا جب تم چھوٹی سی تھیں۔ تب ہی تو

چار جہانگیر بھی پڑھائی ہیں اور تیری ہی خاطر تو اماں نے لاہور چھوڑا ہے ورنہ اماں کو اپنا چوبارہ چھوڑتے بڑا دکھ

ہوا تھا۔ دراصل ادھر کراچی میں ذرا سے بہت بستے ہیں ناں... فلمیں تو اب زیادہ نہیں بنتیں پر پھر بھی اماں کہہ رہی

تھیں ظہور سے کہ پہلے ذرا مومن میں چاس مل جائے تو پھر فلم میں بھی مل ہی جائے گا۔“

”لیکن موتیا مجھے اداکاری کہاں آتی ہے؟“ وہ رد ہانسی ہوئی۔

”اداکاری کون سا مشکل کام ہے جو، اماں کہتی ہیں عورت سے بڑا اداکار کوئی نہیں ہوتا۔ چاہے ہماری طرح

بازار میں بیٹھنے والی عورت ہو چاہے گھر میں رہنے والی شریف زادی۔ سب ہی اداکار ہوتی ہیں۔“

”نہیں موتیا، اداکاری آسان کام نہیں ہے۔ بہت مشکل کام ہے۔“

”کتنا مشکل جو؟ کیا اس سے بھی مشکل کام جو ہم کرتے ہیں اپنے وجود کی نفی کرنا اور اپنے عورت پن کی تحقیر

خود کرنا۔“

موتیا کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے بھل کو چونکا دیا۔ موتیا نے کبھی سنہری کی طرح جھٹکے نہیں کیے تھے اور نہ ہی

کبھی کسی بیزاری کا اظہار کیا تھا وہ ہمیشہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور خوش لگتی تھی لیکن آج اس کے لہجے سے کیسا

درد جھلکتا تھا جو دل پگھلاتا تھا بھل نے اس کے چہرے کی طرف کھوجتی نظروں سے دیکھا لیکن وہ لمحہ بھر پہلے والا تاثر

اب اس کے چہرے پر نہیں تھا اور وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرے خیال میں اماں نے تمہارے لیے بہت اچھا سوچا ہے جو۔ تم بہت لگی ہو... اماں تمہاری اس موٹائی

صورت کی وجہ سے ہمیشہ سے ہی تم پر مہربان تھیں، تم کو شش کرنا کہ اداکاری سیکھ لو اور یہ روح و جسم کے سودا کرنے

سے اچھا ہے۔“ موتیا کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔ بھل کی اذیت میں جیسے اضافہ ہوا تھا اس نے انگوٹھے

اور شہادت کی انگلیوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبا دیا۔

”کیا بہت درد ہو رہا ہے جو؟“ موتیا نے ہمدردی سے اسے دیکھا تو اس نے سر ہلا دیا۔

”میرے پاس سردی کی گونیاں ہیں۔ میں لاتی ہوں تمہارے لیے۔ تم موراں سے کہو تمہارے لیے چائے

بنادے۔ گولی لے کر گرم، گرم چائے پینا سرد دھکیک ہو جائے گا۔“ موتیا بھی تو وہ بھی اٹھ کر باہر آگئی اور بیئرھیوں پر

سے نیچے لاؤنج میں جھانکا۔ لاؤنج خالی پڑا تھا بس ایک لائٹ جل رہی تھی۔ غالباً سنہری اور چینیلی جا چکی تھیں اور پتا

نہیں موراں کہاں تھی۔

”موراں!“ اس نے موراں کو آواز دی اور جب کوئی جواب نہ ملا تو نیچے اترنے لگی تاکہ خود ہی چائے بنا لے،





اس کی پیشانی پر شکن سی نمودار ہوئی اور بنا کچھ کہے اس نے دروازہ کھولا اور باہر دروازے پر دستک دینے کے لیے اٹھے ظہور سے کہہ باجھ بچے گر گئے۔ ہمیشہ کی طرح ظہور سے کی نظریں اس کے پاؤں پر سے ہوتیں اس کے چہرے پر تک گئیں۔ ایک ناگواری نظر ظہور سے پر ڈالتی وہ ساندے سے نکل کر تیزی سے سیریموں کی طرف بڑھی۔ ظہور پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا تھا۔

”اب مر بھی چیک ظہور سے۔“ شاہجہان کی تیز آواز پر وہ چونکا اور اندر قدم رکھتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ شاہجہان اسے حور رہی تھی۔ ”تیری نظروں کی بددلتی نہیں جانی ظہور سے۔ اس کاغذی رشتے کا ہی لحاظ کر لیا کر۔“

”کاغذ پر لکھتے سے میں اس کا باپ تو نہیں بن گیا تھا۔ کتنی بار کہا ہے مجھ سے نکاح پڑھا لے، کاغذی رشتہ بچ بچ کا رشتہ بن جائے گا۔ تمہاری بیٹیاں میری بیٹیاں۔ ویسے میں بددلتی سے نہیں دیکھتا اسے۔۔۔۔ اللہ کی عنائی کو سراہتا ہوں کیا ہیرا تیری گود میں ڈالا ہے اس نے۔“

”اچھا بیک بیک نہ کر۔“ شاہجہان نے اسے گھر کا۔ ”چل بتا چھوڑ آیا لڑکیوں کو اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کسی بہتری تھی سب لوگ فحک تھے ناں۔ کسی گڑ بڑ کا ڈر تو نہیں؟“

”ارے کیسی گڑ بڑ شاہجہان بیگم۔ کل تم بھی تو گئی تھیں سب شریف، معزز لوگ تھے۔“

”ہاں کل تو گھر پر ہی فکشن تھا تھوڑے سے لوگ تھے آج بڑا فکشن ہے ہال میں تو پوچھ رہی تھی۔ آخر اپنی عزت کا خیال بھی تو رکھنا پڑتا ہے ناں۔“

”ہماری عزت؟“ ظہور رازور سے ہنسا۔

”چل دانت اندر کر۔“ شاہجہان برا مانا گئی۔ ”تو کیا ہماری عزت نہیں ہے۔ ہم کیا نگلی بازاروں میں پڑے ہیں۔ سو فٹس کروا کے کہیں جاتے ہیں۔“

”برامان مئی ہو۔“ ظہور سے اسے دیکھ۔

”ہاں تو براماننے کی بات ہی کی تم نے۔ اپنے حساب سے سب کی عزت ہوتی ہے بھلے عزت کے معیار الگ، الگ کیوں نہ ہوں۔ سچ تیرا جتنا تیر کی طرح لگا ہے مجھے۔“

”اچھا چل معاف کر دے۔ سازندوں کے ساتھ شیدے لیے کو بھی چھوڑ آیا ہوں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو لبا لبا دیتا ہے اگلے کو۔۔۔۔۔ واپسی کے لیے بھی راجا صاحب نے کہا ہے کہ گاڑی پر بھجوا دیں گے سب کو تم بھی چلی چلیں۔ سنا ہے بڑے، بڑے سکر آئیں گے آج۔“

”میرے گھنٹوں میں بہت درد تھا۔“

”شوگر کی گولیاں کھانی چھوڑ دی ہوں گی تم نے اور میں دیکھ رہا تھا کہ کل کس طرح حلو سے سے پلیٹ بھری ہوئی تھی تم نے۔“

”تیری نظریں مجھ پر ہی رہتی ہیں کیا؟“ شاہجہان مسکرائی۔

”دیکھ لے ایک بار نظر اٹھی تھی تیری طرف پھر گری ہی نہیں۔“

”پھر شروع ہوئی تیری بیک، بیک۔ چل بیٹھ ادھر اور بتا کچھ خیر خبر ملی۔ کہہ رہا تھا ناں کہ شام تک کچھ خبر مل جائے گی۔“ شاہجہان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ موز سے کوٹھیت کر بند کے سامنے لایا اور بیٹھ گیا۔

”نہیں کسی کے متعلق کچھ نہیں پتا چلا۔ نہ حیاتی دوا کے متعلق نہ خانواستاد کے بارے میں۔۔۔۔ ان کے ٹھکانوں پر بندہ گیا تھا ایک اپنا لیکن وہ تو پرانے ٹھکانے چھوڑ چھوڑ جانے کہاں اڑنچھو ہو گئے پر یہ بتا مجھے اتنی اذیک کیوں

ہے تجھے ان کی۔ بیٹھے بٹھائے اٹھارہ انیس سال بعد تجھے کیا ضرورت آپڑی ہے ان کی؟

”ہاں آپڑی ہے ضرورت۔۔۔۔۔ تجھے کیوں خفقان ہو رہا ہے؟“

”لے مجھے کیوں خفقان ہونا ہے بس ہنسی آتی ہے مجھے کہ اٹھارہ سال بعد پرانا عشق جاگ اٹھا ہے۔ کیا پتا مر

کھپ گئے ہوں۔ ایسے لوگوں کے ہزار دشمن، جتن ہوتے ہیں۔ سائیں منہ سے بھی تو اس نے پنگا لے لیا تھا۔“

”زیادہ بک، بک نہ کیا کر ظبور سے، کسی روز ہاتھ پکڑ کر دروازے سے باہر نکال دوں گی۔“

”ارے ایسا غضب نہ کرنا شاہجہان بیگم۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”اس عمر میں اب کہاں ذلیل و خوار

ہوؤں گا مرتے دم تک تیرا درد نہ چھوڑنے کا عہد باندھ کر بیٹھا تھا ادھر۔“

”اچھا زیادہ دادا کا رشتہ بن اور اپنے کام سے کام رکھ کر، میں تو بس کسی وعدے کے بندھن میں بندھی ہوں۔

کسی سے کوئی وعدہ کر رکھا تھا وہی نبھاتا ہے۔“

”کیا حیاتی دادا سے وعدہ کر رکھا ہے کوئی؟“ ظہور اچھر متحس ہوا تو شاہجہان نے آنکھیں نکالیں۔

”تو باز نہیں آئے گا ظہور بھلا حیاتی دادا نے مجھ سے کیا وعدہ لیتا تھا وہ تو.....“

”ایک بات بتاؤں شاہجہان بیگم۔“ ظہور اچھے کچھ یاد کرتا ہوا بولا تھا۔ ”یہ جو ہمارا بنگلا ہے ناں اس کے

سامنے والی لائن میں سڑک پار کر کے دائیں طرف سے پانچویں نمبر پر جو بنگلا ہے ناں اس کے باہر گیٹ کے پاس

شیدے نے دیکھا تھا حیاتی دادا کو اور تم جانوشیدے کی نظر بڑی تیز ہے۔“

”اچھا“ شاہجہان بیگم کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ”دکھانا مجھے وہ بنگلا کسی دن۔“

”دکھا دوں گا۔“ پر ادھر کوئی پرو فیسر رہتا ہے۔ کہہ رہا تھا اس نام کے بندے کو نہیں جانتا۔ بتایا تو تھا تجھے۔“

”ہوں۔“ شاہجہان نے پُرسوج انداز میں سر ہلایا۔ ”کسی روز میں بھی ادھر جا کر دیکھوں گی۔ کیا پتا نام شام

بدل لیا ہو۔۔۔۔۔ مرد چلا لاک ہوتے ہیں گھر کی عورتوں سے بات کروں گی۔“

”ارے ہاں۔“ ظہور سے نے سر پر ہاتھ مارا۔ اس کی عادت تھی جب کوئی بھولی ہوئی بات اسے یاد آتی تو

یوں ہی سر پر ہاتھ مارتا تھا۔ ”ایک تو تم ہوش بھڑاتی ہو شاہجہان بیگم لاہور سے اور بھی بڑی خبریں آئی ہیں۔ ادھر

تجھے بھی کوئی ڈھونڈنا پھر رہا ہے۔“

”کون؟“ شاہجہان چونکی۔

”پتا نہیں۔۔۔ دو تین پکڑ لگائے اس نے تیرے چوہارے کے۔ سب سے تیرا پتا پوچھتا پھرا۔ ایک روز

راہا کے چوہارے پر چلا گیا تو راہا نے اسے بتا دیا کہ تم کبھی چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہو۔“

”نام پتا نہیں بتایا اس نے اپنا راہا کو؟“

”نہیں بس پوچھ کر چلا گیا۔“

”ہوگا کوئی۔“ شاہجہان نے سندھے اچکائے۔

”کوئی پرانا طلبہ کر یا پھر کیا پتا حیاتی دادا کا ہی دل گر لایا ہو تیرے لیے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ادھر تو

اسے ڈھونڈ رہی ہے ادھر وہ۔“ ظہور سے کی زبان پھر کھل گئی لیکن اس بار شاہجہان نے غصے کا اظہار نہیں کیا بس اتنا

ہی کہا۔

”جیسے راہا تو نہیں جانتی حیاتی دادا کو۔“ علی کا کون سا مھر ہے جو حیاتی دادا کا احسان مند نہ ہو اور بتا کیا

خبریں ہیں؟“



”وہ نہیں تھی رادھا کے چوبارے پر صفو، رخسانہ وہ بن گئی ہے اداکارہ۔ ڈراموں میں کام مل گیا ہے اسے۔“  
 ”لو۔۔۔ وہ موٹو اسے کیسے کام مل گیا؟“ شاہجہان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹ گئیں۔  
 ”لو تو کیا موٹیوں کی ضرورت نہیں ہوتی ڈراموں میں۔“ ظہور اچھا۔ ”یہ دھڑا دھڑنوٹ چھاپ رہی ہے رادھا، اس کی تو بڑی ٹورنار بن گئی ہے۔“

”اچھا۔“ شاہجہان کا دل جیسے بیٹھ گیا تھا۔  
 ”ہاں تو اور کیا آج کل تو مجھ جیسے بھی چل جاتے ہیں۔ کل دیکھا نہیں تھا وہ ڈراما اس میں جو لون تھا مجھ سے بھی گیا گھزرا تھا۔“ اس نے اپنی راکمیں موٹھ مردی۔  
 ”تو بھی کوشش کر لے۔“ شاہجہان مسکرائی لیکن اس کی مسکراہٹ بھی، جھنجھی سی تھی۔ صفو کے ڈراموں میں کام کرنے کا سن کر دل پر بوجھ سا آ پڑا تھا۔

”ہاں اور ایک اور خبر بھی ہے بڑی زبردست۔۔۔۔۔۔ رادھا کے چوبارے پر ایک نئی لڑکی ہے سنا ہے چاند کا ٹکڑا ہے۔۔۔۔۔۔ چاند کا۔“ شاہجہان کے دل پر بڑا بوجھ بڑھ گیا۔

”جہاں سے آئی ہے؟“  
 ”یہ تو پتا نہیں۔“

”تو پتا چلاتاں بلکہ ایسا کرایہ دو دن کے لیے لاہور چلا جا بکے کل ہی نکل جا۔“  
 ”کل تو وہ انصاری صاحب کی طرف جانا ہے جو کو لے کر۔“ تجھے بتانا یا رہی نہیں رہا۔ صبح صبح گیا تھا ان کے پاس دو گھنٹے بٹھانے کے بعد بلایا اور کہہ دیا کہ کل لے آؤں جو کو آڈیشن کے لیے۔ کل تین بجے جانا ہے جو کو کہہ دینا تیار ہو جائے۔“

”اچھا۔“ شاہجہان خوش ہوئی۔ ”دیکھ لینا وہ ضرور اپنی جو کو ڈراموں میں کام دے دیں گے ظہور ہے۔“  
 ”ہر جگہ سفارش چلتی ہے شاہجہان بیگم۔ موتیا سے کہو ناں کہ صاحبزادہ صاحب سے بات کرے بڑے تعلق ہیں ان کے لوگوں سے۔ یہ سہیل انصاری تو مجھے ایویں ہی لگ رہا ہے۔ خواہ مخواہ میں ہی دوڑیں لگواتا رہے گا۔ کام کرنے والا بندہ نہیں لگتا۔“

”تو پھر دفع کر اسے میں موتیا سے کہتی ہوں وہ صاحبزادہ صاحب سے بات کر لے۔“  
 ”ہاں، بڑی دور تک پہنچا ہے صاحبزادہ صاحب کی اور اپنی موتیا کی بات نہیں نالے والے وہ۔۔۔۔۔ دیکھا نہیں تھا کل نظریں کیسے موتیا پر جمائے بیٹھے تھے۔ آج تم شخصوں کا درد لے کر بیٹھ گئیں جاتیں تو چار اور لوگوں سے میل ملاپ ہوتا ہے۔ یہاں کراچی میں ابھی نئے ہیں تو تعلق اور جان پہچان تو ایسے ہی ہوگی ناں۔“ ظہور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر جھانکی روکی۔

”سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے ذرا ایک کش لگا کر آتا ہوں۔“  
 شاہجہان نے سر ہلایا وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”اگر خانوا استاد اور حیاتی دادا کا پتا نہیں چل رہا تو میرا کیا تصور میں نے تو اپنی ہی کوشش کر ڈالی ڈھونڈنے کی۔ ایک سال سے تو تلاشتی پھر رہی ہوں۔ اس لیے اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا اور اب دیکھو اس رادھا کی وہ موٹی صفو بھی ڈرامے کرنے لگی۔ بس رہ گئی میری ججو، ایک دفعہ جائے میدان میں تو سب کے چھٹے چھڑا دے گی اور کیا پتا اٹھا والے دیکھ کر اپنی فلموں کی ہیروئن بنائیں۔ کیا کریں کپور اور رینا ایٹور یا رائے سب اس کے سامنے پانی بھرتی

ہیں اور شیوہ..... بوزھی اور موٹی پرست۔ ” ایک فنڈی سانس لے کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تاکہ بتا کر اچھی طرح سمجھا سکے۔ کب سے دل میں خواہش چھپائے بیٹھی تھی کہ جو کواداکارہ بنائے گی۔ ” اور یہ رادھا کتنی تھنی ہوئی رنگی اپنی لڑکی کو ڈراموں میں کھپا دیا اور ہوا تک نہ گئے دی بھیس اور میں گھریا رچھوڑا دھرا آ بیٹھی اور اس نے وہاں بیٹھے ہی کام دکھا دیا، دفعہ۔ ” اس نے ہاتھ اٹھا کر جیسے کچھ اڑایا۔ ” میں خواہ مخواہ ایک بات کو لیے بیٹھی تھی۔ کیسا دھڑکنا، کہاں کا دھڑکنا ایک بات تھی رات گئی بات گئی۔ ” اس نے دائیں پاؤں کی ایڑی کو یوں دبایا جیسے اس رات کی بات کو اس نے ایڑی کے نیچے مل دیا ہو اور پھر گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر میز صیال چڑھنے لگی۔

ہم ہا ہا ہا

ڈی ون کے لوگ روم میں وہ بے چینی سے ٹپ رہا تھا۔ اسے پاکستان واپس آئے چند دن ہو گئے تھے لیکن اس کا قیام ڈی ون میں ہی تھا ابھی تک وہ گھر نہیں گیا تھا۔ ممتاز خان سے فون پر بات ہو گئی تھی۔ ممتاز خان نے اسے بتایا تھا کہ اس کے جانے کے بعد ایک بار بھی عظام گھر نہیں آیا۔ عظام جب ہاسٹل میں تھا تو کبھی گھر نہیں آتا تھا چھوٹا تھا تب تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اکیلے گھر آنے کا جب تک وہ خود اسے نہ لے کر آتا لیکن جب کانٹا میں چلا گیا تب بھی وہ کبھی گھر نہیں آیا تھا حالانکہ اسے پتا تھا کہ شریات کے جانے کے بعد بھی گھر میں ملازم ہوتے ہیں لیکن وہ جب فون کر کے بلاتا تب ہی گھر آتا لیکن اب وہ رواد کے گھر تھا اور ہو سکتا ہے کہ کسی روز وہ یونی کوئی کتاب یا اپنی ضرورت کی کوئی چیز لینے گھر چلا آئے۔ پتا نہیں یہ خیال کیسے اس کے ذہن میں آیا تھا لیکن یہ خیال آنے کے بعد وہ ہنگام سے واپس آ کر گھر جانے کے بجائے ڈی ون میں ہی میم ہو گیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عظام کو پتا چلے کہ وہ پاکستان میں ہے۔ بگ بانے اس کے ذہن بہت سے کام لگا رکھے تھے، عظام کے ساتھ رہ کر جنہیں وہ نہیں کر سکتا تھا۔ پاکستان آنے سے پہلے ایک دن اس نے عظام سے بہت لمبی بات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ آئندہ چند ہفتے وہ بہت مصروف رہے گا اس لیے کال نہیں کر سکے گا۔ عظام مہم رواد کے گھر بہت خوش اور مطمئن تھا اور اپنی تعلیم کے ختم ہونے کا انتظار بے چینی سے کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہ سکے لیکن اسے لگتا تھا جیسے وہ اگلے کئی سال تک اس دلدل سے نہیں نکل سکے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھجوادے گا۔ یو کے، امریکا، آسٹریلیا کہیں بھی اور اس دوران خود کو اس جال سے باہر نکالنے کی کوشش کرے گا۔ بگ با سے اس سلسلے میں اس نے تفصیلی بات کی تھی۔ بگ با ہمیشہ سے ہی اس کے سپرد دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا تھا۔ اس نے بہت درد مندی سے اس کی بات سنی تھی لیکن اب وہ ایک عام معمولی سا فنڈا یا اسنگر نہیں تھا۔ وہ بین الاقوامی گروپوں سے تعلق کا کچھ بیٹھا تھا۔ اب وہ بھی کسی کو جواب دہ تھا اور پتا نہیں کبھی وہ عظام کی خواہش پوری کر سکے گا یا نہیں۔ بگ بانے کہا تھا یہ اتنا آسان نہیں ہے پھر بھی وہ سوچے گا اس کے متعلق۔ پاکستان آنے کے بعد اس کی اس موضوع پر بگ با سے بات نہیں ہو سکی تھی حالانکہ وہ ڈی ون میں ہی مقیم تھا اور بہت مصروف تھا لیکن شریات نے اس کی مصروفیات کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک دن ہر شے سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا اب تو ایک ہی خواہش رہ رہ کر دل میں چٹکیاں بھرتی تھی کہ عظام کی شادی ہو، اس کے بچے ہوں وہ عظام اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ ایک نارس زندگی گزارے۔ پر سکون ہر خوف سے آزاد۔

ٹپٹے ٹپٹے وہ کھڑکی کے پاس رکا اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھا اور کچھ دیر تک وہ یونی باہر دیکھتا رہا تب ہی بگ با کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ بگ با کی گاڑی اندر آ رہی تھی۔ وہ پردہ برابر کر کے کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا اور گہری سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کیا مڑا اس سب بھاگ دوڑ اور جنگ و دوسے؟“ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے صوفے کی پشت سے سر ٹیک لیا۔

کیا خبر تھی کہ زندگی اس سے ایسا اس طرح کا امتحان لے گی۔ جب سمجھی وہ اپنے ماضی پر نظر ڈالتا تو اسے لگتا وہ بالکل خالی ہاتھ اور خالی دامن ہے۔ ساری زندگی کی بھاگ دوڑ کا حاصل کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ اسے اپنا حال اس فقیر کی بوسیدہ چادر کی طرح لگتا جو اپنی عمر بھر کی کمائی اپنی تار تار چادر میں اکٹھی کرتا رہا ہو اور پھٹی ہوئی چادر سے سب گرتا رہا ہو۔ اس آئینا کسی کونے میں کوئی سکہ انکار ہو گیا ہو اور اب وہ اسے منسوبی سے منسبی میں صیغہ بیٹھا ہو کہ وہ اپنے اس آخری سرمائے کو بھی کھوندے۔ اس کے پاس بھی تو کچھ نہ تھا سوائے عظام کے۔ ایک ایک اس کا جی چاہا وہ یہاں ایک منٹ نہ رکھے، بھاگتا ہوا جائے اور عظام کو اپنی بانہوں میں چھپالے۔ تار تار چادر میں انکا سکہ اس کا آخری سرمایہ تھا اور وہ اسے کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ اس لمحے اسے عظام بہت شدت کے ساتھ پدایا اور عظام کے ساتھ کوئی اور بھی اتنی ہی شدت سے یاد آیا تھا، اس نے اس کی شبیہ کو تصور میں لانا چاہا لیکن اس کے تصور میں فرقی آگئی تھی۔ روتی، مگر مڑاتی، ہاتھ جوڑتی، میس کرتی ہوئی اور اس کے دونوں ماموں فرعون بنے ہوئے تھے اور ارد گرد ہجوم تماشا شانی بنا کھڑا تھا۔ ان میں اکثر چہرے اس کے آشنا تھے لیکن اس وقت سب نے ہی اجنبیت کے نقاب چڑھا رکھے تھے۔

”خدا کے لیے اسے کچھ مت کہیں۔ ہم چپے جائیں گے، ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“ تب ہی کھلے دروازے سے کوئی اندر آ کر دباڑا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے یہ؟“ اس نے ناک سے بہتے خون کو پونچھتے ہوئے آنے والے کی طرف دیکھا۔ جلیل خان غضب ناک نظروں سے سب کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کے پیچھے شیر خان بھی ہاتھ میں کچھ شاپر پکڑے اندر داخل ہوا تھا۔

”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم لوگوں نے؟“ جلیل خان چند قدم آگے بڑھا تھا۔ ”تم لوگوں نے جرات کیسے کی ایک چادر دیواری کا تقدس مجروح کر کے اندر قدم رکھنے کی؟“ شیر خان نے شاپر برآمدے میں پڑے تخت پر رکھ کر ہونٹوں سے رنج و الم اور نکالا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ریو الورد دیکھتے ہی ہجوم تیزی سے منتشر ہوا تھا۔ وہ سب تقریباً ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے باہر نکلے تھے اور اب محکم میں صرف اس کے دونوں ماموں کھڑے جلیل خان کو خوشخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”فرجی..... بیٹی۔“ جلیل خان نے فرجی کے سر پر ہاتھ رکھا تو فرجی کا پتی ہوئی زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جلیل خان نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ حضرات کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”یہی سوال آپ سے بھی کیا جاسکتا ہے سسر آپ کون ہیں اور یہاں کس مقصد سے آئے ہیں؟“ چھوٹے ماموں ہمیشہ سے ہی کچھ نڈر تھے سو انہوں نے وہی سوال جلیل خان سے کر ڈالا تھا۔

”میں اس بچی کا سر پرست ہوں۔ بیٹی ہے میری۔“ جلیل خان نے فرجی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ”اور میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میری بیٹی کے گھر گھس کر غنہ اگردی کرے۔“

”اچھا؟“ چھوٹے ماموں کے لبوں پر ایک مذاق اڑاتی ہوئی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”یہ بڑا ہمارا بھانجا ہے جس کے ساتھ تمہاری لڑکی بھاگ کر۔“

”خبردار اس کے بعد ایک لفظ زبان سے مت نکالنا۔“ جلیل خان پھر دباڑا تھا۔



”شیر خان ان صاحبان کو باہر نکال کر دروازہ بند کر دو۔“ اس نے شیر خان کو اشارہ کیا۔  
 دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دروازے سے باہر نکل گئے لیکن ان کی باڈی لینگوئج بتا رہی  
 تھی کہ اس وقت وہ مصلحتاً چلے تو گئے ہیں لیکن پھر آئیں گے اور شکر کو ہاں نہیں رہنے دیں گے۔  
 شیر خان نے دروازہ بند کر دیا تھا اور جلیل خان تخت پر بیٹھا تاسف سے انہیں دیکھ رہا تھا۔  
 ”تم میری عدم موجودگی میں چلے آئے جبکہ میں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا اور اب میں فرجی بیٹی کو لینے آیا تھا  
 دراصل میں چاہ رہا تھا کہ فرجی بیٹی کو میں روایتی طریقے سے بیٹیوں کی طرح رخصت کروں۔ تم اپنے عزیزوں اور  
 دوست احباب کے ساتھ بارات لے کر آؤ اور اسے عزت کے ساتھ رخصت کروا کے گھر لاؤ تاکہ کوئی تمہاری اور  
 فرجی کی طرف انگلی نہ اٹھائے اور تمہارے رشتے پر شک نہ کرے لیکن یہاں یہ کیا تماشاکا ہوا تھا اور تمہارے اہل  
 محلہ تمہارے گھر میں کیوں اکٹھے تھے اور تمہارے ناموں کیا چاہتے تھے؟“  
 تب اس نے جلیل خان کو تفصیل بتا دی تھی اور جلیل خان نے اس سے پوچھا تھا۔  
 ”پھر اب تمہارا کیا ارادہ ہے شمر... کیا کرو گے تم؟ ان حالات میں کیا یہاں ہی رہو گے؟“  
 اور اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ ماموؤں کے کڑے تیور اسے نظر آ رہے تھے اہل محلہ کا رویہ بھی  
 اس نے دیکھ لیا تھا پھر بھی اس نے یہاں ہی رہنے کا فیصلہ کیا تھا یہ اس کا اپنا گھر تھا وہ کیوں خوفزدہ ہو کر یا تو رگراپنا گھر  
 چھوڑ دیتا۔

”سہیہ میرا گھر ہے میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟“  
 ”اوکے ریٹیکس شمر حیات... فی الحال میرے ساتھ چلو پھر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔“  
 ”شمر پلیز چلو۔“ فرجی نے التجا کی تھی۔  
 ”سہ آپ فرجی کو ساتھ لے جائیں۔ حالات بہتر ہوتے ہی میں چند دوستوں کو لے کر آؤں گا اور باقاعدہ  
 رخصتی کروا کے لے آؤں گا۔ کیا خبر تب تک اماں کا بھی پتا چل جائے۔“ دل خوش فہم نے امید دلائی تھی تو وہ کچھ  
 پُر اعتماد نظر آنے لگا تھا۔  
 ”میں خانہ وال سے ایک خاتون کو لایا ہوں۔ میری جانتے والی ہیں بیوہ ہیں۔ خیال تھا کہ وہ فرجی کی رخصتی  
 کے لیے خریداری وغیرہ میں مدد کریں گی۔ میں بہت دھوم دھام سے رخصت کرنا چاہ رہا تھا اپنی بیٹی کو۔“  
 فرجی کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔  
 ”سہ آپ کے احسانات میں سے یہ ایک اور احسان ہے ہم پر۔ ہم کبھی بھی آپ کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا  
 سکتے۔ میں بھی فرجی کو چوروں کی طرح نہیں عزت و احترام سے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔“  
 ”بے وقوف لڑکے میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ جب میں نے فرجی کو بیٹی کہا ہے تو مجھے اس رشتے کی  
 نوج بھی رکھنی ہے۔ ہم جیسے لوگ بھی بیٹیوں اور بہنوں کے لیے جانیں دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔“ جلیل خان نے  
 کھڑے ہوتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔  
 ”میری خواہش ہے کہ تم بھی میرے ساتھ ہی چلو لیکن میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“  
 ”شمر تم بھی ساتھ چلو۔ تم یہاں اکیلے کیسے رہو گے؟“ فرجی نے اسرار کیا تھا لیکن اب وہ اپنا گھر خالی نہیں  
 چھوڑنا چاہتا تھا۔

”یہ میں کچھ کھانے پینے کا سامان لایا تھا۔ سوچا تھا پہلی بار بیٹی کے گھر جا رہا ہوں خالی ہاتھ نہ جاؤں۔“ جلیل

خان نے شاپر کی طرف اشارہ کیا اور فرحی کی طرف دیکھا۔

”تم نے کیا سوچا ہے چلوگی میرے ساتھ؟“ فرحی زار و قطار رونے لگی تھی۔

”فرحی پلیز تم جلی جاؤ سر کے ساتھ..... میں آتا رہوں مجھ تمہاری خبر لیتا رہوں گا لیکن یہاں یہ لوگ..... پھرت

آجائیں جگ کرنے تم جلی جاؤ پلیز.....“

”تم کہو تو شیر خان کو یہاں ہی چھوڑ جاتا ہوں۔“ لیکن اس نے انکار کر دیا تھا اور جلیل خان، فرحی کو لے کر چلا

گیا تھا۔ فرحی دروازے سے نکلے ہوئے بھی رو رہی تھی۔ وہ جلیل خان کے خلوص سے بہت متاثر ہوا تھا وہ اس کا کوئی

نہیں تھا لیکن اس نے انہیں پناہ دی تھی۔ ان کے لیے سوچا تھا ان کی بات پر یقین کیا تھا لیکن وہ جو اس کے اپنے تھے

انہوں نے اس کے ساتھ کیا، کیا تھا پوری رات وہ جاگتا رہا کبھی اماں کے کمرے میں جاتا، کبھی اپنے کمرے میں کبھی

برآمدے میں آکر بیٹھ جاتا۔ ایک بار تخت پر بیٹھے دیوار سے ٹیک لگائے، لگائے اس کی آنکھ لگ گئی تو اس نے دیکھا

لباس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ اسے دلا سادے رہے ہیں۔

وہ چاروں طرف اماں کو دیکھ رہا ہے اور اماں اسے کہیں نظر نہیں آئیں۔

”اماں کہاں ہیں؟“ وہ صبح مار کراٹھ بیٹھا تھا۔

صبح وہ گھر سے باہر نکلا اور اگلے کئی دن تک اماں کو ڈھونڈتا رہا۔ محلے والے اسے دیکھ کر منہ پھیر بیٹے۔ لڑکے

آوازیں کتے اور محلہ چھوڑ دینے کی بات کرتے۔ اس نے کچھ نہیں کیا تھا اس کے ساتھ تو ظلم ہوا تھا۔ ابا دنیاسے ہی

پٹے گئے تھے اور اماں پتا نہیں کہاں تھیں، یہ لوگ اس سے ہمدردی کرنے کے بجائے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

اسے برا بھلا کہہ رہے تھے۔ کس نے ان کے کان بھرے تھے، اس کے بارے میں کیا کہا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ ایک دو

میں کی پیلائی، محبوب  
جاسوسی شہر میں جانا فراہم احوال

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

درد دل سے لے کر پیدائش انسان کو روئے انسانیت کے لیے کچھ منہ پھیر رہا ہے...

● مسیحی  
محی الدین نواب کے شہر قلم سے درمیان میں کا احوال

● آوارہ گرد  
دیکھ کے شہر کے ساتھیوں کی ایک نئی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک

کوئی تلاش کا سروریش تھا۔ ڈاکٹر عبد اللہ ربیعہ کی شہریت

● مغربی دنیا کی تہذیب و احوال کی عکاسی اور حیرت کی پڑوہ، قاتل فرسٹ کہانیوں

سرورق کی کہانیاں

● بطنی کہانی  
محبت اور جنگ میں سوچ اور ارادے کی جنگی ہی کامیابی

سے جتنا آتی ہے... سلیم فاروقی کی شہریت

● دوسری کہانی  
عراق، عراق کے شہر، عراق کے شہر، کاشف زبیر کاوش



پ کے قلم سے...

میں نے مجھے... شہریت

اور ان کی دلچسپ باتیں... کچھ نہیں





## اعتبار و وفا

سے کچھ رقم ادھارت مانگ لوں۔ اس وقت جب اس کا کاروبار عروج پر تھا اس نے بھی سن لیا ہوگا کہ ماموؤں نے ابا کا سارا روپیہ، انہیں کا زیور و کان، گھر سب قبضے میں کر لیا ہے تو اسے ڈر ہوگا کہ اس سے مدد نہ مانگ لوں تب ہی تو۔۔۔ ہاں تب ہی تو حالانکہ اسے تو صرف اس کے کندھے کا آسرا چاہیے تھا۔

اسے لگا جیسے زندگی اس کے اندر مرنے جا رہی ہو۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنے کسی دوست کے پاس چلا جائے گا۔ اس کی مدد سے کوئی چھوٹا سا گھر کرایے پر لے گا اور پھر فرجی کو لے آئے گا چند دوستوں کے ساتھ رخصت کروا کے کوئی جاب کر لے گا جب تک جاب نہ ملے ٹیوشن پڑھائے گا کچھ نہ بچھ کر ہی لے گا۔ زندگی کو بہر حال شروع تو کرتا ہی تھا لیکن اس کے سناکت و جود میں جنبش ہوئی۔

جب صفدر جیسا دوست جو جب بھی ملتا اس کا شکر گزار ہوتا کہ اگر وہ اپنے ابا سے رقم ادھارت نہ دلاتا تو پاپ سے ناراض ہو کر جب وہ گھر سے نکلتا تھا تو جانے کتنا خوار ہوتا جب اس نے ہی آنکھیں پھیر لیں تو وہ کسی اور سے کیا امید کر سکتا تھا۔ اس نے بہ مشکل قدم اٹھایا۔ پاؤں من، من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ اپنا اپنی گھسیٹا جانے کیسے روڈ تک آیا تھا اور کیسے ٹیکسی میں بیٹھا تھا اور جب سوچے ہوئے بیٹنوں اور ڈھکی پیشانی کے ساتھ وہ جلیل خان کے پاس پہنچا تو اس کا اندر بالکل خالی ہو چکا تھا۔

”میں جینا نہیں چاہتا سر لیکن فرجی مجھے اس کا خیال مرنے بھی نہیں دے رہا۔ میز ایک آخری احسان اور مجھ پر کر دیں۔ ایک بار پھر فرجی کے ذمے سے نہیں انہیں آپ قائل کر لیں کسی بھی طرح اور فرجی کو اس کے اپنوں میں پہنچا دیں۔ میں جینا نہیں چاہتا سر ایک لمحہ بھی نہیں۔“ وہ ہلک، ہلک کر رہ رہا تھا۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک اور آپشن بھی ہے۔ تم میرے ساتھ رہو۔ میرے لیے کام کرو اس چینیج کو قبول کر لو۔ خود کشی بزدل لوگ کرتے ہیں شرم حیات۔ اس دروازے پر جا کر فریاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے جس سے بار بار دھتکار دیے گئے ہوں۔ یوں بھی اب فرجی ان کی نہیں تمہارے ذمے داری ہے۔ وہ تمہاری بیوی ہے۔ نکاح جن حالات میں بھی ہوا شادی کے بعد بیوی کی ذمے داری اس کے شوہر پر ہوتی ہے۔ بار بار پیچھے مڑ کر مت دیکھو شرم حیات، آگے بڑھو۔“ اور اس کے پاس تو کوئی دوسرا آپشن تھا ہی نہیں اس نے سر جھکا دیا۔

”میں نے اپنا آپ، آپ کے حوالے کیا۔ آپ جو چاہیں سلوک کریں۔ یہ زندگی آپ کی ہے۔“ تب جلیل خان مسکرایا تھا۔

”میں چاہتا ہوں فی الحال تم اپنی شادی شدہ زندگی کو انجوائے کرو۔ جو ہوتا تھا وہ ہو چکا۔ گزرا ہوا وقت واپس نہیں لایا جاسکتا لیکن حال کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ چند دن تک فرجی کو باقاعدہ رخصت کروں گا۔ اس کا ویڈیو ڈریس آج مل جائے گا۔ میں اس کے اپنوں کو تو نہیں لاسکتا لیکن جو کر سکتا ہوں وہ کروں گا پھر ویسے کی دعوت کے بعد تم دونوں خانیوال چلے جانا۔ وہاں میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے فرشتہ ہے۔ وہ میری طرف سے میری بیٹی کی شادی کا تحفہ سمجھ لو۔ ایک ماہ تک تم وہاں ہی ہر فکر سے آزاد ہو کر رہو۔ میرے خیال میں تمہیں اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے ایک ماہ کافی ہوگا۔“

اس نے جلیل خان کی کسی بات کی نفی نہیں کی تھی۔ اس کے پاس کچھ کہنے کے لیے تھا ہی نہیں۔ اسے کیا کرتا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ کیا کر سکتا تھا یہ بھی نہیں جانتا تھا اسے وہی کرتا تھا جو جلیل خان نے کہا تھا۔ اس ظالم دنیہ میں صرف وہی تھا جس نے انہیں اپنی پناہ میں لیا تھا اور جو ان کی بہتری کے لیے سوچ رہا تھا۔

”کن سوچوں میں گم ہو شرم جاناں؟“ شرم حیات نے چونک کر دروازے میں کھڑے ہلک باکی طرف دیکھا۔

کبھی کبھی بگ پاؤں میں آکر اسے یوں ہی جلاتا تھا۔ اس وقت جب وہ بہت خوش ہوتا یا بہت اداس ہوتا۔ پتا نہیں اس وقت وہ خوش تھا یا اداس، شرم حیات نے سوچا اور احترام اٹھا کھڑے ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ ایسی چمک جو کسی بڑے سودے پر اس کی آنکھوں میں آتی تھی۔ یقیناً وہ خوش تھا۔

”کچھ نہیں بگ پاؤں کی ماضی کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”تم آج کل ماضی کو بہت یاد کرتے ہو شرم؟“ بگ پاؤں نے، ہولے چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کے کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اسے ہنسنے کے لیے کہا اور خود بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”ہاں، آج کل ماضی بہت سنا تا ہے بگ پاؤں۔ سنا ہے آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنے حال کے بجائے ماضی میں جیتا ہے اسے ماضی کی وہ باتیں بھی یاد آتی ہیں جو بہت معمولی اور چھوٹی، چھوٹی ہوتی ہیں جنہیں کبھی اس نے یاد نہیں کیا ہوتا جیسے کل رات میں سونے کے لیے لیٹا تو مجھے چڑیا کا وہ زخمی بچہ یاد آیا جسے چڑیا نے اپنے گھونسلے سے گرا دیا تھا۔ چڑیا نے یہ گھونسلہ ہمارے گھر کے اسٹور کے ایک روشن دان میں بنا رکھا تھا جسے اندر سے تو بند کر دیا گیا تھا لیکن باہر چڑیا نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ میں نے اس بچے کو اٹھا کر گھونسلے میں رکھا تھا لیکن جتنی بار میں اسے گھونسلے میں رکھتا چڑیا اسے پھر گرا دیتی۔ ایک صبح میں نے اسے فرش پر مردہ پڑے دیکھا تو مجھے بہت دکھ ہوا تھا اور کل رات بھی میرا دل اس چڑیا کے بچے کے لیے دکھی ہوا اور پھر مجھے اپنا طوطا یاد آیا۔ جو بہت بولتا تھا لیکن ایک دن چنجرے کا دروازہ کھلا رہ گیا تو وہ اڑ گیا اور تو اور مجھے اپنے کچے بھی یاد آئے جو میں نے ذیروں ڈھیر اکٹھے کیے ہوئے تھے لیکن پتا نہیں کون میرا وہ کچوں والا ڈبا اٹھا کر لے گیا تھا۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔

”ایسی ہی معمولی باتیں یاد آتی ہیں۔“

”ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ آج کل کبھی کبھار مجھے بھی چھوٹی، چھوٹی باتیں اچانک یاد آ جاتی ہیں۔ جیسے اپنے گھر کی پرچھتی میں چھپ کر سگریٹ کی ڈبیوں سے تاش کا کھیل کھیلنا۔ کئی ہوئی پننگ پکڑنے کے لیے چھتیس پھلانگتا اور اپنے گھر کی مٹی پر چڑھ کر گالی ڈال کر اڑتی ہوئی پننگ کھینچنا اور پھر لڑائیاں۔ میں تو شاید پیدا انٹی تحریر کا رہا تھا۔“ وہ ہنسا۔ ”لیکن شرم حیات تم اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ حال کے بجائے ماضی میں جیو۔“ بگ پاؤں نے بغور اسے دیکھا۔ ”کچھ اور بھی ہے جو تمہیں پریشان کر رہا ہے شرم حیات مجھ سے محل کر بات کرو۔“

”بس تھک سا گیا ہوں بگ پاؤں۔ آپ کو بتایا تو تھا کہ اس زندگی کو خیر باد کہتا چاہتا ہوں۔ عظام کے ساتھ ایک سیدھی سادی زندگی گزارنا چاہتا ہوں بس کبھی، کبھی جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کسی چھوٹے سے گاؤں میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہوں۔ مجھے توں میں کام کر کے رزق حلال کماؤں اور رات کو تھک کر پرسیون نیند سو جاؤں۔“

”بعض باتیں سوچنے میں بہت آسان لگتی ہیں لیکن وہ اتنی آسان نہیں ہوتیں۔ خیر اس موضوع پر پھر بات کریں گے، میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ ایرک کے ساتھ میری ملاقات بہت خوشوار اور کامیاب رہی۔ میں نے اس کے ساتھ کام کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ بہت بڑی پیشکش کی ہے اس نے۔“

”کیا آپ کو نہیں لگا بگ پاؤں کہ وہ جو کہہ رہے ہیں ایسا نہیں ہے۔ اصل کہانی کچھ اور ہے؟“ وہ مضطرب ہوا تھا۔

”کیا کہانی ہونی ہے شرم حیات۔ یہ تم پر ہے کچھ لوگ بھی بال کی کھال نکالتے ہو۔ جانتے ہو کتنے ہزار ڈالر پیشگی ملے ہیں اس کام کے اور کام کے بعد جو ملے گا تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔“

”ڈالر.....؟“ شرم حیات نے گوبر لیا۔ ”آپ اتنی دولت کا کیا کریں گے بگ پاؤں۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ جتنا ہے کیا وہ بہت نہیں ہے؟“

## اعتبار وفا

”ہاں بہت ہے لیکن یا یہ جو دولت کی حُب ہوتی ہے ناں یہ مرتے دم تک ختم نہیں ہوتی۔ دل اور۔۔۔ اور کی تکرار کرتا رہتا ہے۔ جانتا ہوں کہ اگر آج مر گیا تو سب دولت بینکوں میں ہی رہ جائے گی پر دولت کی ہوس ایسی جان سے لپٹی ہے کہ جدھر سے ذرا بھی اشارہ ملتا ہے فوراً اُدھر پھٹتا ہوں۔ شاید اس ہوس کے پیچھے میرے بچپن کے کچھ تلخ دن بھی ہوں۔ باپ کے مرنے کے بعد کئی بار فاقہ بھی کیا۔ ماں کہتی تھی میں ناشکرا ہوں اگر ایک وقت کی روٹی کبھی نہیں مٹتی تھی تو دوسرے وقت کی تولی جاتی تھی برمجھے تو روٹی کے علاوہ اور بھی کئی لالچ تھے، میں بچپن میں بڑا عیدہ ہوتا تھا شمر حیات..... قلفی والا گلی سے گزرتا تو میں گھر کے دروازے سے ٹیک لگائے بچوں کو قلفی خریدتے اور کھاتے دیکھتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور تھوک نکلتے ہوئے قلفی کے ذائقے کو تصور میں محسوس کرتے لیکن ایسا صرف چند دن ہوا تھا پھر میں نے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں سے قلفی اور دوسری چیزیں چھیننا شروع کر دیں۔ ان کی مائیں شکایت لے کر آئیں تو ماں مجھے پیٹ ڈالتی۔ ماں کہا مار مجھے کبھی بری نہ لگی۔ میں ہنستا رہتا اور اماں کہتیں غلٹا بنے گا۔ دراصل خرابی میرے خون میں ہی تھی۔ میرا باپ بھی ایسا ہی تھا چھینا مچھٹ کر لینے والا۔ دودھ نے اثر نہیں کیا تھا لیکن خون اچھلتا تھا میں تو کم عمری میں ہی اپنی گلی کا چھوٹا موہا بد معاش بن گیا تھا۔“ وہ ہولے سے ہنسا لیکن شمر حیات کو لگا اس کی ہنسی میں کہیں ٹوٹے کا لچ کی کھنک بھی تھی۔

”چلو تم نے کہا ہے تو سوچتا ہوں میرے بعد اس دولت کا مصروف کیا ہوگا۔ ویسے اپنے پاکستان پر اللہ کا بڑا کرم ہے شمر جاناں یہاں کوئی بھوک سے نہیں مر سکتا۔ دو وقت کی روٹی نہ ملے تو تیسرے مائٹم تولی جاتی ہے۔ لوگ بڑے سخی ہیں۔“

”اینا پاکستان۔۔۔ آپ نے اپنا پاکستان کہا ہے لیکن آپ نے ایرک سے ڈیل کر کے اس اپنے پاکستان کے لیے اچھا نہیں کیا بگ با۔“ بے اختیار ہی شمر حیات کے لبوں سے نکلا۔

”کیا مطلب؟“ بگ با نے اسے گھورا اس کے چہرے پر چند لمحوں پہلے نظر آنے والے نرم تاثرات غائب ہو گئے تھے۔ ”کیا اچھا نہیں ہوا بے روزگاروں کو روزگار ملے گا۔ جانتے ہوناں اس ملک میں کتنی بے روزگاری اور غربت ہے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”کل کے تمام اخبارات میں اشتہار چھپ جائے گا اور اتوار کو انٹرویو ہوگا۔ انٹرویو پٹی میں ہوگا ایک کمرہ بک کروالیا جائے گا۔ انٹرویو تم اور ولسن لوگے۔“

”بس بگ با۔“ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ جاتے، جاتے بگ با نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

”ایرک کے ساتھ ڈیل کے آرڈر اوپر سے آئے ہیں شمر حیات۔“ بگ با بات کر کے رک نہیں تھا اور میز سے باہر نکل گیا تھا۔ شمر حیات سر جھکا کے مائٹم کھڑا تھا۔

\*\*\*

ایمل سرکئی میں گردن تک تانے آنکھیں موندے لینی ہوئی تھی۔ مٹی بیڈ کے پاس کرسی بچھائے پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا، دودن میں اس کی رنگت خیر کر رہی تھی۔

”ایسا بیٹی کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں مٹی۔“ اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کتنا عرصہ ہو گیا تھا مجھے ڈیڈی سے ملے، انہیں دیکھے۔ میں نے کبھی باہر سے کہا ہی نہیں۔ کبھی اپنی بات نہیں منوالی۔ اگر میں باہر سے کہتی تو کیا وہ انکار کرتا نہیں ناں۔ وہ میری بات ضرور مانتا لیکن میں نے ان سارے



بیچے سالوں میں ایک بار بھی باہر سے نہیں کہا کہ مجھے آپ کے اور ڈیڈی کے قریب رہنا ہے۔ مجھے ڈیڈی سے ملنے جانا ہے حالانکہ میرا دل آپ کے اور ڈیڈی کے لیے اڑا رہتا تھا۔ میں تو بس شرمندہ سی رہی ڈیڈی سے آپ سے کہ میں نے غلط صدمہ کیا۔ میں نے ڈیڈی کو دکھ دیا اور انہیں خود سے دور کر دیا۔ مجھے لگتا تھا جیسے ڈیڈی مجھ سے ایسے محبت نہیں کرتے جیسے پہلے کرتے تھے۔ ان کے دل میں میرا وہ مقام نہیں رہا۔

”ایسا نہیں تھا ایسا بالکل نہیں تھا میری جان وہ تم سے بہت محبت کرتے تھے بہت چاہتے تھے تمہیں۔ انہیں تمہارا بہت خیال تھا۔“ مکی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر تسکین دہانہ کیا۔

”میں جب چھوٹی تھی تو دادا جان اور دادی جان کو پچھو کے نیچے روتے تڑپتے دیکھ کر سوچتی تھی کہ میں بھی ویسی طرح آپ کو اور ڈیڈی کو کوئی دکھائیں پہنچاؤں گی۔ میں آپ کی پسند پر سر جھکا دوں گی لیکن جب میں بڑی ہوئی تو میں نے آپ کی پسند کو رد کر دیا بالکل پچھوئی طرح حالانکہ آپ نے میرے لیے بہترین شخص کو منتخب کیا۔“

آنسو اس کی آنکھوں میں چمکنے لگے۔ وہ ہولے ہولے ہوتی ہوئی چپ کر گئی تھی اسے یاد آیا جب اس نے ڈیڈی کو مدر کے متعلق بتایا تھا تو ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا وہ بہت ہی یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے اور پھر جب مدر حسن کے والد ان کے گھر آئے تو ڈیڈی بہت مایوس ہوئے تھے اور ان کے جانے کے بعد انہوں نے اسے بلایا تھا۔

”سوری ایسا میں نے مدر کے والد سے معذرت کر لی ہے۔ یہ رشتہ مجھے موزوں نہیں لگا۔ ان کے پاس تو اپنا ذالی گھر بھی نہیں ہے۔ مدر کی اپنی تعلیم بھی ابھی ختم نہیں ہوئی کب جا بے گی کیسی ملے گی کچھ پتا نہیں اور پھر جب انٹرنس میں اتنا فرق ہو تو بعد میں بہت پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لازمی بات ہے اس کی نظر تمہاری جائداد پر ہوگی یہ پھر خود کو تمہاری طرح پر لانے کے لیے وہ کچھ ایسا کرے گا جس سے تمہاری زندگی مشکل ہو جائے گی۔“

”مدر ایسا نہیں ہے اسے میری جائداد کا لالچ نہیں ہے، وہ تو کچھ بننے کے بعد ہی آنا چاہتا تھا یہ تو میں نے اسے مجبور کیا تھا۔“ وہ کہنا چاہتی تھی لیکن ایک دم اڑا آنے والے آنسوؤں نے اس کا مطلق ہی لیا تھا۔ وہ ڈیڈی سے مزید کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہیں مدر کا رشتہ پسند نہ آیا تو وہ ان کی بات مان لے گی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ مکی نے اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے۔

”جو مڑ گیا سو مڑ گیا۔ اب کیوں سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی ہو؟“

”مکی!“ اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ”ڈیڈی نے مدر کے والد اور پچھو کو انکار تو کر دیا تھا لیکن وہ ساری رات نہیں سوئے تھے۔ ساری رات ان کی اسٹڈی کی لائٹ جلتی رہی تھی۔ وہ میرے لیے پریشان تھے میں ابھی بیٹی نہیں تھی۔ میں نے انہیں دکھ دیا۔“

”تم بہت اچھی بیٹی ہو ایما۔ مجھے یا تمہارے ڈیڈی کو کبھی تم سے شکایت نہیں ہوئی۔ اپنی حالت دیکھو ذرا۔“ وہ پریشان ہوئی تھیں۔ ابھی آتے ہی تو وہ اسپتال سے آئی تھی۔

”سوری مکی، میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔“ اس نے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے۔

”تم خواہو کہو خود کو ہکان کر رہی ہو ایما۔“ اس نے تمہیں خیر سکون اور خوش رہنے کے لیے کہا ہے لیکن تم نے اپنا کیا حال کر لیا۔ زندگی اور موت انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ تمہارے ڈیڈی کی زندگی بھی اتنی ہی تھی۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ باہر اور بچے بھی کتنے پریشان ہوئے تھے اور جب ڈاکٹر نے بتایا کہ انہما کا ایک ہے تو افاقہ اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ تمہیں اپنے خود خیال رکھنا ہے ہر وقت باہر تمہارے پاس نہیں

ہوتا۔ بچوں کا سوچو انہیں تمہاری ضرورت ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو میری جان۔“

”جی ماما۔“ اس نے سر ہلایا۔

قرآن خوانی کے بعد کھانا۔ میٹھ خانے اور مدارس میں بھجوا کر وہ بے حد تھکی تھکی سی ڈیڈی کی اسٹڈی میں آئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ڈیڈی ابھی نہیں کسی سائنڈ سے نکل آئیں گے اور اس کے سر پر چپتہ مارتے ہوئے کہیں گے۔

”میری کتابوں کو مست چھیڑنا نا ٹی ٹرل۔“

صبح سے وہ خود کو سنبھالے مصروف سی سب کام کر رہی تھی لیکن ڈیڈی کی اسٹڈی میں آ کر اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی ان کی رائٹنگ ٹیبل کے پاس آئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ ٹیبل پر ہلکی گرد پڑی تھی۔ اس نے یونہی انگلی رتے ہوئے ٹیبل کی دراز کھینچی۔ ڈیڈی کے قلم اور ڈائری کے ساتھ اس کی پسندیدہ گڑیا پڑی تھی۔ چھوٹی سی بارلی ڈول جس کے بال کب کے اکھڑ چکے تھے لیکن پھر بھی اسے پسند تھی پھر اسے اپنی کتنی ہی چیزیں دراز میں پڑی نظر آئیں۔ اس کی پونیاں، کچنر، ڈیڈی نے کیا، کیا سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

”بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ آئینہ خالی کر جاتی ہیں لیکن دلوں میں بسی رہتی ہیں۔ ان کے دکھ باپوں کو ڈھکا دیتے ہیں۔“ ایک بار ڈیڈی نے کہا تھا ایک دم ہی دل میں درد اٹھتا تھا۔ اس نے سر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ سانس رکھنے ہی تھی۔

”مامی!“

اس کے منہ سے کھنٹی کھنٹی سی آواز نکلی تھی۔ تب ہی ارتقا دروازہ کھول کر اندر آئی تو اس نے چونک کر ارتقا کی طرف دیکھا۔

”آؤ آ جاؤ گڑیا۔“

ارتقا کا مودہ کافی خراب تھا۔ وہ اندر آ کر ماما کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اہل کے ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہم واپس کب جائیں گے صرف دو دن کے لیے آئے تھے اور۔۔۔“

”سوئی ارنی بنی میری طبیعت خراب ہو گئی اور تمہارے پاپا کو رکنا پڑا۔ میں نے تو کہا بھی تھا کہ وہ چلے جائیں تمہیں اور افغان کو لے کر۔ میری طبیعت بہتر ہوئی تو میں آ جاؤں گی۔“

”میری پڑھائی کا خرچ ہو رہا ہے۔“

”پڑھائی ماں سے زیادہ اہم ہے تمہارے لیے؟“ ماما کو اچھا نہیں لگا تھا وہ نوٹ کر رہی تھیں کہ ارتقا کو اہل کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اس روز جب اہل اسٹڈی میں نیم بے ہوش ہو گئی تھی تو سب ہی پریشان ہو گئے تھے اور فوراً ہی اسپتال لے گئے تھے وہ دو دن اسپتال رہی تھی اور ارتقا صرف ایک بار اہل کو دیکھنے کے لیے اسپتال آئی تھی۔ ارتقا نے ماما کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا اور ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھنے لگی جو واٹس ایپ پر کھڑا تھا اور روشن اسکرین پر ظفری کا تہہ آ رہا تھا اس نے کال ریجیکٹ کر دی۔ رات بھی ظفری کا فون آیا تھا اور وہ رو میٹک ہو رہا تھا۔ ظفری کی گفتگو یاد کر کے اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

”اگر ایسا ہی تمہاری پڑھائی کا خرچ ہو رہا ہے تو ارنی ماما اپنے پاپا سے کہو اور تم تینوں واپس چلے جاؤ۔ ایسا کو ابھی دو تین دن سفر نہیں کرنا چاہیے۔ احتیاط اچھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا خدا نخواستہ بے احتیاطی سے کہیں پھر ایک نہ ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے، میں پاپا سے بات کرتی ہوں، کہاں ہیں وہ؟“ ارتقا ماما کے لیے پرنور کے بغیر کھڑی ہو گئی۔

”اپنے کمرے میں ہوں گے۔“ می نے بغور اسے دیکھا اور بڑبڑائیں۔ ”پتا نہیں اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔“ لیکن وہ ان کی بڑبڑاہٹ سنی ان سنی کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔ باہر نوید اپنے کمرے میں کہیں جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ دستک دے کر اندر آئی تو باہر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”ارے کیا ہوا میری گڑیا کو، سوڈ کچھ خراب لگ رہا ہے تمہارا۔“

”ایک پاپا ہیں جنہیں فوراً پتا چل گیا کہ میرا سوڈ خراب ہے اور ماما انہیں کبھی میرے دل کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ کبھی ماں کی نظر سے دیکھا ہو تو حب ہاں۔“

”ہم واپس کب جائیں گے پاپا؟ بہت بور ہو رہی ہوں میں اور میری پڑھائی کا بھی حرج ہو رہا ہے اس لیے تو میں آنہیں رہی تھی۔ اب دو دن کے بجائے چار دن ہو گئے ہیں ہمیں آئے۔“

”رتی..... تمہاری ماما کی طبیعت جو اچانک خراب ہو گئی تھی تو.....“ باہر کا انداز سمجھانے والا تھا۔

”لیکن اب تو وہ ٹھیک ہیں ناں۔ آپ نے اگر نہیں جانا تو مجھے اورانی کو بھیجوا دیں۔“

”لیکن جانا تو تمہارا رکتا بھی بہت ضروری ہے۔ صمدانی صاحب کہہ رہے تھے کہ کمرل صاحب کے وکیل جو اپنا چیک اپ کروانے کے لیے لندن گئے ہوئے تھے کسی وجہ سے لیٹ ہو گئے۔ اب کل شام کی فائنل سے آجائیں گے تب تک تم لوگوں کا رکتا بھی ضروری ہے۔“ باہر نے نرمی سے کہا۔

”لیکن ہم نے رک کر کیا کرنا ہے؟“

”اٹھوں نے کہا تھا کہ بچوں کا ہونا بھی ضروری ہے ہو سکتا ہے دستخط وغیرہ کی ضرورت ہو۔“

”افغان کی ضرورت تو پڑ سکتی ہے کہ ان کا نوٹا سا ہے میرا بھلا کیا بنتا ہے رکتا؟“ وہ بڑبڑائی باہر جو اس کی طرف دیکھ رہا تھا ایک کسی خیال سے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

”پراس وکیل صاحب سے ملاقات کے فوراً بعد ہم کراچی روانہ ہو جائیں گے۔“ وہ مسکرایا۔

”اس وقت میں ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں چلو گی تمہاری پوریت دور ہو جائے گی۔“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو قیامت تیار ہو کر آ جاؤ۔ میں پورج میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”میں تیار ہی ہوں پاپا۔“ اس نے ماتھے پر ہنسرے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کیا اور پوتی اتار کر دوبارہ نگائی۔ ”او کے تو پھر آ جاؤ۔“

اور تھوڑی دیر بعد وہ باہر کے ساتھ عنبرین کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ عنبرین کے فلیٹ کے دروازے پر رک کر باہر نے نیل دی۔ اندر سے عنبرین کی آواز آئی۔

”دروازہ کھلا ہے آ جاؤ۔“

باہر نے آنے سے پہلے اسے فون کیا تھا اور وہ باہر کے فون کے بعد دروازہ کھول کر کچن میں گھس گئی تھی کہ باہر نے کہا تھا وہ بیچ اس کے ساتھ ہی کرے گا۔ لاؤنج میں رک کر باہر نے عنبرین کو آواز دی۔

”عنبرین دیکھو تو میرے ساتھ کون آیا ہے؟“

”کون ہے؟“ عنبرین کفگیر ہاتھ میں لیے کچن سے نکلی اور اس کی نظر ارتفاع پر پڑی۔

”میری بیٹی۔“ کفگیر اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ دونوں ہاتھ پھیلائے والہانہ اس کی طرف بڑھی۔

جاری ہے





ذیشان رسول نے ابھی تعلیم مکمل بھی نہیں کی تھی کہ ہمارے خاندان کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی۔ تمام رشتے داروں اور ملنے والوں کو یہ اپنا فرض لگنے لگا کہ اس کے لیے لڑکیاں بتائیں۔ سب ہی نے یہ فرض بکوبی انجام دینا شروع کیا۔ میں نے صرف ایک ہی بات مد نظر رکھنی تھی کہ لڑکی اور فیملی دین دار ہو، باپ و بہنوئی، چھ ہی فیملیوں سے ملی ہوں گی تو اندازہ ہوا کہ جو میں چاہتی ہوں، وہ نہیں مل پاتا ہے۔ یہاں ایک بات کا ذکر کروں گی کہ ایک دوست کے بتانے پر جب لڑکی دیکھنے گئی تو اس کی امی اور بہنوں سے ملنے کے بعد

یہ تو طے تھا کہ لڑکی خوب صورت ہوگی لیکن پردہ؟ وہ تو صرف بار یک دوپٹے کو سر پر ڈالنے کی حد تک تھا۔ بڑی کوفت ہوئی کہ یہاں کیوں بھیجا گیا۔ ابھی افسوس کر رہی تھی کہ اس لڑکی کو آواز دی گئی وہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ایسا لگا روشنی ایک دم سے تیز ہو گئی ہو۔ مجھے بھر کو تو واقعی ایسا لگتا تھا کہ چکا چند منٹ بیٹھے ہیں پھر میں نے پہلے ذیشان پر نظر ڈالی کہ اس کے کیا تاثرات ہیں وہ دوسری بہن کے شوہر کے ساتھ (جو کہ لندن کا پڑھا ہوا بہت اچھی شخصیت کا مالک تھا) باتوں میں مصروف تھا لیکن لڑکی کو ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ ذیشان یہیں شادی پر اصرار کرے گا اور وہ پردہ جو میں سوچے بیٹھی تھی ہوا میں اڑ جائے گا۔ یہ مشکل چائے، ناشتا کر کے گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے پہلا سوال کیا۔ "بہن کیا خیال ہے؟ فوہ کہنے لگی۔ آپ بتائیں کیا آپ کے معیار کا خاندان ہے؟

میں نے کہا لڑکی کی امی تو کہہ رہی تھیں آپ جیسے چاہیں گی ہو رہی لڑکی ایسے جواب لے گی۔ (اگرچہ پورا گھرانہ خوب فیشن ایبل تھا) مگر مجھے اس طرح منظور نہیں تھا۔ ذیشان نے اتنی سمجھداری سے کہا کہ ماما آپ کو تو دین دار گھرانہ چاہیے جو کہ میری بھی پسند ہے۔ تو یہاں بھوں جائیں کہ لڑکی دیکھی ہے۔ بہنوں آپ لوگ یقین کریں مجھے ایسا لگا کہ ذیشان صرف میرا دل رکھنے کو کہہ رہا ہے ورنہ اس قدر حسین اور محسوس لڑکی کو انکار کرنا آسان نہیں تھا۔ جس نے بھی نہ یہی مشورہ دیا کہ منع نہ کرو، وہ لوگ تیر تو ہیں حجاب کروانے پر۔ مگر مجھے اور ذیشان کو پورے گھروالوں کی دین داری دیکھنی تھی۔ اب میں نے دعا میں شروع کیس اور صرف اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا کہ وہ ہی ایسے گھرانے کو موانے کے اسباب پیدا کر دے۔ ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا کہ ایک دن لندن سے ذیشان کا فون آیا کہ ماما میرے ساتھ ایک لڑکی فاطمہ جو کہ ڈاکٹر ہے اور اسپیشلائز کر رہی ہے میرے ساتھ ہی اگلے مہینے اس کی ڈگری

کھلی ہو جائے گی۔ اس کی امی اگلے بیٹھے دو تین دن کے لیے کراچی آرہی ہیں کچھ فیملی سے ملنے کے لیے تو آپ بھی مل لیں۔ فاطمہ کا حجاب اور انداز آپ کے اور میرے معیار کے عین مطابق ہے۔ فاطمہ کو میں نے دیکھا نہیں تھا لیکن ذیشان پر مکمل بھروسہ تھا۔ ان لوگوں سے ملاقات ہوئی سو بالکل پر فاطمہ کو دیکھا۔ امی، ابا کا رکھ رکھاؤ، تعلیم، اعلیٰ خاندان سب کچھ ایسا تھا کہ میں نے اسی وقت اپنے مالک کا ڈیروں شکر ادا کیا کہ کس طرح اس نے میری دعا کو مستجاب کیا۔ سچ ہے کہ میں صرف دین دار گھرانہ طلب کر رہی تھی اور میرے مالک نے تعلیم یافتہ اور ویل آف گھرانہ عطا کیا۔ امی، ابا تو ڈاکٹر ہیں لیکن لڑکی کے چچا، پھوپھی، بھائی سب ہی ڈاکٹر ہیں۔ نرم گفتار، منسلک اور سمجھل لوگ ہیں۔ تمام خاندان کے لوگ لندن میں رہتے ہیں۔

میں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ شادی پر کسی سے کوئی تحفظ یا کیش نہیں لیا جائے گا۔ رشتے داروں سمیت ملنے والوں کو روک دیتوں جس سے بھی بات ہوتی اس کے کان میں یہ اندیش دیا جاتا کہ کچھ دینے کے بجائے صرف دعا میں لے آئیں۔ چند فرمانبرداروں کے علاوہ سب نے ہی سنا اور نکال دیا۔ جس قدر میں نہ لینے کے لیے کہہ رہی تھی سب اسی قدر دینے کے لیے تیار تھے۔ میں منع کر کر کے تھک رہی تھی اور دینے والے کچھ بھگنے کو تیار نہیں تھے۔ جس کا اندازہ گھر میں پہلی تقریب پر ہوا۔ مجھے مہندی، مایوں گانے بجائے نہیں کرنے تھے۔ گھر پر مختصر میلاد اور ڈنر کا اہتمام تھا۔ سجاوٹ میں بھی فضول خرچی سے اجتناب کیا تھا کہ یہ پیسے ضرورت مندوں کو دے کر اللہ اور اس کے رسول کو خوش کیا جاسکتا ہے۔ وہ چند دنوں کی سجاوٹ پر نہ لگا دیے جائیں۔ لوگوں کی آمد شروع ہوئی تمام رشتے دار لدے پھندے آ رہے تھے۔ ذیشان اور فاطمہ کے تحفوں کے ساتھ ساتھ میرے اور روشن (ذیشان کی میز) کے جوڑے مٹھائی، پھل نوکروں میں آئے تھے۔ رشتے داروں کا مان جاتا آسان نہ تھا مگر مجھے اپنی دوستوں اور راکٹر

سے امید تھی کہ وہ مان لیں گی، آفس کے لوگوں سے بھی  
 یہی امید تھی مگر چند لوگوں کے علاوہ کوئی اس امید پر پورا  
 نہ اترتا۔ شائستہ اور یاسمین (جو کہ میری بچپن کی سہیلیاں  
 ہیں) اس قدر تھکے منھائیاں اور پھل لائیں کہ مجھے شبہ  
 ہوا کہ کبیں میرے منہ سے یہ تو نہیں نکلا تھا کہ خوب تھکے  
 لے کر آنا۔ شائستہ تو تمام لوازمات کے ساتھ گولڈ سیٹ  
 بھی لائی تھیں۔ رضوانہ پر نہیں نے بہت خوب صورت  
 ڈیزائن کا جیولری سیٹ دیا۔ نسیم ماہ پارہ میرا جوڑا لہر  
 اپنے ہاتھ سے بنا ہوا چمکیٹ ایک خوب صورتی سے سجایا  
 کر لائیں۔ حمیرا طارق نے ڈرتے ڈرتے بڑی رقم کا  
 غلاف پیش کیا۔ اس کو ڈانٹ پڑنے کی قوی امید تھی مگر موقع  
 نہ تھا ورنہ خیر اللہ تعالیٰ سب کو ان کے بچوں کی  
 خوشیاں دکھائے۔ آفس کے کچھ لوگوں نے مل کر تھکا دینے  
 کا فیصلہ کیا اور اینڈیٹر جاسوسی ڈاکٹریکٹ بھی خیال و رمضان  
 شہزاد صاحب، عرفان، آمنہ حماد اور ڈاکٹر نسیم وغیرہ نے  
 مل کر نہایت خوب صورت دو بڑے پٹیل کے منتقل  
 گھداں دیے۔ نسیم کی اینڈیٹر یعنی احمد نے گولڈ  
 کے ٹاپس دیے۔ سب کا بے حد شکریہ کہنا نہ مانتے  
 کا سب موقع کیا تھا کہ کچھ دینے کی ضرورت نہیں ہے  
 مگر ان لوگوں کا کہنا تھا کہ خان ہاتھ نہیں آئیں گے۔  
 تابید فاطمہ حسین نے کچھ دن پہلے ہی میڈیٹر تشریف کر کے  
 لفافہ دینے کی اجازت لے لی تھی۔ انجم انصار اور عظمیٰ  
 آفاق بھی کہنا نہ مانتے والوں میں شامل ہیں۔ یہ سب  
 ان لوگوں کی محبت تھی جو دیے بغیر باز نہیں آتیں۔  
 رفاقت جاوید کوڑھیروں پیار کہ وہ طبیعت خراب ہونے  
 کے باوجود اسلام آباد سے ویسے میں شرکت کے لیے  
 آئیں۔ وہ مجھے کچھ عرصے پہلے بھی نہایت خوب صورت  
 انیمینڈ فلیٹن سوٹ دے چکی تھیں مگر منع کرنے کے  
 باوجود بڑی رقم کا غلاف ڈیشن کو دیا۔

تمام رات رات کی شرکت کا شکر۔ اور جوت آئیں وہ  
 عظمیٰ کی تحریر کے ساتھ شرکت کر لیں گی۔ عظمیٰ آفاق  
 جیروکوورج کرتی ہیں (ماشاء اللہ) عقید حق کا خصوصی  
 شکر یہ وہ امر کا کافی ہوئی تھیں اور صرف ویسے میں

شرکت کرنے کے لیے جلدی واپس آئیں۔ عظمیٰ بتا میں  
 گئی کہ عقید نے کتنے زیورات پہنے ہوئے تھے (بھئی  
 دولہا کی خاصہ جو ہوئیں) احتجاج کرتی تھیں کہ عقید نے  
 بسن کہہ ہے تو حق بھی اور آرتی میں خوش رہیں

عام طور پر میرے بے حد فخر و نیردار ہر بات  
 سننے والے بھائی، بیٹیوں کچھ سننے کو تیار نہیں تھے اور  
 ماشاء اللہ خوب بھرپور تیاریوں کے ساتھ آئے۔ سب  
 ہی نے فاطمہ کے لیے گولڈ کے تھکے اور میرے اور  
 ذیشان کے لیے جوڑے دیے۔ (خدا سب کو  
 سلامت رکھے اور ان کو ان کے بچوں کی خوشیاں  
 دکھائے) ذیشان کی بسن سین تو جس دن سے ذیشان  
 لندن سے آیا تھا اسی دن سے اس کی پسند کی چیزیں بنا  
 بنا کر نکال رہی تھی لہذا کو باقاعدہ کافی ٹینٹل کو رنگ آتی  
 ہے (ہر قسم کے ان لٹین کھانے بہترین ٹینگ کی چیزیں  
 وہ اتنی مقدار میں بنا کر لاتی تھی کہ سارا گھر کھانا پھر بھی  
 ختم نہ ہوتیں۔ دو جب تشریف میں آئی تو کئی لوگ اس  
 کے سامن کو اٹھائے ہوئے تھے (چیزیں ہی اتنی زیادہ  
 تھیں) خدا اس کو خوش رکھے۔ فرحان رسول اور اس  
 کی بیوی عالیہ بھی ہر موقع پر پیش تھے۔ عالیہ اور  
 سین دونوں نے فاطمہ کے لیے گولڈ جیولری دی اور  
 جوڑے تو ہم سب کے اور روشن کے بھی تھے۔ میری  
 بیٹیوں نے بھی خوب صورت گولڈ جیولری اور سب کے  
 جوڑے منھائی میوے، پٹیل خوب دیے ایک کمرہ جو کہ  
 خاصا بڑا ہے پٹیل، پٹیل، منھائی جوڑوں سے بھرا ہوا  
 تھا۔ میری منہ اور ایدہانی نے تمام لوگوں کے جوڑوں  
 منھائی کے علاوہ بھائی جیو تری دی۔ دیو رانی پروین  
 انجیڑا اپنے ہاتھ سے بنا کر ڈیجیٹل ماری منھائی بہت خوب  
 صورتی سے تیار کر لائی تھیں۔ انڈیا سے میری خالہ زاد  
 بسن اینڈ بھائی طبیعت خاصی تیار ہونے کے باوجود  
 آئیں۔ خالہ زاد بھائی مسکری اپنی بیوی مدھو اور بیٹی  
 سمیر کے ساتھ آئے۔ بڑے خالہ زاد حیدر بھائی نے  
 بہتر خوب روتی جھنڈی۔ وہ بڑی باخوب و رخصتیت کے  
 مالک ہیں۔ اینڈ ہم سب تھانہ سے بھرا سوٹ کس



کھولا تو ہوا چار تمام لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ لائی ہیں۔ (جیسے شکر یہ ادا کروں) ان سب کی شرکت ہی بہت قیمتی تھی۔ صغریٰ زیدی میری بہن کینیڈا سے طویل سفر کر کے اتنی چیزیں لے کر آئی کہ اکیلے میں خوب ڈانٹ سکتی جو اس نے دوسرے کان سے لکال دی۔ اس کے شوہر فرخ زیدی جو میرے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔ بڑی مصروف زندگی میں سے وقت نکال کر شادی کو رونق بخشتے آئے۔ سب رشتے داروں اور احبابوں نے مجھ پر خاصہ یہ۔ شادی کا احوال فطرتی اتفاق سے قلم سے اور سب کی اقسام میں اگلے شمارے میں آپ دیکھ لیں گی۔ ابھی تو میری بیٹی نین کے گھر سے ٹی ٹی چند تصویریں شام کی گئی ہیں۔ انی تقریب میں نیگہ ہانسنے کی رسم بھی رکھی تھی جو کہ ڈر کے بعد صرف دشتے داروں کے ساتھ ہوئی۔ سین اکلوتی بہن ہیں مہمان کو گولڈ کا کڑا اور اس کی بیٹی کو گولڈ کا سینٹ دیا اور جوڑوں کے لیے پیس ہزار نقد دیے گئے۔ عالیہ فرحان کو بھی ایک سونے کا کڑا اور لاکٹ سینٹ اور جوڑوں کے لیے پچاس ہزار نقد بھی دیے۔ سین کو بارات والے دن وہیں اتارنے کا نیگہ روٹی اور گولڈ کا ایک کڑا ملا۔ ان کے شوہر حبیب کو صرف ہندی کی رسم کا نیگہ ایک لاکھ دیا اور بھائی فرحان کو پانچ ہینانے کا نیگہ ایک لاکھ دیا۔ باقی ساری کڑا ہینوں کو انگوٹھیاں، بھابیوں کو نقد لٹافے دیے۔ روشن کو جوڑوں کے علاوہ گولڈ سینٹ مل۔ سب ہی بے حد خوش تھے۔ میری نندہ ماہ بہن کو گولڈ اڑ رنگ۔ جوڑے اور ان کی بیٹیوں اور بہو کو نقد نیگہ دیا۔ اسی موقع پر میری چھوٹی ممانی نے کہا کہ یہ پہلی شادی ہے جس میں بچے، بچے کو چھتہ، یکم ملا۔ اور سب کو وہ پانچ اور خوب صورت لٹافے بے حد پسند آئے جو بطور خاص نیگہ اپنے کے مقصد کے لیے خریدے گئے تھے۔

اب اگر کسی کا تذکرہ روٹیا ہے تو میں قسط نمبر دو لکھنے کو تیار ہوں لیکن شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔ کیا خیال ہے بہنوں! ان جن بہنوں نے گھر کا نمبر حاصل کر کے خصوصی مبارک باد دی ان کا بے حد

شکر یہ سب کے نام لکھنے نہیں جاسکتے۔ اس کو جگہ کی تنگی جانتے اور ہینس یہ بھی اب پوچھتی ہیں کہ بہو کے ساتھ نیکی کر رہی ہے تو آپ لوگوں کو بتادوں کہ میرے بیٹا اب تو شادی کے ایک ہفتے بعد ہی ندان چلے گئے تھے کیونکہ وہ ان کو اپنی یونیورسٹی سے متعلق کچھ امور نمٹانے تھے تو فی الحال بہو کے ساتھ رہنے کا کوئی تجربہ نہیں کر سکتی۔ ایسے قافلہ بہت پیاری بچی ہے۔ انشاء اللہ اس کے ساتھ زندگی اچھی گزرے گی۔

پیاری بہن! آپ آئندہ ماہ شادی کا آنکھوں دیکھا حال تو پڑھیں گی ہی مگر اس ماہ یا کیرنہ کی ساگرہ نمبر 2 میں فطرتی اتفاق کے قلم سے چند مٹھی جھلکیاں ضرور پڑھ لیں۔ تاکہ آپ کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ آئندہ وہ شادی کا احوال فطرتی تفصیل سے رہا ہے اور کتنے مزے کا بھی وہ آپ پر جیسے مزیدار بھندیاں۔

### چند مٹھی جھلکیاں

نندہ روہا فیشن رسول کی اکلوتی بہن بہن کے چہرے پر وہی تازگی، وہی معصومیت اور وہی خوب صورتی دکھائی دی جو ان کی شخصیت میں رہی ہوئی ہے۔ اس تقریب میں انہوں نے بے حد خوب صورت جیوٹری پہنی جس کی داؤدہ پٹا زیادتی ہوئی۔

نندہ راکھی کی چھوٹی بہن صغریٰ زیدی جو کینیڈا سے آئی تھیں ان کے ہارے میں بتایا گیا کہ وہ سانس بھی نہ لیتی ہیں مگر ہمیں تو وہ خود ہی پھوٹی سی نظر آ رہی تھیں۔ نندہ معروفتہ اوکا روٹھی جعفری اسکرین پر تو بڑی بڑی اور قد سے بھری و بھری سی تھی جس مگر حقیقت میں وہ اونچی کی نیل پر سوارہ رنگ سی بچی لگ رہی تھیں۔

نندہ نسیم ماہ پر وہ ہزار صرف میلاو کے فنکشن میں آئی تھیں اور بے حد سادہ تھیں مگر ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بہت اچھی منیجر بھی ہو سکتی ہیں۔

نندہ شاستہ اچاز ہیں تو بھولی بھائی سی مگر جب وہ بھویں اچکا اچکا کر ہنسی خیریت پوچھتی ہیں تو ہمیں اپنی عیبت خرابی کی جاتی ہے۔

## شادی کا احوال

☆ رضوان پر بس ایسی شخصیت کا نام ہے جو ہر محفل میں جان ڈال دیتی ہیں۔

☆ یا سکین رشید کے ہاتھوں کے زیورات ہر ایونٹ میں مختلف اور خوب صورت ہوتے ہیں۔

☆ مصنفہ یحییٰ احمد گھانی ساڑی میں تھیں۔ ساڑی شاید انہوں نے پہلی مرتبہ پہنی تھی۔ وہ اپنی ساڑی کی قال دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر چل رہی تھیں۔

☆ اٹلیا سے آئی ہوئی ایک مہمان خاتون مدھوکی تھی مجھے کھن کھناتی سی بے حد پیاری تھی۔ ہاں ان کا ہنر اساتذہ بھی۔

☆ پامست نرہت رضوی نے جب مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا عظمیٰ آپ کی شادی ہوگئی ہے تو میں اسی وقت ان پر سو جان سے عاشق ہوگئی اور اب آپ کے پاس آکر اپنے ہاتھ تو ضرور دکھاؤں گی (بے حد سوت ہیں آپ)

☆ دوست محمد فیضی کی مقبولیت کے گراف میں بالکل کمی نہیں آئی ہے مگر کیا تھا کہ وہ اپنی خوب صورت سی بیگم کو بھی اپنے ساتھ لے آتے۔

☆ مہمان خواتین میں سب سے زیادہ خوب صورت، ہادقارہ، پرکشش، خوش اخلاق (میری نظر میں) رضوان منظر ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ اگر گا جری گھابی رنگ میں گولڈن رنگ ملا دیا جائے تو وہ خوب صورت رنگ۔ تقریب کی میزبان عذرا آنٹی کا تھا۔ (آئی سب رنگ آپ کے لیے بنے ہیں..... ہر رنگ پہن سکتی ہیں آپ)

☆ مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد۔۔۔ دور انٹرز کو دیکھ کر شاکد رہ گئیں (بقول ان کے) پہلی رفعت سراج کہ ان کی سادہ اور دلچسپ گفتگو نے انہیں بہت متاثر کیا اور دوسرے عقیدہ حق کو سونے کے زیورات میں لدا پھندا اور سجا سنورا دیکھ کر انہیں بہت اچھا لگا بقول ان کے شادی کی تقریبات میں اسی طرح جانا چاہیے۔

☆ نرہت اصغر کونل میک اپ میں پہلی دفعہ دیکھا جو ان پر بہت سوت بھی کر رہا تھا۔ (نرہت جی بھی، بھی پارلر جانے میں واقعی کوئی حرج نہیں ہوا کرتا)

☆ رمضان انکل بہت بڑا گفٹ لائے تھے۔ ڈبے کا سائز جہازی سائز کا تھا..... چنانچہ اس میں کیا کیا تھا۔

☆ فیس بک پر دولہا، دلہن کی تصویر سب سے پہلے گفتہ شفیق نے ڈالی اور ویسے کی تقریب میں سب سے زیادہ تصویریں بھی ہنسی مسکراتی گفتہ شفیق نے ہی بنائیں۔ (اپنے موبائل سے)

☆ مصنفہ عطیہ عمر تو ہیں ہی خوش اخلاق مگر ان کے شوہر عمر فاروق بھی ہمیں بے حد خوش اخلاق لگے بلکہ وہ بھی ہمیں اپنی سہیلی کی طرح لگے۔ (ماشاء اللہ)

☆ سیونٹھ اسکاکی کی کونٹینٹ ہیڈ عامرہ شاہد بہت محبت سے ملیں وہ بار بار کن انکیوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں شاید میں انہیں بہت اچھی لگ رہی تھی (ماشاء اللہ)

☆ کم عمر ساس کا پہلا ایوارڈ اگر دیا جائے تو وہ سعد یہ رئیس جیت لیں گی۔ کال ساڑی میں وہ قیامت لگ رہی تھیں۔

☆ عرشہ جنید تبصرہ لکھ لکھ کر آئی تھیں اور بہت پیاری لگ رہی تھیں۔

☆ ڈاکٹر مت زینا مستقل تبصرہ لکھ کر قدرے کمزور لگیں۔ ان کو میں نے ہمیشہ شلواری تھیں میں دیکھا ہے اگر وہ کبھی ساڑی پہنیں تو بہت مگر لیس فل لگیں گی (گو اب بھی ہیں مگر مزید لگیں گی)

☆ مصنفہ اختر شجاعت بیمنی تو زمانے میں تھیں (یعنی خواتین کی نمبرل پر) مگر ان کی نظریں مردانے میں اپنے میاں افتخار صاحب پر تھیں۔

☆ دولہا زیادہ تر ایجنٹ پر ہی پائے گئے۔ ظاہر ہے اتنی پیاری دلہن کو اکیلا چھوڑ کر جانے کو ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

☆ کھانے میں فرونی مچھلی بہت اچھی تھی، ہمیں بھی اس کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

☆ کھانا کھانے کے بعد چند خواتین کی لب اسٹک ٹھوڑی تک آگئی تھی جن کے نام میں نہیں لکھ سکتی کہ میں دوستی میں کوئی دراز ڈالنے کے حق میں نہیں ہوں۔

☆ عظمیٰ آفاق کو اس دعا کے ساتھ اجازت دیجیے کہ خوشی کی تقاریب کی کوریج خوشیوں کے ساتھ لکھنے اور پڑھنے کی اللہ توفیق دے اور اللہ کا کرم ہمیشہ قائم رہے، آمین ثم آمین۔



جب بھی گھنگور گھنٹیں آسمان پر چھا کر آنے والی بارش کا پتہ دیتی ہیں تو بہت سی بھولی بھری یادیں  
داخل ہوتے، اماں جھٹ چار پائی سے اٹھ بیٹھتیں۔  
جلدی سے بستر جھارتیں، نیچے المیہ پٹیں چادریں  
ٹھیک سے بچھاتیں۔ کبھی ایک کمرے سے نکل کر  
دوسرے میں گھس جاتیں، دوسرے سے نکلتیں تو پہلے  
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابا جس دم گھر میں

## ابا کا گھر اور میں؟

تنزیلہ زاہرہ





میں جاگھٹیں۔ گویا ہر طرح سے مصروف نظر آنے کی اپنی سی کوشش کرتیں۔ ابا سخت غصے والے تھے اور ان کا خیال تھا کہ عورتیں ہر دم کام کرتی اچھی لگتی ہیں۔

ابا کی شخصیت بھی تو بہت بارعب..... یہ بات تقریباً ہر کوئی جانتا تھا۔ اماں، عمیر، عبید اور عزیز..... بس ایک میں ہی تھی جو اس بات سے بخوبی آگاہ ہوتے ہوئے بھی نظر انداز کر دیا کرتی کیونکہ میرے خیال میں تو میرے ابا دنیا کی سب سے بہترین شخصیت تھے۔

☆☆☆

ابا نے گھر کی تعمیر کا آغاز کیا تو خیال تھا کہ یہ قصبے کا سب سے خوب صورت گھر ہوگا۔ لڑکیں تو تھا وہ میرا..... لہذا میں بھی بے حد خوش کہ ہمارا ایسا شاندار گھر تعمیر ہو رہا ہے۔

اس روز بھی اسی طرح سے بڑے گھر سے بادل چھائے رہے مگر جب بغیر برسے گزر گئے تو میں نے ابا کو ایک مشورہ دیا۔

”ابا برآمدے کے دائیں جانب کونے پر ستون کے بجائے ایک دیوار بنوائیں تاکہ یہاں گودام کا اناج رکھنے کی محفوظ جگہ بن جائے اور بارشوں میں اناج کے گیلنا ہونے کا خدشہ بھی نہ رہے۔ ورنہ جب بھی بادل پورب سے آئیں گے تو اس سمت کو گیلنا تو کریں گے ہی.....“ مگر نہ جانے کیوں میرے یوں کہنے پر ابا ایک دم پھر گئے تھے انہیں شاید یوں میرا مشورہ دینا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔

”ارے لڑکی تو نے کون سا یہاں رہنا ہے بھلا؟ کھورہنا ہے تم نے اس گھر میں؟ ارے تم تو بیاہ کر پرائے گھر چلی جاؤ گی اور ادھر تو بھی میرا رہے گا، عبید رہے گا اور عزیز رہے گا۔“ وہ نہایت غصے میں بولے تھے اور یوں لہک، لہک کر کہہ رہے تھے کہ گویا وہ ان کے لڑکے نہ ہوئے کسی غزل کے قافیہ ہو گئے۔ میں تو بے حد سہم کر گم سم سی ایک طرف

ہو گئی۔

”اور ہم رہیں گے ہم.....“ کچھ توقف کے بعد ان کی آواز پھر سے گونجی تھی۔

پھر اس روز کے بعد تو میں نے ابا کو کسی بھی بات میں اپنی رائے دینے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

وقت گزرا..... مہینے اور سال بیتے۔ عمیر اور عبید تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر گئے تو پھر وہیں کے ہو رہے۔ اماں کے انتقال کے بعد میں بیاہ کر راشد کے گھر چلی گئی۔ عزیز بھی ملک سے باہر جا آباد ہوا مگر میں ابا کی خیریت دریافت کرنے اکثر میکے آ جایا کرتی..... مگر اب ابا کی آنکھوں کی چمک ان کے نئے گھر کی طرح ماند پڑنے لگی تھی۔ میں اکثر دیکھتی کہ ابا دوپہر کو سستانے لیٹتے تو چپلوں سمیت ہی بستر پر لیٹ جاتے۔ پھر میرے توجہ دلانے پر کھیا جاتے۔ یونہی ایک بار الماری میں اپنی عینک تلاش کرتے، کرتے غلطی سے میری عینک نکال لائے جو میں اکثر اخبار کے مطالعے کے دوران استعمال کیا کرتی تھی۔

”ابا یہ تو آپ نے میری عینک چمکن لی ہے۔“ میں نے ابا سے آہستگی سے کہا۔

”ارے ہاں معلوم ہے مجھے..... پتا ہے مجھے کہ تمہاری عینک ہے یہ۔“ انہوں نے جھٹ سے عینک اتار دی۔ ”پتا ہے مجھے یہ کہ یہ تمہاری دالی ہے..... پتا ہے مجھے۔“ وہ بار، بار ایک ہی جملے کی تکرار کرتے رہے..... غالباً وہ شرمندگی سے بچنے کے لیے یوں مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے۔ مجھے ان کی حالت پر تھوڑا سا افسوس ہوا مگر میں خاموش رہی۔ ایک روز عزیز سے فون پر بات کرتے یونہی اس سے کہہ بیٹھے۔

”بناتم تو خاصے مصروف رہتے ہو دل چاہتا ہے تمہیں دیکھنے کو..... ایسا کر دہائی روز مجھے ہی اپنے پاس بلاؤ۔ میں کچھ دن کے لیے تمہارے بیوی،

### غزل

اب تمنائے یار نہیں  
کسی کا بھی انتظار نہیں  
جو نگاہ سے اترے دل میں  
ایسا کوئی سچا وقادار نہیں  
ہوش سنبھالا تو یہ جانے  
دنیا جھوٹی کوئی غنوار نہیں  
اس کی یاد اور ہم سودا کی  
دل نہ جانے کہ پیار نہیں  
قانع ہوئے مقدر نہیں  
زندگی مکل و عزار نہیں  
نہ دیکھ پھر اپنی نظروں سے  
خزاں رت ہے بہار نہیں  
نہ چڑھا غم کے چڑھاوے  
دل ہے میرا دربار نہیں  
تو آئے اور ہم ہوں منتظر  
ایسا ہوتا ہر بار نہیں  
تیری شب وصال اور میرے حوصلے  
جیت تیری میری ہار نہیں  
کلام: فیضی آصف خان، ملتان

آواز کہیں دور سے میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

"ارے لڑکی تو نے یہاں کون سا رہنا ہے  
بھلا.....؟ کہو رہنا ہے تم نے اس گھر میں؟ ارے تم تو  
بیابان پر اسے گھر چلی جاؤ گی اور ادھر تو بھی عمیر رہے  
گا۔ عبید رہے گا، عزیز رہے گا اور ہم رہیں گے ہم....."  
تھر اس گھر میں نہ عمیر رہا، نہ عبید نہ عزیز.....  
اور نہ ہی آبا..... بس رہی تو نزہت..... جو کل بھی  
اس گھر کے لیے پرانی تھی اور آج بھی پرانی  
ہے..... شاید.....

بچوں سے بھی مل جاؤں گا۔"

مگر عزیز کے پاس تو جواب پہلے سے موجود تھا۔  
جھٹ سے کہنے لگا۔ "ابا یہاں تو پالا پڑتا ہے پھر پالا پڑتا  
ہے، تیسرا کوئی موسم نہیں ہوتا..... اور آپ سے تو ہلکی سی  
ٹھنڈ بھی برداشت نہیں ہوتی۔ یہاں آ کر تو آپ بیمار  
پڑ جائیں گے اس لیے بہتر ہے کہ آپ وہیں رہیں۔  
میں بھی ٹائم نکال کر آ جاؤں گا....."

عزیز کا عذر قبول ہوا مگر اگلے کئی روز اس کے  
دیس کی ٹھنڈ آبا کی آہوں کی صورت ہمارے گھر کو سرد  
کرتی رہی۔ عزیز کہتا بھی تو درست تھا اس کے سفید  
بُراق ملک میں صرف پالا پڑتا تھا اور پھر پالا پڑتا  
تھا..... تیسرا کوئی موسم نہیں تھا۔

☆☆☆

راشد کی وفات کے بعد میں اپنے دو بچوں کے  
ساتھ میکے میں آ گئی تو ابا کسی حد تک سرور نظر آ رہے  
تھے کیونکہ اس طرح انہیں اپنی تنہائی نئی نظر آتی تھی۔  
مجھے یاد ہے کہ جب سسرال کے بجائے میں نے میکے  
میں رہنے کا فیصلہ ابا کو سنایا تو مجھ سے کہنے لگے۔  
"ہاں نزہت، یہ تم نے بہترین فیصلہ کیا ہے۔  
یہ گھر کل بھی تمہارا تھا اور آج بھی تمہارا ہے۔" مگر  
میں خاموش ہی رہی کیونکہ جانتی تھی کہ یہ گھر کس کا تھا  
مجھ سے بہتر بھلا کون جانتا؟

خیر اب تو ابا کی وفات کو بھی کہتے ہی برس گزر  
گئے ہیں..... میں اس گھر میں اپنے دو بچوں اور  
بوزھے ملازم خیر دین اور اس کی بیوی کے ہمراہ رہتی  
ہوں۔ عمیر اور عبید بھی کبھار چھٹیوں میں بچوں کو  
گھمانے یہاں لے آتے ہیں۔ عزیز البتہ کئی برس  
مے یہاں نہیں آیا۔

گو میں ان لوگوں میں سے نہیں جو پرانی یادیں  
سینٹ، سینٹ کر رکھتے ہیں مگر اب بھی جب بھی ٹھنڈ  
گھٹائیں اٹھ اٹھ کر آتی ہیں اور میں برآمدے کے اس  
حصے میں ترپال ڈالنے کے لیے بھاگتی ہوں تو ابا کی



## میتاؤں کا دن

نبیلہ ابرار صاحب

تیسرا حصہ

اگلے دن ویرہ تھا اور صبح ہی شیریں چھوٹی بیٹی کے ساتھ ماڑہ کے ناشتے کی رسم نبھانے پہنچ چکی تھیں مگر یہاں ڈانٹنگ فیمیل کے گرد سب پہلے ہی سے سو جود تھے۔ ڈیرہ کھانے خالص طور پر ناشتے کا اہتمام کر دیا تھا اور اب اپنے ہاتھ سے عمر زیب ایب، ایب پنڈر، امیرار سے ماڑہ کو پیش کر رہے تھے۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہل اٹھی تھی۔ عمر زیب نے ان کا لایا ہوا ناشتا بھی میز پر لگا دیا۔ دوپہر چونکہ ہونے کو بھی تو ڈیرہ کھانا پارہ جاتے



کے لیے مائرہ کی چیزیں اکٹھا کرنے لگی۔ ناشتے کے بعد مائرہ ماں اور بہن کے ساتھ باتوں میں لگ گئی، ادھر دُڑیکتا بھابی کے ساتھ پارٹر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر اسے بتانے آئی تو مائرہ اپنی پھوٹی بہن اور شیریں تاتی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ سامان پہلے سے ہی رکھوایا جا چکا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سامنے ہی گاڑی اب گیٹ سے نکل رہی تھی۔ وہ حیرت سے ادھر ہی دیکھے جا رہی تھی۔ مائرہ بھابی کو اچھی طرح پتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ جائے گی پھر بھی وہ بغیر بتائے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ چلی گئیں۔ اسے عجیب سا دکھ ہوا کیونکہ پاپے بھی کہا تھا کہ تم اپنی بھابی کے ساتھ چلی جانا خیر اس کے پاس اس وقت اتنا نام نہ نہیں تھا کہ وہ سوچ کے کڑھتی۔ شادی والا گھر تھا سو کام تھے اور اسے ہی سب کچھ دیکھنا تھا۔

☆☆☆

مائرہ کل سے بڑھ کر آج حسین لگ رہی تھی۔ اس کے برابر بیٹھا شاہ زیب بار، بار اسی کو دیکھ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس کا نقش، نقش دل میں اتار لے۔ وہ ایسا ہی پاگل، دیوانہ تھا۔ پوری تقریب کے دوران وہ ایک بار بھی اس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ دوست احباب، مٹنے جلنے والے خود ہی آکر مبارک باد دیتے رہے جنہیں وہ مسکرا، مسکرا کر خوشی سے وصول کرتا رہا۔ شیریں بڑی سرور تھیں۔ انہیں اب یقین ہو گیا تھا کہ مائرہ ساری زندگی اپنے شوہر کے دل و دماغ پر حکمرانی کرے گی۔ اسے ناز و انداز کے ایسے جال میں جکڑ کے رکھے گی کہ وہ کاتھ کا الو بن کے ہریات پر ہاں، ہاں ہی کرے گا۔

☆☆☆

”مائرہ اٹھ بھی جاؤ ناں جان کافی نام نہ ہو گیا ہے۔ اب تو پہا بھی آفس کے لیے جا چکے ہوں گے۔ مجھے بات کرنی تھی ان سے تم نے جگا دیا نہیں مجھے۔“ اس نے جھک کر مائرہ کے ساتھ خوب صورت سی شرارت کر دی۔ وہ زلفیں سنہا لتی ایک جھٹکے سے اٹھی اور اس سے قدرے دور ہو گئی۔ اپنی خوشی میں وہ محسوس

ہی نہ کر سکا کہ مائرہ کے چہرے پر بیزاری سی ہے۔ ”کیسے جگاتی میں آپ کو؟ روز لیٹ سوتی ہوں، سکون کی غیند کو ترس گئی ہوں۔ آپ مجھے سونے ہی نہیں دیتے۔“ اب کی بار اس نے غصہ نہیں چھپایا۔ ”پورا دن ہوتا ہے تمہارے پاس آرام سے سویا کرو۔“ وہ مزے سے بولا تو مائرہ چیخ پھن کر ہاتھ روم چلی گئی دروازہ زور سے بند کیا جو اس کے غصے کا واضح اظہار تھا۔

مائرہ ٹھیک کہہ رہی تھی شاہ زیب نے اس کی صورت میں نئی دنیا دریافت کی تھی۔ اپنے جذبات کے اظہار میں وہ کسی قسم کی تنجوی نہیں کرتا تھا۔ دل یہی کرتا تھا کہ مائرہ ہر وقت اس کے پاس رہے۔ دُڑیکتا کالج اور عمر آفس چلے جاتے۔ وہ دونوں بہت دیر سے جا گئے۔ فی الحال کالج سے بھی چھٹیاں لی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

مائرہ، شاہ زیب کے ساتھ میکے آئی ہوئی تھی۔ وہ دن وہ اس کے ساتھ گاؤں میں ہی رہا۔ عمر زیب کی کال آئی تو واپس گیا۔ انہیں کوئی کام تھا ورنہ وہ مائرہ کے ساتھ ہی واپس آتا۔ باسط کے باہر جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ وہ گاؤں شیریں خالہ سے ملنے آیا ہوا تھا، مائرہ بھی ادھر ہی موجود تھی۔ وہ اس کا سامنا کرنے سے کترار ہا تھا پر ہونی ہو کر رہی وہ اس وقت اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ مشہور ڈیزائنر کا... سوٹ زیب تن کیے، خوب صورت جیولری سے آراستہ، ہلکا پھٹکا میک اپ کیے وہ روزِ اول کی طرح ہی اسے اپنی رسائی سے بہت دور لگ رہی تھی۔ باسط کو اندر کہیں زیاں کا شدید احساس ہوا۔ وہ اس سے تفصیلات پوچھ رہی تھی کہ کہاں جا رہا ہے، کیا جاب ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ ہوں ہاں کرتا رہا۔

”باسط تم ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کر رہے۔“

”کیا ہوا ہے؟“

”نور کیسے بات کروں؟“ اتنا اس نے مائرہ سے

سوال کر دیا۔



اسے آنے والے وقت سے ڈرا دیا تھا۔ سب کچھ عمر کے ہاتھ میں تھا۔ شاہ زیب کو بھی با اختیار ہونا چاہیے۔ ایسا بھی ممکن تھا اگر وہ آفس جاب شروع کر دیتا اور کام کو سمجھتا پھر باقی کے مراحل بھی آسان ہو جاتے تھے۔

مارہ بھی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن خیالوں کی رو بہک کر باسط کی طرف چلی گئی۔ وہ پاکستان سے جا چکا تھا پر اس کے خیالوں سے نہیں جا پار ہا تھا۔ اسے باسط سے آخری ملاقات اور اس کی یاس بھری گہری نگاہیں اور ان میں اس کے حصول کی طلب سب اچھی طرح یاد تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ اسے نہیں بھولا تھا۔ کیسا چھپا جانے والا اور اپنی منوانے والا مرد لگ رہا تھا وہ اور ایک یہ شاہ زیب۔ اس نے اپنے پہلو میں بے سدھ سوئے ہوئے شاہ زیب کو دیکھا۔ اس کی انگلی پکڑ کے چھنے والوں میں سے تھا۔ کوئی اتنا، کوئی خود داری، کوئی عزت نفس ہی نہیں تھی اس میں۔ بس بیوی کی جوتیاں سیدھی کرنے میں سکون ملتا تھا اسے۔ شاہ زیب کا بس چھتا تو ساری عمر مارہ کے گھٹنے سے لگ کے بیٹھا رہتا۔

”ہونہہ۔“ مارہ نے سر جھٹکتے ہوئے اس کی طرف سے نظر ہٹائی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

طاہر لغاری کے سینے میں ہلکا سا درد اٹھا پر انہوں نے نظر انداز کر دیا اور یوں آئندہ آنے والے دنوں میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ ہنگامی حالت میں انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹرز نے انجانا بتایا۔ اشعر لغاری تک فوراً یہ اطلاع پہنچی تھی۔ اس نے اسی میں عاقبت جانی کہ پیارے پاس فوراً کوٹ آئے۔

ہفتہ دس دن میں طاہر لغاری صحت یاب ہو کر گھر آ گئے۔ ان کے ڈسچارج ہونے کے کچھ دن بعد اشعر بھی پاکستان پہنچ گیا۔ جب اس نے یہ بتایا کہ وہ پکا، پکا ان کے پاس آ گیا ہے تو انہوں نے اپنے اندر نئی توانائی رگ و پے میں دوڑتی محسوس کی۔ یوں لگتا تھا وہ کبھی بیمار ہوئے ہی نہیں تھے۔ اشعر نے واپس آ کر مستقبل کی

منصوبہ بندی کا آغاز کر دیا تھا۔ کرمنا لوجی کی اعلیٰ ڈگری اور اس فیلڈ میں کچھ تجربہ بھی اس کے پاس موجود تھا سو اسٹیشنل کرائم برانچ میں جاب ملنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ جوان کر چکا تھا۔ طاہر لغاری نے کہا کہ کسی دن وقت ملے تو عمر انکل سے مل آؤ اس نے غائب دماغی سے سر ہل دیا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب نے عمر کے ساتھ آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ انہیں بہت اچھا لگا تھا کہ وہ اپنی ذمے داریوں سے آگاہ ہو رہا ہے۔ وہ اسے اپنے پاس بٹھا کر کاروباری اسرار و رموز کی بابت بتاتے۔ اسی طرح کرتے کرتے اس نے پہلا ماہ بڑے آرام سے گزار لیا تھا۔ آفس آؤ جاتا تھا پرتھوڑی، تھوڑی دیر بعد مارہ کو فون کیا کرتا۔

”کیا کر رہی ہو؟ کیا سوچ رہی ہو؟ کچھ کھایا ہے کہ نہیں؟ مجھے مس کیا کہ نہیں اور اپنا خیال رکھنا میں شام کو جلدی آؤں گا پھر باہر چلیں گے۔“ اس کی گفتگو روزانہ اسی قسم کی ہوتی۔ گھر واپسی پر تو وہ جیسے پھر مارہ کا سایہ ہی بن جاتا۔ اسے ایک بل کے لیے بھی دور نہ ہونے دیتا وہ روتھتی، نخرے کرتی اور وہ ہاتھ جوڑ کر مانتا۔

☆☆☆

باسط اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے دوست نے روانگی سے قبل ایک ہند پکٹ میں کچھ سامان اس کے سپرد کیا تھا کہ ”یہ ائر پورٹ پر اترتے ہی تم نے ایک شخص کے حوالے کرنا ہے۔“ اس شخص کا حلیہ، عمر، نام وغیرہ اور اس طرح کی دیگر معلومات اسے مل گئی تھیں۔ وہ شخص اسے ائر پورٹ سے باہر نکلتے ہی مل گیا تھا۔ وہی شخص باسط کو اس کی رہائش گاہ تک اپنی گاڑی میں بٹھا کے لایا تھا۔ وہاں باسط جیسے تین اور نو جوان بھی تھے۔ باسط کو اب ان کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ ائر پورٹ پہ جو شخص باسط کو ملا تھا اس کا نام اسد گردیزی تھا۔ اسے رہائش گاہ تک پہنچا کر جانے سے قبل اس نے پھولنا ہوا ایک خاکی لفافہ باسط کے سپرد کیا۔

”پھر جب کام ہوگا تمہارے پاس آؤں گا فی الحال



میں ہی اس نے خوشحال ہو جانا تھا۔ دنیا کی ہر آسائش اس کے قدموں تلے ہوئے کھنٹی۔

باسط نے وہاں کے طور طریقے جان کر بہت جلد ہی پیسے پاکستان بھیجے تھے۔ بیٹا کے ہاتھ میں جب پیسے آئے تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے مجازی خدا حمزہ احمد کی طرف دیکھا۔

”اپنے باسط نے نیچے ہیں پورے ایک لاکھ بیس ہزار ہیں گن لو۔ رات اس کا فون آیا تھا کہ اگلی بار اس سے بھی زیادہ بھجواؤں گا۔“

”کیا اتنے زیادہ پیسے؟“ بیٹا کے ہاتھ لرزنے لگے۔

”ہاں اسے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔“

ہمارے تو نصیب کھل گئے ہیں۔ اس کے دوست نے

کافی اس کا ساتھ دیا دیکھو کتنی اچھی نوکری دلائی ہے۔“

”میرا بیٹا چھوٹی عمر سے ہی روزگار اور نوکری کے

چکر میں پڑ گیا ہے، اس کی عمر کے باقی لڑکے بے فکری سے

گھومتے پھرتے ہیں۔ ایک میرا باسط ہے پر دیکھ کی

خاک چھان رہا ہے۔“ بیٹا کے آنسو نکل آئے تھے ان

آنسوؤں میں ممتا اور پیار تھا اور باسط کی جدائی کا غم بھی۔

”اے نیک بخت کیوں روتی ہو شکر کرو کہ بیٹا سدا

پوست ہو گیا ہے۔ ہمارا بھی خاندان میں نام ہوگا عزت

ہوگی۔ یہاں تو جس کے پاس ڈھیر دوا روپے ہو۔ اسی کی

ڈھیر دوا عزت ہوتی ہے۔“ ان کی بات پر بیٹا سر ہلا کر رہ

گئی اور آنسوؤں کی نمی دوپٹے میں ہی جذب کر لی۔

بہارِ حیات

”جان۔“ مارہ کا لہجہ خصوصاً لگاؤ میں ڈوبا ہوا

تھا۔ شاہ زیب ہزار جان سے فدا ہو گیا اور بڑے پیار

ساتھ بیٹے لگا۔

”کیا بات ہے سوئٹ ہارت؟“

”میں کچھ سوچ رہی تھی۔“

”کی۔“

”میں آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کتنی

محنت کر رہے ہیں میرے لیے۔“ مارہ نے اپنا سر اس

کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ اس کے پیار کے نشے میں سرشار

ہو رہا تھا۔ سکون و صرانیٹ انگ، انگ میں دوز رہی

لائف انجوائے کرو۔“ اس نے باسط کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ باسط کی نگاہ پھولے ہوئے خاک کی لفافے پر تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا جانے اس خاک کی لفافے میں کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کھٹا سوال اسد گردیزی نے بھی پڑھ لیا۔

”یہ تمہاری خدمت کا معاوضہ ہے جو تم نے

ہمارے لیے سرانجام دی ہے۔“

”مگر میں نے تو کوئی کام نہیں کیا۔“ وہ الجھن

بھرے انداز میں اسے اب بھی دیکھ رہا تھا۔

”کام تو تم نے کیا ہے اور اتنی خوبی سے کیا ہے کہ

میں بھی داد دینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ جو ٹکٹ تم نے

مجھے دیا ہے وہی تو تمہاری خدمت ہے اور جو میں نے

اس کے عوض تمہیں دیا وہ تمہارا حق۔ اب چلتا ہوں

پریشان مت ہو۔ باقی باتیں تمہیں تمہارے ساتھ رہائش

پزیر ٹرک کے بتا دیں گے پھر بھی کوئی مشکل یا پریشانی ہو

تو مجھے کال کر لینا یہ میرا نمبر ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“

حیران پریشان کھڑے باسط کے ہاتھ پر اسد نے ایک

کارڈ رکھا اور پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ باسط نے ہاتھ میں

پکڑا کارڈ غور سے دیکھا۔ اس میں اسد کا نام اور دو سیل

نمبر درج تھے۔ اس نے کارڈ اپنی پیٹ کی جیب میں

ٹھونس دیا۔ اسے خاک کی لفافے کو دیکھنے کی جلدی تھی مگر

کمرے میں موجود تینوں لڑکے اس سے تعارف کے

منتظر تھے۔ وہ ہادولہ، خواستہ ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس

نے شکر کیا جب وہ سب ایک، ایک کر کے وہاں سے

اٹھے اور سونے کے لیے گئے۔ تنہائی پاتے ہی باسط نے

خاک کی لفافہ کھولا۔ اندر کرارے امرتین ڈالرز بھرے

ہوئے تھے۔ اس کی تو آنکھیں ایسے خیرہ ہوئیں جیسے کوئی

مخزانہ دیکھ لیا ہو۔ اس نے ایک، ایک کر کے تمام نوٹ

گنے۔ از سر نو اس نے یہی عمل پھر کر دیا۔ یہ رقم بہت

زیادہ تھی اس نے پاکستانی روپوں میں لفافے میں موجود

ڈالرز کا حساب لگایا تو خوشی سے چہرہ چمک اٹھا۔

اس کے خوابوں کے پہلے پڑاؤ میں ہی اسے

ناقابل یقین کامیابی ملی تھی۔ اس طرح تو محض چند ماہ

تھی۔ اپنی محبوب بیوی کی ذرا سی توجہ، محبت اور خیال اسے نہال کر دیتا تھا۔

”لو میں کون سی ایسی خاص محنت کر رہا ہوں تمہارے لیے۔“

”محنت ہی تو کر رہے ہیں، آپ نے آرام و آسائش میں زندگی گزاری ہے اور میں نے آپ کو اپنی ذمے داریوں کا احساس دلایا۔ آپ نے آئس جانا شروع کر دیا حالانکہ یہ آپ کے مزاج میں نہیں تھا۔“

”تو اچھا ہوا ناں مجھے بھی زندگی کی مشکلات کا احساس ہوا ہے اور تم تو میرے ذمے داری ہو سوت ہارٹ تمہارے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں یہ تو عام سا کام ہے۔“

”شاہ زیب میں آپ کو تارے توڑ کے لانے کے نیے نہیں کہوں گی مگر آپ فیوجہ کی فکر بھی کریں ساری زندگی ہم نے دو تو نہیں رہنا، ہمارے بچے بھی ہوں گے ان کی سوزووریات ہوں گی۔“ اب وہ مجھو بہ کی جگہ تاحل لگ رہی تھی۔

”جب بچے ہوں گے تو دیکھا جائے گا ان کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں گی۔ تم فکر مت کرو۔“ اس نے پیار سے مارتہ کے ماتھے پر آئے ہاتھ پیچھے کیے۔

”شاہ زیب میں اپنے ہونے والے بچوں کو دنیا کی ہر سہولت و آسائش دینا چاہتی ہوں۔“ وہ بولتے، بولتے اٹھ کر بیٹھ گئی اور ذرا دیر بعد پھر گویا ہوئی۔ ”ان آرام و آسائش کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے پاس بھی کچھ ہو میرا مطلب ہے کوئی پر اپنی، بینک بیلنس تاکہ ہم اپنی مرضی سے سب کچھ استعمال کر سکیں تاکہ کسی اور سے مانگیں۔“

”سب کچھ میرا ہی تو ہے اور جو چیز میری ہے وہ ظاہر ہے میرے بچوں کی بھی ہے۔“ شاہ زیب نے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی مگر وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔

”شاہ زیب آپ جو کدو میں سے اپنا حصہ طلب

کریں۔“ اس نے بہت درمل انداز میں یہ بات کہی تھی جیسے اس کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو مگر شاہ زیب اپنے آپ میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ بیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ایک دن سب میرا ہی ہوگا۔“ اس نے کمزور سے لہجہ میں ہلکا سا سنجالا لینے کی کوشش کی تھی۔

”اب آپ شادی شدہ ہیں۔ عمر چچا کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ آپ کی ایک بیوی ہے، ایک لائف ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میرا شوہر مالک و مختار ہو۔ اس جاندو میں آپ اپنا حصہ مانگیں اور جب مل جائے تو الگ سے اپنا کاروبار شروع کریں کیونکہ اب کہتے ہیں کہ عمر بچا وقت کے ساتھ بالکل بھی نہیں بدلے وہ ابھی تک فرسودہ طریقے سے کاروبار کر رہے ہیں لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں پر ان کا انداز نہیں بدلا۔ آپ جوان ہیں آپ کے پاس نئی سوچ اور نئے آئیڈیاز ہیں۔ دیکھیے گا آپ جب اپنا بزنس شروع کریں گے تو کیسے کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ میرے سب خواب ایک، ایک کر کے حقیقت بن جائیں گے۔ بس آپ ذرا اہم تو کریں۔“ وہ اسے جوش دلا رہی تھی۔ سنہرے روپے لے، خوابوں کی واوی کی سیر پر مجبور کر رہی تھی۔ سچ کچھ شاہ زیب کو اپنے آپ میں تازگی و سرمستی محسوس ہونے لگی۔ اس کے الفاظ کی انگلی پکڑے، پکڑے وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ اپنا بزنس، اپنا آفس، اپنا اسٹاف، اپنی مرضی، اپنا حکم، ہر چیز پر اپنا اختیار، اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا گولڈن چانس۔

کتنا خوب صورت ہوتا ہے یہ سب کچھ اپنی مرضی اور اپنے اختیار کا تصور ہی کتنا سرور آگیا تھا۔ جو بات وہ پہلے سوچ بھی نہیں سکتا تھا اب بڑے آرام سے چنان کر رہا تھا۔ درپردہ مارتہ کا بڑھاد اور مدد بھی شامل تھی۔ اس نے پیار سے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔ مارتہ نے اس کے دماغ میں ڈال دیا تھا کہ سب کچھ تمہارا ہے جو چیز تمہاری ہے اس کا مطالبہ کرنے میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔ اب تو اس کے ذہن نے کچھ عجیب، عجیب سی باتیں بھی سوچنا شروع کر دی

تھیں۔ جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

مارہ نے سوئے ہوئے شاہ زیب کے چہرے سے نگاہ ہٹائی۔ درحقیقت وہ دل میں بہت مسرور تھی۔ جو بات وہ شاہ زیب کے دماغ میں ڈالنا چاہ رہی تھی وہ اس نے ڈال دی تھی۔ اب اس نے اپنا کام بخوبی کر لیا تھا۔ بس وقت اور سامنے آنے والے نتائج کا انتظار کرنا تھا اور یہ انتظار زیادہ طویل نہیں تھا۔ شاہ زیب تو اس کے ہاتھ میں کچھ پتلی کی طرح تھا وہ جب چاہتی ڈور بٹاتی اور وہ اشارے پر حرکت شروع کر دیتا۔ یہ خوشی ہی کتنی بڑی تھی کہ اس کا شوہر اس کی ہر بات مانتا تھا، اس کی جی حضوری اور خوشنودی ہی اس کے لیے اہم تھی۔ پر جانے کیوں پھر بھی وہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی تھی۔ یوں جیسے وہ اس کا شوہر نہیں بلکہ غلام ہے، بے دام کا غلام۔ اسے شاہ زیب کی شخصیت میں عجیب سا خلا محسوس ہوتا جیسے خود اس کی اپنی کوئی بھی انفرادی شخصیت و کردار نہ ہو۔ مارہ جو کہتی وہ وہی کرتا۔ اس کی کہی بات سے وہ انحراف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کتنی غلط باتیں بعض اوقات اسے ماننے پر مجبور کرتی اور وہ بلا چون و چرا امان لیتا ایسے جیسے یہ اس کا فرض ہو۔ وہ اگر کسی بھی فضول اور بے معنی بات پر ناراض ہو جاتی تو وہ متنب کر کے اسے مانتا۔ ہاتھ تک جوڑ دیتا، بچوں کی طرح کان پکڑتا۔ یہ سب دیکھ کر مارہ کو اور بھی آگ لگتی۔ تن من جھلنے لگتا۔ دور، دور تک پچھتاؤں کی خاک اڑتی اور اس گرد و غبار میں سے رفتہ، رفتہ ایک چہرہ نمایاں ہو کے سامنے آتا۔ یہ چہرہ یہ نقش اس کے جانے پہچانے تھے۔ یہ چہرہ یہ نقش باسط کے تھے۔ جس کے چہرے کے تاثرات میں ایک، ایک نقش میں مردانگی و کڑھکی تھی۔ اپنی منوا لینے کا عزم تھا، جنون تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ میچورڈ اور باشعور تھا۔ اس کی شخصیت ایک مکمل اور بھرپور مرد کی عکاس تھی۔ مارہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچتی تھی۔

شاہ زیب سمجھی، سمجھی اسے کسی خوف زدہ بچے کے

مانند لگتا جو بھرے سینے میں اپنوں سے پھڑک گیا ہو اور اب تلاش کرتا پھر رہا ہو۔ اس تلاش میں ہر نظر آنے والے چہرے میں سہارا اور تحفظ ڈھونڈ رہا ہو، پناہ مانگ رہا ہو۔ شاہ زیب کی شخصیت کے اس رخ پر مارہ کو کبھی، کبھی بہت حیرت ہوتی تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید عالمہ چچی کی وفات ہو۔ کیونکہ اس نے بڑوں سے سنا تھا کہ شاہ زیب چھوٹا سا تھا جب عالمہ چچی فوت ہوئیں۔ اس محرومی اور اس خلا کو وہ شاید آج تک پُر نہیں کر پایا تھا حالانکہ مارہ نے یہ بھی سنا تھا کہ عمر چچا کی دوسری بیوی بھی بہت اچھی تھیں خیر اس نے سر جھٹک کر ان سوچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی کیونکہ وہ اس بارے میں جتنا سوچتی اسے غصہ آتا اور اس غصے کا مرکز شاہ زیب کی ذات ہوتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے فی الحال کوئی لڑائی جھگڑا کرے کیونکہ اس نے خود ہی شاہ زیب کو مطلوبہ نتائج کے لیے طاقت اور اہم فراہم کرنا تھی۔

☆ ☆ ☆

سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ شاہ زیب نے ایک، ایک چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ خود برائے نام کھا رہا تھا۔ اسے پپا سے بات کرنی تھی۔ آفس میں تو بات کرنا مناسب تھا۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ گھر میں آرام سے پپا سے بات کرنا مناسب ہوگا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کس وقت بات کی جائے۔ وہ گھر آتے، کھانا کھاتے تھوڑی دیر مطالعہ کرتے اور پھر سونے کے لیے چلے جاتے۔ اتنا وقت ہوتا ہی نہیں تھا ان کے پاس سو شاہ زیب سے صبر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جلد از جلد کھانا ختم ہونے کے انتظار میں تھا تا کہ بات کر سکے۔ عمر نے جو نئی پانی کا گلاس لیوں سے ہٹا کر رکھا شاہ زیب نے اپنی پوری طاقت جمع کی اور ان کی طرف دیکھا۔

”پپا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ چونک سے گئے۔ کچھ عرصے پہلے کی بات یاد آگئی جب وہ اسی طرح اسی ٹون میں ان کے پاس آیا تھا کہ پپا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ ان کی چھٹی حس نے انہیں خبردار کیا۔ شاہ زیب کا لہجہ، انداز اور چہرے پر کھرا



دنیا کی ہر سہولت و آرام دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے پلیز  
پاپا مجھے میرا حق دے دیں جو بھی بنتا ہے۔ "شاہ زیب  
نے اپنی بات کر دی تھی۔ عمر فکر و فکر سے دیکھ رہے تھے۔  
وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ شاہ زیب نے کتنے  
باقابل یقین جملے بولے تھے۔ ان کی سماعتوں نے یقیناً  
دھوکا نہیں کھایا تھا لفظ بہ لفظ ٹھیک سن تھا اپنے سیاق و  
سباق کے ساتھ۔ وہ دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔

"تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" عمر کا  
لہجہ اب بھی ٹھنڈا ہی تھا۔

"جی مجھے پتا ہے۔" دُرِ یکتا ان دونوں کو پریشانی  
سے دیکھ رہی تھی۔ اسے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔

مارہ بظاہر یہاں سے اٹھ گئی تھی پر ڈاکٹنگ روم  
سے باہر دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اندر سے  
آتی آوازیں بخوبی اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔  
رگ و پے میں بیجان سا رہا تھا۔

"پاپا میں نے اپنا حق مانگا ہے۔ آخر کب تک  
مچھولی سے مچھولی ضرورت کے لیے بھی مجھے آپ کی مدد  
کی ضرورت پڑتی رہے گی اور میں آپ کے ہاتھوں کی  
طرف دیکھتا رہوں گا۔ پاپا اب میری ایک فیملی لائف  
ہے، میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری بیوی ہے اس کی بھی سو  
ضروریات ہیں جن کو پورا کرنا میری ذمہ داری ہے  
اور میں نہ صرف اپنے بلکہ اس کے لیے بھی آپ کا محتاج  
ہوں۔ پاپا مجھے اچھا نہیں لگتا ذرا ذرا سی ضرورت کے  
لیے آپ کی طرف دیکھنا۔ اس لیے مجھے میرا حصہ دے  
دیں۔" وہ بڑے سکون سے بولا۔ عمر زیب چند لمحوں  
آنکھیں بند کیے کرسی کے ساتھ ٹیک لگائے وہیں بیٹھے  
رہے پھر کچھ کہے بغیر اٹھے اور اپنے تلے قدم اٹھاتے  
باہر نکل گئے۔ ان کے قدموں کی مخصوص چاپ پچھانتے  
ہی مارہ نے وہاں سے ہنسنے میں دیر نہیں لگائی تھی جب  
تک وہ باہر آتے تب تک وہ راہ واری سے غائب  
ہو چکی تھی۔

مارہ، شاہ زیب کی کارکردگی سے خوش تھی اس نے  
جس طرح بات کی تھی عمر چچا یقیناً اس کے سرکش تیوروں

اضطراب کسی خاص بات کی گواہی دے رہا تھا۔ عمر  
زیب نے اپنے تاثرات کمال مہارت سے چھپا لیے  
اور بظاہر بڑے ہشاش بشاش لہجے میں بولے۔

"کیا بات ہے جو اس طرح ذرہ ذرہ کے بول  
رہے ہو؟" انہوں نے شاید اس کے دل کا چور پکڑ لیا  
تھا۔ مارہ تو اسی وقت برتن اٹھانے کے بہانے منظر  
سے ہٹ گئی اب وہاں ان دونوں کے علاوہ دُرِ یکتا بھی  
تھی۔ اسے بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا کیونکہ شاہ  
زیب کا چہرہ پریشانیوں کی آماجگاہ لگ رہا تھا۔ وہ اٹھتے  
اٹھتے وہیں بیٹھ گئی۔

"پاپا بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنا کاروبار کرنا  
چاہتا ہوں الگ سے۔" پاپا آخر اس نے دل کی بات  
گوشت گزار کر ہی دی۔ عمر زیب کے چہرے پر معنی خیزی  
مسکراہٹ آگئی جسے شاہ زیب کوئی محسوس نہ ہونے سے  
قاصر تھا۔

"الگ کاروبار کرنے کے لیے تجربہ اور مہارت  
درکار ہوتی ہے، وہ تمہارے پاس ہے؟"  
"پاپا تجربہ اور مہارت بھی وقت کے ساتھ  
ساتھ آ جاتی ہے۔ آپ کا بیٹا ہوں اس لیے تو آفس جاتا  
ہوں کہ آپ کے کام کرنے کے طریقہ کار سے واقف  
ہو جاؤں۔" وہ مارہ کے یاد کروائے گئے سبق کو بخوبی  
دہرایا تھا۔

"مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابھی تم اس قابل نہیں  
ہو سکتے کہ الگ سے کاروبار کر سکو۔ ابھی تمہیں کافی کچھ  
سمجھنے کی سیکھنے کی ضرورت ہے۔ تاہم گئے گا اس کے بعد  
میں نے مناسب تصور کیا تو تم بے شک اپنا الگ بزنس کا  
سیٹ اپ بنا لینا مگر ابھی نہیں۔" عمر زیب نے بڑے  
سکون سے اپنی بات مکمل کی تھی پر شاہ زیب کا فطری  
غصہ عود آیا۔

"پاپا میں سب کچھ کر سکتا ہوں شادی شدہ ہوں  
خود مختار ہوں۔ مجھے میرا حق ملنا چاہیے اتنی بڑی دولت و  
جائیداد کا وارث ہوں اور آپ ہیں کہ مجھے اس قابل ہی  
تصور نہیں کرتے۔ کل کو میرے بچے ہوں گے انہیں میں

کی ذرا، ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو اٹھتی۔ اس نے کبھی، کبھی انہیں پریشان نہیں کیا تھا۔ جانے شاہ زیب کو خود غرضی کی ہوا کیوں لگ گئی تھی۔

انہوں نے الہم بند کیا اور آرام سے کھڑے ہوئے۔ اسے اپنی جگہ پر رکھا اور دوبارہ صوفے پر آ بیٹھے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر اٹھے اور دیوار میں نصب سیف کا لاک کھولا۔ اندر بہت سے کاغذات اور کچھ ضروری فائلز رکھی تھیں۔ عمر نے ایک، ایک کر کے سب کاغذات باہر نکال لیے۔ وہ انہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ ان کی زمینوں، جائیدادوں کے کاغذات تھے۔ شاہ زیب نے انہیں دورا ہے پہلا کھڑا کیا تھا۔ اس مشکل سے نکلتا اگرچہ ان کے اختیار میں تھا۔ اور انہیں اپنے گھر کے سکون اور دل سکون کی خاطر کچھ فیصلے کرنے ہی تھے۔

☆☆☆

تین چار روز سے عمر آفس نہیں جا رہے تھے۔ روزانہ شاہ زیب کی آفس روانگی کے بعد وہ تیار ہو کر ڈرائیور کے ساتھ نکل جاتے۔ وہ کہاں اور کیوں جاتے تھے اس کا علم گھر کے کسی فرد کو نہیں تھا۔ ڈریکٹر پریشان تھی ہی پر مارہ کو بھی کچھ بھد لگی ہوئی تھی۔

اسی بنا پر اس نے میٹکے جانے کا پروگرام فی الحال ملتوی کر دیا تھا۔ شاہ زیب بھی کچھ بتانے سے قاصر تھا کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔ ہفتہ دس دن سے ان کی یہی روٹین تھی۔

شاہ زیب صبر سے انتظار کر رہا تھا کہ کب اس کی کئی بات پر وہ عمل کرتے ہیں۔ مارہ بھی خاموش تھی۔

☆☆☆

شاہ زیب تیار ہو کے ناشتا کرنے ڈائننگ ہال میں پہنچا تو عمر زیب اسی کے انتظار میں تھے۔ ڈریکٹر بھی وہیں موجود تھی۔ مارہ البتہ موجود نہیں تھی وہ شاید کچن میں کچھ لینے گئی تھی۔

”آج آفس سے چھٹی کر لو۔“ عمر کسی طرف دیکھے بغیر شاہ زیب سے بولے۔

سے واقف تھے تب ہی تو ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا دل ہی دل میں ہار مان چکے تھے۔ جو ان اولاد کے سامنے کوئی منہ زوری نہیں دکھا سکتا۔ یہ مارہ کا اپنا نظریہ تھا۔

☆☆☆

عمر زیب کے سامنے گھنٹوں پر فوٹو الہم کھلا پڑا تھا یہ بہت پرانی تصاویر تھیں۔ عمر کی، عائکہ کی، شاہ زیب اور موٹر یکتا کے بچپن کی۔ ایک فوٹو میں عائکہ، شاہ زیب کو گود میں اٹھائے بیٹھی تھی۔ ننھا شاہ زیب یہ مشکل ایک سال کا تھا۔ عائکہ کی گود میں بیٹا انگوٹھا چوستا۔ سرے کی طرف حیران نگاہوں سے تکتا جب عمر نے وہ لمحہ تصویر میں قید کیا تھا عمر ایک، ایک تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں اپنا سنہرا ماضی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں خبر ہی نہیں ہوئی کہ ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہوئے جا رہے ہیں۔ عائکہ کی گود میں بیٹھے شاہ زیب کے نقش و خند لا رہے تھے۔ عائکہ کے بعد انہوں نے اس کی وی گئی۔ جھوڑی گئی نشانیوں کی کتنے پیار سے پرورش کی تھی۔ شاہ زیب کی ہر جائزہ جائزہ ضد پوری کی، وہ مارہ کے معاملے میں ان سے مقابلے پر اتر آتو انہوں نے شکست مان لی۔ اس کی ضد پوری کر دی۔

مارہ کو عزت و مان سے بہو بنا کر لے آئے۔ شاہ زیب نے ان کے ساتھ آفس جانا شروع کیا تو وہ خوش ہو گئے کہ جو ان بیٹے کو اپنے فرائض کا احساس ہو گیا ہے۔ آہ ہا یہ فرائض کا احساس تو نہیں بلکہ خود غرضی کی مفاد کی جنگ تھی۔ اختیار و طاقت کے تاج کے حصول کی جنگ تھی۔ طاقت اور اختیار کی جنگ کا یہ تاج جس کے سر پر بجا وہی فاتح قرار پاتا۔ ان سب کے پس منظر میں کسی اور کی سوچ کار فرما تھی۔ یہ شاہ زیب کی اپنی سوچ اور فیصلہ نہیں تھا۔

شادی سے پہلے تک اس کا ذہن کبھی کاروبار، دولت کی ملکیت کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ اب ایک ایک اپنے حصے کا مطالبہ، مالک بنائے جانے کی ضد..... ان کی ساری عمر کی کمائی زیاں کے دور پہ تھی۔

موٹر یکتا اس کے مقابلے میں خاصی کم گوا اور اپنے آپ میں گمن رہنے والی حساس اور خوددار بچی تھی جو باپ





### غزل

فسوں غم کی نئی رسم پھر سے چلنے دو  
شعور ذات آزمائشوں میں ڈھلنے دو  
آئے گی باو صبا خود ہی چتے نو میں کے  
بند کلیوں میں اب نئے گلاب کھٹنے دو  
درد کی شکل کوئی ہو جنوں کے عالم میں  
درد جن کو ملا ہے اس میں ان کو پہنے دو  
اب کے طوقان جو پنا ہے خانہ دل میں  
حشر کو باو بیماری کے ساتھ چلنے دو  
نزدی ہم پائیہ تکمیل تک بھی پہنچیں گے  
گداز دل میں محبت کی شمع چلنے دو  
شاعرہ نازیہ نازکی، نوشہرہ

سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا باس یا انچارج جو کوئی بھی تھا اس نے باسط کی اس خوبی کو بہت جلد ٹھیک کیا۔ اسے اچھی طرح پتا تھا کہ باسط کی یہ خوبی آگے چل کر اس کے لیے بہت فائدہ مند اور معاون ثابت ہوگی۔ ویسے بھی اپنے کاروبار کی روز افزوں ترقی کے لیے اسے باسط جیسے تیز لڑکے کی ہی ضرورت تھی۔ کمپیوٹر کا بزنس شروع کیا۔ باس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کیا ہوا تھا، یہ اس کا نیا پروجیکٹ تھا جو اس نے صرف چھ ماہ پہلے ہی شروع کیا تھا۔ اس کمپنی کے لیے اس نے لیبر پاکستان سے بھی بھرتی کی تھی جن میں سے ایک باسط بھی تھا۔

کمپنی کا دفتر لائشیا کے مینے ترین علاقے میں تھا۔ باسط بھی اسی آفس میں تھا۔ آفس میں اس کی جاب کچھ ایسی بھی خاص نوعیت کی نہیں تھی ہاں جب سامان کہیں لے جاتا ہوتا تو پھر باس کی توجہ اسی پر فوکس ہوتی۔ اس کے ساتھ کے باقی تین چار لڑکے اس کی طرح اتنے ہوشیار نہیں تھے۔ ان میں سے دو تو اس وقت وہاں کی ایک جیل میں سزا رہے تھے۔ باسط اپنے ساتھ اس قسم کے حادثے سے بچنا چاہتا تھا۔ وہ بالکل ہی اپنے ہاتھ پاؤں گنوا کے نہیں بیٹھا تھا۔ باس کی غیر

اسے اپنے حصار میں لیے لیے خوابوں میں گم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

بہت دن بعد عمر زیب اس کی طرف آئے تھے۔ ظاہر لغاری بہت خوشی ہوئے اور اسی وقت اپنے ملازم کو آواز دے کر زبردست سی خاطر مدارات کی ہدایت کی۔ ”اس بار کافی دن بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔ گھر میں سب خیریت ہے ناں۔ میری بیٹی کوڑھیا کیسی ہے اور جناب کے بہو، بیٹے کا کیا حال ہے؟“ ظاہر لغاری نے ایک سانس میں سب کا حال احوال پوچھ لیا۔

”کرم ہے رب کا۔۔۔ خیریت سے ہیں سب اور چکر بہت دن بعد اس لیے لگایا ہے کہ میں کچھ کاموں میں مصروف تھا۔ آج بوجھ ہلکا ہوا تو فرصت ملے ہی تمہاری طرف آ گیا ہوں۔“ وہ دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر لانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

”ایسے کون سے کام تھے؟“

”بس یار شاہ زیب کے حصے کی جائداد کی منتظمی کا کام تھا۔ وکیل آج ہی کاغذات بنوا کے لایا۔ سب کچھ شاہ زیب کے سپرد کر کے میں تمہاری طرف آ گیا ہوں۔“ عمر کا بچہ بہت زخمی سا تھا۔ ظاہر کو تاسف اور گہرا رنج سا ہوا۔ وہ مزید کچھ پوچھ کے اسے اور دھمی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سو موضوع ہی بدل دیا۔

☆☆☆

چھ ماہ گزر گئے تھے۔ باسط کام کی نوعیت کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ شروع میں وہ بھی حیران ہوا کہ ایسا کون سا کام ہے جس میں اتنے پیسے ملتے ہیں ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلانے پڑتے۔ خاص محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ بس سامان ایک اتر پورٹ سے دوسرے اتر پورٹ تک کسی خاص شخص کے حوالے کرنا پڑتا ہے اور پھر ڈیڑھ روڈ دھیر پیسے ملتے ہیں۔

باسط مزاجاً بہت تیز اور سمجھدار تھا۔۔۔ اور بات جہاں پیسے اور مستقبل کی ہو تو وہاں ہر شخص میں عقل خود بخود ہی آ جاتی ہے اور باسط میں یہ صفت اوسط درجے

رشتے داروں کے لیے تحائف بھی لایا۔ وہ سامان سے لہرا پھندا تھا۔ جیسا بطور خاص اسے اپنے ساتھ گاؤں کے لیے لے گیا کیونکہ باسط، شیریں خالہ اور اپنے کزنز کے لیے بھی بہت کچھ لایا تھا۔ ان سب کو تحائف بھی دینے تھے اور کچھ جتان بھی تھا۔ اتفاق سے مارہ بھی میکے آئی ہوئی تھی۔ باسط کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ موٹا اور پہلے سے بڑھ کر پھور لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا اس ایک ماہ میں اس کی عمر جیسے چھ سال بڑھ چکی ہو۔۔۔۔۔ وہ حد سے زیادہ ہنستے کا رنگ رہا تھا۔

”لگ رہا ہے کہ تمہاری جاب اور کام بہت اچھا ہے۔“ وہ ہر سبیل تذکرہ بولی تھی۔

”ہاں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اچھا ہے میرا کام اور ہاں میں نے گھر بھی لے لیا ہے فرزند ہے۔ کبھی آؤں گا ہمارے غریب خانے پر۔۔۔۔۔“ بولتے وقت وہ مارہ کے سر اپنے کو بھی تولتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنوز پہلے کی طرح اسارت اور دلکش لگ رہی تھی۔

”ایا، خالہ نے بتایا ہے کہ تم نے گھر لیا ہے۔ آؤں گی کبھی تمہارے گھر بھی۔۔۔۔۔“ وہ خاص ادا سے بولی تو باسط اسے دیکھنے لگا۔

رات وہ گاؤں میں ہی رکا۔ مارہ رات گئے اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ ان باتوں کے دوران ایک بار بھی شاہ زریب کا ذکر نہیں آیا۔

☆ ☆ ☆

باسط نے پاکستان میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا اس نے واپسی کی سیٹ بک کروائی تھی۔ پہلے کی طرح اسے پھر کوئی سامان کسی مخصوص شخص کے سپرد کرنا تھا۔ اس بار مال کی مالیت زیادہ تھی سو وہ کچھ عروس اور پریشان بھی تھا۔ لیکن کوشش کر رہا تھا کہ اندرونی اضطراب اور کرب اس کے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے پائے۔ سو چیکنگ کے مرحلے سے وہ بخوبی گزر گیا۔ اب دیکھنا تھا کہ وہاں انر پورٹ پر کیسے حالات سے واسطہ پڑتا تھا۔ یہاں سے تو سب آرام سے ہو گیا تھا۔ وہ جتنا ڈر رہا تھا کام اتنی ہی آسانی سے ہو گیا۔ اتنی اسکریننگ کے

موجودگی میں اس کا ایک ٹائپ تھا جو سارے معاملات کا نگران تھا۔ باسط نے اس سے کافی قربت پیدا کر لی تھی۔ وہ باسط کو پسند کرنے لگا تھا۔ کسی بھی قسم کی پریشانی کی صورت میں اس نے باسط کو مکمل مدد کی یقین دہانی کرائی تھی۔ ویسے بھی باسط اس کا خاص منظور نظر تھا۔ اسی نے باسط کو پاس کے مختلف قسم کے بزنس کے بارے میں بتایا تھا۔ ہر کچھ عرصے بعد پاس کوئی نہ کوئی نیا بزنس اشارت کر دیتا اس بزنس کی آڑ میں اس کا اصل بزنس پوشیدہ تھا اور یہی اس کی کامیابی کا نکتہ تھا۔

چھ ماہ کے دوران باسط کی وجہ سے پاس کو بہت کامیابی ملی تھی سو کامیابی کے تناسب سے اس کا معاوضہ بھی دیگر کارکنوں کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ باسط نے اپنی ذاتی صلاحیت سے انگلش فر فر بونا سیکھ لی تھی اور دوسری زبانوں کی کچھ نہ کچھ شدد بدھ اسے ہوئی تھی۔ یہ اس کا روبرو کے لیے بہت ضروری تھا۔

☆ ☆ ☆

دینا گھر کے ایک، ایک حصے کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ حمزہ احمد نے باسط کے بھیجے گئے پیسوں سے یہ گھر کل ہی خریدا تھا اور آج وہ سب اس گھر کو دیکھنے آئے تھے۔

گھران کے پاس پہلے سے بھی موجود تھا اور کافی کشادہ ہوا دار، خوب صورت بھی تھا۔ پرپوش علاقے میں بنے اس جگہ کی کیا ہی شان تھی۔ فل فرزند بنگلا تھا۔ وال ٹو وال دیڑ کار پینٹ، وسیع و عریض لان، جدید فرنیچر سے آراستہ ایسا گھر ہی دینا کا خواب تھا۔

”میں سب کو بلا کے قرآن خوانی کرواؤں گی خاص طور پر شیریں آپا کو تو ضرور بلاؤں گی۔ انہیں جتا چلنا چاہیے کہ میرا باسط کتنا قابل ہے۔ ان کے داماد اور مارہ کے شوہر کو تو ورثے میں سب کچھ ملا ہے پر میرے بیٹے نے سب کچھ اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔ میرا باسط ان کے داماد سے کئی گنا زیادہ اچھا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے بول رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

باسط نے سب بعد پہلی بار پاکستان کا چکر لگایا تو





تھی۔ باقی بھات اس کے علاوہ تھے۔ عمر زریب کبھی کبھار شاہ زریب کے آفس کا پکڑ لگاتے تو اورنگزیب بھائی ادھر ہی مل جاتے پر ان کے رویے میں بڑا فرق آگیا تھا۔ زمین آسمان کا فرق۔ وہ بڑے غرور اور سرد مہری سے ملتے جیسے اس کا رو بار اور آفس کے وہی مالک ہوں۔ شاہ زریب کی بیرونی اور گھریلو زندگی میں ان کا عمل دخل بڑھتا جا رہا تھا۔ عمر زریب دیکھتے پر من سے بول نہ پاتے۔ شاہ زریب کی ضد ماننے کا یہی انجام ہوتا تھا۔

ان کی دولت اور ترقی سے ان کے گئے خونی رشتے حسد کرتے تھے جو کام کوئی نہ کر سکا تھا وہ ایک کمزور سی لڑکی نے ان کی بہو بن کر دکھایا تھا۔ پسے ان کے گھر آئی پھر ان کے بیٹے کے دل میں اتری پھر اس کی زندگی پہ چھا گئی۔ شاہ زریب اس کے پیچھے دم بناتا بندر تھا۔ مارہ ڈمگڈگی بھائی اور وہ ناچنا شروع کر دیتا۔ وہ پوری طرح اس کے بحر میں جکڑا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

شاہ زریب بہت خوش تھا۔ عمر زریب کے توسط سے پہلی بار اسے بیرون ملک سے آرڈر ملا تھا۔ اس کی خوشی ویدتی تھی۔ اسے اس بات کا چنداں احساس نہیں تھا کہ اس آرڈر کی کامیابی سے تکمیل پر اس کے لیے ترقی و کامرانی کے نئے دروازے کھل جائے تھے۔ وہ تو بس آرڈرز منے پر ہی خوشی سے پھولے نہیں مار رہا تھا۔ کاروباری حلقوں میں اسے ملنے والے اس آرڈر پر تبصرے ہو رہے تھے۔ کئی علی کمپنیوں کے چیمونے موٹے آرڈر اس کے علاوہ تھے۔

تایا اورنگزیب کی ہدایت پہ وہ کسی کو بھی نہیں کر پاتا تھا۔ بس آرڈر لیتا جا رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔

مارہ نے اپنی دلچسپی کی نئی راہیں تلاش کر لی تھیں۔ اس نے بہت جلد ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور شاہ زریب کی بیوی ہونے کے ناتے ایک لینڈ رز کلب کی مستقل ممبر بھی بن گئی تھی۔ وہ دن بھر گاڑی اڑائے اڑائے پھرتی۔ ادھر شاہ زریب کے ذہن پر آفس کے

معاملات بری طرح سوار تھے۔ اسنے سارے آرڈرز نے اس کی مت ہی مار دی تھی۔ تایا اورنگزیب کو ان معاملات کی کوئی خاص سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ اپنی عقل سے کام کرتے جا رہے تھے۔ عمر زریب کے ساتھ ان کا رویہ لیے دینے والا تھا سو انہوں نے شاہ زریب کے آفس کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ ان کا یہ رویہ مستقبل قریب میں شاہ زریب کے لیے نقصان لانے والا ہے اگر انہیں علم ہوتا تو وہ شاید کبھی ایسا نہ کرتے۔

☆ ☆ ☆

آرڈر کی بروقت تکمیل کے لیے شاہ زریب نے میٹرل کی خریداری تایا اورنگزیب اور اپنے سالے کے سپرد کی تھی۔ حالانکہ فیجیر نے دبے الفاظ میں کہا بھی کہ انہیں اس کا تجربہ نہیں ہے نہ ہی وہ کوالٹی کے معیار کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جواپا اس نے فیجیر کو بری طرح جھاڑا اور اپنی اوقات میں رہنے کو کہا۔ وہ بیچارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اس فیلڈ میں اس کا تجربہ کافی زیادہ تھا پر شاہ زریب کے رویے کو دیکھتے ہوئے ساکڑ پر ہو گیا۔ اورنگزیب نے ایک فیکٹری سے کپڑا اور دیگر میٹرل خریدا لیا۔ وہ اپنے اس کارنامے پہ خوش تھے کہ انہوں نے یہ سب بہت سستا خریدا ہے۔ شاہ زریب کو بڑھا چڑھا کر انہوں نے بتایا۔ وہ پُر سکون ہو گیا۔ پر کوالٹی کنٹرول فیجیر نے سامان دیکھتے ہی کوالٹی اور معیار کا اندازہ لگا لیا۔ وہ شاہ زریب سے شکایت کرتا چاہتا تھا پر فیجیر نے اسے اپنا واقعہ سنا کر خوفزدہ کر دیا۔ ویسے بھی نام گزرتا جا رہا تھا اور انہیں آرڈر مکمل کرنا تھا۔ اگر نام گزر جاتا تو ان کی کاروباری ساکھ کو شدید دھچکا لگتا۔

میٹرل ملنے بن کام شروع کر دیا گیا۔ وقت بہت کم تھا۔ ساری لیبر اس کام کو پائیہ تکمیل تک پہنچانے میں لگی ہوئی تھی۔ ہونی ہو کر رستی ہے۔ مقررہ معیار کے اندر کام مکمل نہیں ہو سکا۔ جتنا کام مکمل ہو سکا وہ کمپنی کو بھجوا دیا گیا۔ کچھ ہی دن کے اندر اندر تمام سامان شکایات کے ساتھ واپس بھجوا دیا گیا۔ شاہ زریب سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ تمام سرمایہ اس کاروبار میں جھونک چکا

ساتھ بیٹے سے معذرت کر لی تھی۔ وہ اکیلا ہی چلا آیا۔  
 پاپا آفس جانے کی تیاری میں تھے اور دروازہ کھٹکا کالج  
 کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ وہ صبح، صبح اسے دیکھ کر پہلے  
 حیران اور پھر مسرور ہوئے۔ بڑی محبت سے گلے  
 ملے۔ وہ وہ دفعہ جانے کے لیے کھڑا ہوا اور انہوں نے  
 دونوں ہی بار اسے تھوڑی دیر تو بیٹھو کہہ کر اپنے پاس  
 سے اٹھنے ہی نہیں دیا۔ جب وہ آنے لگا تو اسے  
 چھوڑنے گیت تک آئے۔ آخر میں اسے گلے لگا دیا۔  
 ان کی گرفت میں بہت محبت بھری خستہ تھی۔ بے  
 اختیار شاہ زیب نے کسی بچے کے مانند ان کی گردن  
 میں ہاتھیں جمائیں کر کے ان کے ماتھے پر اپنے لب رکھ  
 دیے۔ عمر زیب کے اندر شفقت پوری کا طوفان  
 ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ جانے کیا بات تھی ان کا دل چاہ رہا  
 تھا کہ شاہ زیب اسی طرح ان کے گلے سے لپٹا رہے پر  
 اسے جانا تو تھا۔ دوبارہ مارہ کی کال آ چکی تھی کہ کب تک  
 آئیں گے۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ ناچار شاہ زیب  
 ان سے مل کر واپس آ گیا۔ جب تک اس کی گاڑی نے  
 موزیمس کا پارکرویں کھڑے دیکھتے رہے۔

☆ ☆ ☆

شاہ زیب گھر پہنچا تو شیریں تائی بیٹھی تھیں۔ وہ  
 ابھی ابھی سینیٹی تھیں۔ مارہ نے ہی انہیں بلوایا تھا  
 حفاظت کے نکتہ نگاہ سے۔ گھر قیمتی چیزوں سے بھرا پڑا  
 تھا۔ وہ دونوں بچے جاتے تو دن میں گھر میں کون ہوتا  
 کیونکہ اورنگ زیب بیٹے کے ساتھ آفس میں ہوتے،  
 کہیں شام ڈھلنے کے بعد لوٹتے۔ چوری کی وارداتیں  
 عام تھیں کوئی بھی گھر میں کسی کو نہ پا کر نقب لگا سکتا تھا  
 اس لیے مارہ نے اپنی والدہ محترمہ سے گزارش کی تھی  
 کہ ان کی غیر موجودگی میں آکر گھر کی دیکھ بھال  
 کریں۔ انہوں نے کل ہی آجاتا تھا لیکن ہنگامی طور  
 پر ایک فوجی میں جانے کی وجہ سے وہ نہ آسکیں۔ صبح  
 پوچھتے ہی وہ ڈرائیور کے ساتھ چل پڑیں۔ ان کے  
 ہمراہ مارہ کی چھوٹی بہن سائرہ بھی تھی۔  
 ان کا بدستہ ایبٹ آباد، وادی نلیم کشمیر جانے کا

تھا۔ دوسری کمپنیوں سے بھی یاد دہانی کروائی جا رہی تھی  
 کہ سامان وقت پر پہنچا ہے۔ اورنگ زیب تائی نے بغیر  
 سوچے سمجھے ہر چھوٹی بڑی کمپنی سے جو آرڈر لیے تھے وہ  
 اب شاہ زیب کے گلے کا پھندا بننے جا رہے تھے۔ وہ  
 کچھ دن کے لیے خود کو کاروباری معاملات سے الگ  
 کرنا چاہ رہا تھا۔ تائی اورنگ زیب نے کہا کہ کچھ دن کے  
 لیے گھوم پھر آؤ۔ پیچھے میں تمام کام دیکھ لوں گا۔ وہ خوش  
 ہو گیا۔ بوجھ سر سے اتارنا محسوس ہوا۔ اتنے دن بعد وہ  
 کھل کے خوش ہوا تھا۔ گھر آیا تو مارہ غائب تھی وہ کلب  
 گئی ہوئی تھی۔ اسے غصہ سا آ گیا۔ بڑے سکون سے  
 اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

باہر پورج میں گاڑی رکھنے کی آواز آئی تو شاہ  
 زیب نے بیدار کی کھڑکی سے پردہ اٹھا کر دیکھا۔  
 مارہ چابی جھلاتی گاڑی سے اتری اور تک تک کرتی  
 قدم اٹھانے لگی۔ شاہ زیب آکر بیٹھ گیا۔ مارہ نے  
 دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر چونک گئی۔

”آج آپ جلدی آگئے۔“ وہ پرس  
 صوفے پر پھینک کر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

”ہاں، آج ریلیس کرنے کا موڈ تھا سو آ گیا  
 گھر۔۔۔ کچھ گھومنے پھرنے کا دل کر رہا ہے تم سے وعدہ  
 کیا تھا پہلے تمہیں پورے پاکستان کے قابل دید  
 مقامات دکھاؤں گا، شمالی علاقہ جات سے کر جاؤں گا  
 اس کے بعد لاٹویا اور اٹلی چلیں گے۔ میں نے تائی سے  
 کہہ دیا ہے۔“

”بائے جی شاہ زیب۔۔۔“ مارہ اٹھ کر اس کے  
 گلے لگ گئی۔

”ہاں تم کل سے تیاریاں شروع کر دو، ہم جلد ہی  
 جائیں گے۔“ شاہ زیب کے لبوں پر مسکراہٹ چمکنے  
 لگی۔ وہ آرام سے پروگرام سیٹ کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

مارہ کپڑے اور دیگر تمام چیزیں رکھ چکی تھی۔  
 شاہ زیب، پاپا کی طرف گیا تھا یہ بتاتے کہ ہم گھومنے  
 پھرنے جا رہے ہیں۔ مارہ نے پکینگ کا کہہ کر اس کے

پر وگرام تھا۔ اگرچہ شاہ زیب اپنے دوستوں کے ساتھ پہلے بھی سیر کرنے آچکا تھا مگر اب مائرہ کے ہمراہ سفر اسے بہت زیادہ دلکش لگ رہا تھا۔

☆☆☆

بنی داماد کی غیر موجودگی میں شیریں نے پورے گھر کا ناقہ اندازہ جائزہ لیا اور پھر راز دارانہ انداز میں اپنے شوہر اور نگزیب سے اس گھر کی مالیت کی بابت پوچھنے لگیں۔

”مجھے تو نہیں پتا کہ اس کی درست مالیت کتنی ہے مگر تین کروڑ سے زیادہ کا ہوگا۔“ انہوں نے اندازے سے بتایا تو شیریں کی آنکھیں چپکنے لگیں۔

”عمر بھائی نے شاہ زیب کا حصہ تو اسے دے دیا ہے مگر بنی کے معاملے میں پراسرار خاموشی اختیار کر رکھی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟“

”مجھے کیا پتا..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بتانا نہ چاہ رہا ہو۔“

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ عمر بھائی نے بنی کو بیٹے سے زیادہ حصہ دیا ہو اس لیے خاموش ہوں۔“ شیریں دور کی کوڑی لائی تھی۔ واقعی بات قابل غور تھی وہ اس طرف سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

”اگر ایسی بات ہوئی تو اچھا نہ ہوگا۔“ شیریں جانے کیوں اس قدر اچھل رہی تھیں اور نگزیب بھی اس معاملے پر سوچ رہے تھے کہ عمر نے بیٹے کو جو دینا دلانا تھا دے دیا مگر ورنہ پکا کا حصہ کتنا تھا اس بارے میں ان کی خاموشی معنی خیز تھی۔ اس کے پیچھے جانے کیا مصلحت اور راز تھا۔ جس کا جاننا اب اور نگزیب کے لیے از حد ضروری تھا۔ عمر زیب سے مل کر پوچھا جاسکتا تھا کیونکہ وہ اب اس پوزیشن میں تھے کہ یہ سوال کر سکتے تھے۔

شاہ زیب نے اپنے کاروبار کے عملی معاملات ان کے حوالے کر دیے تھے اور اپنی اس کامیابی پر وہ پھولے نہیں مار رہے تھے۔ برسوں پہلے جب عمر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ شہر شفٹ ہونے کی تیاری کر رہا تھا تو عائدہ کے چھوڑے گئے اثاثوں کی تفصیل جان کے ان

کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش اس میں ان کا حصہ بھی ہو۔ اس وقت یہ ناممکن ہی خواہش تھی پھر برسوں بعد یہ خواہش عجیب طرح پوری ہوئی۔ مائرہ ان کی بیٹی عمر زیب کی بہو بنی اور اس نے اپنے بیٹے کو اس کا حصہ خوشی، خوشی جیتے دی دیا۔ اب یہ مائرہ کے نام کیسے کروانا تھا انہیں سوچنا تھا۔ شاہ زیب ویسے بھی ان کی نگاہ میں جذباتی اور قدرے نان پر کینیکل نوجوان تھا۔ ایسے نوجوان پہ مالی معاملات میں زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا..... وہ سادہ دل تھا ہر ایک پہ امداد اعتبار کرنے والا۔ میسرل کی خریداری کی ذمہ داری ان کے حوالے کر کے اس نے روپے پیسے کی کوئی تفصیل ان سے نہیں مانگی تھی۔ یہ رویہ مستقبل میں بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا ان کی بیٹی کے حق میں..... اس طرح تو کوئی بھی اسے مالی خسارے سے دوچار کر سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مائرہ کو کل کھاں اس وجہ سے کوئی پریشانی ہو اس لیے شاہ زیب اپنی جائیداد میں سے کچھ بیوی کے نام کر دیتا تو اس کا مستقبل محفوظ رہ سکتا تھا۔ اپنے تئیں وہ بہت دور کی کوڑی لائے تھے۔

☆☆☆

وادئی میں موسم بہت ابر آلود تھا۔ وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی اس وجہ سے شاہ زیب اور مائرہ زیادہ محسوس پھر نہیں سکے۔ ہوٹل تک ہی محدود رہے۔ سردی کی شدت بارش کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں ویسے بھی سارا سال موسم بہت اچھا ہی رہتا اور زیادہ تر ٹھنڈ ہوتی۔ اسی وجہ سے شاہ زیب کو یہ جگہ بہت پسند تھی وہ کتنی بار یہاں آچکا تھا۔ مائرہ کے ساتھ پہلی بار یہاں آیا تھا تو یہ وادئی اس کے دل فریب نظارے، گنگنا شورشور مچاتا دریا، نیکم آنکھوں کو تازگی بخشتا سبزہ، فلک بوس پہاڑ سب کچھ ہی تو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس جگہ کا اپنا حسن اور خوب صورتی تھی۔ اس کی رومانوی حس جاگ اُٹھی تھی۔ پر مائرہ جانے کیوں جھنجھلائی ہوئی سی تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر بیزاری ہی بیزاری تھی۔ شاہ زیب آتش دان کے پاس



### سالگرہ میں اور تم

اس سالگرہ پر دل  
بہت اداس ہے جاناں  
کچھ اچھا نہیں لگتا تیرے بنا  
آنکھوں میں کا جل لگاؤں کس کے لیے  
بالوں میں گجرے سجاؤں کس کے لیے  
نجی سنورتی تو تمہارے لیے ہوں  
تم اس سالگرہ پر جو آ جاتے  
اور ایک دم سے آ کر یہ کہہ دیتے  
پتی برتھ ڈے نو یو  
پتی برتھ ڈے نو یو

کلام: فریدہ فری، لاہور

ادوصاف پائے جاتے ہیں بے شاہ زیب کی آنکھوں میں  
اس وقت کیسا ملال تھا۔ جسے مارہ پڑھ ہی نہیں پائی۔  
”بساط کو دیکھ لیں، وہ کیسا رعب دار، ایک مہمل  
مرد ہے۔ خالہ میرا رشتہ ماگ رہی تھیں پر امی ابو عمر چچا کو  
زبان دے چکے تھے ورنہ آج حالات کچھ اور  
ہوتے۔۔۔۔۔“ مارہ اس کی حالت سے بے خبر جانے کیا،  
کیا بول رہی تھی۔ شاہ زیب پیچھے ہٹا بیڈ کے پاس  
پڑے اپنے جوتے اٹھائے پہلے جرابیں پاؤں  
میں چڑھا میں پھر جوتے پہنے۔۔۔۔۔ سائنڈ فیکل پر پڑی  
گاڑی کی چابی اٹھائی۔ صرف ایک ٹاپے کے لیے مارہ  
کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل  
پر تھا۔ اگلے ہی لمبے وہ نرم گرم کمرے کی پناہ سے باہر  
تھا۔ غصہ اڑنے والی لہو کو سرد کر دینے والی ٹھنڈک تھی۔  
ہوٹل کے ساتھ ہی ایک خالی قطعہ زمین کو پارکنگ کی  
شکل دی گئی تھی۔ اس کی گاڑی ادھر ہی پارک تھی۔ شاہ  
زیب کے ذہن میں اس وقت کچھ نہیں تھا۔ سمجھ ہی  
نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ گاڑی نکال کر  
دھڑلوان سڑک پر لایا، اتنے میں پیچھے سے ہوٹل کے اسٹاف  
میں سے ایک شخص نے دیکھا تو اس کے پیچھے بھاگا۔۔۔۔۔  
اسے منع کرنے کے اس وقت اس موسم میں ذرا سوج

بیٹھا تھا۔ مارہ کھل اوڑھے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ باہر پانچ  
بجے ہی رات اتر آئی تھی اور بارش تو اتر سے ہو رہی تھی۔  
شاہ زیب کی نگاہوں میں خمار اور مستی اتر آئی۔ وہ آتش  
دان کے پاس سے اٹھ کے مارہ کے پاس آیا تو اس نے  
شاہ زیب کا بازو جھٹک دیا۔ وہ اسے محبوب بیوی کا ادا  
سمجھا اور پیار سے اس پہ جھکا تو اس نے اس بار شاہ زیب  
کو پیچھے کی طرف ہٹا دیا۔

”سوٹ ہارٹ کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے  
ناں تمہاری بے شاہ زیب کے لہجے میں محبت کی ساری  
نرمانہیں بول رہی تھیں۔ مارہ کو اور بھی غصہ آ گیا۔ شاہ  
زیب میں تو جیسے مردانہ انا موجود ہی نہیں تھی، کیسے وہ  
اس کی انا کو اپنے پاؤں تلے روندتی اور وہ ہنستا چلا جاتا  
اس کی منتیں کرتا، مناتا، بچوں کی طرح راضی کرتا۔

”میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے، مجھے کیا ہوا  
ہے۔ میں اس وقت اکیلے رہتا چاہتی ہوں۔“ جانے  
کیوں آج کل اس پرستی اور بیزار ہی طاری تھی۔ ٹھک  
بھی جلدی جاتی۔ شاہ زیب کی جراثیم کا سامنا کرتا  
اس کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔ تب ہی اس وقت  
اسے غصہ آ گیا تھا۔ جواباً شاہ زیب اسے منانے لگا۔  
اسی حساب سے مارہ کا غصہ مزید بڑھنے لگا۔

”پلیز شاہ زیب مجھے عورتوں والی عادات لیے مرد  
اچھے نہیں لگتے۔۔۔۔۔ پلیز اپنے اندر رعب و مردانگی پیدا  
کریں۔ جیسے اور عورتوں کے شوہروں میں یہ وصف پایا  
جاتا ہے۔“ مارہ کے لہجے میں از حد سختی اور درخشندگی تھی۔

”تو تمہارے خیال میں مجھ میں مردانگی نہیں  
ہے؟“ شاہ زیب کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

”نہیں ہے، نہیں ہے مردانگی تب ہی تو کہا ہے  
کہ خود میں پیدا کریں۔ مرد میں ایک انا، ایک رعب  
اور عزت نفس ہونی چاہیے۔“

”تو مجھ میں مردانگی اور انا کے ساتھ ساتھ عزت  
نفس بھی نہیں ہے؟“ شاہ زیب کو عجیب سا لگا۔

”ہاں نہیں۔“ وہ لمبی نگاہ کی طرح رہی تھی۔  
”تو بتاؤ مجھے بھلا کس طرح کے مردوں میں یہ

کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ وہ تیزی سے بھاگا اپنی جھونک میں گرا تو درو سے کراہ کر رہ گیا۔ اب اسے اپنی فرتحی شاہ زیب کا خیال بھول گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہ کافی آگے آ گیا تھا۔ چلی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ گھپ اندھیرا تھا گاڑی کی ہینڈ لائٹس کی روشنی بھی اس موسم میں تا کافی ثابت ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کی نگاہیں غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں اور کانوں میں مارہ کی آواز گونج رہی تھی۔

”پلیز اپنے اندر مردانگی پیدا کریں۔ باسط کو دیکھ لیں وہ ایک مکمل مرد ہے۔ مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ خالہ میرا رشتہ مانگ رہی تھیں پر امی، ابو عمر چچا کو زبان دے چکے تھے ورنہ آج حالات کچھ اور ہوتے۔“ ”آف شاہ زیب کے لیے ان آوازوں سے چھپا چیز انا ناممکن تھا۔ مارہ، باسط کو ایک مکمل مرد قرار دے رہی تھی۔ اس کی جرأت ایسے کیسے ہوئی۔ کیا وہ باسط کے ساتھ اپنے شوہر کا موازنہ کر رہی تھی؟ گویا باسط مردانگی میں شاہ زیب سے بازی لے گیا تھا۔ اس کی محبوب بیوی جسے شاہ زیب نے شادی کے بعد بھی محبوبہ کے رتبے پر فائز کر رکھا تھا اس باسط کے اپنے کزن کے اس کے سامنے یعنی اپنے شوہر کے سامنے مردانہ اوصاف گنوا رہی تھی۔ ”ایسا کیوں تھا، کیا مارہ اس سے ناخوش تھی؟“ یہ ایسا روح فرسا سوال تھا کہ شاہ زیب کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ وہ خود سے ایک ہی سوال کر رہا تھا۔

”کیا مجھ میں کوئی کمی ہے؟“ مارہ جس طرح لڑائی کے موڈ میں بھری بیٹھی تھی شاہ زیب اس سے بچنے اور دل و دماغ میں کمی آگ سرد کرنے کے لیے منظر سے ہٹا تھا۔ کیونکہ مارہ لڑائی کے موڈ میں ہوتی تو بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی تھی۔ ہمیشہ وہ ہی خاموش ہوا تھا۔ اس بار بھی اس نے ہار مان لی تھی اور وہاں سے اٹھ آیا۔ مارہ تب بھی اونچا، اونچا بول رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی شاہ زیب سے نہیں پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو، مت جاؤ، موسم بہت خراب ہے، ایسے موسم میں یہاں خطرناک حادثے رونما ہونا عام سی بات تھی۔

پر مارہ کو شاہ زیب کی پروا ہوتی تو تب ناں..... اس نے تو اپنی ساری نفرت اور کڑواہٹ اس پر انڈیل دی تھی۔ یہ خیال کیے بغیر کہ شاہ زیب یہ کیا کر رہی ہے یا اس پر آئندہ آنے والے وقت میں کیا کرے گی۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ شاہ زیب بغیر سوچے کچھ گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اسے اس وقت کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔

اس کا سارا وجود گویا سماعت بنا ہوا تھا۔ اور ایک ایک عضو مارہ کی آواز جیسے سن رہا تھا۔ اب تو بارش، پہاڑ اور ان پر چھایا اندھیرا شور مچا تا دریا کے غلیم بھی اس سے یہی سرگوشیاں کر رہا تھا کہ ”پلیز خود میں مردانگی پیدا کرو۔ باسط تم سے مردانگی میں بڑھ کر ہے۔ تم میں مردانگی اور عزت نفس کی کمی ہے۔ باہا ہا..... شاہ زیب تم میں مردانگی کی کمی ہے۔ مردانگی کی کمی ہے اور ساتھ غیرت کی بھی کمی ہے۔ اگر تم میں غیرت کی کمی نہ ہوتی تو آج تمہاری محبوب بیوی تمہارے سامنے یعنی اپنے شوہر کے سامنے ایک غیر مرد کی تعریف نہ کرتی اور تعریف کی بھی تو مردانگی کی۔“ شاہ زیب کو یوں لگ رہا تھا اس وادی کی ہر چیز اس کا مذاق اڑا رہی ہے اس پر طنز کر رہی ہے۔ اسے بے غیرتی کا طعنہ دے رہی ہے۔ ”میں بے غیرت نہیں ہوں۔ ہے۔ ہے مجھ میں غیرت۔“ اس کے ہاتھ سے اسٹیرنگ ویل پھسل گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کمی آگئی تھی۔ سخت سردی میں شاہ زیب کا سارا وجود پسینہ اگل رہا تھا نمی تو اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔

”میں بے غیرت نہیں ہوں، نہیں ہوں بے غیرت، میں مکمل مرد ہوں۔“ اس نے ہانگوں کی طرح چیخ کر پوری قوت سے کہا۔ غصے کے عالم میں اسٹیرنگ ویل اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ آنکھوں میں اچانک آنے والی نمی نے اسے عارضی طور پر سامنے کا منظر دیکھنے سے محروم کر دیا تھا۔

ہلا ہلا ہلا

مارہ کیسے اوڑھے حیرے سے لیٹی ہوئی تھی۔ شاہ

گاڑی کو یہاں نہ پا کر .... پریشانی حد سے سوا ہو گئی۔ اب وہ کمرے کو آیا کرے۔

”میڈم آپ کچھ دیر اور دیکھ لیں ہو سکتا ہے آپ کے شوہر واپس آجائیں۔“ ہوٹل کے اوپریئر منیجر نے اسے تسلی دی۔ پر دوسرے مارہ کے دل و دماغ میں پنچے گاڑھ کر بیٹھ چکے تھے۔ وہ جا کے ہوٹل کی لابی میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رست وارج پر ٹائم دیکھتی کچھ دور لوگ بھی آکر شاہ زیب کے بارے میں معلوم کر رہے تھے کہ آپ کے شوہر واپس آئے نہ نہیں ہوٹل میں مقیم اکثر مسافروں کو معلوم ہو چکا تھا۔ منیجر خود اسے کتنی بارتسلی دے چکا تھا۔ جوں جوں گھڑی کی سوئیاں آگے کی طرف جارہی تھیں۔ مارہ کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آج تک شاہ زیب اس صرح ناراض نہیں ہوا تھا بلکہ وہ تو اس سے ناراض ہوتا ہی نہیں تھا۔ اپنی غلطی ہوتی یا نہ ہوتی ہمیشہ مارہ کو وہی راضی کرتا۔ لڑائی کی ابتدا ہمیشہ مارہ کی طرف سے ہوتی۔ وہ ہنس، ہنس کر اس کی کڑوی سیلی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا۔ اور اس طرح ناراض ہو کر وہ کہیں جاتا بھی نہیں تھا۔ اور یہاں گھر سے دور ایک اجنبی جگہ پر وہ اسے اکیلا چھوڑ کر غائب تھا اس لیے وہ بہت پریشان تھی۔ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہوٹل میں رات کا کھانا سرو ہو چکا تھا۔ مارہ سے مزید انتظار برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پھر ریسپشن کی طرف چلی آئی۔

”میرے ہر مینڈ ابھی تک نہیں واپس نہیں آئے ہیں، منیجر سے کہیں کچھ کریں۔“ وہ رو ہانسی ہو رہی تھی۔ کچھ مرد اسے ترس آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ سب کو پتا تھا کہ اس لڑکی کا شوہر دو گھنٹے سے گاڑی لے کر غائب ہے۔ وقتاً فوقتاً سب نے ہی ہمدردی جتائی تھی۔ منیجر پہ نفس نفیس اس کے پاس خود چل کر آیا۔

”میڈم مجھے لگتا ہے کہ خدا انھو استہ آپ کے شوہر کسی حادثے کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ ہم کچھ لوگوں کو ان کی تلاش میں روانہ کر رہے ہیں۔ آپ فکر مت کریں۔ انشاء اللہ وہ واپس آجائیں گے۔“ منیجر نے

زیب کو گئے ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو رہا تھا۔ اس کی واپسی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے کہیں پرے پھینکا۔ جوتے پہنے اور کمرے سے باہر نکلی۔ .... چاہے نہیں وہ کہاں تھا۔ مارہ کا خیال تھا شاید ہوٹل میں ہی کہیں بیٹھا ہو۔ چھوٹا سا ہوٹل تھا اس نے ممکنہ جگہوں پر دیکھ لیا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ ریسپشن کی طرف آگئی کہ شاید وہاں سے کچھ معلومات مل جائے۔ پریشانی اب اس کے چہرے سے ہو رہی تھی۔ ریسپشن پر موجود لڑکا فوراً بھانپ گیا کہ کوئی بات ہے۔

”میرے ہر مینڈ ایک گھنٹے سے غائب ہیں ان کا کچھ پتا نہیں ہے۔ میں نے ہوٹل میں بھی دیکھ لیا ہے۔ وہ یہاں نہیں ہیں۔“

”وہ کہاں گئے ہیں کچھ بتایا نہیں؟“

”نہیں، اصل میں وہ کچھ غصے میں تھے اس لیے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے یہی سوچا کہ جب ان کا غصہ ختم ہوگا تو آجائیں گے مگر۔“ مارہ بولتے، بولتے چپ ہو گئی۔ اسنے میں کچھ اور لوگ بھی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان میں ہوٹل کے اسٹاف کا وہ آدمی بھی تھا جس نے شاہ زیب کو گاڑی لے جاتے دیکھا تھا۔ وہ یہاں ٹھہرنے والے مسافروں کو جانتا تھا کیونکہ چھوٹا سا ہوٹل تھا۔

”میڈم آپ کے شوہر نے براؤن کھر کی جیکٹ تو نہیں پہنی تھی؟“

”ہاں، ہاں یہی کھر تھا۔“ مارہ بے قراری سے بولی۔

”میں نے انہیں پارکنگ سے گاڑی نکال کر سڑک پر لے جاتا دیکھا تھا اور ان کے پیچھے بھاگا بھی کہ صاحب اس موسم میں ڈرائیونگ مت کریں۔ مجھے پتھر سے چوت لگی میں وہیں گر گیا اتنے میں گاڑی دور جا چکی تھی۔“ اس آدمی نے تفصیل سے بتایا اور جا کے ہوٹل کے منیجر کو بھی بلا لایا۔ وہ خود مارہ کے ساتھ پارکنگ لاسٹ تک گیا کہ دیکھے آیا ان کی گاڑی یہاں موجود ہے کہ نہیں۔ گاڑی یہاں ہوتی تو ملتی تاں۔



کسی اچھی خبر کے انتظار میں تھی۔  
 ”کچھ پتا چلا؟“ منیجر کو دیکھتے ہی وہ کھڑی ہو گئی۔

”نہیں ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ لگتا ہے کہ شاہ زیب صاحب کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔“ صاف جواب سن کر مارہ کے چہرے کے تاثرات رونے والے ہو گئے۔  
 ”لیکن فکر نہ کریں ہم صبح ہوتے ہی پھر سے تلاش کا کام شروع کریں گے۔ ابھی یہ کام ناممکن ہیں۔“ مارہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔

☆☆☆

عمر زیب بار بار دیوار گیر گھڑیال کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاہ زیب روزانہ ایک مخصوص وقت میں انہیں پل سی او سے فون کرتا تھا کیونکہ یہاں سگنلز نہیں ملتے تھے۔ منبر اس نے نوٹ کروا دیا تھا۔ انہوں نے دو بار خود کال کر کے شاہ زیب کا پوچھا مگر پل سی او کے مالک نے لائمی کا اظہار کیا۔ اس کے پاس روزانہ فون کرنے بہت سے لوگ آتے تھے وہ کس کس کو یاد رکھتا۔  
 دھلتی شام کے سائے اپنے پر پھیلا رہے تھے۔  
 عمر زیب انہ کے باہر کی طرف بڑھے تو ان کے سینے میں درد سا اٹھا۔ ایک عجیب سا کرب اور اضطراب ان کے پورے وجود پر طاری ہو چکا تھا۔ اپنی اس حالت کی سمجھ انہیں خود بھی نہیں آ رہی تھی۔ انہیں خود بخود ہی جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے کسی انہونی کا احساس دلایا تھا۔ درد و کرب میں ڈوبی آواز میں انہوں نے ڈریکٹا کو آواز دی۔ وہ دہل سی گئی۔ پپا نے بھی اسے اس طرح نہیں پکارا تھا۔

”جی پپا!“ وہ فوراً بھاگی بھاگی آئی۔ عمر زیب کا چہرہ تکلیف کی وجہ سے زرد سا ہو رہا تھا۔ جانے کیا بات تھی۔  
 ”پپا کیا ہوا ہے؟“ ڈریکٹا نے انہیں دونوں کندھوں سے تھام کر پاس پڑی کرسی پر بٹھایا اور پانی گلاس میں ڈال کر لے آئی۔

(باقی آئندہ)

اسے کھوکھلی تسلی دی۔ اپنی کئی بات کا اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ کیونکہ ہوٹل کے جس آدمی نے شاہ زیب کو گاڑی لے جاتے دیکھا تھا اس نے کہا تھا کہ صاحب بہت تیزی سے گاڑی لے کر گیا ہے۔

کچھ تجربے کار لوگ جو ان علاقوں سے اچھی طرح واقف تھے وہ شاہ زیب کی تلاش میں روانہ ہو گئے تھے۔ مارہ دعا کر رہی تھی کہ شاہ زیب نچیک ٹھاک اور خیریت سے ہو۔ گھر سے دور اس انہنی جگہ پر اسے اپنے اکیلے پن سے ڈر لگ رہا تھا۔ شاہ زیب کے ساتھ اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ کچھ عورتیں بھی جو اس کی طرح گھومنے پھرنے کی غرض سے آئی ہوئی تھیں۔ اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ اسے تسلی دلا سہ دینے لگیں۔  
 شاہ زیب کی تلاش میں گئے لوگ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ کافی دیر ہو گئی تھی۔ اب تو منبر خود بھی پریشان ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ کمردن کے دروازے بند ہونے لگے۔ ہوٹل میں مقیم لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ مارہ کے ساتھ اب صرف ایک ہی عورت تھی باقی انہ کے چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

امدادی پارٹی واپس آ گئی تھی۔ شاہ زیب کی تلاش میں انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ ایک تو رات تھی اوپر سے بارش۔ پھر خراب راستہ، گاڑی تو گاڑی پیدل چلنے والوں کے لیے بھی اس وقت باہر نکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا جو لوگ شاہ زیب کو ڈھونڈنے ... گئے تھے وہ برسوں سے ان علاقوں میں آباد تھے۔ یہاں کے چپے، چپے کے بارے میں جانتے تھے۔ انہوں نے ممکنہ جگہوں پر دیکھا تھا۔ نہ تو شاہ زیب اور نہ اس کی گاڑی کی جھلک نظر آئی تھی۔ سب کے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ شاہ زیب یقیناً کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔

انہوں نے واپس آکر ہوٹل کے منیجر کو اپنی ناکامی کی اطلاع دی۔ مایوسی ان سب کے چہرے پر صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ مارہ کے پاس آیا جو پریشانی سے



## قرضی

ناہیدہ فاطمہ حسنین

جب پہلی بار اس نے اس سے اظہارِ عشق کیا  
وہ فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ اس نے بتایا وہ اسے، اس  
وقت سے چاہتا چلا آ رہا ہے جب وہ کلاس سکسٹھ  
(6th) کا اسٹوڈنٹ تھا۔

یہ سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پٹ گئی  
تھیں۔ وہ ان کا ہمسایہ تھا۔ ”لوگ تو کہتے ہیں عشق  
اور محبت چھپائے نہیں چھپتے، اڑ کر پہنچتے ہیں پھر اس کی  
محبت کی خوشبو اس تک کیوں نہ پہنچی؟“ وہ سوچنے لگی۔





”ایسے نہ ہٹا کرو مجھے... کسی دن یہ آنکھیں میرا قتل کر ڈالیں گی۔“ روشو مسکرایا تو اس نے پھر سر جھکا لیا۔

”چلیں اب۔“ اس نے موبائل میں وقت دیکھا تو جیسے گڑبڑائی۔ روشو نے اپنی رسٹ وائچ میں وقت دیکھا۔

”ابھی تو پون گھنٹا باقی ہے۔ چلو کچھ کھاتے پیتے ہیں۔“ وہ اٹھ کر بائیک تک آیا وہ اس کے پیچھے تک آئی تو مگر بائیک تک پہنچ کر ٹھک گئی۔

”بھئی۔“ روشو نے بائیک اسٹارٹ کی۔

”مم... میں؟“ وہ گڑبڑائی۔ اصل میں تو وہ پرائیویٹ کنوینس سے کالج تک آئی تھی پھر قریبی پارک کے گیٹ پر روشو مل گیا تھا سو وہ واک کر کے یہاں تک پہنچی تھی۔ اب ریٹورنٹ تک جانے کے

نہیں۔ جب روح، جسم سے ناراض ہو جاتی ہے تو اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے پھر وہ بے حس و حرکت وجود کسی کام کا نہیں رہتا۔ مٹی میں مل کر حشرات الارض کا رزق بن جاتا ہے اور میں تم سے ناراض ہو کر اپنا وجود نہیں کھو چاہتا۔“

سارہ نے اسے پھر غیر یقینی انداز میں دیکھا۔ یہ بات ابھی اس کے تجربے میں نہیں آئی تھی کہ لڑکا عشق کے ابتدائی مراحل میں ناراض نہیں ہوتا بلکہ ناراض محبوبہ کو منانے کے تمام گر جانتا ہے۔ لڑکے کی ناراضی تو محبت کی ساری منازل طے کرینے کے بعد وجود میں آتی ہے۔

”بولو ناں... تم نے کیا پڑھا تھا؟“

”میں نے پڑھا تھا...“ اس نے ایک لمحے کو روشو کو تنکا پھر سر جھکا کر اپنی رنگ کو انگلی میں خواہ مخواہ گھمانے لگی۔ ”میں نے پڑھا تھا... مرد کی محبت ساحل کی لہر جیسی ہوتی ہے جس تیزی سے بڑھتی ہے اسی تیزی سے واپس پیچھے بھی پلٹ جاتی ہے اور عورت کی محبت سمندر کے سینے کے تپوں بچ اٹھتا بھنور ہے جس میں دائرے بنتے رہتے ہیں۔ عورت اس بھنور سے کبھی باہر نہیں نکل پاتی۔“ اتنا کہہ کر وہ چپ ہو رہی۔

”ہونہ... افسانوی باتیں۔“ اس کا منہ کڑوا ہو گیا تھا۔ ”ایسے افسانے لکھنے والی بھی عورتیں ہی ہوتی ہیں انہوں نے ہی عورت کا مقدمہ لڑتا ہے پھر خود ہی اسے جتوا بھی دینا ہے۔ نہ پڑھا کرو افسانے۔“ وہ لمحے بھر کو رکا۔ ”زندگی افسانوں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔“

”مگر افسانوں میں وہی کچھ لکھا جاتا ہے جو زندگی میں ہو رہا ہو۔“

”ہاں۔“ اس نے ہاں کو خوب لمبا کھینچا۔ ”مگر اس میں کافی کچھ cosmic ہوتا ہے۔“ اس نے اپنی گھنیری پٹلیں جھپک، جھپک کر روشو کو تنکا۔

سلامی اعوان

عراق اشک بارہیں ہم

زندگی اور موت کے درمیان ایک ہولناک سفر

عراق کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ قابل فخر اسلامی کرداروں کی درخشاں روداد

القاعدہ وہاں کیا کر رہی ہے

بغداد کی الف لیلوی کہانیاں اور بہت کچھ

الفیصل پبلی کیشنز لاہور

042-37230777 سے طلب کریں

لیے اس کی بایک پر جانا تھا۔ کہانی کے اس سین کا تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔

”مم..... میں..... نہیں تو کیا میں؟“ روشو نے اس کی نقل اتاری۔

”اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟“ وہ شش دہچ میں مبتلا تھی۔

”زیادہ دماغ پر بوجھ نہ ڈالا کرو مت اتنا سوچا کرو۔ سوچیں بھولی بھلیوں میں الجھا کر منزل سے بھٹکا دیتی ہیں۔ چلو بیٹھو۔“ اس نے کھڑے، کھڑے بایک کو ریس دی۔ وہ گھبرا کر جلدی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ بایک ہوا میں اڑ رہی تھی اس نے روشو کی پشت سے اپنا سر لگا کر خود کو چھپانے کی پوری سعی کی ہوئی تھی۔

یہ پوری زندگی کی پہلی چوری تھی۔ ایک چوری کے بعد قدم خود بخود بے باک ہو جاتے ہیں پھر پوری زندگی چوری کرتے گزر جاتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس چوری پر ندامت نہیں رہتی۔ سر جھکا نہیں رہتا، نظریں شرمندہ نہیں ہوتیں۔ دل کی دھڑکنوں کا رد ہم بے ترتیب نہیں ہوتا۔ زبان اور ہونٹ بار بار خشک نہیں ہوتے، ماتھا عرق آلود نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونے جا رہا تھا۔

☆☆☆

زندگی ریسٹورانوں اور فون کالز سے نکل کر مختلف پبلک پلیسز اور دوستوں کی شادیوں کے بہانوں تک پہنچ گئی مگر اس دوران روشو بے باک نہیں ہوا۔ ”پاگل، تم بوڑھی بھی ہو جاؤ گی تو میں تمہیں اسی شدت سے پیار کرتا رہوں گا۔“ وہ اکثر کہتا۔

ایک بار اس نے ریسٹورنٹ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا تھا۔ وہ لرز گئی تھی۔ دنوں دل کی دھڑکن بے ترتیب رہی۔ وہ خفا ہو گئی تھی مگر پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ روشو کا اس کے ہاتھ کو پکڑنا، بال سنوار دینا، کندھے پر سر رکھ لینا کچھ بھی برا نہیں لگا کرتا۔ یہ زندگی

کا اصول ہے کہ جب ہم زندگی کے زینے پر پہلا قدم رکھتے ہیں تو اگلا قدم اس سے اوپر رکھنا ہماری مجبوری ہماری خواہش، ہماری ضرورت بن جاتا ہے۔

سارہ بی ایس سی فائنل میں تھی اور روشو برسرِ روزگار۔ اس نے گھر والوں کو مجبور کر کے رشتہ بھجوا دیا۔ سارہ کے گھر والے بھی اس رشتے پر آمادہ نہ تھے روشو ان کی نظر میں محض ایک عام سا بڑا دی تھا جس کی کوئی قدر نہ تھی مگر جب اسی نے سارہ کی آنکھوں میں روشو کے نام کے جگنو ٹمٹماتے دیکھے تو اس ہونے والی شادی کو اور بیچ کرنے کا فیصلہ کر کے بابا کو راضی کر لیا۔ وہ بہت سنجھی ہوئی دورانِ دلش خاتون تھیں۔

منگنی کر دی گئی۔ اب روشو دھڑلے سے ان کے گھر آنے جانے لگا۔ کسی نہ کسی ضروری چیز کی خریداری کے بہانے، گھومنے پھرنے بھی جانے لگا۔ ”دیکھو میرے آنچل اور بابا کی پکڑی کی لاج رکھنا۔“ اسی سے بہت سمجھا کر بچتیں۔ وہ امی کو اس طرح بکتی کہ امی مطمئن ہو جاتیں۔ اس میں کوئی دو رائے بھی نہ تھی کہ اس نے روشو کو غلطی کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، وہ جانتی تھی کہ زندگی کی بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جس میں کسی معافی تائے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جو کبھی صحیح نہیں ہو سکتیں۔ تاہم آنچل کا داغ بن کر غلطی ہی رہتی ہیں۔

☆☆☆

”روشو اگر میری امی راضی نہ ہوتیں اور ہم کبھی ایک دوسرے کے نہیں ہو پاتے...؟“ ایک روز اس نے پوچھ ہی لیا۔

”تو کیا..... پھر بھی میں تمہیں چاہتا رہتا۔ یہاں تک کہ تم بوڑھی ہو جاتیں۔ میری چاہت میں کوئی کمی نہ آتی۔“ وہ اسے ایک تک دیکھے چلی گئی اس کی آنکھوں کی چمک اس کی صداقت کی گواہی تھی۔ ”ساحل کی لہر..... اور سمندر کے سینے کے

بانیک پر بیٹھ گئی۔ بانیک نے ابھی اسپینڈ بھی نہ پکڑی تھی کہ وہ دھواں دھار روئے بیٹھ گئی۔

”تم اتنے بے وفا ہو، اتنے ہرجائی۔۔۔ تم نے میرے بنایہ زمانہ کیسے جی لیا؟“ وہ بس رورہی تھی۔

”کیا زمانہ۔۔۔ کتنے دن۔۔۔ کتنے برس گزر گئے؟“ وہ منے چلا گیا۔ ”میں سب کچھ ہو سکتا ہوں مگر بے وفایا ہر جائی نہیں۔“ وہ شوخی میں بانیک کو زنگ

زنگ چلانے لگا۔

”روشو کے بچے۔۔۔۔۔۔“ اس نے اس کی پیٹھ پر دھموکا لگا کر نوحہ۔ ”گر جاؤں گی میں۔“

”نہیں گرتیں۔“ وہ ہنسا۔ ”روشو کے بچے تو اب ہوں گے۔“ وہ ہنستا چلا گیا۔

”اتنے ناراض کیوں تھے؟“

”شی۔“ اس نے انگشت شہادت اپنے لبوں پر رکھی۔ ”تم جانتی ہوں ناں مجھے ایک ہی بات بار بار دہرائی

کتنا برا لگتا ہے اور بحث کرتا۔۔۔ بحث تو میری جڑ ہے۔ سولیووس ٹاپک۔“ اور وہ اسی لمحے چپ ہو گئی۔

روشو کی فیملی شفٹ ہو گئی۔ اس کی روٹین نہ بدلی وہ روز گنڈ مارنگ نو گنڈ ٹائٹ درجنوں میسجز

کرتی۔ روشو کا کبھی کبھار جواب آ جاتا ورنہ وہ بھی نہیں۔ رفتہ رفتہ روشو کی لمبی کالز مختصر ہوتے، ہوتے

بالکل ہی ختم ہو گئیں۔ اب روشو کے بجائے وہ فون کرتی تو روشو آدھا گھٹنا بہ مشکل بات کرتا اس آدھے

گھٹنے میں بھی کئی، کئی بار اسے ہولڈ کر داتا۔ وہ روہا سی ہو جاتی، شکایت کرتی تو وہ بہت تحمل سے کہتا۔

”سارہ یاد رکھو میں تمہارا ہی ہوں اپنی آخری سانس تک۔ میں کبھی کسی کا نہیں ہو سکتا۔ میں جاب

میں کافی مصروف ہو گیا ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں تمہیں بھول گیا یا تم سے بے پروا ہو گیا

ہوں۔ تمہارا خیال سایہ بنا مجھ سے جڑا ہوا ہے۔“ مرد کی سچی جھوٹی ہر تسلی کو عورت سچ ہی مان لیتی ہے اس

بچوں بچ بھنور۔“ اسے یاد آ گیا مگر اب اس اعتبار اس کی اہمیت اس کی نظروں میں نہیں رہی تھی۔

”لکھا جانے والا ہر جملہ سچ نہیں ہوتا۔“ اس نے دل کو ہلکی، ہلکی تھپکی دی۔

☆ ☆ ☆

مستثنیٰ کا دورانیہ بڑھتا چلا گیا امی، بیٹی کی ماں تھیں سو فکر مند رہنے لگیں۔ اس نے روشو سے کہا تو

روشو نے اسے اصل سبب بتایا کہ عنقریب وہ نوگ۔ یہ محلہ چھوڑ کر کسی اچھی جگہ شفٹ ہو رہے ہیں۔ اس کا

دل ہولنے لگا۔ اس نے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا تو روشو نے بہت مضبوط لہجے میں کہا۔

”مجھ پر بھروسہ رکھو۔“

”محبت کرنے والے بھروسے سے زیادہ دوسروں میں جتنا رہتے ہیں۔“ وہ رو پڑی۔

”پاکل ہو تم تو ہر وقت نیکیوں ہی سوچتی ہو۔“ وہ پہلی بار غصہ ہوا تھا اور انھیں کر چلا بھی گیا تھا۔

پھر تین دن تک نہ اس نے اپنی شکل دکھائی نہ سچ نہ فون کیے۔ یہ تین بے چین دیے تاب دن جو

اس کی زندگی کی کتاب میں پہلی بار رقم ہوئے تھے، اس نے انگاروں پر لوٹ کر گزارے۔ وہ صرف

روتی تھی میسجز کرتی جس کا کوئی رپلائی نہ آتا۔ فون کرتی جو اینڈ ہی نہ ہوتا۔ وہ جان گئی تھی یا تو روشو نے

اپنا سیل فون سائلٹ پر لگا دیا ہے یا اس کا نمبر اسکرینڈ مینج میں ڈال دیا ہے یا فون میں کوئی سسٹم لگا دیا ہے

اور یہ کسی طور ممکن نہ تھا کہ وہ ہر تھوڑی دیر بعد دروازہ کھول کر اس سمت دیکھے جہاں روشو کا گھر تھا۔ ان

تین دنوں میں وہ سیکڑوں فون کالز کر چکی تھی اور اتنے ہی میسجز اسے سینڈ کر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

ایک روز وہ کالج سے نکلی تو سامنے روشو بانیک لیے کھڑا تھا۔ وہ تو چکرا اسی گئی۔ روشو نے آنکھوں کے اشاروں سے اسے بلایا وہ آنا فنا بھاگتی ہوئی آ کر



نے بھی اسے سچا جانا اور سر جھکا دیا۔

☆☆☆

”روشو کے گھر والے تو کوئی سن گن ہی نہیں لے رہے۔ ہم کب تک بیٹی کو بیٹھائیں اب اس کا فائل ایئر بھی آپہنچا ہے۔“ امی نے بابا پر اپنی تشویش ٹکاہری۔

”تم بات کرو۔“ بابا کے کہنے پر پہلے تو امی چپ ہو گئیں پھر بہت دھیرے سے بولیں۔

”یہ مجھ سے نہ ہوگا بیٹی کی ماں ہوں لاچ آتی ہے۔“ اس نے روشو سے کہا تو روشو نے گھر والوں پر زور ڈالا۔ ان کا فون آیا کہ ہم اگلے بیٹے شادی کی تاریخ لینے آرہے ہیں۔ امی کو پتا ہی نہ چلا ان کی مشکل سارہ نے حل کی ہے۔ امی بہت خوش ہو گئیں حالانکہ سارہ اور روشو جانتے تھے یہ زبردستی کا سودا ہے۔

عین اس دن جب روشو کی فیملی کو تاریخ لینے آتا تھا روشو کی خالہ کا انتقال ہو گیا۔ یوں تاریخ پھر آگے چلی گئی۔ سعد صیانی کے تاتے سارہ کے والدین اور وہ بھی خالہ کے گھر تعزیت کو گئے۔ روشو کی فیملی کے ساتھ، ساتھ ان کے پورے خاندان نے سارہ کے والدین کو بہت عزت و احترام دیا لیکن سارہ کے آنے کو کسی نے پسند نہ کیا۔

اب ان کی شادی کا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا کم از کم چالیسویں تک تو۔

اب وہ جب بھی روشو کو فون کرتی وہ ہوں ہاں تک محدود رہتا۔ سارہ نے ڈرتے ڈرتے شکایت کی تو روشو نے تسلی دی۔

”دیکھو سارہ بچہ نہ بنو۔ میری اکلوتی خالہ تھیں خالو کا پہلے انتقال ہو چکا ہے اب ان کی اکلوتی جوان بیٹی ہے، اس کا مسئلہ ہے وہ اکیلی رہ گئی ہے اسے ہم گھر لے آئے ہیں۔“ اتنا سنتے ہی اس کا دل صلق میں آ رہا روشو پھر بولا۔

”اس کا نکاح ہو چکا ہے ہم پہلے اس کی رخصتی

کریں گے۔“ باقی کا جملہ سن کر اس کی جان میں جان آئی۔ ”اور بھی دوسرے مسائل ہیں۔ میں بہت الجھا ہوا ہوں ہمارا پورا گھر ڈسٹرب ہے تم زیادہ خود غرض نہ بنو اور اپنی امی کو بھی بولو۔۔۔۔۔ وہ چپ کر کے بیٹھیں۔“ روشو نے یہ سب باتیں اس طرح میں کہ وہ خود شرمندہ ہو گئی۔

☆☆☆

زندگی کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ کب کس طرح کروٹ بدل لے۔ کون سا رخ اختیار کر لے۔ کس سمت گھوم جائے۔ کون سا چہرہ دکھا دے کس کو داخل کرے، کس کو خارج کر دے۔ کسی کو کچھ نہیں پتا چلتا۔ وہ گھر بیٹھی فائل ایئر کے رزٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ امی کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ روشو کی ماں اچانک اپنا اطلاع آ گئیں۔ وہ سمجھ تو گئی کہ روشو نے بھیجا ہوگا مگر اسے حیرت تھی کہ روشو نے اسے قبل از وقت کیوں نہ بتایا حالانکہ تین دن قبل اس نے روشو کو فون کیا تو خیر خیریت کے فوراً بعد روشو نے کہا تھا تم فون رکھو میں آدھے گھنٹے بعد تمہیں کال بیک کرتا ہوں اور تین دن تک وہ کال بیک نہ کر سکا۔ وہ فون کرتی تو حسب معمول کال سسٹم پر ہوتی۔ ریکارڈ پر ایک دلکش آواز اس کا مذاق اڑاتی۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے براہ کرم کچھ دیر بعد رابطہ کیجیے۔“ وہ اپنی ہونے والی سانس کی خدمت میں جت گئی۔ ناشتے کے لوازمات نیمبل پر چھنے کے بعد وہ چائے لے کر دروازے تک پہنچی تو ان کی آواز پروں میں ٹھک گئی۔

”ہم کیا کریں بہن۔۔۔۔۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ ہماری بہن کی بیٹی کا جس سے نکاح ہوا تھا وہ فراڈ نکلا۔ پہلے سے شادی شدہ اور بچوں والا تھا۔ طلاق بھی دینے پر آمادہ نہ تھا۔ اب بڑی مشکل سے خلع حاصل کر کے ہم نے اسے راشد کی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ بڑی زور کا دھماکا اسے اپنی سماعتوں

سرسبز شربت

سرسبز شربت

شمارہ کی 2015  
کی جھلکیاں

فلسفی

اس شخصیت کا زندگی نامہ جس نے زمانہ قدیم  
میں حکمرانی کے اصول مرتب کیے تھے

انگریز کے

ان شخصیات کا ذکر جن کی موت  
میں سانگرہ کے دن ہوئی

ماہ

اس مہینے میں پیدا اور وفات پانے  
والے اہم لوگوں کا تذکرہ

انعامی

جس کے خوف سے امریکن آئی اے  
لڑوچی مگروہ غریبوں کا سچا کہلایا

وا

قوت سماعت سے محروم ایک لڑکی کی  
سچ بیانی۔ اس نے اپنی محبت کو کیسے پایا

ادبی

سفر نامہ معروف فلمی شخصیت کا احوال زیست،  
طویل مگر لمبہ گرم کردینے والی سرگزشت "سراب" اور  
بھی بہت سی سچ بیانیوں کے واقعات دلچسپ قصے

سرسبز شربت

کے آس پاس سنائی دیا۔ امی بھی گنگ رہ گئیں۔

"دیکھیں بہن۔" انہوں نے اسی نرم لہجے میں  
کہہ کر محبت سے امی کے ہاتھوں کو چھوا۔ "سارہ کی  
منگنی ہوئی ہے منگنی ٹوٹنا اتنا معیوب نہیں جتنا  
نکاح..... پھر اس بچی سے کوئی رشتہ کرنے کو تیار نہیں  
کہ ظلع یافتہ ہے حالانکہ وہ بالکل کنواری ہے سو ہم  
نے فیصلہ کیا کہ ہم ہی اسے اپنائیں۔ سارہ کو تو بہت  
سے مل جائیں گے مگر....." وہ دروازے سے ہٹ  
آئی۔ دل میں عجیب طوفان برپا تھا۔

وہ جان گئی تھی بے وفائی کے خاردار راستوں  
سے گزرتی جدائی کی منزل آنچنی ہے۔ عام لڑکوں کی  
طرح وہ بھی اس کے دل کو کھلونے کی طرح کھیل کر  
بازی پلیٹ کر جا چکا ہے۔ اسے دکھ صرف اس بات کا  
تھا کہ روشو بے وفائی کرنے کے بجائے فون کر کے  
خود اسے بتا دیتا۔ اس کے ساتھ بھوٹ موٹ کے  
آنسو بہا لیتا۔

اگر وہ با وفا ہوتا

نہ یوں دل توڑ کر جاتا

نہ مجھ کو چھوڑ کر جاتا

مگر وہ با وفا کب تھا؟

اس نے اپنی کنپٹی دبا کی، چکراتے وجود کو سمیٹا۔  
اگر وہ مجھ سے منقص تھا تو گھر والوں سے بغاوت  
کر سکتا تھا نہیں تو مجھے اعتماد میں لے سکتا تھا۔ جی تو  
چاہا خوب زور، زور سے روئے..... چونکھٹ سے سر  
ٹکرا کر خود کو لہو لہان کر لے مگر وہ کچھ نہ کر سکی تو ضبط کا  
کڑوا گھونٹ حلق سے اتارا۔ گہری سانس بھر کر تازہ  
آکسیجن اپنے وجود کے اندر اتاری گویا نئی سارہ  
کو وجود بخشنا اس کا مقصد ہو۔ آنسو کے بس دو ہی  
قطرے نکلے۔

ساحل کی لہر..... اور سمندر کا بھنور..... مدتوں  
قبل پڑھا تھا قیاس اس کے دل و دماغ پر روئیٹ ہو رہا  
تھا۔ اس نے چائے کی ٹرے کچن میں قیغ کرو دیں

چوکھٹ سے سرفیک دیا۔

”کاش..... آسمان نہ کسی چھت ہی مجھ پر آگرے۔ زلزلے بھی تو آتے ہیں ناں۔ ایک زلزلہ زندگی میں آگیا تو ایک اس حصے میں کیوں نہیں آسکتا۔ جس میں، میں کھڑی ہوں۔“

”تمہارے دل میں دھڑکن بن کر جیوں گا۔ آنکھیں بند کر کے میرے لمس کو محسوس کرنا۔ میں تم سے ناراض ہو کر اپنا وجود نہیں کھوسکتا۔ میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں..... خدا راتم مجھ سے دور مت ہو۔“ یہ اور اس جیسے ان گنت جملے جو روشو نے ابتدائی مراحل عشق میں کہے تھے..... معذرتہ بچوں کی طرح آپس میں جھگڑ کر ایک میس کھڑا کر چکے تھے۔

”اوہ خدا.....!“ اس نے سسکی بھری اور کمرے میں آکر خود کو بستر پر گرالیا۔

☆☆☆

اگلے روز وہ بہت دیر سے جاگی۔ امی نے بھی اسے قصد نہیں جگایا تھا۔ اس نے بغور امی کو دیکھا ان کی آنکھیں متورم تھیں اس نے ان سے کچھ نہیں پوچھا یا ہر آئی بابا ایزی چیئر پر بھی اسے ایزی فیئنگز کے ساتھ نہیں نظر آئے۔ کمرے میں آکر اس نے موبائل فون نکالا ایک منیج ٹائپ کیا۔

”ہوں تو پہلی مگر تم مجھے اپنی زندگی کی دوسری عورت بھی بنا سکتے تھے۔“ اس نے روشو کو آخری منیج ٹائپ کیا اور سینڈ کر دیا۔ موبائل کو اٹھا کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔ ڈھیر سارے دن گزر گئے روشو کا جواب آتا تھا نہ آیا۔

”آئی لو یوٹس مائی لاسٹ بر۔ جھ۔“ روشو کا کہا جملہ کہیں پاتال میں گم ہو گیا۔ زندگی کی کہانی کا درمیان آنے سے قبل ہی وہ در بدر ہو گئی تھی۔ زندگی کی رانگانی بڑی تلخ ہوتی ہے۔

ساحل اور سمندر..... سمندر اور ساحل

ساحل کی موج اور سمندر کے سینے کا بھنور۔ وہ

خود گرداب میں آ پھنسی تھی۔ آج اسے تمام حقائق سمجھ آ گئے تھے۔ تمام سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ آنکھیں موندیں تو روشو کا لمس محسوس کیا۔ کیا روشو نے بھی اسے اسی طرح لمس کیا ہوگا؟ وہ سوچے گئی..... اتنا کہ تھک گئی۔

کبھی دل کہتا ”ہاں وہ مجبور ہوگا وہ بھی اسے لمس کرتا ہوگا۔“ اور کبھی دماغ اس خیال کی نفی کر دیتا۔ انسانی جسم بھی کتنا دلچسپ و عجیب ہے جس کے دو organ اپنی الگ، الگ رائے رکھتے ہیں۔

”ہات دماغ بھی کہتا ہے اس کے باوجود حیات دل جاتا ہے، زندگی کی دوز دھوپ بہت کچھ دھندلا دیتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے تا عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ بابا کا انتقال ہو گیا، امی کو چپ لگ گئی بس اسے کمر، ٹکڑی رتیں۔ اس نے ملازمت کر لی تھی باقی وقت امی کی خدمت اور رب سے لو لگالی تھی۔

اس نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا تھا، آئینہ دیکھنا چھوڑ دینا سچ سے گریز کا دوسرا نام ہے۔ آئینہ دیکھنا چھوڑ دینے سے حقائق نہیں بدل جاتے۔ ایک روز ماتھے پر کسی کیزے نے کاٹا تو جا کر آئینہ دیکھا۔ ماتھا تو کیا ہی دیکھ پانی خود کو دیکھ کر سسک اٹھی۔ بالوں کی ایک لٹ تو پوری دودھیا چاندی تھی، چہرے پر زمانے بھر کی گرد، آنکھوں کے گہرے حلقوں میں بھی ہلکی، ہلکی جھریاں منہ چڑا رہی تھیں۔

محبت میں پڑتی نہیں جھریاں ”پاکل تم بوڑھی بھی ہو جاؤ گی تو میں تمہیں اتنا ہی چاہوں گا۔“ یہی ایک جملہ زندگی سے چمت کر رہ گیا تھا۔ دن میں اب تک کسک آباد بھی پھر اس دن سے نہ جانے زندگی میں کیسا انقلاب آیا۔ اس نے اپنا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ ایک آس..... ایک موہوم سی امید پر۔

☆☆☆



پر آنے سے قبل ہی شکوہ دم توڑ گیا۔ بس وہ سوچے گئی۔ وہ بیٹھتے، بیٹھتے اسے تلے ہوئے ٹھنکا۔

”جی فرما میں نے“ بیویوں سے پھسلا ہی تھا کہ اس نے پرچہ اس کی سمت بڑھایا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ روٹھنے پرچہ اس کے ہاتھ سے لے تو لیا لیکن اس کی، اس پر مڑی نظر ایک لمحے کو بھی ادھر ادھر نہ ہو سکی کہ اچانک۔

”سارہ“ وہ اس کی سمت بڑھا لے بھر میں آنا فنا اس کے چہرے کا نقاب بچھینکا کہ اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ ”تم لاکھ بادلوں میں چھپ جاؤ میں ان آنکھوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ جن سے میں قتل ہو چکا ہوں۔ جتنیں بڑی شدت سے میں نے چاہا تھا۔“ آتسو بھل، بھل اس کے گالوں پر بہنے لگے۔

”کیا تم مجھے اپنے گھر کے ایک کونے میں رکھ سکتے ہو؟“ پرچہ روٹھ کے ہاتھ سے گرچکا تھا تو اسے مدعا بیان ہی کرنا پڑا۔ ”میں بے سرو سامان، بے آسرا ہو چکی ہوں۔“ روٹھنے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”گو زندگی اب تو انا نہیں رہی جس وقت زندگی تو انا تھی، میں تم سے کیا عہد نبھانہ سکا، مجھ میں والدین سے بغاوت کی ہمت نہ تھی۔ اب زندگی کمزور ہے لیکن بیوی کی موجودگی میں تمہیں اس گھر میں بسانے کی ہمت موجود ہے۔ تم نے اپنی زندگی کے تمام شب و روز میرے نام امتساب کر کے مجھے اپنا مقروض کر لیا ہے اور جو مقروض ہو جائے اس کے شانے تو ویسے ہی ڈھلک جاتے ہیں۔ میں یہ قرض چکانے کو تیار ہوں۔“

زندگی میں پہلی بار اس نے بہت شدت سے اسے خود سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ کسی کمزور چڑیا کی طرح اس کے سینے سے لگی کانپ رہی تھی۔ بھی روٹھ کر آنکھ سے نکلے ندامت کے دو قطرے اس کے بالوں میں کہیں گم ہو گئے تھے۔

پھر جب امی نے بھی زندگی سے ناتا توڑ لیا۔ اس نے چاروں سمت دیکھا کچھ نہ تھا ماسوائے گہرے خاموش خانے کے۔ وہ ادھ کھڑی ہوئی جانے کے لیے۔ اس منزل کی طرف جس کا اسے خود بھی یقین نہ تھا کہ وہ منزل اسے قبول کرے گی یا نہیں؟

اس نے خود کو بہت اچھے طریقے سے برقع سے کور کیا۔ اس کی صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ وہ آنکھیں جن پر کبھی وہ مرتا تھا مگر آج ان آنکھوں کے دیے جلتے جھٹے چراغ تھے۔

”ایسے نہ ہکا کرو مجھے۔ کسی دن تمہاری آنکھیں میرا قتل کر بیٹھیں گی۔“ اس نے اپنے دل کی یاد دہانی کو سر جھٹک کر نظر انداز کیا۔

”کیا تم کو اپنا وعدہ یاد ہے؟ میں آج بوڑھی ہو چکی ہوں۔ تم مجھے قبول کر دو گے؟ کیا تم نے میرے حصے کی بجاہت بچا کر رکھی ہے؟“ اس نے ایک پرچے پر لکھا اور مٹھی بے درکرا اس کے گھر جا پہنچی۔

”مجھے راشد جزہ سے ملتا ہے۔“ دروازے پر آنے والی ملازمہ تھی جس سے اس نے مدعا بیان کیا۔ ”کیا وہ ہیں؟“ بے چینی کے ساتھ ساتھ اسے گھبراہٹ نے بھی آن لیا تھا۔

”ہاں جی۔۔۔۔۔ آپ کون؟“

”میں ان کی پرانی شناسا ہوں۔“ ملازمہ نے اسے ڈرائنگ روم تک آنے میں مدد دی۔ وہ بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی نظر کو محمد درکھانہ ارد گرد دیکھا نہ اس کی خواہش ہوئی بس اس کی نظر ڈرائنگ روم میں کھٹنے والے دروازے پر مرکوز تھی اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنی آواز نہیں سناے گی۔

سامنے آنے والا روشو ہی تھا وقت نے روشو کے سر میں بھی چاندی مل دی تھی مگر وہ کچھ اور سویر ہو گیا تھا۔

”اسنے ماہ و سال میرے بغیر گزار لیے۔ میری یاد کا کوئی جھونکا تک تمہیں مضطرب نہ کرے گا۔“ لیوں



منی ناول

# جنگل کا پھول

زاہد پروین



نواں اور آخری حصہ



بابر بہت دیر تک بے یقینی کے عالم میں بھائی کو  
کھورتے رہے، نکتے رہے، ڈرائنگ روم پر گہرا سکوت  
طاری رہا۔ خاور اس طرح ٹینشن میں بیٹھے تھے جیسے  
پوشیدہ شادی کا یہ جرم انہی سے سرزد ہوا ہو۔

”شادی...؟ خرم نے شادی کر لی؟“ مارے  
حیرت کے بابر کی آواز پھٹ کر رہ گئی۔  
”جی بھائی جان۔“ خاور نے اتنا کہہ کر بے  
چارگی سے سر جھکا لیا۔

”تمہیں... کیا یقین ہے؟“ انہوں نے تھوڑی

دیر کے بعد پوچھا۔

”جی بھائی جان بالکل روز روشن کی طرح...“ خاور نے برکت جواب دیا۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

”یا اللہ...! تو ہمارے گھرانے پر فضل فرما...“ کہتے، کہتے باہر نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

اس وقت یہ دونوں ڈاکٹر خاور کے اسپتال والے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

بہت دنوں کے غور و فکر کے بعد خاور نے فیصلہ کیا کہ اس راز میں باہر بھائی جان کو شریک کر لینا چاہیے۔ وہ اکیلے تو کچھ بھی کر سکتے کی پوزیشن میں نہیں تھے، خرم جس منجد ہار میں پھنس گیا تھا اس کی مشکلات کو محسوس کرتے ہوئے ان کا دل بہت درد مندی سے کوئی راہ تلاش کرنے کے لیے تڑپ اٹھتا تھا مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخر وہ بھائی کے کام آئیں تو کس طرح کام آئیں؟

بالآخر بات کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے جس میں بڑے بھائی کی مدد ضروری ہے، لہذا باہر کو انہوں نے کسی نہ کسی طور یہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔ کیونکہ اپنے گھر کی حدود میں یہ معاملہ زیر بحث لانا غیر ممکن تھا۔

خاور اٹھ کر گئے، فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس نکال لائے، پانی پی کر باہر کے گئے حواس قدرے بحال ہوئے تو انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بڑبڑا کر بولے۔

”سوچ کیا رہے تھے، ہو کیا گیا... یہ وہی بات ہو گئی کہ ایک ہاتھ جوڑنے کی کر رہے تھے اور ستر ہاتھ مزید ٹوٹ گئے۔“

خاور نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگے مگر زبان سے کچھ بولے نہیں۔

”کب کی ہے خرم نے شادی اور کس سے کی

ہے؟“ باہر نے خود ہی دریافت کیا۔

”مدت کا تو نہیں معلوم کہ کب کی ہے مگر یہ معلوم ہے کہ کس سے کی ہے۔“ خاور نے سر جھکائے، جھکائے کہا اتنا کہہ کر ایک گہری سانس لی اور آہستگی سے پوچھا۔ ”آپ کو یاد ہے کہ ایک بار ہم خرم کے پاس شکار کی غرض سے گئے تھے؟“

”ہاں، بالکل یاد ہے۔“ انہوں نے فوراً جواب دیا۔

”بس یہ وہیں کا واقعہ ہے، وہاں ریسٹ ہاؤس کے قریب کی بستی میں آپ نے رحمت بابا کو دیکھ ہوگا۔ جن کے بڑے سے ایک رپچہ حملہ آور ہو کر ان کے پاس آئے۔ جانوروں کو زخمی کر گیا تھا۔ خرم کی شادی انہی کی بیٹی سے ہوئی ہے۔“

”مزید تفصیل کیا ہے؟“ باہر دانت بھینچ کر پوچھا۔ خرم نے جو تفصیل بتائی تھی، خاور نے وہ تمام باتیں بڑے بھائی کے سامنے بیان کر ڈالیں۔

پرچھل سے بیٹھے سنتے رہے اور دن ہی دن میں کسی نتیجے پر پہنچتے رہے۔ خرم کی دیدہ دلیری نے ان کو سخت دھچکا پہنچایا تھا۔ اپنے کنبے کے مسائل حل کرنے کے لیے آج کل وہ جن الجھنوں میں گرفتار تھے، وہ کچھ ان کا جی ہی جانتا تھا۔ اب یہ درمیان میں خرم کا مسئلہ آن انکا تھا اور وہ بھی اس غیر معمولی انداز میں کہ اگر یہ خبر نامہ تکم تک پہنچ جاتی تو وہ ایک تہلکہ مچا دیتیں اور خرم کو کوٹھی میں گھسنے نہیں دیتیں۔

”تم میرے ساتھ چلو... ہمیں فوراً رحمت بابا سے ملنا چاہیے۔“ خاور خاموش ہوئے تو وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

”لیکن... اب کیا کیا جائے بھائی جان...“

رحمت بابا کا تو کب کا انتقال ہو چکا ہے۔“ خاور کچھ اور ہی سمجھے... افسوس کے لہجے میں بولے۔

”ایں... کیا مطلب...؟“ اپنی بیٹی خرم کے سر تھوپ کر خود مر گئے۔“

”ان کی موت بھی بڑے المناک طریقے سے ہوئی ہے، کہتے ہیں کہ بچا روں کا جھونپڑا ان کے اوپر



ہی آگرا تھا۔“ خاور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”ہمارے گھر میں تو بھونچال آجائے گا خرم کی  
 اس حرکت سے۔ ماں جان فحشہ کر ڈالیں گی، خرم نے  
 ہم سب کو سخت کھٹکھٹ میں مبتلا کر ڈالا ہے۔“  
 خاور بالکل خاموش رہ کر ان کی لعن طعن سن رہے  
 تھے اور سوچ رہے تھے کہ اچھا ہے کہہ سن کر بھائی جان  
 کے جی کی بھڑاس نکل جائے پھر ان سے اس معاملے  
 میں تعاون کرنے کی درخواست کریں۔  
 ”وہ لڑکی..... جس سے خرم نے شادی کی ہے،  
 وہاں اس کے کوئی عزیز رشتے دار بھی تو ہوں  
 گے؟“ کچھ سوچ کر بابر اچانک غصیلے انداز میں بولے۔  
 ”ضرور ہوں گے۔“ خاور نے جواب دیا۔  
 ”تو بس ٹھیک ہے۔“ بابر پر جوش ہو کر بولے۔  
 ”کل اتوار ہے، تم کل ہی میرے ہمراہ چلو..... ہم اس  
 لڑکی کو خرم سے علیحدگی دلوا کر اس کے رشتے داروں  
 کے سپرد کر کے آئیں گے۔“ خاور ان کے عزائم سن کر  
 بھونچکا رہ گئے۔  
 ”اور بچہ.....؟“ ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔  
 ”بچہ.....؟ کون سا بچہ.....؟“  
 ”خرم اور ریشم بھائی کا بچہ بھائی جان۔“ اب  
 حیران ہونے کی باری بابر کی تھی۔  
 ”کیا..... ان کا بچہ..... بھی ہے؟“  
 ”جی ہاں..... آپ کے ویسے کے دوسرے دن  
 تو ہوا ہے۔“  
 ”خدا کی بناء۔“ بابر کے آئے حواس جاتے  
 رہے، انہیں ایک دم چپ لگ گئی۔ خاور نے انہیں  
 دوبارہ پانی پلایا۔  
 بہت دیر سکوت طاری رہا۔ اب بابر کی ہمت  
 جواب دے گئی تھی۔ بچے کا سن کر ان کا دل خود بخود نرم  
 پڑنے لگا تھا۔  
 ”بھائی جان.....“ تھوڑی دیر کے بعد خاور نے  
 ڈرتے ڈرتے انہیں پکارا۔  
 ”کیا بات ہے؟“ انہوں نے کھست خوردہ لہجے

میں پوچھا۔  
 ”بھائی جان! اب تو خرم شہر منتقل ہو چکا ہے۔“  
 ”تمہیں یہ سب اطلاعات کون پہنچاتا ہے؟“  
 اچانک ان کی ذہنی روایتیں انہوں نے تیر کی چڑھا کر  
 پوچھ لیا۔  
 ”مجھے.....“ خاور ہکا کر چپ ہو گئے۔ پھر سنبھل  
 کر جواب دیا۔  
 ”دراصل..... ان کی وائف کا آپریشن میرے  
 اسپتال میں ہوا ہے، میں نے وہیں ان کو پہچانا تھا۔“  
 بابر نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔  
 ”اچھا..... تو کیا آپریشن تک نوبت پہنچی؟“  
 ایسے میں خرم کو بہت گھبراہٹ ہوئی ہوگی، کو بابر لیڈیز  
 وغیرہ بھی اس کی بیوی کے ساتھ نہیں ہوں گی نسلی  
 دلاسے کے لیے..... دیکھو..... چوری چھپے کا کام کس  
 قدر غلط ہوتا ہے۔“  
 ”جی ہاں..... یہ تو آپ کا کہنا بالکل درست ہے،  
 میں نے پہلے دن ان کی وائف کو رحمت بابا کی بیٹی کے  
 لحاظ سے شناخت کیا تو وہ اکیلی کھڑی روئے جارہی  
 تھیں۔“ خاور نے اعتراف کیا۔  
 پھر انہیں تفصیل کے ساتھ اپنی ملاقات اور تحقیق  
 کے متعلق بتایا اور بولے۔  
 ”آپ کے ویسے سے فارغ ہو کر اسپتال گیا تو  
 اسی روز ہر راز پر سے پردہ اٹھ گیا۔ خرم سے میری کھل  
 کر گفتگو ہوئی جس سے میں نے آپ کو ابھی آگاہ کیا  
 ہے۔ پھر..... پھر مجھے ان کے گھر جانے کا بھی اتفاق  
 ہوا..... یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ ان کے مالک  
 مکان اور ان کی بیوی بہت خیر خواہ لوگ ہیں۔“ خاور  
 نے احتیاطاً بھائی کے سامنے شرمین کے گھرانے کا ذکر  
 نہیں کیا۔  
 کل واقعات اور بطور خاص بچے کا سن کر بابر کا  
 دل بہت تسکین چکا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاور سے اظہار  
 خیال کرتے رہے۔ آخر میں بولے۔  
 ”بھئی خاور! پانی سر سے اونچا جا چکا ہے، خالی

ہم تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس بے حد نازک معاملے میں کسی بڑے کا شامل ہونا از حد ضروری ہے، اس لیے میں چاہوں گا کہ ہم یہ قصہ پھوپھی جان اور پھوپھا جان سے بیان کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اماں جان کو بتانے کی تو ہمت ہے نہ جرات۔“

ہلہ ہلہ

شرمین کی دادی اماں نے بھی ریشم کے بیٹے کے لیے عینک لگا کر کرتے، ٹوپی پہنے تھے۔

دنیا میں ایسے خوش نصیب لوگ بھی کم، کم ہوتے ہیں جیسے کہ ریشم تھی۔ جس کا یہاں شہر میں کوئی نزدیکی سگا رشتہ نہ ہوتا ہوئے بھی اسپتال سے واپسی کے بعد ایسا والہانہ استقبال ہوا تھا کہ خرم بیچارہ تو حیران رہ گیا۔

خان صاحب، دادی اماں اور بسنتی کے گھروں میں اندر سے باہر تک خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ سب اسے اور اس کے بیٹے کو دیکھ، دیکھ کر اس قدر خوش ہو رہے تھے جیسے چھوٹے بچے بھی دیکھے نہ ہوں۔ خان صاحب کے آگن میں سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ مبارک باد دینے والوں کا تانا باندھ گیا تھا۔

دادی اماں بذات خود شرمین کے ساتھ آئی تھیں۔ خان صاحب جھٹ.... بازار سے بہت سارے بتائے لے آئے تھے۔ دونوں میاں بیوی خوش، خوشی بچے کے تانا، تانی بن بیٹھے تھے۔ ریشم اپنی ساری تکلیف بھول کر خوشیوں سے نہال ہو گئی۔

ذکیہ خالہ اسپتال میں ایک، ایک پل ریشم کے ساتھ رہی تھیں۔ مگر چھٹی کے بعد بھی اسے اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ کبھی اس کے لیے اچھوانی میں رہی ہیں، کبھی بچے کو نہلا دھلا کر کپڑے پہنا رہی ہیں، اس کے کپڑے دھو رہی ہیں، ریشم کے بیسیوں کام اپنے ہاتھ سے نمٹا تیں، بسنتی آتی سارے گھر کی جھاڑو صفائی کر جاتی، کسی وقت دادی اماں اپنی ملازمہ کو بھیج کر برتن دھوا دیتیں۔ ریشم کے سارے کام ہاتھوں ہاتھ ہو جاتے۔

تیسرے دن ڈاکٹر خاور کو بھی آنے کا موقع مل گیا تھا جب بچے کو قدرے ٹھنڈکا اثر ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کا معائنہ کر کے دوا دی اور کافی دیر بیٹھے رہے، جاتے وقت بھائی کو خوب ساری تسلی دے کر گئے تھے کہ جو ہوگا، اللہ بہتر کرے گا۔ جاتے، جاتے بھی خاور امید بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے رہے مگر شرمین کہیں ہوتی تو دکھائی دیتی۔ دیواروں کے آر پار کس طرح دیکھ لیتے بیچارے۔

خاور کے چلے جانے کے بعد اس روز ریشم نے کھل کر خرم سے اصرار کیا اور اس قدر کیا کہ انہیں اقرار کرتے بنا کہ وہ فقط دوست نہیں بلکہ سگے بھائی ہیں۔ جب ساری بات کھل ہی چکی تھی تو مزید چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لہذا خرم نے اسے اپنے بہن، بھائیوں اور والدین کے متعلق تفصیل سے بتا دیا۔

یہ ایک اتنا بڑا انکشاف تھا کہ ریشم سہارنہ سکی اور اس نے اگلے دن یہ بات ذکیہ خالہ کے گوش گزار کر دی۔

دو دوڑی، دوڑی گئیں، دادی اماں کے گھر یہ دھماکا خیز طماع پہنچا دی۔ لب و لہجہ ایسا پُر جوش اور بڑبڑور تھا کہ کیا بسنتی اور شرمین، سب کے سب اس راز سے آگاہ ہو گئے۔

ریشم انجانے ہی انجانے میں شہر کی ایک اعلیٰ ترین خاندان کی بہو ثابت ہو چکی تھی۔ ان گھروں میں یہ خبر خوشخبری بن کر گھوم گئی۔ ذکیہ خالہ نے سب کے درمیان بیٹھ کر فخر یہ کہا۔

”بھئی شکر ہے، ہم نے تو پہلے ہی تانا، تانی کا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ ہمارے مکرم کا ودھیال تو بہت ہی چوٹی کا خاندان ہے۔“ انہوں نے اپنے اس نواسے کا نام مکرم رکھا تھا۔

سب تو ہر طرح کے تہرے کر کے خاموش ہو گئے تھے مگر اس انوکھے انکشاف کا سب سے بڑا اثر شرمین نے لیا تھا۔ وہ ساری رات اس نے سوچوں میں گزار دی۔ یہ بات سنتے ہی اس کی نگاہوں کے سامنے

سوچنے لگی۔

”بڑے آدمیوں کے بڑے کام..... بھلا ریشم غریب کو اتنی بڑی کوٹھی میں وہ کیوں گھسنے دیں گے۔ اگر اپنے دل سے مجبور ہو کر ان کے بیٹے نے ایک غریب لڑکی کو گلے لگانے کا جرم کر لیا ہے تو باقی سب لوگ اس جرم کو کیوں دہرائیں گے؟ میں بھی کیسی پاگل، دیوانی ہوں، مجھ سے زیادہ عقلمند تو ریشم ہے جو ایسی انہونی سوچ کر اپنا جی تو نہیں جلاتی۔“

☆ ☆ ☆

”ہم تو خاور کے لیے کیسے، کیسے پار پڑا رہے تھے اور یہاں وہ خرم صاحب ایسے چھپے رستم نکلے کہ تمام میدان ہی پار کر گئے بلکہ..... کوہ ہمالیہ سر کر لیا انہوں نے۔“ باہر سارے دن سے اسی نوعیت کی بڑ بڑاہٹ میں جھلا تھے، جیسے ہی اپنے کمرے میں آتے، شروع ہو جاتے۔

اس وقت ایسا ہی ہوا۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر روٹی اپنے بال سلجھا رہی تھی ڈریسنگ کے سامنے کھڑی۔

باہر جملہ بڑ بڑا کر لینے اپنی پیشانی سہلارہے تھے۔ روٹی نے مزکران کی طرف دیکھا۔ برش لیے لیے ان کے قریب آ کر بولی۔

”بہزار ہو چکی ہوں آپ کی لن ترانی سن کر.....“

آخر کر کیا دیا ہے خرم نے.....؟ کھل کر کیوں نہیں بتا ڈالتے؟“ انہوں نے سنجیدگی کے عالم میں جواب دیا۔

”جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟“ وہ ہنسی ہوئی ان کے قریب بیٹھ گئی اور شرارت سے بولی۔

”آنکھیں کھول کر دیکھیے سرتاج آپ ممانی جان سے نہیں بلکہ..... اپنی لائف پارٹنر سے مخاطب ہیں، فرمائیں، فرمائیں.....“

”تو جگر کو تھام کر نہیں کہ آپ کے دیور صاحب خرم جہا تدار نے شادی رچالی ہے اور ایک عدد صاحبزادے کے والد بزرگوار بھی بن چکے ہیں۔“ انہوں نے ڈرامائی انداز میں انکشاف کر ڈالا۔

سب سے پہلے نامہ بیگم کا سراپا گھونسنے لگا تھا۔ اور وہ سر سے ہر تک جھرجھری لے کر رہ گئی۔

کافی عرصے ان کے ہاں بطور نیوٹر جاتے رہنے کی وجہ سے وہ وہاں کے ماحول سے واقف ہو چکی تھی۔ سب کے اخلاق اور تہذیب کی دل سے معترف تھی۔ وہ روٹی اور معصومہ کا دوستانہ رویہ، شمس بیگم کا مشفقانہ سلوک، بچوں کی محبت اور انسیت..... مگر ان سب روٹیوں کے ساتھ، ساتھ نامہ بیگم کے مزاج کی..... عجیب و غریب سی کچھ مخمرازجی اور متکبرانہ انداز..... وہ آواز و مزاج کے علاوہ ظاہری شکل صورت سے بھی حد درجہ مغرور اور حاکمانہ فطرت اور نفوت والی شخصیت دکھائی دیتی تھیں۔

اور جو انہوں نے آخر میں شرمین کے ساتھ دل شکن اور دل آزار رویہ اختیار کیا تھا۔ وہ سب فراموش کر ڈالنے کے لائق ہرگز نہیں تھا۔ ان کی سوچ اور الفاظ کا زہر ناقابل یقین اور ناقابل برداشت تھا۔ اسی بنا پر شرمین کو یقین نہ تھا کہ وہ ریشم کو آسانی سے قبول کر سکیں گی۔

”یا اللہ! ریشم کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہ ہو، وہ تو اب ان کے بیٹے کی بیوی اور اس کے بچے کی ماں تھی۔ خود بھی بہت معصوم اور ہر بات سے لاعلم تھی۔“ اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی۔

مگر کو ڈاکٹر خاور سے کچھ کہنے سننے کا موقع ملا تھا نہ وقت..... مگر اس کے باوجود شرمین کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ اندر سے بہت ڈسٹرب اور پریشان ہیں، بھائی کے کام بھی آنا چاہ رہے ہیں مگر اس معاملے میں لاچار اور مجبور بھی ہیں، ظاہر ہے بڑوں کے سامنے چھوٹوں کی کیا اہمیت..... یہ سب سوچنے کے باوجود وہ دل ہی دل میں اگلے چند دنوں تک بڑی شدت سے منتظر رہی کہ شاید اب ان کے ہاں سے کوئی ریشم اور اس کے بچے کو لینے آئے یا تب آئے مگر رفتہ رفتہ مکرم دس پندرہ دن کا ہو گیا۔ مگر لینے تو کون آتا، کوئی بچے کو دیکھنے اور ملنے تک نہیں آیا۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر رہ گئی۔ اور



”شادی کے بعد۔۔۔ یا۔۔۔ شادی سے پہلے؟“  
روٹی محض مذاق سمجھی، برجستہ پوچھا۔

”تصدیق کر لی گئی ہے، نکاح پہلے ہوا تھا، مینا  
بعد میں۔“ باہر نے اسی سوڈ میں جواب دیا۔

”آپ کچھ کہہ رہے ہیں یا مذاق کر رہے  
ہیں؟“ اب روٹی نے بغور ان کی صورت گئی اور جھبرا  
کر پوچھا۔

”اگر جیتے جاگتے بیٹے مذاق میں ملتے ہوں تو  
ایک ہمیں بھی عنایت کر دیجیے۔“ باہر نے اس کی طرف  
ہاتھ پھیلا کر کہا۔

”آپ کو معلوم ہے ماں آپ کیا کہہ رہے  
ہیں؟“ مار سے پریشانی کے روٹی کے ہاتھ سے برش  
چھوٹ گیا۔

”نہیں، ہم گھاس کھا گئے ہیں اور جھوٹ بول  
رہے ہیں۔“

”ممائی جان کو یہ سب معلوم ہے؟“  
”ہم سب کی جانیں سلامت چاہتی ہیں یا  
نہیں؟“ باہر نے طنزیہ پوچھا۔

”یا خدا۔۔۔ اب کیا ہوگا؟“ روٹی نے ان کا  
انداز نظر انداز کر کے بدحواسی سے کہا۔

”یہ خرم کو کیا سوچھی بیٹھے بٹھائے؟ کیا ممائی جان  
ان کی شادی نہ کرتیں؟ ظاہر ہے اب وقت آ رہا تھا۔“  
جواب میں باہر خاموش رہے۔

”آپ تو ایک شوٹا چھوڑ کر خاموش ہو گئے۔ خدا  
کے لیے سب کچھ سچ، سچ بتا دیجیے کہ اصل واقعہ کیا  
ہے؟“ روٹی بہت دیر کو گو کے عالم میں ان کا جائزہ لیتی  
رہی بالآخر خوشامد اندہ بولی۔

باہر خود بھی کم پریشان نہیں تھے اس لیے زیادہ دیر  
خاموش نہ رہ سکے اور ہلکے دم کا سست تمام واقعہ روٹی کو سنا ڈالا۔  
یہ سن کر کہ یہ قصہ خاور کی معرفت ان تک پہنچا  
ہے، روٹی چونکی۔ رہا نہ گیا تو کہنے لگی۔

”کہیں خاور، ممائی جان کو نہ جانتائیں؟“  
”انہیں اپنی چند یا کے بال عزیز ہیں اور انہوں

نے تو مجھے ہی بہت جھجک، جھجک کر بتایا ہے اماں جان  
کو کیا بتائیں گے۔ اب تم بھی دماغ لٹاؤ کہ کیا کرنا  
چاہیے؟“ باہر نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ  
جواب دیا۔

”میں کیا بتاؤں؟“ روٹی نے پریشانی سے  
جواب دیا۔

”بات تو بہت بڑی ہے معمولی نہیں۔۔۔۔۔ ہم،  
آپ کے بس کا روگ نہیں ہے، امی جان اور بابا جان  
کے غم میں لائیں فوراً۔۔۔“

”میرا اپنا بھی یہی خیال اور ارادہ بھی تھا۔ ایسا نہ  
ہو اماں جان کہیں خرم کی بات چیت چلا دیں یا رشتہ  
وغیرہ ٹھہرا دیں۔۔۔۔۔ اس صورت میں معاملہ بہت تازک  
رنگ اختیار کر جائے گا۔ خرم پھنس جائے گا۔“

”ایسا تو سو فیصد ممکن ہے، ویسے بھی ممائی جان،  
امی جان کا ہی انتظار کر رہی ہیں، ان کے آتے ہی کوئی  
سلسلہ چلائے والی ہیں۔“ روٹی نے مسکرا کر کہا۔

”کیا تم سے۔۔۔۔۔ کچھ کہہ رہی تھیں؟“ روٹی ان  
کی گھبراہٹ دیکھ کر ہنس دی۔

”مجھ سے ایسے تعلقات کہاں ہیں ابھی۔“ جواباً  
باہر نے بیوی کو خشکیوں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے  
بیزاری سے کہا۔

”کب تک یہ تماشا طے کا ختم کرو بس سب۔۔۔۔۔“  
”ختم کر دیں گے، ختم کر دیں گے اب تو ہم ایک  
چھوڑ دو، دو ہو گئے ہیں۔“ روٹی نے شوخی سے جواب دیا۔  
”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”مطلب یہ کہ ہماری مددگار ہماری دیورانی بلکہ  
بلدی لگی نہ پھنکری ایک عدد ننھے ننھے بھتیجے صاحب  
بھی۔“ باہر کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ چھلک گئی  
مگر زبان سے کچھ نہ بولے۔ کروٹ سے چپ چاپ  
لیٹ گئے۔

اب رات کافی بیت چکی تھی۔ کونہی کی ٹہنی منزل  
گہرے سناٹوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شاید سب لوگ  
سو چکے تھے۔



”اب پورا قصہ اپنی زبانی سناؤ۔“

”بھائی جان نے سنایا تو ہوگا؟“

”مگر تم اپنی زبان سے سناؤ، شاید کوئی بات چھوٹ گئی ہو۔“

”جی ہاں، سو فیصد سچ ہے۔“

”یعنی؟ کوئی بات چھوٹ گئی ہے۔“

”جی ہاں..... مگر دانستہ چھوڑی ہے۔“

”سناؤ۔ پھر جلدی سناؤ۔“ روبی نے بے صبری سے اصرار کیا۔

”مگر وعدہ کیجئے اس چھوٹ کو میرا جرم قرار نہ دیا جائے گا۔“

”سناؤ کو آج نہیں ہوتی۔ تم بتاؤ..... فیصلہ از خود ہو جائے گا۔“

”نئی بھابی، شرمین کی پڑوس ہیں، یہاں شہر میں۔“

”کیا؟“ روبی اچھل پڑی۔

”جی ہاں، یہ حقیقت ہے، ایک سادہ سی حقیقت.....“ خاور نے بالتفصیل پورا واقعہ سنا ڈالا۔

اڑوس پڑوس اور آپس کے برادرانہ تعلقات سن کر روبی دنگ رہ گئی۔

”اب میری خبر نہیں ہے، سر پر ویسے ہی چار بال ہیں۔“ وہ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”آپ کا انشاء اللہ بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ بس آپ یہ کیجئے کہ کسی طرح ان سب کا میل ملاپ کروادیتے آپس میں۔“

”ہاں، یعنی خرم، ان کی بیوی اور مہ..... ممائی جان کا؟“ روبی نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

”ہاں تو اور کیا۔“ باقی کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔“

”پہلے میں اپنا ملاپ تو کرالوں۔“ وہ ہنسی۔

”کیا مطلب؟ آپ کے ملاپ کو کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں.....“ روبی نے جلدی سے بات چلی۔

”حالات بہت سیریس ہو چکے ہیں، امی جان کو اب فوراً کونھی واپس آ جانا چاہیے۔ کل ہی..... بلکہ آج

میں کچھ کرنا ہوگا۔“

”ہاں اچھی بھابی جان! کچھ تو کیجئے۔“ خاور درو

مندى سے بولے۔

”ریشم بھابی بیچاری ادھر کی ہیں نہ ادھر کی۔ اپنے

میکے سے بھی چھوٹیں اور سسرال بھی نہیں پوچھتی۔ اب تو

چھوٹا بچہ بھی ہے، خود خرم بیچارہ سخت شرمندہ اور رنجیدہ رہتا ہے۔“

خاور چلے گئے اور روبی پر سوچ کے نئے دروازے کھول گئے۔ رات بھی وہ دیر تک تمام

واقعات کی کڑیاں جوڑ، جوڑ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اب خاور سے چند اہم ترین

باتیں مزید سننے کو مل گئی تھیں۔ اتفاق سے اسی شام شرمہ بیگم واپس اپنی کونھی پر

آپہنچیں۔ سب تو خوش ہوئے ہی تھے مگر نائتمہ بیگم کو بے حد خوشی اور اطمینان کا احساس ہوا تھا۔ اپنی ہزار

مصروفیات اور الجھنوں کے باوجود نند کے بغیر انہیں دونوں گھر خالی، خالی لگتے تھے۔

خود شرمہ بیگم بھی واپس اپنے مقام پر آ کر بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔ شادی رخصتی کے بعد سے ابھی

تک انہوں نے اپنی بیٹی، داماد کو اپنے ہاں بلا کر رکھا تک نہیں تھا۔ اب سارے ارمان پورے کرنے کا

ارادہ تھا ان کا۔ مگر اگلے چند دن میں ایک نئی خبر دونوں گھروں

میں گردش کرنے لگی تھی۔ روبی نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ کم از کم ایک ماہ کے لیے باہر کے ہمراہ شمالی علاقہ

جات کھوٹنے جائے گی۔ نائتمہ بیگم کچھ بھی نہ بول سکیں۔

☆☆☆☆

آواز رفت رفت تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سہ پہر کا سناٹا، ہر طرف پھیلی ہوئی خاموشی، کچھ ایسا محسوس ہو رہا

ہے جیسے آواز میں کسی تکلیف کا اظہار ہو..... نیند تو تک چڑھی بہو کے کمرے میں انہیں کیا آتی، البتہ جھکی سی

آئی تھی۔ انہوں نے بے چینی سے لیٹے، لیٹے کروٹ بدلی۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ ماحول کا احساس ہوتے



## حکمل کا پھول

چینی اتنی بڑھی کہ وہ باہر نکل آئیں۔ گرمی کی سہ پہر اور لان کی ویرانی ہر طرف پھیلی پھیلی، پھلی دھوپ مگر سکوت میں ابھرتی آواز۔ مزید واضح ہوتی گئی تھی۔

انہیں یوں لگا آواز شمس بیگم کے باغ کی طرف سے آرہی ہو، وہ ایک اضطرابی سی کیفیت میں ان کی طرف مڑ گئیں۔ شمس بیگم کی کونھی کا لان عبور کرتی ہوئی وہ چار میز پر چڑھ کر رہائشی عمارت میں آ گئیں۔ سخت حیرت اور جستجو کے عالم میں انہوں نے خود کو ان کے پچھلے برآمدے میں کھڑے پایا اور آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر سامنے کا منظر دیکھنے لگیں۔

گلابی رنگ کے جوڑے میں لمبوس ایک نوجوان لڑکی ایک چھوٹے سے بچے کو بیٹھی نہلا رہی تھی اور شمس بیگم پانی ڈال رہی تھیں۔ بچہ تھا کہ زور شور سے رو رہا تھا۔ ہاتھ پیر مار رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں نے بچے کو نہلایا۔ شمس بیگم نے سفید تولیہ دیا اور لڑکی نے جلدی سے بچے کو تولیے میں لپیٹ لیا۔

”جی شمس بیگم کی نظر تادم بیگم پر پڑی۔“  
”ارے تادم، آؤ، آؤ، کھڑی کیوں ہو؟“ انہوں نے کرسی آگے بڑھائی۔ ان کی نگاہیں اب تک لڑکی اور بچے پر لگی ہوئی تھیں۔ نند کے گھر میں زندگی میں پہلی بار یہ نظارہ دیکھنے کو ملا تھا۔

”آیا! یہ کون ہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا؟“ بیٹھے کو تو بیٹھ گئیں مگر وہی زبان سے پوچھا۔ شمس بیگم مسکرائیں۔

”بتاتے ہیں، بتاتے ہیں، صبر کرو۔“ پھر وہ لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئیں جو بچے کو تولیے میں لپیٹ بیٹھی تھی۔ دونوں نے مل کر اسے خشک کیا۔ ٹیلکم پاؤڈر لگایا، کپڑے پہنائے، شمس بیگم نے اس کے سر پر ہلکا سا تیل لگایا پھر بھاوج سے بولیں۔

”ابھی صاحبزادے کی مالش کی ہے تو خوب چلا، چلا کر رو رہے تھے اور اب نہا کر کیسے خوش ہو رہے ہیں۔“ کہتے، کہتے انہوں نے سفید کرتے پا جاسے

ہی وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔

کمرے میں ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی۔ عطر کی خوشبو۔ پھولوں، کلیوں کی خوشبو۔ ٹیلکم پاؤڈر کی خوشبو۔ کریم کی خوشبو، صابن کی خوشبو۔ نئی نوپلی دہن کی خوشبو، مہندی کی خوشبو۔ وہ بری طرح چونک پڑیں۔ سمجھتے ہوئے نرم و گداز بستر کے سرہانے باہی پھولوں کا گچھ اب تک تک رہا تھا۔ جس آواز کو سن کر نیند اچٹ گئی تھی وہ دوبارہ سماعت سے نکل آئی۔ سہ پہر کے سائے ڈھنسنے شروع ہو گئے تھے، ہر طرف سکوت تھا، اوپر کی اس منزل اور کمرے میں سنا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں لان میں لائے، لائے درختوں کے سائے ساکت تھے۔ ہوانہ چلنے کی وجہ سے سخت گرمی اور ہوکا عالم طاری تھا۔

نامہ بیگم دو گھنٹے پہلے بلا ارادہ رولی کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔ کافی دیر ادھر ادھر جھانکتی پھریں، بالکونی میں کھڑی ہو کر باہر دیکھتی رہیں۔ پھر بیڈ پر آ بیٹھیں۔ کمرے کا اے سی بند ہونے کے باوجود انہیں اس زور کی جھونک آئی کہ وہ وہیں لڑھک گئیں۔

پرسوں رولی اور باہر تفریحی دورے پر روانہ ہوئے تھے، ابھی سے اندر باہر کی قضائیں مزید خاموشیوں کی نذر ہو کر رہ گئی تھیں۔ شادی کے بعد سے مسلسل رولی کی فرمائشوں، ہمدوں اور چڑچڑے پن کے مظاہروں نے نامہ بیگم کو اس حد تک تھکا اور الجھا ڈالا تھا کہ اس کا گھومنے جانے والا مطالبہ اچھا نہ لگنے کے باوجود انہوں نے اس کی غیر موجودگی کو غنیمت جان کر سکھ کی سانس لی تھی۔ انہیں آزادی کا سا احساس ہوا۔

ورنہ وہ اور رولی کے کمرے میں ان کا پایا جاتا۔ چہ معنی دارد؟ کھلی کھڑکی کی راہ آواز پھر ان کے کانوں سے نکل آئی۔ کسی ننھے سنے بچے کی آواز لگ رہی تھی۔

نامہ بیگم دہن کی خواب گاہ بند کرتی ہوئی دھیرے، دھیرے زینے اترتی ڈرائنگ روم میں آئیں۔ یہاں کے سائے میں آواز بھی تیز تھی۔ انہیں قدرے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ پھر یہ بے

میں ملبوس گل تھوٹنے سے صحت مند بچے کو اچانک نامہ  
بیگم کی گود میں لٹا دیا۔ اور لڑکی کی طرف اشارہ کر کے  
بولیں۔ ”یہ ریشم ہے۔“

ریشم نے ادب سے انہیں سلام کیا۔  
”ریشم، جاؤ تم نہ! آؤ بیٹی بہت گرمی ہے۔ منے  
میاں کو ہم دیکھ لیں گے۔“  
”جی بہت اچھا۔“ کہہ کر وہ سب سامان سمیٹی  
ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

نامہ بیگم بغور انہیں دیکھتی رہ گئیں۔ ماں، بیٹے  
دونوں ہی بہت پرکشش تھے۔

”بات دراصل یہ ہے۔“ شمسہ بیگم نے بھابھ  
کے قریب بیٹھتے ہوئے سلی سے کہنا شروع کیا۔

”ان کے (متین احمد) کے ایک بہت پرانے اور  
قریبی دوست تھے رحمت علی خان، اب تو خیر بیچارے  
مرحوم ہو چکے، یہ لڑکی ریشم انہی کی بیٹی ہے، بیچارے  
بہت ہی شریف مگر ایک غریب آدمی تھے، انتقال سے  
پہلے اپنی بیٹی کی شادی جہاں کر گئے وہ لڑکا اپنے والدین  
کا اکلوتا بیٹا ہے، بیوہ ماں نے بہت ہی محنت اور محبت  
سے اپنے بیٹے کی پرورش کی۔ پڑھایا، لکھایا، برسرِ روزگار  
ہو گیا تو شادی کر دی۔ خود ذرا سخت مزاج سی نہ زیادہ  
ہنسنے والی نہ بولنے والی خاتون ہیں، میں اچھی طرح  
واقف ہوں ان سے، دل کی ویسے بہت صاف شفاف  
ہیں، ان کی حد درجہ سنجیدگی کی وجہ سے بہو ذرا دبی گئی سی  
رہتی ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اچانک ہی دونوں  
ماں، بیٹے کالج پر جانا ہو گیا۔ ادھر بہو کا مچھونا سا بچہ

لڑکی جوان، تنہا، کہاں اور کس پر چھوڑ کر جائیں۔ جانا  
بھی ضروری اپنے مقدس سفر پر۔ لہذا میں نے ہامی  
بھری۔ بس نامہ! میرا جی نہ مانتا تم سے مشورہ کرنے کا  
بھی موقع نہیں تھا۔ یہ (متین احمد) موجود تھے، انہیں تو  
اللہ ایسی نیکی کا موقع دے۔ مجھ سے بھی انکار نہ  
ہو سکا۔ سو یہ ماں بیٹا میرے ہاں آ گئے۔“ شمسہ بیگم نے  
ایک گہری سانس لے کر پُر اعتماد انداز میں شروع کی نئی  
داستان ختم کر لی۔

نامہ بیگم نے بے خیالی میں بچے کے منے منے  
ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔  
”آپ کب لائیں ان کو؟“

”ارے! کل شام کو تو آئے ہیں دونوں۔“  
جواب دیتے ہوئے وہ لپک کر گئیں اور کاجل کی ڈبیا  
اٹھالا میں اور کھول کر رکھ دی۔  
”نو۔۔۔۔۔ اپنے ہاتھ سے آنکھوں میں کاجل لگا دو  
منے کے۔ بھلا معلوم ہو گا۔“

نامہ بیگم نے جھٹ سے انگلی ڈبیا پر پھیری اور  
بچے کی آنکھوں میں کاجل لگا دیا پھر اسے کندھے پر لگا  
کر تھپکنے لگیں۔

پل کی پل میں ان کی بچے سے دوستی پکی ہو گئی۔  
چہرے پر منوں ممتا پھوٹ پڑی، چہرے کی سنجیدگی میں  
دراثر پڑ گئی۔

جب تک ریشم نہا کر آئی دونوں بوڑھیاں۔۔۔۔۔  
مکرم کے سیکڑوں لڑا اٹھانے میں مصروف ہو چکی  
تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں پرانی شناسائی  
ہو۔ اور پھر یہ شناسائی ماشاء اللہ بڑھتی ہی چلی گئی۔

نامہ بیگم ہر روز دوپہر کو خراماں، خراماں اپنی  
طرف سے نکلتیں اور شمسہ بیگم کے ہاں آ بیٹھتیں۔  
گھنٹوں مکرم کو کھلاتی رہتیں۔ ریشم سے ادھر ادھر کی  
باتیں کرتی رہتیں۔ یہ پیاری سی لڑکی اور اس کی بھولی  
بھالی غریبانہ باتیں انہیں بہت اچھی لگتیں۔ اکثر دل ہی  
دل میں اس کا موازنہ اپنی مغرور بہو سے کرنے لگتیں تو  
ان کی اندر کی آنکھیں کھلتی چلی جاتیں۔ سوچتیں۔

”دونوں ہی اللہ کی مخلوق ہیں مگر دونوں میں کیسا  
زمین آسمان کا سا تضاد ہے، ایک سادگی کا مرقع اور  
گلدڑی میں چھپا اعلیٰ ہے تو دوسری دکھاوت اور ملاوت  
کی پوٹ۔۔۔ فقط اس لیے کہ ایک غربت کی گود میں  
پرورش پانے والا ہیرا تو دوسری منہ میں سونے کا مچھ لے  
کر پیدا ہوئی ہے، وقت اور حالات کی گردش بھی کیا، کیا  
گل کھلاتی ہے۔“ غرض یہ کہ جوں، جوں دن گزرتے  
جا رہے تھے، مکرم اور ریشم کی الفت ان کے دل و دماغ

منزلے گا۔“ متین احمد ہنس کر کہتے۔  
 ”اے ہائے ایسا غضب مت کر دیجیے گا۔“ وہ  
 دہل کر منع کرتی۔ ”نامہ کا غصہ معلوم نہیں ہے کیا؟  
 لڑکے کو زندہ چھوڑ دیں گی بھلا؟“  
 ”اماں بس دیکھتی رہو، آگے، آگے ہوتا ہے کیا۔  
 یہ سب ایک ہی تھلی کے پٹے بٹے ہیں کیا ماں، بیٹا، کیا  
 دادی، پوتا اور کیا ساس، بہو۔ سب ایک ہو جائیں  
 گے اور ہم تم ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جائیں  
 گے۔“ متین احمد ان کو تسلی دیتے۔  
 ”معلوم نہیں کیا، کیا گل کھلاتے رہتے ہیں۔“ وہ  
 براہمان کر کہتی۔

”خود ہی ریشم کو یہاں بلوایا، ترکیبیں لڑائیں  
 ملوانے کی۔ اب خود ہی اس طرح کی باتیں بھی  
 کرتے رہتے ہیں ہم کیا کریں یہاں تو ڈرا سے پڑا  
 ہو رہا ہے۔“



شمسہ بیگم نے ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے  
 سر لے لی تھی مگر اب چاروں اطراف کے نظروں نے بھی  
 انہیں گھیر رکھا تھا۔

بابر اور روبی بھی گھوم پھر کر واپس آتے والے  
 تھے۔ دوسری طرف انہیں شرمین اور اس کی دادی اماں  
 کا بھی خیال تھا۔ سوچتی تھیں کہ اگر نامہ مان گئیں اور  
 پھر شرمین کی دادی اماں نہ مانیں تو کیا ہوگا؟ خاور کی  
 مایوسی تو اسے جیتے جی مار ڈالے گی۔ اس لیے زیادہ بہتر  
 ہے کہ کسی صورت ان کا عندیہ بھی لے لیا جائے تاکہ  
 بات صاف ہو جائے۔

بہت غور و خوض کرنے کے بعد ایک دن انہوں  
 نے ریشم کو ڈاکٹر کو دکھانے کا بہانہ کیا اور دونوں ماں،  
 باپ بیٹے کو لے کر شرمین کے ہاں آئیں تاکہ سب  
 لوگوں سے ملاقات بھی ہو جائے۔

یہاں تو ریشم کی آمد خوشخبری کی طرح اندر باہر  
 گھوم گئی۔ آن کی آن میں ہر کوئی بھاگا چلا آیا۔ سب  
 نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا، ذکیہ خالہ دوڑی چلی آئیں۔

پرگھری ہوتی جا رہی تھی۔  
 ایک وہ ہی کیا۔ مکرم دیکھتے ہی دیکھتے گھر بھر  
 کی آنکھوں کا تار اٹھتا جا رہا تھا۔ کوئی ایک ہل اسے  
 آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ ابھی اسے معصومہ  
 گدگد رہی ہے تو ابھی کامی، جانی اور افشاں اسے  
 گودوں میں بھرے گھوم رہے ہیں، اسپتال سے آکر  
 خاور اسے بلوا لیتے اور تو اور کبھی کبھار ڈیوٹی سے گھر  
 آنے والا خسر بھی اس ننھی سی جان کا شیدائی ہو چکا  
 تھا۔ گود سے چپکا تا تو واپس دینا بھول جاتا۔ ظاہر ہے  
 اولاد تو اسی کی تھی ماں وہ بھی سب سے خوب روز بروز  
 مانوس ہوتا جا رہا تھا۔

نامہ بیگم اس کا اس قدر خیال رکھتی، لاڈ کرتی،  
 چاؤ چوتھیلے اٹھاتی جیسے وہ انہما کے گھر کا ایک فرد ہو۔  
 ایک سے ایک مارکیٹ سے جوڑے، کپڑے اور  
 کھلونے منگوا منگوا کر دے چکی تھیں۔

کچھ ہی عرصے کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ وہ شرم  
 بیگم کے بجائے نامہ بیگم کے گھر میں پایا جائے لگا۔ فقط  
 فیڈ کرانے کے لیے ریشم کے پاس بھیجا جاتا۔ متین احمد  
 جب بھی زمینوں سے واپس آتے، تمام داستانیں اور  
 کارروائیاں بیوی کی زبانی سنتے تو ان کے فنگ شکف  
 قہقہوں سے ان کی کوٹھی گونج اٹھتی۔ بیوی کو جی بھر کے  
 شاباشی دیتے۔ ریشم کو خوب مبارک باد دیتے اور خرم  
 بروقت دستیاب ہو جاتا تو وھمو کے مار، مار کے اس کی  
 پیٹھ لال کر ڈالتے۔

”واہ میرے مٹی کے شیر.....!“ وہ اسے  
 چھیڑتے۔ ”خوب چھپے رہتے نکلے۔“

”بس سمجھو پھر میں جو تک لگ چکی ہے۔“ نامہ  
 بیگم کا حال دیکھ، دیکھ کر بیوی سے کہتے۔ لیکن کسی، کسی  
 دن شمسہ بیگم پریشان ہوا ہتھیں اور ہول ہول کر کہتی۔  
 ”اجی میں کہتی ہوں یہ اونٹ آخر کس کروٹ  
 بیٹھے گا؟ جس روز بھی یہ ڈھول کا پول کھل گیا نامہ بیٹھے  
 سے اکھڑ جائیں گی۔ سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔“

”خرم کو آگے کر دیں گے۔ خود ہی پٹ پٹا کر





### سجانی

شہر نگاراں میں رہتا تھا  
شہر خوشاں جب پہنچا  
حدنگاہ تک دیکھا میں نے  
آبادی ہی آبادی تھی  
نہ کوئی خواب جاگ رہا تھا  
نہ کوئی خواہش بول رہی تھی  
خاموشی کی چادر اوڑھے  
ساری بستی سو رہی تھی  
درختوں پہ بیٹھے کچھ پرندے  
اپنی بولی میں کہہ رہے تھے  
تخت مٹی، تاج مٹی، سب مٹی ہو جاتا ہے  
مٹی کے بچھونے پر بندہ مٹی اوڑھ کے  
سو جاتا ہے

شاعرہ: نجمہ ناز اعظمی، کراچی

پیاری، پیاری حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے گزردہا  
تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے معصومہ کی سرگرمیوں پر  
زیادہ غور کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

رولی کے جہیز میں آرائش خانہ کا بہت سا سامان  
تھا جو ہنوز پیک حالت میں ہی پڑا تھا۔ معصومہ نے بڑی  
ہمت اور جرأت سے کام لے کر یہ تمام پیننگ کھولی،  
ملازموں اور ریشم کی مدد سے ساری کوٹھی کو از سر نو ترتیب  
دے ڈالا۔ ڈرائنگ روم میں رولی کے جہیز کے نئے  
قالین، صوف، سیٹ، کچھ مختلف آرائش کے سامان کے  
ساتھ، ساتھ قیمتی پینٹنگز بھی لٹکوا کر سجائیں۔ ضروری  
اضافے کیے ڈرائنگ ہال اور لاونج میں چونکہ ٹائمے بیگم  
زیادہ توجہ نہ اعتراض کیا اس لیے معصومہ کی بہت حوصلہ  
افزائی ہوئی رہی اور وہ مزید خوش ہو، ہو کر آرائش خانہ  
میں مصروف رہی اور ترامیم اضافے کرتی رہی۔ اسے  
اس خیال سے خاصی خوش ہو رہی تھی کہ بھائی اور بھابی

”اسے کہے گا کون، میں کیا خود کم ہوں ان کی  
پھولی.....“ وہ اقرار میں سر ہلا کر بولیں۔

”ہاں یہ تو آپ نے سچ کیا، کہاوت مشہور  
ہے۔ ”ماں، بیٹی دو ذات، بھینٹی، بھینٹی ایک ذات“  
دیے میں کبھی ان کی والدہ وغیرہ نے کوئی بات کہلوائی  
ہے۔ ”شمس بیگم ان کی سادگی پر مرئیں، محبت آمیز لہجہ  
میں بولیں۔

”جب موقع ہوگا، انشاء اللہ وہ بھی ضرور آپ  
کے پاس حاضری دیں گی۔ سچی بات ہے مجھے تو آپ  
کی پولی دل و جان سے بہت پسند ہے اس لیے احتیاطاً  
آپ سے تذکرہ کر دیا۔“

”اللہ آپ کو سکھی رکھے، تندرستی قائم رکھے۔“ دادی  
اماں نے انہیں دل سے دعا دی۔ وہ متاثر ہو کر بولیں۔

”میرے کہہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کہیں  
سے ذکر وغیرہ آئے تو آپ ذہن میں میری بات کو  
بھی رکھیے گا۔ اللہ اور اس کے حبیب نے چاہا تو جلد  
ہی کوئی سبیل نکلے گی اور ہم آپ کے پاس حاضر ہوں  
گے۔“ ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو جمع ہو گئے  
تھے مگر انہوں نے غیر معمولی ضبط سے کام لیا اور  
آہستہ سے بولیں۔

”بی بی یہ تمہاری قدر دانی اور محبت ہے، جب  
جی چاہے آؤ، تمہارا اپنا گھر ہے، ہمارے سر آنکھوں  
پر آؤ۔“

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ ذکیہ خالہ، مکرم کو گود میں  
لپے لیے آگئیں۔ ان کے پیچھے ہنستی اور ریشم بھی تھیں۔  
”بھئی پیاری بو اور شرمین نے مل کر سب کی خاطر  
تواضع کا بہت معقول انتظام کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے  
بعد سب لوگ کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

باہر اور رولی کے آنے میں چند روز باقی تھے، سبھی  
کو ان کے آنے کی خوشی اور چاہت تھی مگر سب سے  
زیادہ خوشی کا اظہار معصومہ کی طرف سے ہو رہا تھا۔  
ٹائمے بیگم کا زیادہ وقت تو مکرم کی معصوم، معصوم

آکر دیکھیں گے تو بہت خوش ہوں گے اور اس کی تعریف کریں گے۔

خلاف معمول خاور بھی کہیں، کہیں اس کے مدد گار رہے اور مختلف معاملات میں اسے اپنے مشوروں سے نوازتے رہے۔ اتفاق سے دونوں گھروں کے بڑوں میں سے کسی نے اسے روکا اور نہ ٹوکا۔ وہ انہی خوشی اپنے کام میں مگن رہی۔ چنانچہ جب وہ ساری جہاڑ کر چکی تو کوٹھی اندر سے واقعی جھلکا اٹھی۔

اپنی کارگزاریوں پر وہ اترا نہ لگی۔ ریشم کو بھی یہ سب تیاریاں دیکھ، دیکھ کر روبرو سے ملنے کا بے پناہ اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔

بالآخر وہ وقت بھی آ گیا اور وہ دونوں اپنے گھر اترے۔ دونوں تقریباً ڈیڑھ دو ماہ کی سیر و تفریح کے بعد آئے تھے اور اسے خوش و خرم اور اسے حسین و دلکش لگ رہے تھے کہ نامہ بیگم نے بے اختیار دونوں کی بلائیں لے ڈالیں۔ دوپہر کا وقت تھا، اچانک ہی آہنیچے تھے اس لیے شمسہ بیگم کے ہاں کسی کو خبر ہی نہیں تھی۔

نامہ بیگم بیٹے اور بہو کو پیار کر کے نماز ظہر کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ معصومہ، روبرو کا ہاتھ پکڑ کر خوشی، خوشی ڈرائنگ روم میں لائی اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے تاکہ بھانوج سے داد وصول کر لے۔

روٹی کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتی رہی پھر اچانک ہی غم و غصے کی شدت سے اس کا بدن کاچنے لگا۔ برداشت نہ ہو سکا تو چلا کر بولی۔

”یہ میرے جہیز کا سامان کس بد بخت نے نکالا ہے؟ کس نے یہ جرات کی ہے؟ آج میں اس کا حشر بگاڑ دوں گی۔ کیا لاکھوں کا جہیز اس لیے زانی تھی کہ اس کی یہ گت بنائی جائے؟ کیا مجھے کسی ٹٹ پونجیے خاندان کی سمجھا ہے کہ میں کسی سے دب کر رہوں گی؟“ اس کی چیخ دھماکی آوازیں ہر جگہ گونج گئیں۔

اچانک اس پر مزید جنون طاری ہو گیا۔ اس نے ایک بھاری گھدانا اٹھایا، وہ بالکل آپے سے باہر ہو چکی تھی۔ چیخ کر بولی۔

”لو میں خود ہی ختم کیے دیتی ہوں، نہ ہوگا بانس نہ بچے گی بانسری۔۔۔۔۔“ کہتے، کہتے اس نے گھدانا پوری قوت سے سامنے بچے ہوئے شوئیس پر دے مارا۔

ایک زوردار دھماکے کے ساتھ شوئیس کا شیشہ ٹوٹا اور نوٹیلی کر چیاں دور، دور تک بکھر گئیں۔ معصومہ چیخ مار کر باہر بھاگی۔

”اماں..... اماں..... دیکھیں بھابی جان کیا کر رہی ہیں؟“ نامہ بیگم اس کی چیخ پر ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے آئیں۔

مگر یہاں تو ایک طوفان بدتمیزی مچا ہوا تھا۔ ہر طرف ٹوٹے ہوئے ظروف، کاغذ، ریزوں اور ٹکڑوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

نامہ بیگم کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ان کی قوتِ مویائی جیسے سب ہو کر رہ گئی۔ اس المناک واقعے کے بعد انہیں صحیح معنوں میں چپ لگ گئی۔ معصومہ الگ اسم کر رہ گئی۔ کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔

نامہ بیگم جو اپنے کمرے میں تھیں تو باہر نکلتا ہی بھول گئیں۔ نئی، نئی سوچوں نے انہیں غڈ حال کر کے رکھ دیا۔ یوں تیسے لگا چند گھنٹوں کے اندر، اندر گویا کسی نے ان کا خون نچوڑ لیا ہو۔

روتے، روتے معصومہ نے کسی نہ کسی صورت ڈرائنگ روم کی صفائی تو کر دادی تھی مگر اماں کی غیر معمولی خاموشی اور عجیب سے سکوت نے اسے اندر ہی اندر بری طرح سہاڑا لیا تھا۔ وہ کئی بار وقفے، وقفے سے ان کے کمرے میں جھانک آئی تھی مگر وہ چپ چاپ لیٹی رہیں۔ آج انہوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا نہ شمسہ بیگم کی طرف گئیں۔ مگر م کو بھی نہ بلوایا۔ معصومہ بہت خوف زدہ تھی ان کی طرف سے۔

شمسہ بیگم کو بھی روٹی کی حرکت کا علم ہو گیا تھا۔ وہ دانستہ اس طرف نہ آئیں۔ آخر کو بیٹی کا سسرانی معاملہ تھا۔

گرمی کی طویل دوپہر بیت گئی۔ شام جھک آئی۔ چائے کا وقت آ گیا مگر نامہ بیگم اپنے کمرے سے باہر نہ



### عزل

کرتی نہیں ہوں بات میں اس بات کے سوا  
چارہ نہیں ہے کوئی ملاقات کے سوا  
میں بن چہ مدہوش ہوں جب تک وہ ساتھ ہے  
پھر یاد کچھ رہتا نہیں اس ساتھ کے سوا  
ہوں کس کس ہاتھ کا لیے سرور کس قدر  
اب ہاتھ ملائی نہیں اس ہاتھ کے سوا  
کل بھی ملے تھے دیکھا تھا پر بات نہ ہوئی  
کیسے ہو، ٹھیک ہوں شکر اس بات کے سوا  
مجبوریوں کی قید میں احساس کھوئے جو  
سب مل گئے مجھے تیرے جذبات کے سوا  
ان بے خواب آنکھوں میں سپنوں کو توڑ کر  
نٹھری اداسیاں بھی ہیں برسات کے سوا  
از: خولہ عرفان، کراچی

”آج کتنا سوؤ گی؟ یہ دیکھو کون آیا ہے  
تمہیں جگانے کے لیے۔“ مگر انہوں نے آنکھ کھول بھی  
نہیں دیکھا۔

اتنے میں کرم نہیں سامنے دیکھ کر چل اٹھا اور  
ان کے پاس جانے کے لیے ان کی طرف گرنے لگا۔  
شمسہ بیگم نے موقع غنیمت جان کر اسے بند پر  
بٹھایا۔ وہ دونوں ننھے منے ہاتھ ان کی کمر پر مارنے لگا۔  
”ہائے.....“ شمسہ بیگم نے ایک دفعہ پھر انہیں  
محبت سے پکارا۔

مگر وہ ان کی پکار سے زیادہ کرم کے ہاتھوں کے  
لمس سے اٹھ بیٹھیں پھر اچانک ہی معلوم نہیں کیا ہوا،  
انہوں نے دھمکتے ہوئے کرم کو اٹھا کر بازوؤں میں بھر لیا  
اور بچوں کی طرح پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگیں۔  
شمسہ بیگم بوکھلا اٹھیں، ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ  
وہ کیا کریں؟ انہوں نے اپنی آج تک کی زندگی میں جو  
نہیں دیکھا تھا، وہ آج دیکھ رہی تھیں۔ واقعی آج کا دن  
عجیب دن تھا۔

آئیں۔ ایک جاہل سا ناان کے جسم و جاں پر جاری تھا۔  
گہری خاموشی اور سکوت کا عالم تھا۔

آج کا دن اپنے دامن میں جانے کیا کچھ لیے  
ہوئے تھا۔ معصومہ نے ایک بار پھر ڈرتے، ڈرتے ان  
کے کمرے میں جھانکا مگر وہ دوپہر کی طرح ہی بے مدد  
پڑی تھیں۔

اس دفعہ اس سے رہا نہ گیا۔ وہ تیز قدموں سے  
پھوپھی کی طرف آئی، وہ بیٹھی ہوئی کرم کو کپڑے  
پہنا رہی تھیں۔

”پھوپھی جان.....!“ اس نے گھبرا کر  
انہیں پکارا۔ ”اماں جان کو دیکھیے چل کر۔ سارا دن گزر  
گیا ہے ایک کھیل اڑ کر ان کے منہ میں نہیں مٹی  
ہے، کمرے میں لیٹی ہیں۔“ شمسہ بیگم نے پریشانی کے  
عالم میں ماتھے پر ہاتھ مارا اور بولیں۔

”الٹی! اب کون سے کو تک ہاتی رہ گئے ہیں  
ہونے کو؟“ پھر معصومہ سے دریافت کیا۔ ”اور تم.....  
تمہاری بھانج کہیں گئیں ڈراما چاکر؟“

”اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔“ اس نے بسور  
کر جواب دیا۔

”اچھا تم یہیں رکو۔ ہم دیکھتے ہیں۔“ شمسہ  
بیگم نے معصومہ کو ہدایت دی اور جلدی، جلدی کمرے کو  
تیار کرنے لگیں۔ آج بچہ دن انہیں بہت بھاری لگ  
رہا تھا۔ آٹھن میں خاور بھی اندر داخل ہوئے مگر پھوپھی  
نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ معصومہ کو بھی آنکھ کے  
اشارے سے منع کیا..... معلوم نہیں وہ کبھی یا نہیں

خاور، کرم کو گدگداتے گئے تو وہ ہنسنے لگا۔

شمسہ بیگم اسے اٹھاتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”لاؤ، آج ان کی خاص ضرورت ہے۔“

خاور کچھ نہ سمجھے، وہ کرم کو گود میں بھر کر چل دیں۔ ہائے  
بیگم کے کمرے میں آئیں تو دماغ میں سواندیشے رنگ  
رہے تھے۔

”اے ہائے.....“ انہوں نے اندر مچھتے ہی انہیں

زور سے پکارا۔

کمرے میں نائمہ بیگم کے زور شور سے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں اور مکرم ان کے گلے سے چپکا ہوا تھا۔

جوں، جوں وقت گزر رہا تھا، ان کے رونے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، شدت بڑھتی جا رہی تھی، حتیٰ کہ شمس بیگم ڈر سی گئیں، وہ ان کے قریب مسمری پر ہی بیٹھ گئیں اور ان کا شانہ ہلا کر بولیں۔

”نائمہ.....! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”تم تو بچوں سے بدتر ہو گئیں؟“

”یہ اس قدر شدت سے رو کیوں رہی ہو؟“

”کہیں ایسا بھی دنیا میں ہوتا ہے؟“

”کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا؟ خدا کے لیے چپ

ہو جاؤ۔“

”چپ ہو جاؤ نائمہ.....! دیکھو ہمارا بھی دل گھبرانے لگا ہے۔“ ان کی آخری بات سن کر نائمہ بیگم نے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں ان پر گاڑ دیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

”تپ نے بھلا کسی اور کو ہم سے زیادہ قسمت کاٹنا دیکھا ہے۔ شمسہ آیا! کوئی دوسرا ہوگا ہم جیسا کم نصیب.....؟“

”اے ہے۔ خدا کے خوف سے ڈرو نائمہ تم۔“ شمس بیگم نے دہل کر جواب دیا۔

”ایسا تمہارے ساتھ نصیبوں نے کیا ظلم کر دیا؟“

انہوں نے اچانک بڑی درومندی سے سوال کیا۔

”آپ ہی بتائیں، ہم نے اپنی اولاد جیسی بہو کے ساتھ کیا برا سلوک کیا ہے؟ وہ کیوں ہم سے برگشتہ رہتی ہے؟“ ان کے سوال سے شمس بیگم ٹھک کر رہ گئیں۔ انہیں اپنا آپ چور سا محسوس ہونے لگا۔ مگر نائمہ بیگم ان کے احساسات سے بے خبر بہتی چلی گئیں۔

”ضرور ہم سے کوئی بہت بڑی خطا ہوئی ہے شمسہ آپ..... ہم سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے جس کی سزا ہمیں اس شکل میں مل رہی ہے، خدا کے لیے ہمیں مشکل سے نجات دلائیں۔“ شمس بیگم نے ہمت کر

کے پوچھا۔

”آخر کیا ہے تمہارے دماغ میں؟ کھل کر بتاؤ تو سمجھ میں آئے؟“ وہ کسی سوچ سے بلبل کر بولیں۔

”آپا! ہم نے ایک دن محصور سے پوچھا تھا وہ کہہ رہی تھیں کہ اپنی ڈاکٹر شاگرہ سے اس لڑکی کا پتا معلوم ہو سکتا ہے جو بچوں کو پڑھانے یہاں آیا کرتی تھی۔“ ان کے آنسو اب تک متواتر بہہ رہے تھے، خوشامد سے بولیں۔

”آپا! آپ اس سے ملو ادیں ہمیں، ہم نے اسے بہت بری طرح جھڑکا تھا بلکہ گائیاں بکی تھیں، ضرور اس محصور کا صبر پڑ رہا ہے ہم پر..... ہمارا صبر و قرار لٹ کر رہ گیا ہے۔“

شمس بیگم کے دل کی کلی کھل گئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ انہوں نے دل کھول کر انہیں بولنے دیا۔ جب وہ بول، بول کر تھک گئیں تو انہوں نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔

”اگر تمہارے دکھوں کی درماں وہی لڑکی ہے تو اس سے مل لینا کوئی مشکل ہے؟ ہم اپنی سی کوشش کر لیں گے..... مگر.....“ انہوں نے بات کو دانستہ ادھوری چھوڑ دیا۔

”مگر.....؟ مگر کیا.....؟ کہیں اس لڑکی کی شادی تو نہیں ہو گئی؟“

شمس بیگم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور دل میں سوچا۔

”تو یہ..... اس انداز سے سوچ رہی ہیں؟“ پھر لا تعلقی سے ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہو سکتا ہے شادی ہو گئی ہو مگر تمہیں کیا فکر اس کی شادی کی.....؟“

”پھر..... ہمارے خاور کا کیا بنے گا؟“ نائمہ بیگم نے جیسے کسی چوٹ سے بلبل کر بے اختیار کہا۔

تیر ٹھک نشانے پر لگا تھا۔ شمس بیگم پُر اسراریت سے مسکراتے لگیں۔

عین اسی وقت ریشم، مکرم کے لیے پانی کا فیڈر

1987ء سے خدمت میں مصروف

## LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلہری  
قابل علاج مرض ہے

## STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

**اجمل زیدی** کے دو بیٹے کسٹار کا مستقبل پریشان  
 سنی  
 ایورڈ  
 ہولڈر

ملٹی  
ایوارڈ  
بولڈر



ASIAN EXCELLENCE  
PERFORMANCE AWARD



**AWARD OF  
BEST ACHIEVEMENT**

اسلام آباد

9- اپریل 30۴ مکی  
9- اگست 30۴ شمیر  
9- اکتوبر 30۴ جنوری



**AWARD  
PILLAR OF LEUCODERMA**

لاہور

کلف سیٹر

۱۴- فروری ۲۷ فروری

فصل: 16  
روز: 10

0300-8556188



14- جرن 27 جرن

५३१-२७५३१-१४

پشاور

پیشکش

یکم فروری ۱۹۶۵ فروری

یہ لکھنا ہے کہ جو کہ

0300-8566156



نیم جون ۱۱۵ جون

مجله کتب ۱۱۵۷ - استور

## ملتان

بریل

28 مارچ 6۲ء - اپریل

*(Signature)*

4542803 (0300-8586188)



28 جولائی کی 65-اگست

28 نومبر 75ء دہلی

کراچی

فردی و خانوار

27-13

فیس 708 - 7 غور مشاہیر اور اعلیٰ  
مری ماسٹاپ جیٹوئی K.F.C. کوئی

021-7012068-B  
0300-8366188



۱۳۔ جولائی ۲۷ء جولائی ۲۷ء

13- لومبر 27ء

E-mail: syedajmal2004@hotmail.com - syedajmal2004@yahoo.co.uk



بھی چکی ہیں۔

اور اسی رات کو..... روٹی کے کمرے میں روٹی، معصومہ، باہر اور خاور کے قہقہے گونج رہے تھے۔  
"خاور..... پھولی جان نے بھی کیسے، کیسے پاپڑ بیٹے ہیں تم لوگوں کے لیے..... ساری زندگی ان کے احسان مند رہنا۔" باہر بولے۔

"لیکن..... بھالی جان..... ایسے سب تو ٹھیک ہے مگر اب آپ اماں جان کو کس طرح منائیں گی؟ ان کا دل آپ کی طرف سے تو واقعی بہت ٹوٹ چکا ہے۔ انہیں بھلا کیا معلوم..... آپ انہیں دولت مندوں سے متفر کرنے کے لیے کیا، کیا اور کیسے، کیسے ڈھونڈ رہا رہی تھیں۔" معصومہ فکر مندی سے گویا ہوئی۔

"اس بات سے تم نے فکر رہو، خاور اور شرمین کا کل رشتہ پکا ہوتا ہے ہی میں انہیں تمام حقیقت سے خود آگاہ کر دوں گی۔" روٹی نے شوخی سے جواب دیا۔ مسکراتے ہوئے خاور نے مارے خوشی کے آگے بڑھ کر روٹی کو شانوں سے پکڑ کر پورے کمرے میں ایک زور دار چکر دے ڈالا۔ اس وقت ان کا چہرہ اندرونی مسرتوں کا آئینہ دار ہو رہا تھا۔ دفعتاً باہر ان دونوں کے درمیان آتے ہوئے شرارت سے بولے۔

"ارے ڈاکٹر صاحب..... ذرا اپنی خوشیوں میں ہماری خوشی کا بھی خیال رکھیے..... احتیاط لازم ہے۔" سب لوگ حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ وہ مسکرا کر بولے۔

"انری ڈاکٹر صاحب..... آپ جلد ہی چچا بننے والے ہیں، اور یہی خوشخبری سنا کر ہم اماں جان کو منائیں گے۔"

ان سب سے دور دروازے کے قریب خرم اور ریشم..... ہاتھوں میں ہاتھ لیے کھڑے سب کی شرارت دیکھ اور سن رہے تھے، مسکرا رہے تھے اور ان دونوں کا جنگل کا پھول اپنی دادی جان کی گود میں لینا کھلکھلا رہا تھا۔

شتم شد

لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

اسے دیکھ کر نائٹ بیگم نے اپنے بچے آنسو پونچھ لیے اور نند سے سرگوشی میں بولیں۔

"آیا! یہ بھی کسی کی اولاد ہے اور اب کسی کی بہو بھی..... جس قدر خوش بخت ہے وہ ساس اور بیٹا، جس کی یہ بہو اور بیوی ہے۔" قریب آ کر اس نے دیکھا مکرم، نائٹ بیگم کے کندھے سے لگے، لگے سو گیا تھا۔ ریشم نے اسے سہولت سے دیں مسمدی پر لٹا دیا۔

شمر بیگم نے ریشم کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور بولیں۔  
"آج تو ہماری آپا تمہاری بہت تعریف کر رہی ہیں۔" نائٹ بیگم نے برملا اقرار کیا۔

"ہاں یہ ہے ہی تعریف کے قابل، نہ میرا اس سے رشتہ تاتا مگر روز میری خدمت پر کمر بستہ رہتی ہے، کبھی سر میں تیل ڈال رہی ہے، کبھی پٹیا گوندھ رہی ہے، سچ کہا ہے کسی نے گدڑی میں لعل ہوتے ہیں، یہ چلی جائے گی تو بہت یاد آئے گی۔"

شمر بیگم نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔ سر پر گویا کفن باندھ کر بولیں۔

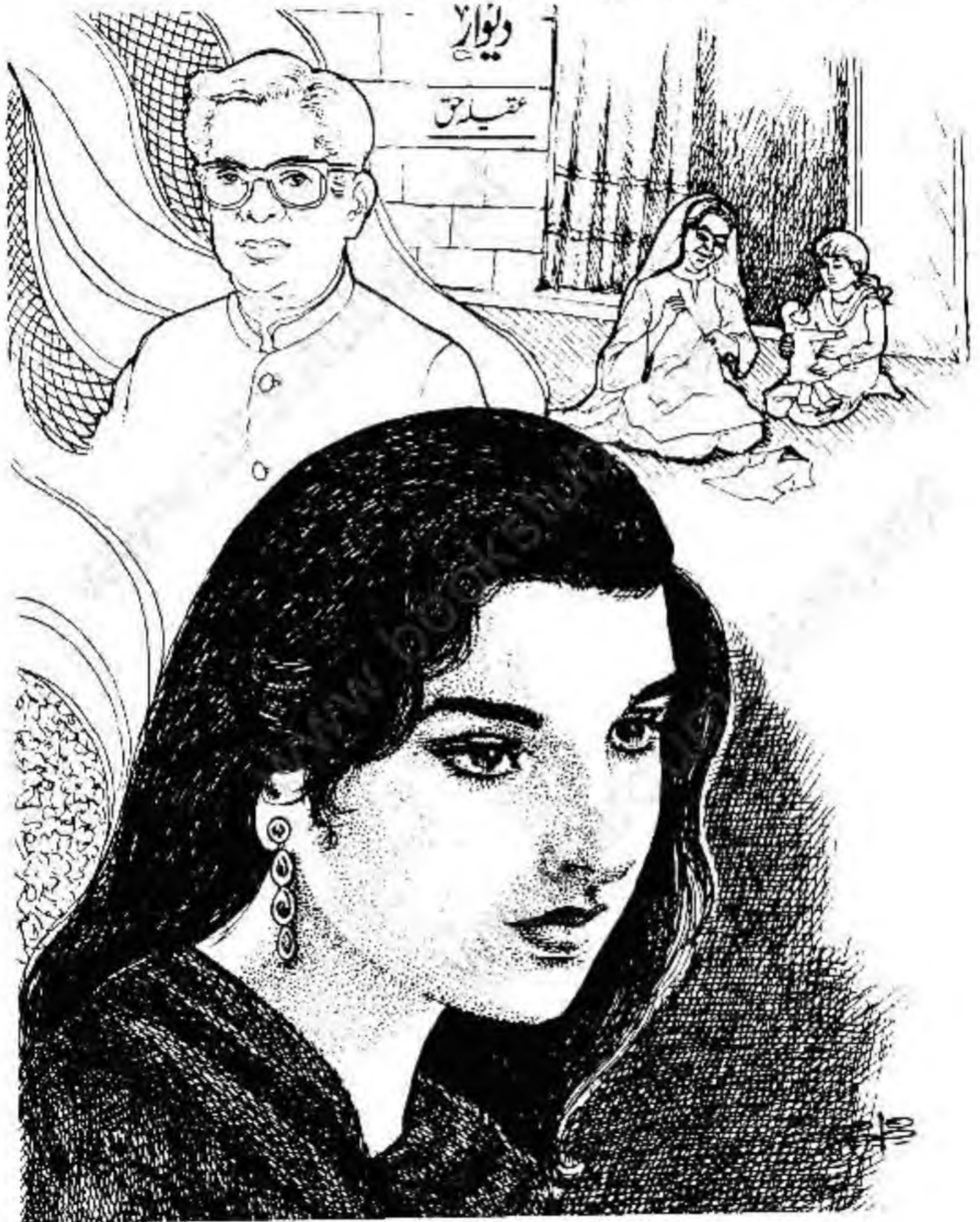
"چلی کیوں جائے گی۔ تمہاری اصلی بہو ہے سہی رکھوانے پاس..... اے بائے۔ یہ خرم کی دلہن ہے، رحمت علی خان دراصل متین احمد کے دوست تھے، مرتے دم اپنی بیٹی شبنم احمد کے سپرد کی اور خرم سے نکاح کر گئے تھے۔" شمر بیگم نے سچ جھوٹ ملا کر پوری کہانی سنا ڈالی۔ پھر ہنس کر اضافہ کیا۔

"اور تمہاری وہ ہونے والی بہو شرمین بھی کہیں نہیں گئی۔ انشاء اللہ کل ہی سب کے ساتھ خاور کا رشتہ سہلے کر جاؤں گی۔" نائٹ بیگم جو آنکھیں پھاڑے ریشم کو دیکھے جا رہی تھیں۔ بے اختیار ہانپیں پھیلا کر بڑھیں اور اسے گلے سے چمٹالیا۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کب اور کن حادثات میں خرم نے بیاہ بھی رچا ڈالا تھا۔ شاید اس سے آگے انہوں نے کچھ نہیں سوچا کہ شمر بیگم کون، کون سی کہانیاں سنا

دروازے پر دستک مسلسل ہو رہی تھی.....  
 دستک کے دوران، ٹھنڈائی ہوئی سرگوشی ابھرتی.....  
 اور سرگوشی کے ساتھ دستک تیز ہو جاتی..... دستک  
 دینے والا تھک نہیں رہا تھا۔ وہ واپس جانے کے لیے  
 نہیں آیا تھا۔ دستک اب دھڑ دھڑاہٹ میں اور  
 سرگوشی گراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔  
 بوسیدہ دیواروں والے اس کمرے میں، ہلے  
 ہوئے دروازے کی کھڑکی لگائے، چٹنی پڑھائے،

دیوار

عقیدہ



خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتی..... دیوار سے لگی، اپنے آپ میں کھنٹی، وہ کپکپاہی تھی۔ کسی بھی لمحے دروازہ ٹوٹ سکتا تھا۔

بے بسی اور خوف، اس کے کمزور وجود کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ آنسو اس کے چہرے سے ہوتے ہوئے اس کے گریبان میں چھپ کر دبائیں مار رہے تھے۔

پناہ اور پناہ گاہ کا فرق اسے رُلا رہا تھا۔

اس کا دل چاہا اپنے سینے میں کوئی خنجر اتار لے ایک دم اس کی نظر کونے میں رکھے ہوئے نمین کے صندوق پر پڑی۔ وہ ایک غیر مرئی قوت کے تحت اس صندوق کی طرف بڑھی اور بے تاب سے دھنسن کھولتے ہی۔ بے قراری سے صندوق کے اندر ہاتھ مارنے لگی جیسے کچھ دھونڈ رہی ہو اور پھر

☆ ☆ ☆

”اتو کیوں اس قدر مار کھاتی ہے..... اس ہر حرام اور ناشکی مرد کو ٹھوکر مارا اور میرے پاس آ جا.....“ مسز احمد نے بختاں کے جسم پر جہ بجانیل اور زخمیوں کے نشانات دیکھ کر ہمدردی اور غصے کے مے چلے جذبات کے ساتھ کہا۔

”میں نے حاجی صاحب کو بتایا تھا کہ تیرا میاں اس قدر ظلم کرتا ہے ان کو بھی بہت افسوس ہوا۔ کہنے لگے کہ اللہ رحم کرنے والوں کو، صلہ رحمی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اس بچی سے کہنا..... ہمارے گھر کے دروازے کسی مظلوم کو پناہ دینے کے لیے ہر دقت کھلے ہیں۔“ مسز احمد نے اپنے شوہر حاجی احمد علی کے بارے میں بتایا جسے سن کر عقیدت و احترام سے اس کا سر جھٹکا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

مسز احمد کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، ان کے سب بچوں کی شادیاں ہو گئی تھیں اور وہ سب امریکا میں سیٹل تھے۔... برسوں اپنی مصروفیات کی

وجہ سے ماں، باپ سے ملنے نہ آتے تھے۔ مسز احمد اور حاجی احمد علی تنہا تھے۔ حاجی احمد علی کا زیادہ تر وقت مسجد اور دفائی کاموں میں گزرتا۔... مسز احمد تنہائی کی ماری ہوئی عورت تھیں۔... اور بختاں ان کی قاطب بھروسہ ملازمہ۔ ایک ایسی ملازمہ جس پر وہ آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتی تھیں۔

آج کل کے دور میں با اعتماد ملازمہ اللہ کی نعمت ہوتے ہیں۔ اور مسز احمد دل سے چاہتی تھیں کہ بختاں رات دن کے لیے ان کے پاس رہ جائے تاکہ وہ گھر کی طرف سے بے فکر ہو کر..... اللہ کی طرف لگ جاسیں۔ لیکن بختاں

☆ ☆ ☆

”تجھے آج پھر دیر ہو گئی۔ بتا کہاں رک گئی تھی۔“ اس نے شکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”بتاناں چپ کیوں ہے؟“ شید سے نے اس کی لمبی چوٹی کو اپنے ہاتھ میں لپیٹ کر ایک زوردار جھٹکا دے کر پوچھا۔

بختاں علی الصبح جب شیدا گھری نیند میں مدہوش ہوا کام پر نکل جاتی۔ غلیم کالونی سے..... خیابان صابک وہ پیدل ہی جاتی تھی..... اور پھر تین بنگلوں میں کام

بڑے گھر والوں کے چھوٹے پن کو سہتے، سہتے..... شام تک وہ نڈھال ہو جاتی۔ جو کبھی کوئی باجی بچا ہوا سالن، رات کی روٹی، بچا کھچا قروت دیتی تو ایک دو کام وہ ایکسٹرا کروا لیتیں۔... اور بختاں سو گھی دوروٹیوں کے لیے مزید دو گھنٹے کام میں جُست جاتی۔

آج بھی شام والی باجی نے سارا کام منوا کر اس سے کہا کہ وہ رات کی بچی ہوئی بریانی لے جائے لیکن ہاتھ کے ہاتھ ریفریجر ضرور صاف کر دے..... ایک پلیٹ بغیر بوٹی کی بریانی اور تین ہاسی نان کے لیے اس نے بیگم ارشد کا ڈبل ڈور کا



لات مارتے ہوئے بولا۔۔۔ اور اس کی پھٹی چادر کے کونے میں بندھے نوٹ کھول کر گننے لگا۔

☆☆☆

بختاں کی شادی شیدے سے اپنے باپ کے وٹے پر ہوئی تھی۔ اس کے باپ کا دل گاؤں کی خوب صورت عورت پر آیا تو اس نے سولہ سالہ بختاں کو وٹے میں اس کے چالیس سالہ بھائی کو تھما دیا۔

باپ پر عشق سوار تھا۔ سو اس نے بختاں کی ماں کے مرنے کے صرف ایک ہفتے بعد ہی بختاں کو شیدے کے ساتھ بیاہ دیا اور خود اس عورت کو بیاہ لایا جس کے لیے اس نے اپنی بیوی کو انتہائی سختیوں سے مار ڈالا تھا۔ باپ اپنی من چاہی بیوی کے غرے اٹھانے میں مصروف ہو گیا اور وہ شیدے کی ماریں کھانے لگی۔

شیدائشی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا حرام بھی تھا۔ لہذا پہلے زیور، برتن کے پھر نوبت فاقوں سے ہوتی ہوئی بھیک مانگنے تک آگئی۔۔۔۔۔ تو وہ کراچی چلی آئی۔ نہ جانے کتنے برس ہو گئے نہ وہ کبھی واپس گاؤں گئی نہ ہی کوئی کبھی گاؤں سے اس کی خبر گیری کو آیا۔ یوں وہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو گئی۔ قسمت کی مار ایسی کہ اولاد بھی نہ ہوئی۔ لیکن ہاں یہ ضرور ہوا کہ شیدا چھوٹی موٹی برائیوں کو چھوڑ کر شہر کی بڑی لعنتوں میں گرفتار ہو گیا۔

☆☆☆

”اللہ کرے تو مر جائے شیدے۔۔۔۔۔ تجھے کوڑھ ٹپکے۔۔۔۔۔ تو بس کے نیچے آئے۔۔۔۔۔ تیرے ہاتھ پیر گل گل کر گریں۔۔۔۔۔ ارے اتنے ہم دھماکے ہوتے ہیں تو کبھی ہم دھماکے میں کیوں نہیں مر جاتا۔ روز لوگ سڑکوں پر مرتے ہیں تو کیوں کسی سڑک پر نہیں مر جاتا۔ نشہ، شراب، جوا اور اب طوائفوں کے کوٹھے پر بھی جانے لگا۔ اے میرے مالک۔۔۔۔۔! میں نے آج تک کوئی خوشی نہیں دیکھی تو مجھے زندگی میں ایک خوشی

ریفریکٹری جو اللہ کی نعمتوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں صاف کیا اور اس دوران وہ اللہ کی تقسیم پر حیران بھی ہوتی رہی اور صبر بھی کرتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ شیدا غصے میں پاگل ہو رہا ہوگا۔۔۔۔۔ اسے یقین تھا کہ آج وہ اس کو دھنک کر رکھ دے گا۔۔۔۔۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔

کٹے بالوں اور گوری رنگت والی، پڑھی لکھی ماڈرن سی باجی اندر سے بہت سخت گیر تھی۔ ایک سیکنڈ میں کسی غریب کو کیسا بے مول کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ جانتی بھی تھی اور سہتی بھی تھی۔

”باجی آپ مجھے میں روپے دے دیں۔“ بختاں نے نرم صوفے میں دھنسی، کاجو کھائی مسز ارشد سے منمناتے ہوئے کہا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ مسز ارشد جو تھوڑی دیر پہلے غریب اور مظلوم عورتوں کے ایک ادارے کا افتتاح کر کے آئی تھیں۔۔۔۔۔ نے کھر دے لہجے میں پوچھا۔ ”باجی دیر بہت ہو گئی۔۔۔۔۔ شیدا مارے گا۔“ اس کی مجبوری نے الفاظ کا روپ دھارا۔

”ایک تو بھی تم لوگ اور تمہارے مسئلے۔۔۔۔۔ یہ تو کبھی ختم نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ ہمارے پاس کون سے درخت لگے ہوئے ہیں۔ بہت محنت کرتے ہیں ہم لوگ بھی خیر۔۔۔۔۔“ مسز ارشد نے ایک طویل سانس لے کر اپنے پیر نرم و دبیز اٹالین قالین پر رکھے۔

”تم ذرا کولڈ کریم سے پہلے میرے پیروں کا مساج کر دو۔“ مسز ارشد نے اپنے ایمپورنڈ پیئڈ بیگ میں سے بیس کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک کام اور بتایا۔

اور بختاں ذہنی طور پر شیدے کی لاتیں اور گھونٹے کھانے کے لیے تیار ہو گئی۔

”کھانا دے۔۔۔۔۔ یا اب گھنٹے بھر ماتم ہی کرتی رہے گی۔“ شیدا جب مارتے، مارتے تھک گیا تو کونے میں گھڑی کی طرح پڑی بختاں کے پیٹ پر

جی کی بات کائی۔

”ہاں مرد جیسا بھی ہے۔۔۔ اس کی قدر کرو۔“ ملائی جی نے جھنگا سی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بختاں کو سمجھایا۔

”ملائی جی آپ نہیں جانتیں۔ وہ مجھے مارتا ہے، پیٹتا ہے، گندی گندی گالیاں دیتا ہے۔۔۔ میرے پیسے چھین لیتا ہے۔ میرے۔۔۔“ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں سب جانتی ہوں دیوار سے دیوار ملی ہے۔۔۔ میں سب سنتی ہوں بیٹا۔۔۔ میں بیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے، وہ سائبان جس کا نام مرد ہے۔۔۔ شوہر ہے۔ اس کے بغیر عورت کیسے کڑکتے موسم میں چلتی دھوپ میں ننگے سر اور ننگے پیر کھڑی رہ جاتی ہے۔۔۔ اس مرد کی گندی نگاہ کو بھی برداشت کرنی ہے جس کے بارے میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتی۔۔۔ ارے میری بچی۔۔۔ اسے کونسنے کے بجائے اس کے راہ راست پر آنے کی دعا کیا کرو۔“

”آپ نہیں جانتیں ملائی جی۔۔۔ وہ بہت بے غیرت ہے۔ وہ کبھی نہیں سدھرے گا۔۔۔ وہ کیا میری حفاظت کرے گا۔ ارے وہ تو خود کسی دن مجھے جوئے میں بار جائے گا۔ مجھے بچا ڈالے گا۔“ وہ سسک رہی تھی۔

”دنیا کا ہر مرد اس سے اچھا ہوگا۔۔۔ بہتر ہوگا۔ ارے اس کبخت سے جان چھوٹنے لگی تو میں بھی چند دن خوشی اور عزت سے گزار لوں گی۔“ ملائی جی اسے کیا سمجھا رہی تھیں پر بختاں سن سب رہی تھی اس کی تو اپنی سوچوں کے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

بیس بائیس سال کا سن گندی رنگت۔۔۔ پانچ فٹ سے ٹھکا قدر، متناسب بدن، کمر پر جھولتی لمبی ریشمی سیاہ چوٹی۔۔۔

”یہ کون ہے گدڑی میں لعل۔۔۔ بچہ ارشد

دے، دے۔۔۔ تو اس شیدے کو اٹھالے تو اس سے میرا چھٹا چھڑا دے۔“ عورت جو نشی مرد کے جوتے کھاکر کھنٹی سرتاج، سرتاج کی رٹ لگائے رکھتی ہے، آج اتنی بے کس و مجبور ہوئی کہ اس کے منہ سے اپنے ہی سرتاج کے لیے بددعا میں نکلنے لگیں۔

”بس کرو بختاں کتنی دیر سے تو اپنی زبان خراب کیے جا رہی ہے۔“ شیدا ابھی بختاں کو اچھی طرح مار پیٹ کر اس کی تنخواہ چھین کر یاہر گیا تھا اور اب محکم میں بیٹھی بختاں سینہ کو بلی کر رہی تھی۔ ملائی جی کی آواز پر وہ یک دم جیسے خاموش ہو گئی۔

چند لمحوں کی تاخیر کے بعد جب اسے شیدے کی گالیاں یاد آئیں تو وہ پھر سے رونے لگی اور ہاتھ اٹھا کر اسے پھر کوسے لگی۔

”پھر۔۔۔ شروع ہو گئی تو۔۔۔ میں منع کر رہی ہوں ہاں۔۔۔ بختاں۔۔۔“ ملائی جی نے محبت سے اس کے ہنجرے بال سمیٹتے ہوئے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ارے ملائی جی۔۔۔ آپ اللہ کی نیک بندی ہو۔ نماز پڑھتی ہو۔۔۔ قرآن پڑھتی ہو۔۔۔ آپ یہاں بیٹھو۔“ بختاں کو روتے، روتے خیال آیا کہ ملائی جی اپنے سفید براق پکڑوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ کچے فرش پر ہی آ بیٹھی ہیں۔۔۔ اس نے جلدی سے انہیں موڑھا نکال کر دیا۔ اس کی محبت اور مصومیت پر ایک لمحے کے لیے ملائی جی کے چہرے پر ایک خوب صورت مسکراہٹ رہ گئی۔

”اتنی محبت کرنے والی بختاں کسی کو کوس بھی سکتی ہے؟“ ملائی جی نے اس سے محبت بھرے انداز میں سوال کیا۔

”بیٹا مرد جیسا بھی ہو۔۔۔ عورت کے لیے سائبان ہوتا ہے۔ مجازی خدا ہوتا ہے۔ اس کی عزت و آبرو کا رکھوالا ہوتا ہے۔ اپنے مرد کی قدر کرو۔“

”ایسے مرد کی قدر کرو؟“ بختاں نے ملائی

آرام سے مان جائے گا یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

ارشاد صاحب کی حرکتیں اب اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ دو روٹیوں اور ایک جوز سے کپڑے کے لیے اپنی عزت کا سودا کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ دل سے چاہتی

صاحب نے معمولی کپڑوں میں ملبوس ڈسٹنگ کرتی ملازمہ کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا۔

”بجٹاں صاحب کے لیے ہاٹا لگاؤ.....“ مسز ارشد نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”بجٹاں، اچھا تو یہ بجٹاں ہے.....“ ارشد صاحب کی رال ہنسی۔

غور سے اس نے ایک صفت اللہ نے ایسی رکھی ہے کہ ہزار کے مجمع میں بھی اگر کوئی شخص اس کی طرف دیکھ رہا ہو تو اس کی نظر جا کر اسی پر پھیرے گی..... اور جس نظر سے دیکھ رہا ہے اس کے اندر آرام سا بچنے لگتا ہے..... اور اس کے اندر بھی آرام سا بچ گیا۔ اس نے سینے پر اپنا پھنسا ہوا دوپٹا پھیلا لیا..... اور پھر سارا دن وہ ارشد صاحب کے گھر میں ان کی ہوس بھری نظروں سے بچنے کی کوشش کرتی رہی.....

☆ ☆ ☆

”نہیں باجی اللہ کا شکر ہے۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔“ بجٹاں نے آرام سے کپڑوں کا شاپر واپس کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں تم رکھو..... ارشد بہت صاف ستھری طبیعت کے مالک ہیں، انہیں گھن آتی ہے۔ گندئی سے..... وہ تمہیں دیکھ کر ناراض ہوتے ہیں..... تم کپڑے رکھ لو اور کل سے نہ دھو کر صاف ستھرے کپڑے ہی پہن کر آنا۔“ مسز ارشد نے زبردستی اپنے پرانے سوٹ بجٹاں کو تھماتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔

مسز ارشد کافی کھلے گریبان اور تنگ فٹنگ کی کی قمیص پہنتی تھیں اور اس کی اتارن میں بجٹاں کو اپنا آپ چھپا ہوا مشکل ہو جاتا۔

☆ ☆ ☆

”شیدے تو کوئی کام کیوں نہیں کر لیتا۔“ آج جب بجٹاں کو شیدے کا موڈ روز کی نسبت قدرت سے بہتر لگا تو اس نے ڈرتے، ڈرتے اس سے کہا۔

”کام..... چل کر لیتا ہوں.....“ شیدا اتنے

**قارئین متوجہ ہوں**

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔

ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ **یک سال کا نام جہاں پرچا ملتا ہے وہ جہاں پرچا نہیں ملتا**

☆ **شہر اور علاقہ کا نام**

☆ **مکمل پتہ اور PTCL کی سربراہی کا فون نمبر**

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

**نصر عباس**

**03012454188**

**جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز**

**سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت**

**63-63 فی 111 ایڈیشن ویش ایڈنگ ادارتی میں کوئی روڈ، کراچی**

**35802552-35386783-35804200**

**ای میل: jdpgroup@hotmail.com**



تھی۔ گو کہ اس کو یقین تھا کہ شیدائیں مانے گا لیکن پھر بھی، وہ چاہتی تھی کہ شیدا کوئی کام کر لے تو وہ پہلی فرصت میں سزار شد کے گھر کا کام چھوڑ دے۔

”اچھا تو کام کرے گا؟“ بختاں کی آواز خوشی سے کپکپائی۔ ”کیا کام کرے گا؟“ وہ بے قرار تھی۔

”جو تو کہے.....“ شیدے نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔

”تو ایسا کر ٹھیلہ لگالے.....“

”کیا مطلب.....؟“

”ہاں..... ہاں ٹھیلہ لگالے..... ہر مال دس، دس روپے کا۔“

شیداء بختاں کی خوشی پر بے ساختہ ہنس دیا۔

”ہنس مت شیدے، آج میں بہت خوش ہوں۔“

”لیکن بختاں ٹھیلہ لگانے کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا۔“ شیدے نے سب سے اہم نکتہ اٹھایا۔

”تو فکر مت کر شیدے..... وو ڈھائی ہزار روپے میرے پاس جمع پڑے ہیں باقی کے لیے میں اپنی اکلوتی بالیاں بیچ دوں گی.....“ بختاں نے ٹوٹے صندوق کی تہ سے مڑے مڑے دس اور بیس کے نوٹ ڈھائی ہزار کی شکل میں اور انبی ماں کی واحد نشانی سونے کی بالیاں شیدے کی پھینکی پر رکھتے ہوئے کہا اور شیداء سے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

”واقعی ملانی جی صحیح کہتی ہیں، شیداء اتنا بھی برا نہیں ہے۔ اب وہ کام کرے گا اور میں صبح جاتے ہی سزار شد کو منع کروں گی کہ بیگم صاحب کسی اور کو رکھ لو اور اپنے میاں کو رسی سے باندھ کر رکھو.....“

بختاں نے نیاز کے لیے آنے کے گلگلے بناتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

وہ بہت خوش تھی..... اور شیداء.....

☆☆☆

”تم ہماری بیٹی کی طرح ہو..... تم جہادے پاس

رہو..... یہاں تم کو کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ حاجی صاحب نے روتی ہلکتی..... ہر اسماں سی بختاں کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ مغرب کی نماز پڑھنے جا رہے تھے تو بختاں اپنے کپڑوں کا صندوق لے کر سزار شد کے پاس چلی آئی اور جب حاجی احمد علی نے اس کی دکھ بھری داستان سنی تو فوراً ہی اسے رہنے کی اجازت دے دی۔

حاجی احمد علی نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ اب اسے کہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں..... بس وہ ان کے گھر کے کام کرے اور اس کی وہ تنخواہ جو تین گھروں سے اس کو ملتی ہے وہ اس کو دے دیں گے۔

☆☆☆

”کیا ہو گیا تھا آپ کو..... اتنی تنخواہ دینے کی کیا ضرورت تھی.....“ رات کو جب عشا کی نماز کے بعد بختاں اپنے کوارٹر میں چلی گئی تو سزار شد نے حاجی صاحب کو ٹوکا۔

”ارے بیگم کیا ہر وقت حساب کتاب کی بات کرتی ہیں کچھ چیزیں صدقہ سمجھ کر کر دیا کریں.....“ غریب، مظلوم بد حال اور پریشان عورت ہے۔ ہم پر کیا فرق پڑتا ہے اگر 1000 یا 500 زیادہ دے دیں گے..... اور آپ کو بھی تو سہولت ہوگی..... گھر سنبھالنے کے لیے ذلت دار عورت مل گئی اور آپ کا اکیلا پن بھی کسی حد تک کم ہو جائے گا، حاجی احمد علی نے آرام سے بیوی کو سمجھایا تو وہ خاموش ہو گئیں..... کہ بات تو بالکل صحیح تھی.....

☆☆☆

کیا موبجیں ہو رہی ہیں شیدے بھائی کی.....“ اللہ دت نے گھٹیا شراب اپنے اندر اٹھیلے شیدے کو چھیڑا۔

”کس کا موبائل چھینا ہے یا کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔“ اختر نے اپنے پیلے، پیلے دانت نکالے۔

”اوسے باؤلوں..... پرس اور موبائل تم چھینو،

## صاں

میری ماں.....!

تیری نظریں دعاؤں کی طرح  
 گھیرے میں لیے رہتی تھیں مجھے  
 تیری زورور ہستی سے شام و سحر  
 ضیا پاتی تھی میری ہستی  
 میں تیری الفت کے کھلونوں سے بہنے والی  
 میں جو اٹھلا کے اڑی پھرتی تھی  
 تیری شفقت کی رداؤں میں چھپائے خود کو  
 پھر اچانک ہی میری ماں! ہر ماں کی طرح  
 وہی قصہ ازل کا دہرایا تو نے  
 اپنے ہاتھوں سے کڑے ہجر کا قصہ لکھا  
 اپنی پیکوں میں چھپا کر آنسو  
 مجھ کو وہی میں بٹھایا تو نے  
 میں اپنے نئے گھر میں تجھے بھوجتی تھی  
 بہت یاد کرتی تھی میری ماں..... میں تجھے شام و سحر  
 جب تیری خوشبو گلشن کی صبا آتی تھی  
 تیری ممتا کی مہک آنگن میں اتر آتی تھی  
 میری ماں! کئی بار کڑے ہجر میں سنبھالا مجھ کو دیا  
 تیری ہستی نے سہارا میری دنیا کو دیا  
 ایک جان نغز احساس میرے ساتھ تو تھا  
 مگر اب تیری ہستی کو تراشوں کیسے؟  
 میں تجھے جنت کی حور دل میں تلاشوں کیسے؟  
 تو نے میری دنیا کو اپنی ضیا سے محروم کیا  
 کڑے ہجر کو، پیاسے صحرا کو مقدر کر کے  
 کیا پاتا تھا تو یوں چلی جائے گی  
 مجھے تیری دعاؤں کی ضرورت پہلے سے  
 کہیں زیادہ ہے  
 میری ماں.....!

شاعرہ: نیر رانی شفیق، ڈی جی خان

میرے تو گھر میں گنگا بہتی ہے۔ یہ تو میری بیوی نے  
 دیے ہیں سالی کہہ رہی تھی محنت کرو۔ ٹھیلالگاؤ.....  
 گدھی کہیں کی۔" شیدے نے زمین پر تھوکا۔

"اوکے خیر..... میرا یہ..... اتنے روپے دو  
 کر بیٹھا ہے اور یا رموج نہ اڑائیں۔ یہ تو ظلم ہے  
 بھئی..... چل پھر آج بائی کا گانا سنتے ہیں۔" ارشد بھی  
 باجھیں پونچھتا اٹھ آیا۔

شیدے نے ان سب کو ایک تختیر آمیز نظر سے  
 دیکھا اور پھر اپنی مونچھوں کو تار دیتا ہوا کھڑا ہو گیا۔  
 "ہائی کے پاس صرف گانا سننے جاتے ہو تم  
 لوگ؟" شیدے نے ان سب کو گھر کا۔

اور پھر ان کی کھیالی ہنسی میں شیدے کا قبضہ  
 بھی شامل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"تجھ پر خدا کی ماربو..... اللہ کرے تو مرحلے  
 منوں۔ تیرے ساتھ رہنے سے بہتر ہے میں اکیلی  
 رہوں، تجھے نہیں پا لوں گی اب تیرے اور میرے  
 راستے الگ ہوئے..... یا اللہ تو اسے اٹھالے  
 اس منی کے ڈھیر کو۔ جو صرف مجھے دکھ دیتا  
 ہے تکلیف دیتا ہے۔ یا اللہ اس کی زندگی  
 میرے لیے صرف تکلیف کا باعث ہے..... یا اللہ تو تو  
 اپنے بندوں کو ان کی ہمت سے زیادہ دکھ  
 نہیں دیتا۔ مجھے اس دکھ سے نجات دے  
 دے..... اس کمبخت کو اٹھاے۔" وہ ہلک رہی تھی۔

"کتنا خوش تھی میں.. کہ یہ کام کرے گا۔  
 ہائے میرے اللہ میری جمع پونجی اور میری ماں کا واحد  
 نشانی بھی طوائف کے کوٹھے پر لٹا آیا۔ یہ بے  
 غیرت..... یہ بدنصیب....."

نشے میں دھت پڑے شیدے کو بچاں نے  
 نفرت سے دیکھا اور اللہ سے فریاد کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"اللہ کا شکر ہے میں اب سکون سے ہوں۔ یہ

الگ بات ہے کہ سارا دن گھر میں کام کرتے، کرتے میری ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ لیکن حاجی صاحب..... اور باجی دونوں ہی میرا..... اتنا خیال رکھتے ہیں کہ تھکن، تھکن نہیں لگتی۔ اب تو انشاء اللہ میں مرتے دم تک شیدے کی شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔ آج بھی حاجی صاحب کتنی محبت سے کہہ رہے تھے۔ بس اب بختاں بیٹیں رہے گی..... ہماری بیٹی کی طرح..... اللہ حاجی صاحب کو لمبی زندگی دے۔ ”وہ کوارٹر میں بیٹھی اپنے صاحب کے لیے دعائیں کر رہی تھی کہ دستک ہوئی۔“

”بختاں دروازہ کھول۔“ دروازے پر ہلکی دستک کے ساتھ سرگوشی ابھری۔

”حاجی صاحب..... اس وقت.....؟“ بختاں نے حیرت سے گھڑی کی سوئیوں کو رات کے دو بجاتے دیکھ کر اپنے سے کہا۔

☆☆☆

”نہ جانے بختاں کہاں، کہاں کی ٹھوکریں کھا رہی ہوگی۔ بے وقوف کو کتنا سمجھایا تھا کہ اپنی چار دیواری کے باہر صرف بھیڑیے گوشت نوچنے کے لیے گھڑے ہیں۔ گھر سے نہ نکل۔ اپنا مرد جیسا بھی ہو۔ اپنا ہی ہوتا ہے۔ آج کل تو اللہ معاف کرے، سنگے رشتوں کا بھروسہ نہیں وہ نہ جانے کس پر بھروسہ کر بیٹھی ہے۔ یا اللہ اسے عقل دے۔ اسے سمجھ دے۔ میرے مالک اس کی عزت و آبرو کی حفاظت فرما۔ میرے مالک.....“ ملائی جی نے تہجد کے نفل پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو روز کی طرح بختاں کے لیے دعا کرنا نہ بھولیں۔ اور تہجد کے وقت کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں۔

☆☆☆

”میری رانی..... میری جان..... بختاں دروازہ کھول کہاں ہے تو..... اب صبر نہیں

ہوتا..... دروازہ کھول.....“ حاجی صاحب کی سرگوشیاں مسلسل بڑھ رہی تھیں۔

”حاجی صاحب..... آپ تو مجھے بیٹی کہتے تھے..... آپ میرے باپ کی جگہ ہیں..... اللہ کے واسطے واپس چلے جائیں۔“

بختاں کے لب خاموش تھے لیکن اس کا دل دہائیاں دے رہا تھا۔

”اری بچی، کوئی منہ بولا باپ اور بھائی نہیں ہوتے۔ یہ سب غیر شرعی ہے۔“ ملائی جی کی ایک نصیحت عملی طور پر سامنے آئی۔

”دروازہ کھول بختاں.....“ حاجی صاحب کی سرگوشی غراہٹ میں بدلی۔

”کم بخت..... کم نسل..... اپنے میاں کی نہیں..... تو ہماری کیا ہوگی..... اس میں سرخاب کے پرتھوڑی لگے تھے جو میں اسے اپنے گھر میں رکھتا اور اس کو اتنی زیادہ تنخواہ دیتا..... ارے اس کی جوانی نے تو مجھے اپنی جوانی یاد دلادی..... کیسا ٹھن کیسا روپ ہے اس کا.....“ حاجی صاحب کی سوچوں نے چوہر میں بیٹی بختاں کی عزت بڑھاتا کر دی۔

☆☆☆

مسز احمد کسی شادی میں گئی ہوئی تھیں..... حاجی صاحب پر شیطانیت کا وہ غلبہ تھا کہ کسی بھی مجھے دروازہ ٹوٹ سکتا تھا۔

”نہیں، نہیں ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ میں اپنے سینے میں خنجر مار لیتی ہوں لیکن ہائے..... شیدے تو کہاں ہے؟“

بختاں کو شیدا یا دایا..... چاہے ٹشٹی تھا..... لیکن اگر اس وقت ہوتا کم از کم حاجی صاحب کی اتنی امت نہ ہوتی.....

”ہائے شیدے.....“ آنسو اس کے گالوں پر پھیلے۔

”رک جا۔ پس میں دیکھتا ہوں۔“ وہ جو دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھی تو شیدے نے چنگ پر



سے اٹھتے ہوئے اسے روکا۔

”نہ جانے کون ہوگا..... ہر ایرے غیرے کے سامنے نہ آیا کر.....“ شیدے نے غرا کر کہا۔

”سارا دن تیرے میرے گھر میں کام کرتی ہوں اور اب تجھے خیال آیا ہے۔“ بختاں طنز یہ بلی۔

”ہاں وہ الگ بات ہے.....! لیکن اس وقت تو میرے گھر میں ہے..... اور میرے سامنے کوئی تجھ کو نظر اٹھا کر دیکھے تو سارے کی آنکھیں نکال کر اس کی پتیلی پر رکھ دوں گا۔“ شیدے نے دروازے کی کنڈی کھولنے سے پہلے.... آنکھ کے اشارے سے اسے اندر جانے کو کہا۔

”او ہند بڑا آیا..... رکھو!.....“ بختاں اپنے آپ سے کہتی منہ بناتی گھر کے واحد کمرے میں چلی گئی۔

”بختاں دیکھ دروازہ کھول دے..... ورنہ تیرا وہ حشر کروں گا کہ ساری دنیا دیکھے گی۔“ حاجی صاحب کی دمکی اسے حقیقت میں واپس لے آئی۔

اس نے ہلتے دروازے کو دیکھا..... اور پھر صندوق میں تیزی سے ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی۔

اور پھر اس کے ہاتھ میں موبائل آ گیا۔ وہ موبائل جو اس نے اپنے باپ سے بات کرنے کے لیے شیدے سے چھپا کر خریدا تھا۔

”کوئی پریشان کرے تو 15 پر نمبر ملا دیتا۔“ سزا احمد کی نصیحت یاد آئی وہ تیزی سے نمبر ملانے لگی۔

لیکن دوسری طرف کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بار بار نمبر ملا رہی تھی اور پھر کال ریسیو ہو گئی۔

”ہیلو..... شیدے میں بختاں..... تیری بختاں مجھے آکر لے جا شیدے۔“ اس نے جلدی، جلدی شیدے کو پتا بتایا..... اور فون بند کر دیا۔ اصل میں اس نے 15 پر کال ملا دی تھی..... شیدا اس کے لیے کیا تھا آج کڑی دھوپ میں کھڑے ہو کر اسے اچھی طرح احساس ہو گیا تھا۔

## ایک خوفزدہ ماں

### کے دل کی صدا

میرے بچے تجھے گھر سے نہ نکلنے دوں گی مجھ میں ہمت نہیں ہے تجھے کھودینے کی

مجھ میں طاقت ہے کہاں تجھ سے چھڑ جانے کی

میں نے پالا ہے تجھے خون جگر سے اپنے ہنس کے جھیلنا ہے ہر دکھ تیرے سکھ کی

خاطر

تو میرے گلشن ہستی کا وہ گل ہے جس سے

اپنی دنیا کو نکھارا ہے ہر اک پل میں نے ہاں سکھائی تھی تجھے میں نے بلند پروازی

تیری ہمت کو بڑھایا تھا سدا میں نے ہی اپنے ہیروں پہ کھڑا ہونا سکھایا تجھ کو

کب خبر تھی مجھے، دن ایسا بھی آئے گا کبھی

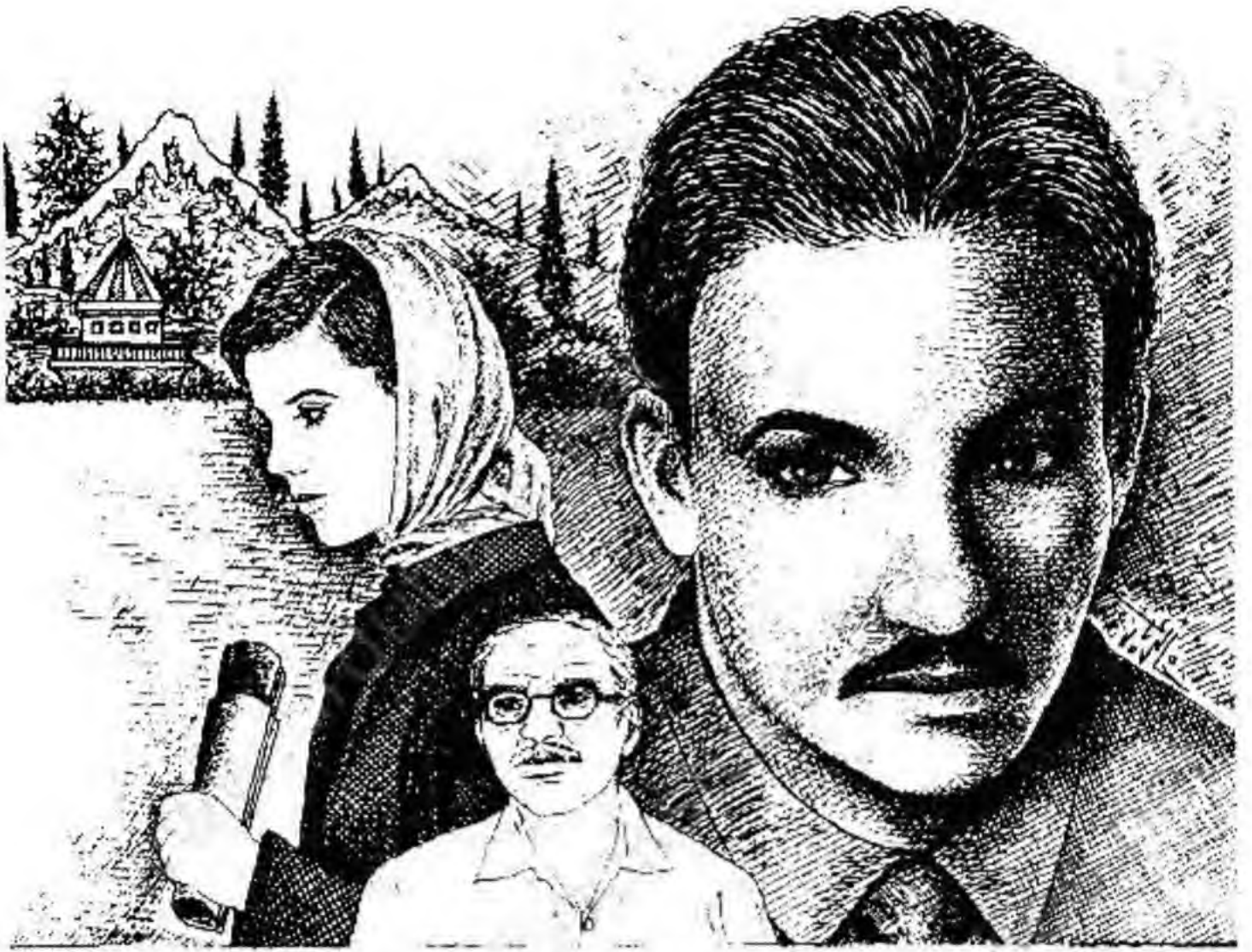
اپنے آئین کی بہاروں میں خزاں کے ڈر سے

صرف گولی ہی سے کیا خود سے چھپاؤں کی تجھے

گھر سے نکلا اور اگر آیا نہ واپس تو پھر.....؟

بس اسی خوف سے گھر میں ہی تجھے رکھوں گی

میرے بچے تجھے گھر سے نہ نکلنے دوں گی کلام: شائستہ زریں، کراچی



ادبیات



## چلو ہم سب ساتھ چلتے ہیں؟

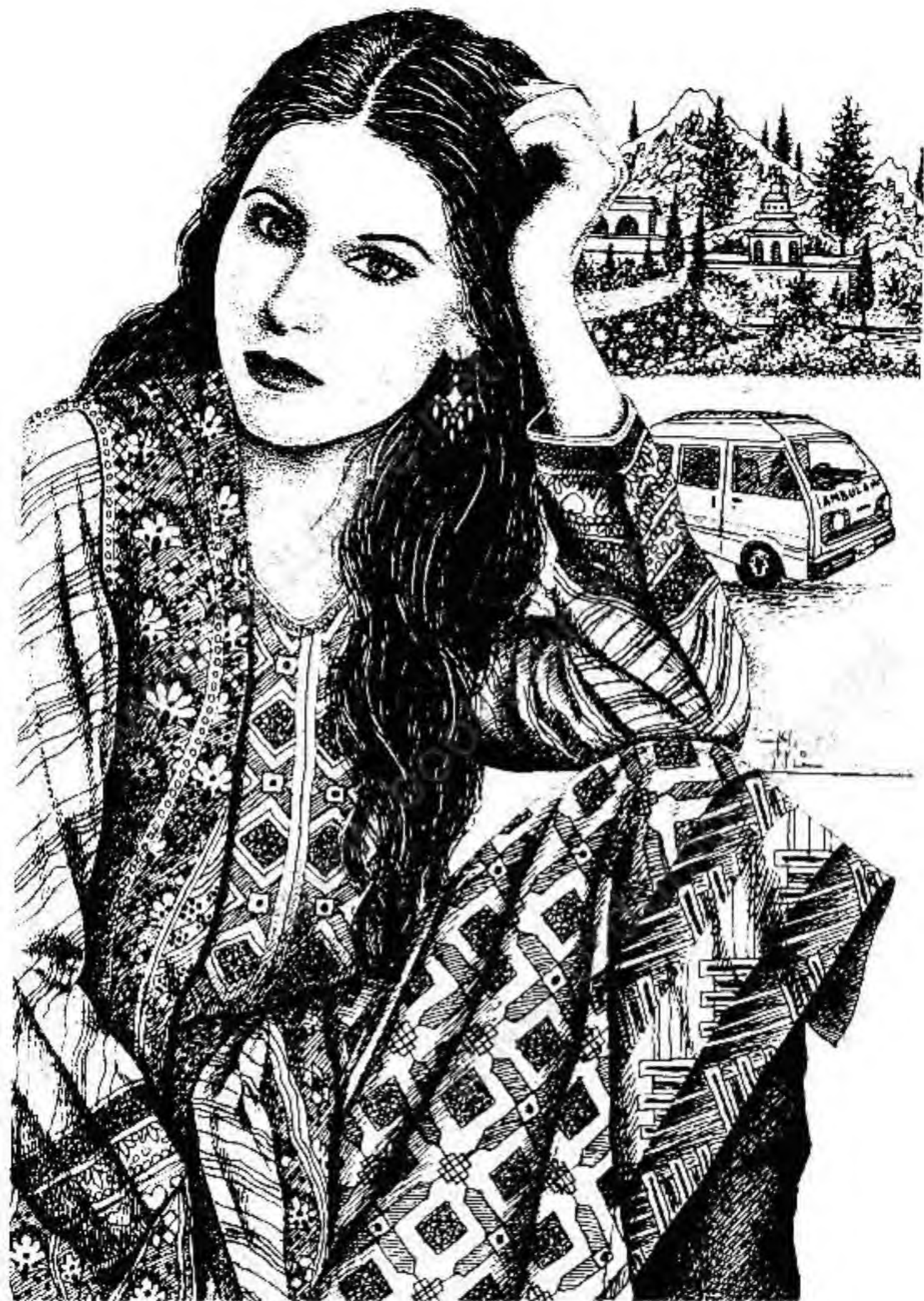
صائم اکرم

اسے ذرا بھی اس چیز کا احساس نہیں تھا۔  
”وہ خاصی ”پچی“ ہوئی چیز ہے، یہ ناچر لفظوں  
میں نہیں بتا سکتا.....“ عمار نے طنز یہ لہجہ میں کہہ کر لمبی  
سانس لی اور اضطراری کیفیت میں اپنے ماتھے کو دو

”آخر یہ چیز کیا ہے بھوہ خالد.....؟“ احیان  
نے کچھ جھنجھاکر ہاتھ میں پکڑا پیپر ویٹ میز پر رکھا اور  
اپنے بزنس پارٹنر عمار کو دیکھا، جو پریشانی کی کیفیت میں  
اپنی ناپسندیدہ بلیک کافی کا دوسرا کپ پی رہا تھا اور

116 مابنامہ باکیزدہ۔ مئی 2015ء







انگیوں سے ملنے لگا۔ احیان نے کھا جانے والی نگاہوں سے اپنے بزنس پارٹنر کو دیکھا جس نے اتنی ایمر جیسی تافذ کی تھی کہ اسے اپنا چھ مہینوں کا امریکا کا ٹرپ مختصر کر کے تین ماہ میں واپس آنا پڑا۔ دونوں نے نیا، نیا ہی بزنس اشارت کیا تھا۔

”یار کچھ تو بتاؤ، آخر پتا تو چلے اس محترمہ کے بارے میں۔“ احیان کو اب عماد پر غصہ آنے لگا۔

”نیکسٹ پیشی پر عدالت میں جا کر دیکھ لیو، قد تو اس کا ساڑھے پانچ فٹ لیکن زبان پوری چھ فٹ لمبی ہے اور جب شالیمار ایکسپریس کی طرح چلتی ہے تو کہیں انجن بھی فیل نہیں ہوتا اس کم بخت کا۔“ عماد اپنی مخالف پارٹی کی وکیل پر بری طرح تپا ہوا تھا۔

”تو تم بھی کوئی ڈھنگ کا وکیل کر لیتے۔“ احیان نے منہ بنا کر مشورہ دیا۔

”تم نے اس مکار لڑکی کی قبیحی کی طرح چلتی زبان نہیں دیکھی، ہمارے اچھے خاصے گھاگ وکیل کو کراہائے عدالت میں انگیوں پر پھاری ہے۔“ عماد بھل کر بولا۔

”اچھا مٹکو کھوڑا ڈھونڈا ہے تم نے، جو فوراً مٹا پھینکے بھی تیار ہو جاتا ہے۔“ احیان کو عماد کے وکیل پر غصہ آیا۔

”یار قصور اس پتھار سے کا نہیں ہے، وہ آتی ہی اتنی تیاری کے ساتھ ہے۔“ عماد نے اپنے وکیل کی سائنڈل۔

”تو تم نے ایسا نالائق وکیل ہار ہی کیوں کیا، جو منہ اٹھا کر بغیر تیاری کے اپنا مذاق بنوانے آ جاتا ہے۔“ احیان کے پاس بھی ہر بات کا جواب تھا۔

”تو ٹھیک ہے تم ڈھونڈ لو، خود تو امریکا جا کر بیٹھ گئے۔“ عماد غصے میں بلیک کافی کا تیسرا کپ بنانے لگا۔

”میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا، کروڑوں کا معاملہ ہے یار، ڈیڈی تو قتل کر دیں گے مجھے۔“ احیان کو ایک اور خوف لاحق ہوا۔

”اور میرے پاپا تو ڈی چوک میں کھڑا کر کے ڈائریکٹ پھانسی دیں گے مجھے۔“ عماد جھنجھلا کر کھڑا ہوا۔

”کتنا منع کیا تھا ڈیڈی نے عینہہ بزنس کرنے سے۔“ احیان کو ساری چیزیں ایک، ایک کر کے یاد آنے لگیں۔

”اور مجھے تو پاپا نے کہا تھا انشاء اللہ روٹے ہوئے واپس آؤ گے۔“ عماد اب باقاعدہ آنکس میں شہلے لگا۔

”معاف کرنا یار تمہارے پاپا کی زبان خاصی ”کالی“ واقع ہوئی ہے۔“ احیان نے اپنے بیٹ فریڈ کو چرایا۔

”تمہارے ڈیڈی کی زبان سے جتنے پھول جھرتے ہیں، وہ بھی دیکھ رکھے ہیں میں نے۔“ عماد نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا جو رات ہی پاکستان پہنچا تھا۔ احیان نے اس کا طنز خاصے محل سے برداشت کیا اور قدرے شجیدگی سے پوچھا۔

”نیکسٹ پیشی کب ہے۔“

”نیکسٹ منڈے۔“ لیکن میں ہرگز نہیں جاؤں گا اپنا خون جلانے۔“ عماد پریشانی کے عالم میں ایک دفعہ پھر سیٹ پر بیٹھ کر کافی پینے لگا۔

☆☆☆

”تم لوگوں کو ضرورت ہی کیا تھی، اپنی ٹیکسٹری کے لیے وہ ممتاز زمین خریدنے کی۔“ اس دن وہ شام کو اپنا غم غلط کرنے والی کی اسٹڈی میں پہنچ گیا۔ جنہوں نے سارا قصہ سننے کے بعد آرام سے اپنا سگار لگایا لیکن اس سے زیادہ تو احیان غصے سے سلگ اٹھا۔

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے اس زمین پر سارے وارثوں کے بڑے، بڑے پوسٹرز لگے ہوئے تھے اور ہم حاضری رجسٹر اٹھا کر ون بائے ون سب کی اینڈنس لگاتے اور پھر آگے کا ردائی کرتے۔“ وہ جل کر کھڑا ہوا اور اپنی پیٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر شہلے لگا۔

والی نے مسکرا کر اپنے سب سے لاڈلے اور چھوٹے پوتے کو دیکھا جس کا بزنس اینڈ منسٹریشن کی ڈگری کے بعد پہلا تجربہ ہی خاصا تلخ واقع ہوا تھا۔ اس

پردہ مزید مشکوک ہوا۔

”کوئی خفیہ شادی وادی تو نہیں کر رہی آپ نے.....؟“ اس کے شکی لہجے پر داجی بے اختیار ہنسے۔

”مگر ہم اس کی عمر چوبیس پچیس سال ہوگی اور میری سب سے بڑی پوتی عمارہ اس وقت تیس سال کی ہے۔“

”لیکن.....؟“ وہ شش و پنج کا شکار ہوا۔

”تمہارا پراہلم حل ہو جائے گا۔ ہنڈرڈ پرسنٹ گارنٹی ہے۔“ داجی نے اسے مزید لالچ دیا۔

”عماد بتا رہا تھا بہت اصول پسند ہے.....“ احیان نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”کہا ناں کچھ نہیں کہے گی“ داجی اب پرسکون تھے۔

”پھنسوا مت دیجیے گا کسی چکر میں.....“ اس کا دل تو نہیں مان رہا تھا لیکن معاملہ کروڑوں کا تھا اس لیے اپنے دس کو ایک ساڈہ پر رکھ کر سوچنا ہی پڑا۔

اس کے داجی سید مجتبیٰ علی شاہ کے دو بیٹے سجاد علی اور مراد علی تھے۔ بڑے بیٹے سجاد علی کی صرف ایک بیٹی عمارہ تھی جو شادی کے بعد لاہور میں مقیم تھی۔ جبکہ

چھوٹے بیٹے مراد علی کے تین بیٹے تھے۔ بلال اور احیان تھے۔ جن میں حمزہ اور بلال شادی شدہ اور باپ کے ساتھ بزنس میں مکمل ہاتھ بٹا رہے تھے لیکن احیان کو

شروع سے اپنی راہیں خود نکالنے کا شوق تھا اور وہ مراد صاحب کی مخالفت کے باوجود اپنے دادا کی مکمل حمایت کے ساتھ علیحدہ بزنس اپنے بہترین دوست عماد کے

ساتھ شروع کر چکا تھا۔ لیڈر ٹیکسٹری کے لیے خریدی جانے والی زمین ان کے لیے وہ نوالہ بن چکی تھی جسے نہ

وہ نگل سکتے تھے اور نہ اگل

سجاد علی اور مراد علی کی بیویاں آپس میں ملکی زمینیں

تھیں اور شہر میں ایک پرائیویٹ انکسٹریٹ میڈیم اسکول بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہی تھیں۔ مراد علی کو اپنے

سب سے چھوٹے بیٹے احیان سے کافی شکایتیں تھیں۔ وہ ضد کر کے پڑھنے کے لیے باہر گیا اور وہاں آ

کر اپنا علیحدہ بزنس شروع کرنے کا اعلان کر کے اس

لیے تو اسے آج کل بات بے بات غصہ آ رہا تھا۔

”پھر بھی..... یہ آہستہ، آہستہ اس زمین کے اتنے وارث کہاں سے آگئے گئے.....“ داجی نے عینک

کا مشیش صاف کرتے ہوئے اسے مزید چڑایا۔

”ہمیں تو خود تب ہا چلا جب باقی وارثوں نے کیس کیا ہمارے اوپر.....“ اس نے منہ بنا کر مزید

کہا۔ ”دن میں مارے دکھا دیے ہیں انہوں نے ہمیں۔“

”اب اس مسئلے کا کوئی حل.....؟“ داجی کو تشویش لاحق ہوئی۔

”جو بھی حل نکالتے ہیں وہ فساد لڑکی، ایک منٹ میں اس کے بیٹے ادھیڑ دیتی ہے۔“ احیان سپ کر بولا۔

”کون لڑکی.....؟“ داجی حیران ہوئے۔

”مخالف پارٹی کی وکیل محترمہ ہسمہ خالد مغل صلاب.....“ احیان نے ایسے چبا کر اس کا نام

ڈھرایا، جیسے حقیقت میں اسے دانتوں سے چبا رہا ہو۔

”ہسمہ خالد مغل.....“ داجی بری طرح چونکے۔

”فاروق ایسوسی ایشن کے چیمبر میں بیٹھتی ہے ناں؟“

”آپ کیسے جانتے ہیں.....؟“ احیان کو حیرت کو

جھٹکا لگا کیونکہ اسے علم تھا پچھلے دس سال سے داجی بزنس سے بالکل کٹ کر گھر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

”وہ ہی ہے ناں.....؟“ داجی کے لبوں پر ایک پراسراری مسکراہٹ ابھری۔

”ہاں..... ہاں سو فیصد وہی ہے۔ سو سٹ جونیر لیکن حد درجہ شارپ۔“

”تم ملے ہو اس سے.....؟“

”نہیں.....“

”تو جاؤ جا کر ملو اس سے اور کہنا شاہ جی نے بھیجا ہے.....“ داجی کی بات پر اس نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”آگے سے اس نے پوچھ لیا کہ کون شاہ جی.....؟“

”نہیں پوچھے گی.....“ داجی اب کھل کر مسکرا

رہے تھے۔ احیان کو ان کی ذہنی حالت پر کچھ شک ہوا۔

”ایک لفظ بھی نہیں پوچھے گی.....“ داجی کی بات

نے اپنے باپ اور تایا کو حیران کم اور پریشان زیادہ کر دیا تھا۔ دادا کی سپورٹ کی وجہ سے احیان کے اکثر مسائل آسانی سے حل ہو جاتے تھے لیکن تھنا ز زمین کے مسئلے نے دونوں دوستوں کی راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ دونوں ہی اپنے والدین سے یہ بات چھپائے ہوئے تھے اور اپنے طور پر حل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

☆☆☆

اس نے سر اٹھا کر سرخ اینٹوں سے بنی قدیم اور جدید امتزاج کی حامل عمارت کو سرسری سی نگاہ سے دیکھا۔ اس پانچ منزلہ عمارت کی دلکشی میں ایک محسوس کی جانے والی مسامت اور سنجیدگی تھی۔ اس کے سامنے لاش گرین گھاس اور پودوں سے آراستہ خوب صورت لان تھا جس کی کانٹ چھانٹ اور پودوں کی ترتیب سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اس نے ایک تو صحنی نگاہ لان پر ڈالی... اس کی سلور ہنڈ اسوک اب اس بلڈنگ میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے داخلی دروازے کے پاس ایک خاص ترتیب میں سفید سنگ مرمر کے گیلے رکھے گئے تھے جس نے ارد گرد کے ماحول کی خوب صورتی کو گنا کر دیا تھا۔ لان کے انتہائی بائیں طرف وسیع و عریض پارکنگ تھی۔ جہاں اس وقت ایک اینڈ ہونے کی وجہ سے گاڑیوں کی تعداد خاصی کم تھی۔

احیان نے انتہائی سنجیدگی سے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ باہر نکل کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ اور اس کے اوپر رکھا چشمہ اٹھا۔ اس کے چہرے پر دنیا جہان کی اکتاہٹ تھی۔ کسی ناپسندیدہ شخصیت سے ملاقات کا تصور جتنا بیزار کن ہوتا ہے اس سے کئی گنا بیزاری احیان کے چہرے پر فیک رہی تھی۔

بلیک کمر کے اٹالین سوٹ میں اس کا قد خاصا لمبا اور شخصیت میں محسوس کی جانے والی بے نیازی تھی۔ باہر نکلتے ہی اس نے آنکھوں پر سلور کمر کا چشمہ لگایا اور

بریف کیس اٹھا کر گاڑی کو لاک کیا۔ سفید سنگ مرمر کی روش پر بیزاری سے چلتے ہوئے وہ اس عمارت کی طرف بڑھا۔ گھاس دال کا بنا دروازہ اندر کی جانب دھکیل کر وہ جیسے ہی عمارت میں داخل ہوا اسے سی کی خوشگوار خنڈک میں کسی دلغریب ایئر فریشر نے اس کا استقبال کیا۔

رہنمون پر لڑکی نے اس ڈشنگ پرسن لٹی کے حامل شخص کو اندر آتے دیکھا تو فوراً ایکٹو ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر بڑی پروفیشنل قسم کی مسکراہٹ پھیلی۔ وہ اب سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”قدروق ایسوسی ایٹس کا آفس کس فلور پر ہے؟“ وہ وہاں پہلی وفد آیا تھا۔

”تھرو فلور پر رائٹ کارڈر میں.....“ اس نے مسکرا کر اس کی رہنمائی کی۔

”آپ کو وہاں کس سے ملنا ہے؟“ اس لڑکی نے بڑے خوشگوار انداز سے پوچھا۔

”ایڈووکیٹ بسمہ خالد سے.....“ وہ سپاٹ سے انداز میں کہہ کر لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔

”بہت ہی روڈ بندہ ہے.....“ رہنمون پر موجود لڑکی نے براہ راست بتاتے ہوئے سوچا اور اپنے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”واہ..... احیان مراد اب تم پر یہ وقت بھی آتا تھا۔“ لفٹ میں سوار ہو کر اس نے خود کو کوسا۔

”دھیان سے جانا، بسمہ خالد بولتے ہوئے کسی کا لحاظ ذرا کم ہی کرتی ہے.....“ لفٹ سے باہر نکلتے ہوئے اسے اپنے بزنس پانٹر عمارت کی بات یاد آئی تو دل میں کوفت کا احساس مزید بھر گیا۔

قطار میں بنے ہوئے آئینز پر ناموں کی تختیاں پڑھتے ہوئے وہ فاروق ایسوسی ایٹس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ یہاں آتا نہیں چاہتا تھا لیکن آچکا تھا۔ جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا کاؤنٹر پر موجود خاتون رہنمون نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ سامنے ایک ادراکار یڈور تھا، جہاں دائیں بائیں



فارل انداز سے گفتگو کا آغاز کیا۔  
 ”نو ٹھیکس.....“ احیان نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”جی فرمائیں آپ کسی کیس کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟“ ہسمہ نے ہلکے پھلکے انداز سے پوچھا تو احیان کو اپنے پارنر کی ساری باتیں مبالغہ آرائی پر مشتمل لگنے لگیں جو اس نے اس معصوم سی لڑکی کے بارے میں پھیلا رکھی تھیں۔

”میں آپ سے کسی نیوکیس کے سلسلے میں بات کرنے نہیں آیا۔“ اس نے سنبھل کر بات کا آغاز کیا۔  
 ”میرا تعلق انارگروپ آف کینسر سے ہے.....“ اس بات پر وہ زبردست انداز سے چونکی اور اس کا چہرہ ہلکا سا تناؤ کا شکار ہوا۔

”دیکھیں اگر آپ اس متنازعہ زمین کے کیس کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں تو آئی ایم سو سوری آپ ہمارے کلائنٹ نہیں ہیں۔“ اس نے بے رخی کے سارے ریکارڈ ایک لمحے میں توڑے۔ احیان کا چہرہ خفت کے گہرے احساس سے سرخ ہوا۔ اسے پہلی دفعہ اندازہ ہوا اتنے معصوم چہرے کے پیچھے کتنی خطرناک زبان چھپی ہوئی ہے۔

”میں اس موضوع پر بات کرنے ہرگز..... نہیں آیا.....“ اس نے بے مشکل تحمل بھرے انداز سے کہا۔  
 ”پھر.....؟“ اس کا انداز سراسر اہلکار تو جین آمیز لگا۔

”مجھے شاہ جی نے آپ کے پاس بھیجا ہے.....“ اس نے اپنی جیب سے وہ طلسم نکال کر اس پر پھونک دی دیا جس کے بارے میں واجی کا خیال تھا کہ سامے دروازے کھل جاسم سم کی طرح کھلتے جائیں گے۔

”کیا.....؟“ ہسمہ کو شک لگا۔ اس نے سخت تعجب اور بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ جس نے گویا کمرے میں صور پھونک دیا ہو۔

”آپ کو شاہ جی نے بھیجا ہے؟“ اس نے بڑی سرعت سے خود کو سنبھالا۔ اب اس کے لہجے میں ترشی کے

چھوٹے چھوٹے آفسز بنے ہوئے تھے یہ سب اس جیمبر میں بیٹھنے والے اینڈوکیٹس کی پرائیویسی کے خیال سے بنائے گئے تھے۔ سامنے ایک میٹنگ ہاں تھا۔

”ہسمہ خالد کا آفس کہاں ہے؟“ اس کے سنجیدہ سے انداز پر اس نے دائیں کارڈور کی طرف اشارہ کیا۔ وہ فوراً اس سائڈ پر مڑا تو پہلے ہی دروازے پر اس کا نام دیکھ کر اس نے ہلکا سا ٹک کیا اور اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک نازک سی یگ لڑکی کو دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔

”یہ چھٹانک بھر لڑکی بھی کسی کو ٹاکوں چنے چوڑا سکتی ہے؟“ اس کے ذہن میں پہلی سوچ یہی ابھری تھی۔  
 ”مجھے اینڈوکیٹ ہسمہ صاحبہ سے ملنا تھا.....“ احیان کے لیے اتنی کم عمر وکیل کو ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی تسلی کرنے کے لیے پوچھ ہی لیا۔  
 ”جی میں ہی ہوں ہسمہ.....“ اس نے لیپ ٹاپ سے نظر ہٹا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”مجھے احیان مراد کہتے ہیں، میں نے کل ریپشن پر بارہ بجے اپائنٹمنٹ کے لیے اپنا نام لکھوایا تھا.....“ اس نے وال کلاک پر ایک نظر ڈال کر اسے جتایا۔

”اوہ یس.....“ اس نے ہلکا سا ہاتھ اپنی پیشانی پر مار کر اپنی یادداشت کو کوسا اور جلدی سے میز پر رکھا اپنا چشمہ ٹشو سے صاف کرنے لگی۔

”آئی ایم سوری میرے ذہن سے ہی نکل گیا.....“ اس نے چشمہ لگاتے ہوئے سنجیدگی سے وضاحت دی تو احیان کو محسوس ہوا کہ گلاسز کی وجہ سے وہ اب اتنی بھی کم عمر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جتنی گلاسز کے بغیر لگتی تھی۔

”افس اوکے.....“ اس نے بھی فارل انداز میں کہہ کر اس کے آفس کا انٹریز بردیکھا۔ جس میں سفید اور گرے رنگ نمایاں تھا۔ اس کی سیٹ کے پیچھے ایک دیوار گیر شیشے کی الماری تھی جو قانون کی موتی، موتی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔

”چائے لیں گے یا کافی.....؟“ اس نے بڑے

بجائے نرمی اور نظروں میں تلخی کے بجائے عقیدت تھی۔  
 ”جی۔ آپ کو کوئی شک ہے تو ان کو کال کر کے پوچھ سکتی ہیں۔“ احیان کو اس کے یوں گرم گت کی طرح رنگ بدلنے پر حیرت ہوئی۔  
 ”میرے پاس ان کا کوئی کاٹلیٹ نمبر نہیں ہے۔“ اس کے جواب نے اب احیان کو حیران کیا۔ جدوہ ایک لمحے کے توقف کے بعد گویا ہوئی۔  
 ”ان کا اسٹار گروپ آف کینیڈا سے کیا تعلق ہے؟“ وہ اب حقیقتاً پریشان دکھائی دے رہی تھی۔  
 ”ان کا نہیں میرا تعلق ہے۔“ احیان کے منہ سے پھسلا۔

”آپ کا ان کے ساتھ کیا ریلیشن ہے۔۔۔؟“ اس نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔  
 ”میرے گریڈ فادر ہیں وہ۔۔۔۔۔“ احیان کی بات پر اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔  
 ”اوہ آئی ایم سوری۔۔۔۔۔“ وہ بہ مشکل مسکرائی۔  
 ”میرے خیال میں ہمیں اب اس کیس پر بات کر لینی چاہیے۔ میں کیا سیلپ کر سکتی ہوں آپ کی؟“ وہ فوراً اٹھی اور دیوار میں ایک تریب سے بٹے ہیٹس میں سے ایک فائل نکال کر لے آئی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا ناں، میں اس کیس پر بات کرنے نہیں آیا۔۔۔۔۔“ گیند اب احیان کے کورٹ میں تھی، اس نے بڑی مہارت سے شارٹ لگایا اور کھڑا ہو گیا۔ بسند نے حیرانی سے اس شخص کو دیکھا۔ جبکہ اس کے چہرے کی حیرانی اور بوکھلاہٹ احیان کو لطف دے رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش عماد بھی اس کے ساتھ ہوتا اور اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا تو شاید اس کی اتنے دنوں کی اذیت میں کمی آ جاتی۔

”بیٹھ جاؤ، مجھے اندازہ ہو چکا ہے، شاہ جی نے آپ کو میرے پاس کیوں بھیجا ہے؟“ وہ اب بڑے پُر اعتماد انداز سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”کس وجہ سے بھیجا ہے۔۔۔؟“ احیان نے

سراسر اسے چڑایا۔  
 ”بہی کہ مجھے اس کیس پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور جس حد تک ہو سکے آپ کی کمپنی کے لیے نرم گوشہ رکھنا چاہیے۔“ وہ اب مسکراتے ہوئے اس کا سکون درہم برہم کر رہی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔“ احیان نے نظریں چرائیں۔  
 ”جھوٹ بولنے کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں۔ جن میں سر فہرست قد مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ہے۔“ اس کا طنزیہ لہجہ احیان کو سٹکا گیا۔

”جی۔۔۔۔۔ اس کا عملی مظاہرہ تو آپ اکثر کورٹ میں کرتی ہوں گی، اسی جھوٹ پر ہی تو آپ کی روزی روٹی کا انحصار ہے۔“ حساب برابر کرتے ہی وہ آفس سے گولی کی طرح نکلا اور بسند کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

”یار کہیں تمہارے داہنی کا اس کی والدہ کے ساتھ ماضی میں کوئی انفر تو نہیں چلتا رہا۔۔۔۔۔؟“ عماد نے فرائڈ رائس اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے شرارت سے کہا۔ وہ دونوں اس وقت میریٹ میں موجود تھے اور احیان اسے سارا قصہ سنا چکا تھا۔

”تمہیں وہ اتنی اچھی لگتی ہے جو اپنی والدہ کے کسی پرانے عاشق کا نام سنتے ہی اپنے سارے اصول بدل ڈالے؟“ احیان نے برا سامنے بتایا۔

”پھر مجھے تو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی، پوچھو ناں داہنی سے۔“ عماد کا تجسس عروج پر تھا۔

”ہا تو ہے تمہیں داہنی کا۔۔۔۔۔ جو بات نہ بتائی ہو، جتنا مرضی دیوار سے سر پھوڑ لو، نہیں بتاتے۔“ احیان نے اسے یاد دلایا تو وہ مسکرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا۔

”کچھ بھی ہے یار، اب مجھے کچھ تسلی ہے، معاملہ منڈل ہو جائے گا۔“ عماد نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہوتا بھی چاہیے۔۔۔۔۔ اس زمین کے معاملے میں دھوکا تو ہمارے ساتھ بھی ہوا ہے، ہمیں کون سا پتا

ہیں۔" عماد نے اس کے دو بڑے بھائیوں کا نام لے کر یاد دلایا۔

"مجھے پسند نہیں، میں اپنے مل بوتے پر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔" احیان کے زندگی گزارنے کے اپنے اصول تھے۔

"ویسے اس ملاقات کا کوئی اثر بھی ہوگا یا اس زمین سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" عماد کا ذہن اب بھی اسی کہیں میں الجھا ہوا تھا۔

"اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہم نے بھی تو کروڑوں کا سودا اندھوں کی طرح کر لیا۔ کسی سے مشورہ تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" احیان کو آج کل اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی غصہ آ رہا تھا۔

اس کی بات پر عماد نے فوراً تائید کرنے کے لیے اثبات میں سر ہلایا۔

"ایکسکوڑی! آپ عماد درانی ہیں ناں؟" ہمسہ کی آواز پر وہ دونوں ایک دم چونکے، وہ پتا نہیں کب ان کے سر پر پہنچی، انہیں گفتگو کے دوران احساس ہی نہیں ہوا۔ اس وقت رائل بیجو سوٹ میں اس کی شفاف رحمت دمک رہی تھی۔

"ہیس..... مس ہمسہ..... ہو آ سیٹ پلیز....."

عماد بوکھلا کر کھڑا ہوا۔ "نوشٹس.....! مجھے سید مجتبیٰ علی شاہ صاحب کا نمبر چاہیے تھا۔" وہ دیکھ احیان کی طرف لیکن مخاطب عماد سے تھی۔ احیان اس وقت بے نیازی کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے بڑے آرام سے کھانا۔ کھانے میں مگن تھا۔

"جی ضرور....." عماد نے جلدی سے اپنے سیل فون سے ان کا نمبر دیکھ کر اسے نکھوایا۔

"نوشٹس....." وہ مسکراتے ہوئے خاصی دلکش لگتی تھی، احیان کو پہلی دفعہ احساس ہوا۔

"یار تم نے ایک دفعہ بھی اسے جھٹنے کو نہیں کہا۔

اپنی کینٹس اور میسرز بھی کسی چیز کا نام ہیں....." وہ جیسے ہی وہاں سے گئی عماد، احیان پر ہنس پڑا۔

تھا۔" احیان نے رشمن سلاو پلیٹ میں نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ ہمسہ خالد ہی ہے ناں، فاروق صاحب کے ساتھ....." عماد کھانا کھاتے ہوئے ایک دم چونکا۔

"کہیں اس بابے نے کوئی لائن تو فٹ نہیں کر رکھی، اس لڑکی کے ساتھ....." احیان نے اس کی نظروں کے تعاقب میں مڑ کر دیکھا۔ ہمسہ مسکراتے ہوئے ساٹھ سالہ فاروق احمد کے ساتھ اسی ہوٹل کے ہال میں ایک ریزرو ٹیبل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"نہیں یار..... اس ٹاپ کی نہیں ہے وہ۔" عماد نے فوراً ہی تردید کی۔

"وہ نہ سہی، فاروق احمد تو ہوسکتا ہے ناں....." احیان شرارت سے مسکرایا۔

"یار سب جانتے ہیں اس نے ہمسہ کو اپنی بیٹی بنا رکھا ہے، اس کی بیٹی کی کلاس فیلو تو تھی یہ، ورنہ فاروق احمد کہاں کسی نئے وکیل کو گھاس ڈالتا ہے۔" عماد کی معلومات مکمل تھیں۔

"تم نے بڑا ریسرچ ورک کر رکھا ہے اس زبان وراز پر۔" احیان ہنسا۔

"تم تو امریکا میں جا کر بیٹھے ہوئے تھے، یہاں سب کو مشافعوں میں ہی دے رہا تھا۔ تم نے اس کی کورٹ میں چلتی زبان نہیں دیکھی۔" عماد کو ایک پرانا زخم یاد آیا۔ "فیس ٹوفیس بات کرنے میں وہ جتنی 'ٹھگین' لگتی ہے، تمہیں اس کا اندازہ نہیں۔" احیان نے منجورین پیٹ میں نکالتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"ویسے وہ جتنی ذہین اور حسین ہے۔ یہ دونوں خوبیاں کسی بھی عورت کو مردوں کے لیے واقعی ٹھگین بنا سکتی ہیں۔" عماد اب کھل کر ہنسا۔

"پتا نہیں ڈیڈی نے اتنا بڑا بزنس کیسے سنبھالا ہوا ہے، یہاں تو سر منڈاتے ہی او لے پڑ رہے ہیں....."

احیان کا پہلا ہی بجر بہت تھا۔

"تو کس نے کہا تھا ایڈونچر کرنے کو، جزرہ اور بلال بھائی بھی تو انکل کے ساتھ ہی بزنس کر رہے



”ہاں تو تمیز اسے ہونی چاہیے، میرے دادا کا نمبر وہ تم سے مانگ رہی ہے۔“ احیان چڑ کر بولا تو عمار کو فحشی آگئی۔

”اچھا تو اصل دکھ تمہیں اس بات کا ہے۔“ عمار اب سسکی سے سویٹ ڈش پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ جبکہ احیان نے کھا جانے والی نظروں سے اپنے اس بہترین دوست کو دیکھا اور بیزاری سے سر جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ویسے نمبر کس لیے لیا ہے اس نے؟“ عمار ہلکا سا پریشان ہوا۔

”اللہ بہتر جانتا ہے۔“ احیان نے مسکرا کر جواب دیا۔

”جا کر واجی سے پوچھنا ضرور۔“ عمار کی سولی دہرا گئی ہوئی تھی۔

”جی جناب ضرور، جو حکم سرکار کا۔“ احیان نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

”جیمینکس گاؤں پر ایلم حل ہوگئی۔“ وہ جیسے ہی آفس میں داخل ہوا، عمار نے پرجوش انداز میں اسے اطلاع دی۔

”وہ کیسے؟“ وہ سخت حیران ہوا۔

”ہاشمی صاحب آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دوسری پارٹی مصالحت کے لیے تیار ہوگئی ہے، ہمیں اپنی مکتبہ واپس مل جائے گی۔“ عمار نے ہچکچاتا سے اچھی خبر سنائی تھی۔

”لیکن یہ سب کیسے ہوا؟“

”ایڈووکیٹ ہمسہ آج ہاشمی صاحب کے جمیر آئی تھی، اپنے موکل کے ساتھ۔“

”پھر؟“ احیان کو یقین نہیں آیا۔

”ہمیں اپنی مکتبہ واپس مل جائے گی، باقی

اس زمین کے مالکان آپس میں جو بھی طے کریں یہ ان کا معاملہ ہے۔“ عمار نے تفصیلاً بتایا۔

”جیمینکس گاؤں۔“ احیان کو پورے تین ماہ بعد

اپنے اعصاب پر سکون ہوتے محسوس ہوئے۔ ”مجھے واجی کو خود یہ خبر سنانی چاہیے۔“ وہ فوراً اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر نکلا۔

جیسے ہی اس کی گاڑی ”مجتبیٰ کالج“ کے سامنے پہنچی۔ مین گیٹ کھلا اور اندر سے ایک سلور گرے سوئفٹ گاڑی نکلی۔ جسے ہمسہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ احیان کو اسے دیکھ کر حیرت کا جھونکا لگا۔ ہمسہ نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی اور اپنی گاڑی نکال کر لے گئی۔

”یہ محترمہ کس سے ملنے آئی تھیں؟“ اس نے اپنی گاڑی ایک منٹ کے لیے گیٹ پر روکی اور چوکیدار سے پوچھا۔

”بڑے صاحب سے۔“ چوکیدار نے منودہانہ انداز سے جواب دیا۔

”کب آئی تھیں؟“ احیان نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”دو گھنٹے پہلے۔“ چوکیدار کے جواب نے اسے مزید حیران کیا۔

”اوکے۔“ اس نے ہلکا سا سر کو خم دیا اور گاڑی پورج کی طرف لے گیا۔

”وہ دو گھنٹے واجی سے کیا باتیں کرنے آئی تھی؟“ وہ یہی سوچتا ہوا واجی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

”عشق کا شین“ پڑھنے میں مگن تھے۔ اس کے سوال کو انہوں نے بے پروائی سے سنا اور اس سے بھی زیادہ بے پروائی سے جواب دیا۔

”کہاناں، ویسے ہی ملنے آئی تھی۔“ واجی کی بات پر وہ جھنجھلا اٹھا۔

”واجی۔۔۔۔۔ آپ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں؟“ اس نے ہلکا سا چڑ کر جواب دیا۔ اس گھر میں وہی تھا جو انہیں اس لہجہ میں جواب دے سکتا تھا اور نہ تو مجتبیٰ علی شاہ کے دونوں بیٹوں اور ان کی آل اولاد کو ان کے سامنے بے تکلفی سے بھی بات کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

”سمجھنے کی کیا بات ہے، وہ تو تم ہو۔“ واجی

ایڈیٹر ایک ہی سیشن میں بھگتا دیتی تھیں۔  
 ”یہ فیضان صاحب کا وہی پوتا ہے ناں جو اسکول  
 میں احیان کا کلاس فیلو تھا۔“ داچی نے یونہی بات  
 بدھانے کو کہا۔ جبکہ احیان منہ بتاتے ہوئے اپنے سیل  
 فون پر کسی کو فیکسٹ کرنے لگا۔ مسز مراد ان کی اسٹڈی کا  
 تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے چومکس۔

”جی۔۔۔۔۔ جی وہی۔۔۔۔۔“ انہوں نے تائید میں سر  
 ہلایا۔ ”پہلکشن آپ کی اسٹڈی کی ڈھنگ سے صفائی  
 نہیں کرتی، دیکھیں ذرا کونے میں جالا لگا ہوا ہے۔“  
 ”تم جالوں کو چھوڑو، اس ٹالاق کے لیے کوئی  
 لڑکی ڈھونڈو، کب تک یونہی پھرتا رہے گا۔۔۔۔۔“ داچی  
 کے شرارتی انداز پر احیان نے کوفت سے پہلو بدلا۔

”لڑکی سے مجھے یاد آیا۔ کچھ دیر پہلے بڑی پیاری  
 سی لڑکی پورچ کی طرف جا رہی تھی، میں نے اپنے

نے مسکراتے ہوئے کتاب بند کی۔“ تم پوچھنا کیا  
 چاہتے ہو؟“

”آپ اس لڑکی کو کیسے جانتے ہیں۔۔۔۔۔؟“ وہ  
 ناراضی سے گویا ہوا۔

”میرے ایک دوست کی بیٹی ہے۔۔۔۔۔“ انہوں  
 نے صاف اسے بہلایا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔“ احیان نے فوراً  
 ہی ان کی بات کو مسترد کیا۔ ”اس کی جتنی عمر ہے اس  
 لحاظ سے آپ اس کے دادا یا نانا کے دوست تو ہو سکتے  
 ہیں۔ اس کے قادر کے نہیں۔۔۔۔۔ احیان کی دلیل پر داچی  
 نے بے ساختہ سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ہمیشہ کی طرح انہیں  
 لا جواب کر چکا تھا۔

”احیان کیوں پریشان کر رہے ہو مجھے؟“  
 داچی ہلکا سا جھنجھلائے۔

”میں پریشان کر رہا ہوں یا آپ۔۔۔۔۔؟“ اس  
 نے شکایتی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”تمہارے کیس کا فیصلہ تمہارے حق میں ہو  
 گیا، بس بات ختم؟“ انہوں نے اسے پھر سے بہلانا چاہا۔  
 ”ختم کہاں۔۔۔۔۔؟“ ابھی تو شروع ہوئی ہے، پلیز  
 بتائیں ناں۔“ وہ ضد پر اتر آیا۔ اس سے پہلے داچی کوئی  
 اور بہانہ بتاتے ان کی اسٹڈی کا دروازہ کھلا۔

”بابا، شام میں فیضان صاحب کے پوتے کا  
 ولیمہ ہے، آپ کو بہت اصرار کر کے بلایا ہے انہوں  
 نے۔۔۔۔۔“ مسز مراد کی اچانک آمد نے احیان کو  
 جھنجھلاہٹ میں مبتلا کیا جبکہ داچی کے حلق سے بڑی  
 پرسکون سانس خارج ہوئی۔

”مئی کو بھی ابھی آتا تھا۔۔۔۔۔“ احیان ان کو سلام  
 کرتے ہوئے جی بھر کر دل ہی دل میں کوفت کا شکار ہوا۔  
 ”شکر ہے بہو، تم نے یاد دلادیا، ورنہ میرے تو  
 ذہن میں ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔“ داچی نے مسکرا کر اپنی چھوٹی  
 بہو کو دیکھا۔ جو کم، کم ہی ان کے پورشن کو رونق بخشی  
 تھیں لیکن جب کبھی آ جاتیں تو پھر دو کھٹے سے پہلے  
 جانے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ سارے معاملات، خانہ دانی

## رات کا مسافر

منی کے ٹکڑے میں سیشن کے آخری صفحات پر

قارئین کے محبوب قلم کار  
 طاہر جاوید مغل کا نیا شاہکار

جذبات کے بھنور میں الجھے ایک نوجوان  
 کی سرکشی، جس کے پیروں میں ایک  
 وعیے کی زنجیر سے نکلنے نہ دیتی تھی۔۔۔۔۔  
 رنگین و سنگین پڑاؤ کی دلربا داستان

الگ مسجد بنا کر بیٹھ جائے، اچھا خاصا اپنے باپ کا چلن  
ہوا بزنس چھوڑ کر خود بخوبی کرنے بیٹھ گیا ہے۔“  
”ہا تو ہے تمہیں اس کے مزاج کا، سب بچوں  
سے مختلف ہے۔“ داجی کے لہجے میں احیان کے  
لیے محبت ہی محبت تھی۔

”اس کا مختلف ہونا ہی تو پریشان کرتا ہے  
ہمیں۔ حزرہ اور جلال بھی تو ہیں۔“ انہوں نے منہ  
بنایا تو وہ مسکرا دیے۔

”تم چھوڑو اسے، یہ بتاؤ مراد آگیا اسکاٹ لینڈ  
سے۔“ داجی نے ان کی توجہ دوسری جانب  
مبذول کی۔

”نہیں۔۔۔ رات دس بجے کی فلائٹ ہے ان  
کی۔۔۔“ مسز مراد نے سنجیدگی سے جواب دیا اور ان کی  
اسٹڈی کے پردے ہٹائے۔ دھوپ کا ایک طوفان سا  
کمرے میں گھس آیا۔ سامنے ہی احیان کی گاڑی گیٹ  
سے نکل رہی تھی۔

☆☆☆

”ویسے یار بڑا احسان کیا ہے بسمہ خالد نے ہم  
پر۔۔۔۔۔“ وہ دونوں گالف کلب سے نکل رہے تھے۔ عمار  
کی بات پر احیان نے تپ کر اسے دیکھا۔

”ایسا کون سا احسان کر دیا ہے، جو تم صبح شام  
اس کے نام کی تسبیح کر رہے ہو؟“

”یہ بات کیا کم ہے اس نے اپنا وہ کیس بیچ میں  
چھوڑ دیا۔ جسے وہ آسانی سے جیت سکتی تھی۔“ عمار  
نے ریموٹ سے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔

”تو کیا کمال کیا؟“ احیان کا مزاج خواہ مخواہ  
ہی برہم تھا۔

”کمال یہ کیا کہ ہمارے وکیل کو اس کیس کے  
سارے ویک پوائنٹ بتا دیے۔ جس کے نتیجے میں  
دوسری پارٹی کو مجبوراً ہم سے مصالحت کرنی پڑی۔“

عمار کی بات پر اس کا دماغ بھٹک کر کے اڑا۔  
”تمہیں کس نے بتایا۔؟“ اس نے بے تابلی  
سے پوچھا۔

نیرس سے دیکھا تو ملازمہ نے بتایا۔ آپ سے منے آئی  
تھی۔“ مسز مراد کی بات پر احیان کے چہرے پر بڑی  
ظنیہ مسکراہٹ ابھری۔ داجی ایک دفعہ پھر ہیرے میں آ  
چکے تھے۔

”وہ۔“ داجی نے لمبا سا وہ ادا کیا۔ ”میرے  
ایک فرینڈ کی پوتی ہے۔“ داجی کے بیان بدلتے پر  
احیان نے ناراضی سے ان کی طرف دیکھا۔

”کیا کرتی ہے۔؟“ مسز مراد نے دلچسپی  
سے پوچھا۔

”ایڈووکیٹ ہے، پریکٹس کر رہی ہے آج کل۔“  
”اوہ۔۔۔۔۔ کب تک بات و ات طے ہے اس کی۔۔۔۔۔؟“  
ان کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوا۔

”میرا خیال ہے، ابھی نہیں۔۔۔۔۔“ داجی نے مسکرا  
کر احیان کو دیکھا جس کے چہرے کے زاویے بری  
طرح بگڑ رہے تھے۔

”تو بات کریں تاں احیان کے لیے۔ اچھا ہے  
یہ بھی ٹھکانے لگے۔“ ممی کی بات پر احیان کو جھٹکا لگا۔

”حد کرتی ہیں ممی آپ بھی، میں اتنا گیٹ گزرا  
ہوں؟ ایک نیرس سے جھانک کر آپ نے لڑکی کو  
دیکھا اور میرے لیے پسند کر لیا۔“ اس کے تلخ انداز پر  
وہ مسکرائیں۔

”وہ دور سے اتنی پیاری لگ رہی تھی تو قریب سے  
تو یقیناً بہت خوب صورت ہوگی۔“ مسز مراد کی بات پر  
ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر دوڑی۔

”ممی اچھی زندگی گزارنے کے لیے لائف پارٹنر کا  
صرف ظاہری طور پر خوب صورت ہونا ضروری نہیں  
ہوتا۔ اس کا مزاج، عاداتیں اور رویہ زیادہ اہم ہے۔“ وہ

جھنجھلا کر اٹھا اور سر جھٹک کر کمرے سے نکل گیا۔  
”اسے کیا ہوا۔۔۔؟“ مسز مراد نے حیرانی سے

اپنے سر صاحب کا تبسم چہرہ دیکھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔ بزنس کی وجہ سے اب پیٹ  
ہے۔۔۔۔۔“ انہوں نے بہانہ بنایا جو ان کے ہی گلے پڑ گیا۔  
”تو اسے کس نے کہا ہے اچھا ڈیڑھ اینٹ کی



چرانے کے لیے اچانک مخاطب کیا۔  
”کیا مطلب.....؟“ اس کی آنکھوں میں  
الجھن در آئی۔

”آپ نے اپنے سابقہ کلائنٹ کے سارے  
ویک پوائنٹس دوسری پارٹی کے وکیل کو بتائے، اس  
مات فیر.....“ احیان کے طنزیہ انداز پر وہ مسکرائی۔

”ہوں۔“ وہ دونوں بازو سینے پر باندھ کر اس  
کے تھوڑا قریب آئی۔ ”آپ کو کس نے کہا ایسا.....؟“  
”شہریار صاحب نے۔“ احیان کا اطمینان  
دیدنی تھا۔

”انہوں نے یہ نہیں بتایا پروفیشنل لائف میں  
جہاں مجھے یہ محسوس ہو کہ اگلی پارٹی کے ساتھ حقیقتاً  
زیادتی ہو رہی ہے، میں اپنا کیس وہیں ڈراپ کر دیتی  
ہوں۔“ ہسمہ نے بڑے پُر اعتماد انداز سے اس کی  
آنکھوں میں جھانکا۔

”دوسری پارٹی کی زیادتی کا آپ کو شاہ جی سے  
پلنے کے بعد پتا چلا ہوگا۔“ احیان کے چہرے پر طنزیہ  
مسکراہٹ ابھری۔

”نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔  
”حقیقت پتا پلنے کے بعد ہی میں ان سے معذرت  
کرنے لگی تھی۔“

”فرض کریں، ہم لوگ غلط ہوتے، تب بھی آپ  
شاہ جی کے کہنے پر وہ کیس چھوڑ دیتیں۔“ احیان کو اس  
سے بحث میں اب مزہ آنے لگا۔

”نہیں۔“ ہسمہ نے اسے حیران کیا۔  
”شاہ جی نے آپ کو میرے پاس بھیجا تو میں سمجھ  
گئی کہ کسی نہ کسی پوائنٹ پر میں غلط ہوں۔ ورنہ وہ ایسا  
نہ کرتے۔“ اس کی بات پر احیان کو جھٹکا لگا۔

”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں.....؟“  
”وہ کم از کم مجھ سے کسی غلط بات پر فیور نہیں  
ماگ سکتے۔“ اس نے گاڑی کا دروازہ ایسے بند کیا  
کہ ایک لمحے کو احیان کو لگا جیسے وہ اس کے منہ پر طمانچہ  
مار کر گئی ہو۔ وہ اب گاڑی اشارت کر رہی تھی۔ احیان

”شہریار باٹھی نے۔“ عمامہ نے اپنے وکیل کا نام  
لیا تو احیان کو اس کی بات کا یقین آ ہی گیا۔ اندر کی کہانی تو  
اسے آج معلوم ہوئی تھی۔ ورنہ وہ تو کیسی فرض کیے بیٹھا تھا  
کہ معاملہ بہت آسانی سے طے ہو گیا تھا۔ اسی لیے تو وہ  
ہسمہ خالد کا احسان ماننے کو راضی نہیں تھا۔

”سچ مانو، میں تو بہت مشکور ہوں اس کا.....“  
عمامہ کی بات پر وہ چنسا گیا۔

”ایسا کرو ایک سیج خریدو اور اس پر اس کے نام  
کا پہاڑ اڑھنے لگو.....“

”خیر ہے تم کیوں اتنا بھڑک رہے ہو۔ کس نے  
تمہاری دم برپاؤں رکھ دیا؟“ عمامہ ہنسا۔

”پتا نہیں یار، آج کل خواہ مخواہ ہی غصہ آنے لگا  
ہے مجھے.....“ احیان نے گل کر اعتراف کیا۔

”تو میری جان، کچھ ریٹ ریٹ کرو۔ یہ  
لڑکیوں کی طرح بات بے بات غصہ کرنا تم جیسے مرد پر  
سوٹ نہیں کرتا.....“ عمامہ اس کی گھوریوں کی پروا نہ  
کرتے ہوئے اپنی

گاڑی میں بیٹھ کر اسے اشارت کر چکا تھا۔ اس  
سے پہلے کہ وہ تپ کر اسے جواب دیتا، وہ شرارت سے  
گاڑی لے کر نکل گیا۔

☆☆☆

آج کافی دن کے بعد وہ بڑی فرصت سے  
شاپنگ کے لیے نکلا تھا۔ جناح پیر سے ہو کر وہ سینورس  
شاپنگ مال کی طرف نکل آیا۔ دو گھنٹے ٹھیک ٹھاک  
شاپنگ کر کے وہ باہر نکلا تو سامنے ہی ہسمہ بہت سے

شاہزادہ شاہنے پارکنگ کی طرف ہی آرہی تھی۔ اس کی  
گاڑی احیان کی گاڑی کے بالکل ساتھ تھی۔

”کیسے ہیں آپ؟ شاہ جی کیسے ہیں؟“ وہ مسکرائی۔  
”بہتر ہیں.....“ احیان نے سنجیدگی سے جواب

دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو اپنی شاپنگ گاڑی  
کی چھٹی سیٹ پر رکھ رہی تھی۔

”ویسے پروفیشنل لائف میں، میں آپ سے اس  
بددیانتی کی توقع نہیں رکھتا تھا۔“ احیان نے اسے

جھنجھلا کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور آندھی کی طرح اڑتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ سامنے داعی لان میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ انہیں سرسری سا سلام کر کے اندر کی جانب بڑھ رہا تھا جب داعی نے اسے پیچھے سے مخاطب کیا۔

”تم ناراض ہو مجھ سے؟“ وہ چلتے، چلتے مڑا۔

”میں ایسی جسارت کر سکتا ہوں بھلا۔۔۔“ وہ

داعی ان سے تھا تھا۔

”جسارتیں تو تم خاصی بڑی، بڑی کرنے لگے

ہو، تمہیں خود بھی پتا نہیں چلتا۔“ داعی کے ہنگلے پر وہ

ہلکا سا جھنجھلا یا۔

”آپ کو وہ لڑکی مجھ سے زیادہ عزیز ہے۔“

”ہاں؟“ ”بے اختیار ہی اس کی زبان پھسلی تو وہ مسکرا دیے۔

”کسی کی پرسنل لائف کو اس کی اجازت کے بغیر

ڈسکس کرنا مجھے مناسب نہیں لگتا۔“ داعی کے سنجیدہ

انداز پر وہ ٹھنکا۔

”اس نے منع کیا ہے آپ کو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ لان چیمبر پر بیٹھتے ہوئے

بولے۔ ”میرا اپنا بھی تو اخلاقی طور پر کچھ فرض بنتا ہے۔“

”اس اوکے۔“ ”کچھ دیر سوچنے کے بعد اس

نے ہتھیار ڈال ہی دیے کیونکہ یہ بات تو طے شدہ تھی وہ

داعی سے ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں اٹھوا

سکتا۔ اگلے کئی دن تک وہ اور عمارت اپنی فیکٹری کے لیے

کوئی اور جگہ ڈھونڈنے میں مصروف رہے۔ آخر کار

انہیں ایک مناسب جگہ مل ہی گئی لیکن اس دفعہ دونوں

خاصے محتاط تھے۔ اس لیے معاملہ خیر اسلوبی سے سر

انجام پا گیا۔ انہی مصروفیات کی بنا پر اس کی کئی دن تک

داعی سے ملاقات نہیں ہوئی اور بسہرہ تو بالکل ہی ذہن

سے نکل چکی تھی۔ اس دن وہ رات بارہ بجے کے قریب

گھر پہنچا تو حیران رہ گیا۔

پورچ میں داعی کی گاڑی اشارت کھڑی تھی اور

ملازم ان کا چھوٹا سوٹ کیس گاڑی میں رکھ رہا تھا۔ جبکہ

داعی پریشانی کے عالم میں کسی سے فون پر بات کر رہے

تھے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے فون بند کر دیا۔

”داعی کیس جا رہے ہیں کیا۔۔۔۔۔“ ”احیان کو سخت

حیرانی ہوئی کیونکہ بہت عرصے سے انہوں نے باہر نکلتا

خاصا کم کر دیا تھا اور اب رات گئے اس طرح سوٹ

کیس کے ساتھ نکلتا واقعی تعجب کی بات تھی۔

”ہاں ایک ایمر جنسی ہو گئی ہے۔“ وہ اپنی گاڑی

کی طرف بڑھے۔ ”مری کے لیے نکل رہا ہوں۔“

”مری، اس وقت؟ کوئی پرابلم ہے تو میں ساتھ

چلوں۔۔۔۔۔؟“ وہ پریشان ہوا۔ داعی ایک لمحے کو ٹھنکے۔

”کچھ سوچا پھر اثبات میں سر ہلایا۔

”میں گاڑی میں ہوں۔ تم ایک دو سوٹ لے آؤ

اپنے۔“ ”بیس رہتا چڑے گا وہاں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ

جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ احيان ابھرن بھرے

انداز میں اپنے کمرے کی بڑھاؤ تین سوٹ اپنے بیگ

میں ڈالے اور لیپ ٹاپ اٹھا کر باہر نکل آیا۔

رات کی تیر گھنٹہ میں گاڑی گھر سے نکلی، اس نے

جلدی سے عمارت کو ٹیکسٹ کر کے بتایا کہ وہ داعی کے

ساتھ گاؤں جا رہا ہے باقی معاملات وہ دیکھ

لے۔ ایف سیون سیکٹر سے گاڑی اسلام آباد ایکسپریس

دے پر پہنچ چکی تھی۔ داعی کا چہرہ سپاٹ اور انداز میں

کوئی بات ایسی تھی کہ وہ کئی دفعہ انہیں مخاطب کرتے،

کرتے رہ گیا۔

شکر پڑیاں اشارے سے گاڑی ایچ ایٹ سیکٹر کی

طرف مڑ گئی۔ وہ تھوڑا سا حیران ہوا، یہ مری کا روٹ تو

نہیں تھا۔ کار اسلام آباد کے شفا انٹرنیشنل اسپتال کے

سامنے جا کر رک گئی۔ احيان نے سوالیہ نگاہوں سے

داعی کی طرف دیکھا جو بجلتے بھرے انداز میں گاڑی

سے نکلے اور اسے وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دس منٹ

کے بعد ان کی واپسی بسہرہ خالد کے ساتھ ہوئی۔ جس کا

چہرہ شدت گریہ سے سرخ اور آنکھوں سے آنسو قطار کی

صورت بہہ رہے تھے۔

احیان کو غیر متوقع طور پر اسے دیکھ کر جھٹکا لگا۔ وہ

سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سے اگلی ملاقات اتنے عجیب

جلائے بیٹھے تھے۔

”کیا ہوا احمد بخش؟“ واجی کی آواز میں تشویش کا عنصر شامل ہوا۔ انہوں نے شیشہ نیچے کر کے ڈرائیور سے پوچھا جو گاڑی کا جائزہ لینے میں مگن تھا۔

”صاحب جی گاڑی کا کچھلا ٹائر پتھر ہو گیا ہے۔“ احمد بخش کے دانت سروئی کی شدت سے بج رہے تھے۔ پیچھے آنے والی ایسولینس بھی رک گئی۔

”آپ لوگ سامنے والے ہوٹل میں چلے جائیں، میں کچھ کرتا ہوں۔“ ڈرائیور کے مشورے پر احیان نے جیسے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ بارش کی ایک تیز بو چھانڑنے اس کا استقبال کیا۔ سردیوں کی اس سخت رات میں پہلی دفعہ احیان کو بارش سخت پری لگی۔ ہڈیوں کو خمند کرنے والی ہوائے اچھی خاصی نیچکی کی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔

وہ، واجی اور بسند سڑک پر بیٹے اس چھوٹے سے ہوٹل میں چلے آئے۔ دوسرے کی واک نے ان تینوں کو اچھا خاصا بھگو دیا تھا۔ رات کے دو بجے اس ہوٹل کا مالک تین لوگوں کو آتا دیکھ کر حیران ہوا۔

”چائے ملے گی؟“ واجی کے پوچھنے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”واش روم کس طرف ہے؟“ واجی کی بات پر ہوٹل کے مالک نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”بسند بیٹا آپ بیٹھیں۔“ واجی نے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ افسردہ سے انداز میں اس طرف چل پڑی۔ احیان سامنے لگے واش روم کی طرف آگیا اور قہقہوں کر جیسے ہی ہاتھ دھونے کے لیے نیچے کیے۔ اس کو جھٹکا سا لگا۔ غٹھنڈا پانی ایک لمحے کو سارے حواس معطل کر گیا۔ اس نے جھٹکے سے ہاتھ پیچھے کیے۔ اور مزید دھونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

جیسے ہی وہ واپس آیا۔ اسے ایک دم جھٹکا لگا۔ بسند سامنے موجود کرسیوں پر نہیں تھی۔

”کہاں گئی وہ؟“ احیان پریشانی سے ہوٹل سے باہر نکلا۔ موسلا دھار بارش میں وہ سڑک کے پاس

طریقے سے ہوئی۔ وہ واجی کے کندھے سے نمی گاڑی کی طرف آتے ہوئے مسلسل رو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی گہرے صدمے سے دوچار ہوئی ہو۔

”احیان تم ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر چلے جاؤ۔“ واجی کے سنجیدہ انداز پر وہ فوراً خاموشی سے گاڑی سے اتر اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”ایسولینس کے ڈرائیور سے کہو، وہ ہماری گاڑی کے پیچھے رہے۔“ واجی نے اپنے ڈرائیور کو اگلا حکم صادر کیا جسے سنتے ہی احیان کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ وہ ابھی تک یہ سارا سمجھنے سے قاصر تھا۔

”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ کچھ سیٹ پر بیٹھے واجی نے یقیناً یہ دلا سا بسند کو دیا تھا۔

گاڑی اب اسلام آباد ایکسپریس دے سے سری کی جانب بھاگ رہی تھی۔ اس کے پیچھے خاموشی سے دوڑتی ہوئی ایسولینس اس بات کی گواہ تھی کہ اس میں آنے والا مردہ جسم اپنی زندگی کی بازی ہار چکا ہے اور یقیناً اس کا بسند کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے۔ رات کے سنانے میں اس لڑکی کی سسکیاں ماحول کو عجیب سا بٹارہ بن گئیں۔ سردیوں کا موسم تو آنے لگا اپنے غرور پر مرتع۔ اس وقت بھی ٹمپریچر منفی میں تھا۔ رات کی تیرگی میں دائیں بائیں بلند و بالا پہاڑ بعض دفعہ بہت ہیبت ناک لگتے ہیں۔ احیان اپنے ارد گرد کے مناظر سے بے نیاز بس کچھ سیٹ پر بیٹھے دو لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”کون ہے یہ لڑکی اور اس کا واجی سے کیا رشتہ ہے؟“ سوچ، سوچ کر اس کا دماغ تھک چکا تھا۔

”ایسولینس میں رکھی مینٹ کس کی ہے؟“

”اس مینٹ کا واجی سے کیا تعلق بنتا ہے؟“

وہ انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ سڑک پر دوڑتی ہوئی گاڑی کو ایک دم جھٹکا لگا اور ڈرائیور نے جلدی سے بریک لگا دی۔ نور گاڑی سے اتر آ احیان نے چونک کر دیکھا سڑک کے کنارے پر ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ جس کے برآمدے میں دو آدمی ٹکڑیوں کا الاؤ



رکی ایسبولینس کا دروازہ کھڑے بری طرح رو رہی تھی۔ سردیوں کی اس ٹھنڈی، بے رخت رات میں دھواں دھار ہونے والی بارش کے درمیان ایسبولینس کے پاس کھڑی وہ لڑکی اپنے ہوش و حواس میں نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے کندھوں تک آتے بال اور سیاہ شال بری طرح بھگی چکی تھی۔

”پانگل ہو گئی ہو کیا؟“ احیان نے ناراضی سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کیا۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں اس قدر اذیت، وحشت اور سراسیمگی تھی کہ احیان نے خوفزدہ ہو کر اس کا بازو چھوڑ دیا۔

اس کے چہرے پر پھیلا کرب وہ رات کی اس تاریکی میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ رو نہیں رہی تھی بلکہ لمحہ لمحہ ختم ہو رہی تھی۔ وہ اذیت کی اس انتہا پر تھی جہاں انسان کا رابطہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور موسموں سے بالکل کٹ جاتا ہے۔

”ماما میز اٹھ جائیں.....“ وہ ایسبولینس کا دروازہ کھڑے دیوانوں کی طرح رو رہی تھی۔ احیان کو ساری فضا ہی سو گوار محسوس ہوئی۔ ایسے لگا جیسے آسمان بھی اس کے غم میں کھل کر رو رہا ہو۔ ہر بوند اشک بار تھی۔

”ٹیک اسٹ ایزی میز.....“ اس نے بے ساختہ ہی جذبہ ہمدردی سے مغموم ہو کر اسے اپنے بازو کے ساتھ لگایا اور وہ تو ویسے ہی ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ اس کے بازو پر ہاتھ رکھے بری طرح رو رہی تھی۔

”احیان..... بسمہ.....“ داجی نے ہوش کے برآمدے کے سرے پر آ کر بلند آواز میں پکارا۔ احیان نے آہستگی سے اس کا بازو پکڑا اور اسے زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ ہو کر کی طرف لے آیا۔ وہ بری طرح کپکپا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ سردی کی شدت سے نیچے ہو رہے تھے۔

”بسمہ.....“ داجی کی آواز میں پنہاں دکھ اس وقت وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ جس قیامت سے وہ گزر رہی تھی۔ وہ لوگ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔

”بے وقوف لڑکی ہمارے کپڑے کیلے ہو گئے ہیں

تمہارے.....“ داجی کے لہجے میں شفقت کی فراوانی تھی۔

”سوری انگل.....“ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں کو بے دردی سے رگڑا۔

”احیان، اس کا بیگ نکال کر لاؤ گاڑی سے.....“ وہ پانچ منٹ کے بعد واپس آیا تو وہ کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ڈرائیور گاڑی کا مائٹربیل کر چکا تھا اور اس وقت بھی لوگ خاموشی سے چائے پی رہے تھے۔ جب تک انہوں نے چائے ختم کی، وہ اپنا ڈرائیو تبدیل کر کے آچکی تھی۔ اب وہ سیاہ سوٹ پر سیاہ رنگ کی شال اوڑھے ہوئے اس تاریک رات کا کوئی سو گوار ماحول لگ رہی تھی۔

ڈرائیور نے گاڑی میں بیٹھتے ہی میٹر چلایا تو گرمائش نے اندر کا ماحول خاصا بہتر کر دیا تھا۔ رات نے مری کے بلند و بالا پہاڑوں کی دلکشی کو چھپا دیا تھا۔ ڈرائیور اب بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ لوگ جب مری پہنچے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ بسمہ کا گھر مری کے قریب بھور بن کے علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھا۔ گاڑیاں اونچی نیچی مل کھاتی سڑکوں پر چلتی ہوئی ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جا کر رک گئیں۔ اس گھر کے کیمنوں کو شاید اس حادثے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اس لیے گاڑیوں کی آوازیں سنتے ہی دو تین مرد باہر نکل آئے۔ جبکہ ایک بوڑھی سی خاتون نے آگے بڑھ کر بسمہ کو گلے لگایا اور وہ ایک دفعہ پھر بے آواز رونے لگی۔ میت کو بڑے آرام سے اتارا جا رہا تھا۔ ان کے کافی رشتے دار باہر نکل آئے تھے۔

”شاہ جی، آپ ادھر آ جائیں.....“ بسمہ کے کسی بزرگ رشتے دار..... نے احترام کے ساتھ گھر کی بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔ احیان، داجی کی پیروی میں اندر داخل ہوا۔ اندر کا ماحول خاصا گرم تھا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور چھوٹے سے کمرے میں دو پٹنگ، دو کرسیاں اور میز رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں آرائشی چیزیں بالکل نہیں تھیں۔

اطلاع دے کر خود کچھ اور مہمانوں کے ساتھ ایسے مصروف ہوئے کہ پھر اگلے دن ہی ہاتھ آئے۔ وہ اس وقت تک جی بھر کر بور ہو چکا تھا۔ لیپ ٹاپ کی بیٹری ختم ہو چکی تھی اور وہ ساتھ لانا بھول گیا تھا۔ تنگ آ کر وہ اگلے دن باہر نکل آیا۔ آج موسم خاصا خوشگوار تھا۔ موسم سرما کی نرم دھوپ نے تمام پہاڑوں پر بسیرا کر رکھا تھا۔ وہ پتھروں پر چلتا ہوا خاصا دور نکل آیا۔ گاؤں کے جنوبی سائڈ پر چھوٹا سا قبرستان تھا۔ صنوبر اور چیز کے درختوں کے نیچے دور، دور تک کافی سنگ مرمر کی بنی ہوئی قبریں تھیں۔ جو شاید یہاں کے پچھلے موسموں کی وجہ سے بنائی گئی تھیں۔ ایک تازہ تازہ بنی ہوئی قبر پر فاتحہ کرتی لڑکی کو دیکھ کر اسے کافی حیرت ہوئی۔

”ہمس! آپ؟“ وہ اسے پہچان چکا تھا۔  
”کیسے ہیں آپ؟“ وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

”میں تو ٹھیک ہوں، آپ کی والدہ کی ڈیڑھ کا بہت افسوس ہوا۔“ اس نے گئے ہاتھوں افسوس کی رسم نبھائی۔

”وہ میری والدہ نہیں، داوی تھیں۔“ اس کی اطلاع پر اسے جھٹکا لگا۔

”اوہ۔۔۔ مجھے پتا نہیں تھا۔۔۔“ وہ شرمندہ ہوا۔  
”کیوں، شاہ جی نے نہیں بتایا آپ کو؟“

اس کے سادہ سے انداز میں احیان کو طکر کی آمیزش محسوس ہوئی۔ وہ اب چل پڑی تھی۔

”بتایا تو تھا لیکن میں نے شاید غور نہیں کیا۔“ اس نے جلدی سے صفائی دی۔

”آپ کے پیرنس کہاں ہوتے ہیں؟“ وہ چلتے، چلتے رکی۔ استغاب یہ انداز سے اسے دیکھا۔

”میرا خیال ہے شاہ جی نے آپ کو شاید ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ اس نے بالکل درست اندازہ لگایا۔ وہ کل کی نسبت آج خاصی کمپوزڈ تھی۔

”ایسا نہیں ہے۔“ اس نے فوراً جھوٹ بولا۔ ”اچھ نکلی میرے ذہن سے نکل گیا، شاید آج کل

”آپ لوگ ریٹ کریں۔ ہم لوگوں کو میت کے حوالے سے کچھ انتظامات کرنے ہیں۔“ وہ بزرگ معذرت کر کے بیٹھک سے نکل گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گرم گرم چائے، اسٹے اٹلے اور ڈرائی فرڈس کی ٹرے اندر آ گئی۔ چائے کی حطب تو دونوں کو بھی لیکن باقی چیزوں کو انہوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اسی دوران چند اور مرد بھی شاہ جی سے ملنے کے لیے آئے اور احیان نے اندازہ لگایا وہ دائمی سے بڑے احترام اور عقیدت بھرے انداز میں مل رہے تھے۔

”احیان تم سو جاؤ۔“ ان کے کمرے سے نکلتے ہی دائمی نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔ دماغ میں ان گنت سوالوں نے پچھل پچا رکھی تھیں لیکن اس ذہنی اور جسمانی مشقت کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ اگلے ہی چند رہ منٹوں میں گہری نیند میں تھا۔ اگلی صبح نو بجے جا کر ہی اس کی آنکھ کھلی۔ واش روم میں گرم پانی سے بھری بالٹی اور ایک چھوٹا ٹب رکھا ہوا تھا۔

اسے پہلی دفعہ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی مشکلات کا اندازہ ہوا۔ شاور لے کر وہ باہر نکلا تو سامنے چھوٹے سے ٹینٹ میں چند لوگ اکٹھے تھے۔ دس بجے جنازہ تھا۔ ہمس کے سارے ہی رشتے دار اکٹھے ہو چکے تھے۔ دائمی بھی اس وقت چند بزرگوں کے گھیرے میں تھے۔ احیان ایک سائڈ پر بیٹھ گیا۔

”ہمس! دو تین دن یہاں رہنا ہوگا۔“ جنازے کے بعد دائمی کی سنجیدگی سے دی گئی اطلاع پر وہ حیران ہوا۔  
”وہ کیوں؟“

”ہمس کے کچھ معاملات ہیں، جن کو نبھانا ضروری ہے۔“ دائمی کی بات پر اسے یاد آیا کہ رات سے اس نے دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھی تھی، وہ یقیناً خواتین والے حصے میں ہوگی۔ دائمی نے بھی شاید اس کی سوچ کو پڑھ لیا تھا۔

”اس کی طبیعت رات سے خاصی خراب ہے، ڈاکٹر نے اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے فیندکا انجکشن لگایا ہے، وہ ابھی سو رہی ہے۔“ دائمی اسے

بزنس کی طرف زیادہ دھیان تھا میرا۔" وہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ اونچے اونچے پہاڑی راستے پر بڑی مہارت اور تیزی سے چل رہی تھی۔ جبکہ احیان کو چلنے میں ذرا دشواری ہو رہی تھی۔

"اچھا۔۔۔" اس نے تبصرہ نہیں کیا۔ احیان کو مایوسی ہوئی۔

"آپ کے اور بہن بھائی نظر نہیں آئے اس موقع پر۔۔۔"

"میں اٹھوتی ہوں۔۔۔" اس نے اطلاع دی۔

"اوہ۔۔۔" وہ حیران ہوا۔

"دامی آپ کے کیا لگتے ہیں۔۔۔" وہ چپے، چلتے رکی اور دونوں بازو سینے پر باندھ کر بڑے آرام سے بور۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" اسے جھکا لگا۔

"اگر دنیا میں انسانیت، ہمدردی اور انسان دوستی کی بنیاد پر بنائے جانے والے رشتوں کا کوئی نام ہے تو سمجھ لیں، شاہ جی کے میرے ساتھ یہی رشتے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ وہیں کھڑا سوچنے کا سوچتا رہ گیا۔

"یار یہ کیا فلم چل رہی ہے یہاں۔۔۔؟" اس نے شک آکر عماد کو فون ملا لیا۔

"لگتا ہے دامی کا اس کی دادی مرحومہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رہا ہے۔۔۔" عماد کی بات نے اسے ہلکی سی الجھن میں مبتلا کیا دل ایک دم بد مزہ ہو گیا۔ ست سے قدموں سے وہ اس کے گھر تک پہنچا، جینٹک کا دروازہ باہر کی جانب کھلا تھا۔ جیسے ہی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ ہسمہ، دامی کے سامنے والے چنگ پر دل گرفتہ سے انداز میں بیٹھی تھی۔ وہ اسے کچھ سمجھا رہے تھے۔

"اپنی دادی سے ہی کچھ سیکھ لو، کتنی باہمت خاتون تھیں وہ۔ تم ابھی سے حوصلہ ہار رہی ہو۔" دامی کی بات پر احیان نے چونک کر دامی کا چہرہ دیکھا۔ عماد کی بات میں اسے کوئی نہ کوئی سچائی محسوس ہوئی۔

"ان کے جیسے تو میں سر کر بھی دو بارہ پیدا نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔" وہ خامی دل گرفتہ لگ رہی تھی۔ احیان کو اس موقع پر اپنا آپ خاصا آ کر رڈ لگ رہا تھا لیکن وہ ڈھیٹ بن کر خود ہی دامی کے چنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے گفتگو کر رہے تھے جیسے کوئی اور کمرے میں موجود ہی نہ ہو۔

"تمہیں اگر عطا الرحمن پسند نہیں ہے تو میں خود تمہارے تایا سے بات کر لیتا ہوں۔" دامی کی بات پر وہ الجھا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی۔۔۔۔۔" وہ واقعی کسی گہری الجھن میں مبتلا تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی ہسمہ خالد ہے جو کورٹ میں پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کی تک ایک منٹ میں پہنچ جاتی تھی۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کے معاملے میں اس قدر شش و پنج کا شکار تھی۔

"نہیک ہے، پھر آپ جاؤ، ریٹ کر دو، مجھے کچھ سوچنے دو۔۔۔" دامی کی بات پر وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل گئی۔ دامی اب اس کی طرف متوجہ ہوئے جو دنیا جہان کی بیزاری اپنے چہرے پر سجائے بیٹھا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا۔۔۔؟" وہ اس کے مزاج آشنا ہونے کا دعویٰ یونہی تو نہیں کرتے تھے۔

"کچھ نہیں۔۔۔ کب چلنا ہے یہاں سے دامی۔۔۔؟" وہ واقعی سخت بور ہو چکا تھا۔

"بس دو چار دن اور۔۔۔۔۔" ان کی بات پر اسے کرفٹ ہی تو لگا تھا۔

"کیا۔۔۔؟ دو چار دن اور۔۔۔؟" وہ ایک دفعہ پھر بد مزہ ہوا۔

"تم اگر بور ہو رہے ہو تو میں تمہیں واپس بھجوا سکتا ہوں اسلام آباد، میں ایک دو دن بعد آ جاؤں گا۔" ان کی بات پر وہ جھنجھلا اٹھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آرہی دامی، جب آپ نے مجھے ڈھنگ سے کوئی بات تو بتائی نہیں ہے تو میں کیا یہاں بیٹھ کر کھیاں ماروں؟"



”بسمہ کی والدہ کا انتقال اس کی پیدائش پر ہی ہو گیا تھا۔ اس کی دادی اور باپ پر ہی اس کی ساری ذمہ داری تھی۔“

”پھر؟“

”بس میں نے اس کے والد کی ماہانہ میادوں پر مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا، جب تک اس کے والد زندہ رہے، ان کا میرے ساتھ رابطہ رہا۔“ دادی نے مزید بتایا۔

”اب کیا ان کا انتقال ہو چکا ہے؟“

”ہاں آج سے کچھ سال پہلے جب بسمہ نے گریجویشن کیا تھا۔“ دادی کی بات پر اسے مزید افسوس ہوا۔ ”تب اس کی دادی نے دوبارہ مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ بسمہ لاؤ پڑھنا چاہتی ہے۔ میں نے اس کا ایڈمیشن کروادیا اور اس کے فادریں وفات کے بعد بھی اس کی جاب ہونے تک امداد کا سلسلہ جاری رکھا۔“

”اچھا۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔“ احیان کو ساری بات سمجھ میں آگئی۔

”لیکن جیسے ہی بسمہ پریکٹیکل لائف میں آئی تو اس کی دادی نے بتایا کہ اب انہیں مزید سپورٹ کی ضرورت نہیں۔“

”تو آپ کبھی نہیں ملے تھے اس سے۔۔۔؟“ وہ جلدی سے بولا تھا۔

”نہیں۔۔۔“ دادی کی بات نے اسے حیران کیا۔ ”کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ حتیٰ کہ میری تو کبھی بسمہ سے بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ اصل میں اس کی دادی نے بہت عرصے کے بعد اسے بتایا تھا کہ گھر کے مالی معاملات کس طرح سے چلتے رہے ہیں۔“

”تو اب اسے کیا مسئلہ ہے۔۔۔؟“ احیان نے الجھن بھرے انداز سے پوچھا۔

”زیتون خاتون کے انتقال کے بعد اب ان کے سارے ہی رشتے دار انھیں کرا گئے ہیں اور اب بسمہ بھی مالی طور پر مستحکم ہے تو اس کے تایا اپنے بیٹے کا رشتہ کرتا چاہتے ہیں بسمہ سے۔“ انہوں نے اصل بات بتائی جسے سنتے ہی احیان کو غصہ آ گیا۔

”اچھا، پوچھو، کیا پوچھنا ہے۔۔۔؟“ ان کی اگلی بات نے احیان کو حیران کیا۔

”یہ بسمہ آپ کی کیا لگتی ہے۔۔۔؟“

”کچھ بھی نہیں۔“

”تو پھر ہم یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔۔۔؟“ وہ بیزار سے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”کسی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اگلے بندے کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق یا رشتے داری ضرور ہو۔“ دادی کے سنجیدہ انداز پر وہ چونکا۔

”کوئی نہ کوئی تو لنک ضرور ہوتا ہے، ورنہ ہم کیوں کسی کے لیے ایسے خوار ہوں۔“ احیان نے طنزیہ انداز سے انہیں دیکھا۔

”تمہیں کس نے کہا، میں خوار ہو رہا ہوں۔۔۔۔۔۔“

دادی کی بات پر وہ شیشا سا گیا۔

”میں تو ہو رہا ہوں۔“ وہ یہ بات صرف سوچ سکتا تھا، کہنے کی صورت میں دادی کی دل آزاری یقینی تھی۔ اس لیے وہ چپ رہا۔

”بسمہ تمہارے تایا کی فیکٹری کے ایک مزدور کی بیٹی ہے۔۔۔۔۔“ دادی کی بات پر اسے کرٹ سا لگا۔ ”آج سے بیس سال پہلے جب بسمہ صرف چار سال کی تھی، اس کے والد فیکٹری میں ایک کرین سے ٹکرانے کی وجہ سے اپنی ٹانگوں سے محروم ہو گئے تھے۔“ دادی نے آخر اپنی پوٹلی کھول ہی دی تھی۔

”پھر۔۔۔؟“ وہ سخت حیران ہوا۔

”تمہارے تایا نے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا، تب بسمہ کی دادی زیتون بیگم مدد تو ہوئیں میرے پاس آئیں۔“ دادی مضطرب انداز میں کھڑے ہوئے۔

”پھر کیا ہوا۔۔۔۔؟“ وہ بے تاب انداز میں گویا ہوا۔

”اس کی دادی نے بتایا کہ رشتے داروں نے بھی ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔ حتیٰ کہ بسمہ کے چچا اور تایا بھی کسی قسم کی مالی سپورٹ کرنے کو تیار نہیں۔“

دادی نے سنجیدگی سے اس کہانی کے کچھ اور پہلو کھولے۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ اسے افسوس ہوا۔

”اور آپ ان خود غرض اور مفاد پرست لوگوں میں شادی کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں اسے۔۔۔۔۔“

”میں نے اسے کبھی مشورہ نہیں دیا، ہمیشہ اس کی رائے کا احترام کیا ہے، وہ میرے لیے بالکل عمرہ کی طرح ہے۔“ داعی نے اپنی اکلوتی پوتی کا نام لیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی بھی رشتہ قائم کرنے کی، جنہوں نے اتنے مشکل وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔“ احیان کا بے رنگ تبصرہ ہسمہ نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے بتا کی ہوش و حواس سنا تھا۔ وہ جو کھانے کی ٹرے لیے اندر آ رہی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کر احیان ایک دم سٹیپ سا گیا۔

”داعی کھانا۔۔۔۔۔ ہسمہ کی بات پر احیان بری طرح چونکا۔ ہسمہ نے انہیں ”شاہ جی“ سے ”داعی“ کہنا کب شروع کیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

”میز پر رکھ دو بیٹا، میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“ داعی فوراً وائش روم کی طرف بڑھے۔

”آؤ بیٹا، تم بھی ہمارے ساتھ کھاؤ ناں۔“

داعی نے محبت بھرے انداز میں اس سے کہا۔ وہ چونکی۔

”نہیں داعی مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ کمرے سے نکل گئی۔

”تم کرو گے ہسمہ سے شادی۔۔۔۔۔“ داعی نے کھانا کھاتے ہوئے بڑے عام سے انداز میں اچانک پوچھا، اس کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا۔

”کیا کہا آپ نے۔۔۔۔۔؟“ احیان کو اپنی کامتوں پر یقین نہیں آیا۔

”میں نے پوچھا ہے کہ تم ہسمہ سے شادی کرو گے۔“ داعی نے ایک دفعہ پھر مکمل اطمینان سے پوچھا، دوسری طرف ہسمہ جو سوٹ ڈش لیے ہوئے دوبارہ بیٹھک کی طرف آ رہی تھی داعی کی بات سن کر سے جھٹکا سا لگا، وہ دروازے کے پردے کے پیچھے ہی رک گئی۔

”داعی مذاق کر رہے ہیں آپ؟“ احیان سنبھل کر بولا۔

”کچھ باتیں کہنا جتنا آسان ہوتا ہے ان پر عمل درآمد کرنا اتنا ہی مشکل۔“ وہ احیان سے مخاطب ہونے لگا۔

”میں صرف اتنا جانتا ہوں، آپ کے لیے کوئی بھی چیز مشکل نہیں ہوتی جو میرے نہ کہہ جائے عدالت میں اور نہ زندگی کے میدان میں۔“ احیان کی بات پر اس نے چونک کر اس شخص کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں بالکل داعی کی طرح تھیں۔

”یہ کوئی عدالت کا کٹہرا نہیں ہے جہاں میں وائش کے ساتھ مخالف گروپ کو لا جواب کر دوں۔ ذاتی زندگی میں انسان کو بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔“ ہسمہ کی بات پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ احیان کے چہرے پر ابھری۔

”اپنی ذاتی زندگی کو دوسروں کی پسند ناپسند پر دؤ پرا لٹا بھی کوئی عقلمندی نہیں۔۔۔۔۔“ وہ داعی کو وائش روم سے باہر نکلتے دیکھ کر خود بھی ہاتھ دھونے کے لیے بڑھ گیا لیکن جاتے، جاتے وہ ہسمہ کو کسی گہری سوچ میں مبتلا کر گیا تھا۔

”تمہارا اور میرا مذاق کا رشتہ ہے کیا۔۔۔؟“

داعی ٹھیک ٹھاک برامان گئے۔

”آئی ایم سوری داعی، مجھے یہ پروپوزل کچھ مناسب نہیں لگ رہا اپنے لیے۔“ اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ باہر کھڑی ہسمہ کو دھچکا سا لگا۔

”اس لیے کہ اس کا باپ مزبور تھا۔۔۔۔۔“ داعی کی بات پر احیان نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

”مجھے تو آج پتا چلا تم بھی اپنے والدین کی طرح ہی انٹینس کانٹریس ہو، مجھے تم سے کوئی ٹھک نہیں۔ یہ تمہاری زندگی ہے تم اپنے لیے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔“ احیان کی مسلسل خاموشی اس بات کی گواہ تھی کہ داعی بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ دروازے کے پردے کے پیچھے کھڑی ہسمہ کو ایسے لگا جیسے مری کے سارے پہاڑ اڑتے ہوئے اس کے وجود سے آنکڑائے ہوں اور اس کا وجود ہزاروں حصوں میں تقسیم ہو رہا ہو۔ وہ اذیت کی انتہا پر تھی۔

دوسرا اور اختتامی حصہ اگلے ماہ

# ماں

## رفعت شہباز

اماں کمرے میں اکیلی بیٹھی کھڑکی کی جانب خالی  
نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جانے کیا سوچے جا رہی  
تھیں۔ وقت کتنی جلدی کتنا آگے نکل گیا تھا اور سب بچے  
مرئی سہیلوں کی طرح دانہ چک کر اپنی، اپنی منزلوں کی  
جانب رواں دواں ہو گئے اور وہ وہیں اکیلی رہ گئیں۔  
اماں کچھ دیر کے لیے ماضی میں چلی گئیں..... صبح،  
جن اس رد منزلہ عمارت میں افرا تفری کا سماں  
ہوتا..... کوئی اسکول، کوئی کالج تو کوئی آفس کے لیے  
تیاری کر رہا ہوتا۔ سب کے ہاتھ تیار ہو رہے ہوتے  
اور اماں ہر بچے کی فرمائشیں پوری کر رہی ہوتیں۔  
بلاں اور جہاں کو انڈے پرائٹھے چاہیے  
ہوتے۔ ابا جو آفس جانے کے لیے تیار ہو رہے





ہوتے بیوی کو سب کا جلدی جلدی ناشتا تیار کرتے ہوئے دیکھ رہے ہوتے۔ وہ آخر میں جاتے تھے وہ ان کے لیے انڈا بانٹنے کے لیے رکھ دیتیں اور پھر ایک بچی کے بال گوندھ رہی ہوتیں تو دوسری کی پونی بنا رہی ہوتیں۔۔۔۔۔ کسی کا بستہ سیٹ کر رہی ہوتیں، غرض آٹھ بچے تھے ان سب کی فرمائشیں اور ضرورتیں پوری کر کے سب کو بھیج کر پھر میاں کو بھی روانہ کر کے سکون سے بیٹھتیں اور کچھ دیر بعد دوپہر کے کھانے کا انتظام کر رہی ہوتیں۔ ان کا کوئی مددگار نہیں تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ بچیاں چھوٹی تھیں اور لڑکے کالج جانے کی عمروں کے تھے۔

اب اس گھر کے درو دیوار پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ہر کمر خالی اور ویران لگتا۔۔۔۔۔ کبھی اس گھر کے ہر کمرے میں لوگ بسا کرتے تھے۔ ہر طرف تہموں کی آوازیں آیا کرتیں۔۔۔۔۔ کبھی لڑائی جھگڑے، چھوٹے، چھوٹے ہنگامے۔۔۔۔۔ بہن بھائیوں کے آپس کے معصومانہ جھگڑے۔۔۔۔۔ سب اماں کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔

”اماں اس جلال نے میرا بستہ پھیٹ دیا۔“

جلال چیخ کر اماں کو متوجہ کر پڑا۔

”ہاں اپنی بھی تو بات بتاؤ، تم نے بھی تو میرے جو گرز چھپا دیے تھے“ جلال بھی اپنی شکایت کرتا۔ اماں اسی طرح تمام ہون لڑائی جھگڑوں کی صلح کراتی رہتیں۔

”اماں میں نے اپنی دوست کے گھر جانا ہے۔“

جلال بھائی سے بولیں وہ مجھے چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ عظمیٰ تیار ہو کر اماں کے سامنے آئی۔

”میں نہیں جاؤں گا۔۔۔۔۔ تم نیل کے ساتھ چلی جاؤ۔ ایک میں ہی تم کو نظر آتا ہوں پورے گھر میں جیسے مجھے اور کوئی کام نہیں ہے۔“ بلال نے غصے سے جواب دیا۔

”اماں میں کیسے جاؤں۔۔۔۔۔ بنیل بھائی جا رہے ہیں اور نہ ہی بلال بھائی۔۔۔۔۔ عظمیٰ سننا ہی۔“

”چلو ساجد تم نادور کو بلاؤ، وہ عظمیٰ کو چھوڑ دے گا اور کون سا تم کو اتنی دور جاتا ہے۔ نادور کے ساتھ

پیدل چلی جاؤ۔“ اماں نے مشورہ دیا۔

غرض کہ ہر طرف زگمگیاں اور چھپاہٹ تھی۔۔۔۔۔

انہیں حاصل کرنے کے بعد آہستہ آہستہ بیٹیوں کی شادیاں ہوتی گئیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تینوں بچیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ بیٹوں کی جانب نکلنے کے بعد ان کی بھی شادیاں ہو گئیں اور خیر سے پانچ بہویں اس گھر میں دلہن بن کر آ گئیں۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ ایک خوش حال زندگی گزار رہی تھیں۔ آخری بیٹے کی شادی سے قبل شوہر کا انتقال اچانک ایک ٹریفک حادثے میں ہو گیا تھا اور اب وہ اپنے اس تکشن میں سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تھا۔ بیٹوں کی نوکریاں لگیں اور کچھ جمع جتنا تھا جو اب مکان تین منزلہ بنالیا گیا تھا۔ سب سے پہلی منزل پر وہ دونوں بلال کے ساتھ رہتے تھے اور اب شوہر کے انتقال کے بعد وہ ان بیٹا، بہو کے ساتھ تھیں۔ نادور تیسری منزل پر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہا تھا۔ نیل قریب ہی رہتا تھا اور وہ اماں کی خیریت آتے جاتے پوچھتا رہتا تھا۔

جلال ان کا دوسرے نمبر کا بیٹا تھا۔ اس کی بیوی کو سب کے ساتھ رہنا پسند نہیں تھا اس لیے وہ ایک پوش ایریا میں رہنے لگے تھے۔ کبھی کبھار فون پر بات کر لیا کرتے تھے اور سال میں دو تین چکر لگالیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی گفتگو زیادہ تر زبانی کلامی ہوتی اور ساری سنجوسی اماں پر آ کر ختم ہوتی تھی۔

☆☆☆

”ارے اماں بڑی خاموش بیٹھی ہیں، لائٹ تو جلا لیں مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔“ آنے والی نادور کی بیوی جمع تھی جس کی آواز سے اماں چونک گئیں اور اپنے خیالوں سے پلٹ آ گئیں۔

”اماں رات کو جلال بھائی آئے تھے وہ کیا کہہ رہے تھے؟“

”کوئی خاص بات نہیں کہہ رہے تھے۔ بس خیریت پوچھنے آئے تھے۔“ اماں نے بہو کی طرف نظر

”جیتے رہو بیٹا تم اس وقت.....؟“

”اماں مسجد سے آ رہا ہوں۔“ نیل نے جواب دیا۔  
 ”بیٹا تم تو قریب ہی رہتے ہو..... لیکن آج ایک  
 ہفتے کے بعد اپنی شکل دکھا رہے ہو، کہاں تھے تم اسے  
 دن سے.....؟“

”در اصل آفس سے آنے کے بعد فرصت ہی  
 نہیں ملتی..... تھکا ہارا آ کر لیٹ جاتا ہوں۔ آج جمعہ تھا  
 تو جلدی گھر آ گیا۔“ اس نے نہ آنے کا عذر سنا دیا۔  
 ”اماں آج مسجد میں مولوی صاحب نے بڑا اچھا  
 درس دیا تھا۔ وہ بھی ماں باپ کے حقوق پر.....“ مولوی  
 صاحب کے درس نے اس کے دیرخا صا اثر کیا تھا جیسی  
 ماں کے پاس فوراً چلا آیا تھا۔

”اماں مولوی صاحب بتا رہے تھے کہ قرآن پاک  
 میں ہے کہ ماں، باپ کے ساتھ احسان کرو اگر تیری  
 موجودگی میں ان میں یا دونوں میں سے ایک بڑھاپے پر  
 پہنچ جائے تو ان کے آگے کف تک نہیں کہنا..... ان کی  
 آواز پر آواز بلند نہ کرنا۔ ان کے ساتھ احترام سے  
 بات چیت کرنا اور عجزی کے ساتھ ان کے آگے جھکے  
 رہنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے رب ان پر دیا  
 رحم کر جیسا انہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش  
 کے وقت کیا۔ اماں اس کے علاوہ یہ بھی کہا کہ بھول کر  
 بھی کبھی کسی سے اپنے ماں، باپ کے متعلق برا نہ  
 کہو۔ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اور حقوق العباد کی.....  
 ادائیگی میں کوتاہی اللہ کو سخت ناپسند ہے۔“

ساجد جو ابھی ابھی دفتر سے آیا تھا وہیں اماں کے  
 پاس بیٹھا نیل کی باتیں سن رہا تھا۔ فوراً بولا۔  
 ”ہاں بھائی ماں باپ کی خدمت کرنا بہت بڑی  
 نیکی ہے۔“

”ہے تو نیکی لیکن خالی باتیں کرنے سے کچھ نہیں  
 ہوتا کچھ خدمت بھی کرلو..... اماں کی.....“ نیل نے  
 طنز یہ کہا اور اماں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ نیل  
 اور ساجد کی کافی گفتی تھی ساجد سے اکثر ماں کی طرف  
 سے غفلت برتنے پر طنز کرتا تھا۔

اٹھا کر کہا۔

”اماں آپ کو لے جانے کے لیے تو نہیں کہا۔“  
 شمع نے کرید..... انہوں نے گردن ہٹا کر نیلی میں جواب  
 دیا۔ اور ذرا توقف کے بعد بولیں۔

”میں کہیں نہیں جا رہی ہوں یہ میرے مرحوم  
 شوہر کا گھر ہے میں یہیں رہوں گی۔“

”ارے، ارے اماں میں تو یونہی کہہ رہی تھی اگر  
 چلی بھی جاتیں تو تھوڑا ان کے بچوں کا دل رہ جاتا۔  
 میں کچھ دن بعد نادرو کو بھیج کر واپس بلوائیتی۔“ شمع ایک  
 دم گھبرا گئی۔ اپنی بات کہہ کر وہ مزید لگاوٹ سے بولی۔  
 ”ویسے بھی اماں آپ کے بغیر ہمارا دل بھی  
 نہیں لگتا..... ہمارے بچے بھی آپ کی غیر موجودگی میں  
 اداس ہو جاتے ہیں۔“ شمع نے وضاحت کی..... ویسے  
 بھی اماں نادرو اور بلال کے بچوں کے ساتھ بہت خوش  
 رہتی تھیں اور اپنی ہر بات زیادہ تر شمع..... سے شیئر  
 کرتی تھیں اور شمع کی ہر بات مانتی بھی تھیں..... اور  
 شمع، غفلت کی بیٹی تھی جو اماں کی چھوٹی بہن تھیں۔ اس  
 طرح شمع اماں کی بھانجی بھی تھی۔

”میں کہیں نہیں جا رہی ہوں، میرا کہیں بھی دل  
 نہیں لگتا..... میں اسی گھر میں ٹھیک ہوں..... اور کیا میں  
 تم پر بوجھ ہوں جو تم لوگ مجھ سے بیزار ہو گئے ہو؟“  
 اماں نے اب غصے سے کہا۔

”نہیں اماں ایسی کوئی بات نہیں ہے میں تو ویسے  
 ہی کہہ رہی ہوں۔ ارے میری اماں آپ تو ناراض  
 ہو رہی ہیں۔ میں تو آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔“  
 شمع ایک دم اماں سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

”ارے دیکھنا، دروازے کی قفل بج رہی ہے  
 کوئی آیا ہے۔“ اماں نے حنا کو آواز دی۔

دروازے پر نیل تھا۔

”اماں نیل بھائی آئے ہیں.....“ بلال کی بیوی  
 حنا نے اماں کو بتایا۔

”السلام علیکم اماں.....“

”یہ میری دوائیں ختم ہو گئی ہیں بازار جاؤ تو لیتے آنا۔“ انہوں نے نیل کو دوا کا پرچہ پکڑا دیا۔

”وہ اماں ابھی تو مجھے وقت نہیں ہے۔ ایک دوست کی عیادت کو جا رہا ہوں۔ ٹائم ملا تو لا دوں گا آپ ایسا کریں کل پر رکھ لیں ورنہ یہ ساجد تو خالی بیٹھا رہتا ہے اس سے منگوالیں۔“ ساجد کو فوراً غصہ آ گیا۔

”میں کہاں گھر پر رہتا ہوں، دفتر کے بعد پارٹ ٹائم کرتا ہوں..... سارا دن تو مصروف رہتا ہوں تم تو عصر کے بعد سے ہی گھر آ جاتے ہو۔“

”چھوڑو آپس میں نہ لڑو میں منگوا لوں گی تم دونوں چپ ہو جاؤ۔“ اماں نے دونوں بھائیوں کو الجھتے ہوئے دیکھا تو بولیں۔

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد ساجد پھر بھائی سے مخاطب ہوا۔

”بھائی تمہارا گھر کتنے عرصے میں مکمل ہو جائے گا اور تم سب شفقت پور رہے ہو؟“

”بھئی ابھی تو اس میں کافی کام باقی ہے۔“ نیل نے ساجد کو جواب دیا۔

”ارے اماں سنا ہے کل آپ چندرہ دن کے لیے نہیں بھائی کے گھر جا رہی ہیں؟ ہے ناں بھائی؟“ ساجد نے جان بوجھ کر نیل سے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا ابھی تو ہمارے بچوں کے امتحان ہونے ہیں تو کنزروی بھی نہیں جاتی اور نہ مہمانوں کو پسند کرتی ہے۔“ نیل ایک دم گھبرا گیا اور فوراً بولا۔

”پر تمہاری ساس بھی تو آئی ہوئی ہیں۔“

”تمہارا کیا مطلب ہے اب میں کسی کو اپنے گھر آنے سے منع کر دوں اور وہ آتی ہیں تو بچوں کو سنبھال لیتی ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے عظمیٰ باجی (نیل کی بڑی بہن) آگئی تھیں سارا دن انہی کے چکر میں ختم ہو گیا

اب ہم بچوں کو سنبھالیں یا آنے والوں کو دیکھیں۔“ ساجد کی بات پر نیل ایک دم غصے میں آ گیا اور بولا۔

اماں نیل کی لمبی تقریریں سن کر پریشان ہو گئیں

اور بولیں۔

”تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو..... ساجد کو تو عادت ہے مذاق کرنے کی، میں تمہارے گھر نہیں آ رہی ہوں اور عظمیٰ کو بھی سمجھا دوں گی۔“

”ارے اماں تم تو ناراض ہو جاتی ہو، میں اس لیے تھوڑی کہہ رہا ہوں۔“ نیل شرمندہ ہو گیا اور کچھ منٹوں کے بعد خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

”اماں یہ نیل بھائی بھی بہت لمبی، لمبی تقریریں کرتے ہیں۔ زیادہ تر زبانی جمع خرچ ہے اور عمل سے کوسوں دور ہیں۔“ ساجد کو ایسے ہی کافی غصہ آ رہا تھا۔

”چھوڑو بیٹا تیرا بڑا بھائی ہے۔“ اماں نے ساجد کو پیار سے ڈانٹ کر چپ کرادیا۔

”اماں میں کیوں نہ بولوں..... ابھی تم کنزری بھائی کو ایک لفظ کہہ کر تو دیکھو سارے وعظ ان کے ختم ہو جائیں گے۔ دوسروں کو نصیحت کرتے رہتے ہیں،

کوئی کام کہہ دو تو ناں منول سے کام لیتے ہیں۔ دوائیں لانے سے منع کر دیا اور اپنی ساس اور بیوی کے غلام بچے رہتے ہیں۔ کل ہی مارکیٹ سے اپنی ساس کی دوا میں لے کر آ رہے تھے اور تم کو منع کر دیا..... ماں

کے کام کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے اور گرتے ہیں ماں باپ کے حقوق کی بات..... ہونہہ منافق کہیں کے۔“ ساجد کا غصہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔

اماں ساجد کی بات سنی رہیں، وہ بھی جہاں دیدہ خاتون تھیں انہیں سب کی حقیقت معلوم تھی لیکن وہ بات نہیں بڑھاتا چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

”ارے عظمیٰ آئی ہوئی ہے، کیا حال چال ہے کب آئیں.....؟“ حنا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنی نند کا حال پوچھا۔

”بھائی ابھی ابھی آئی ہوں، اماں کی طبیعت کا سا تھا تو سوچا مل کر آ جاؤں۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔

”دیکھو اماں بیچاری خود تو کسی سے کچھ کہتی نہیں ہیں ہم لوگوں کے ساتھ رہتی ہیں تو ہم خبر گیری کرتے



## حصہ

کسی کے صے گھر آیا کسی کے صے دکان آئی  
میں گھر میں سب سے چھوٹا میرے صے میں ماں آئی  
مرسلہ ایمان چوہدری، فیصل آباد

”کیوں بکواس کرتی ہو تم کچھ نہیں جانتی ہو  
خاموش رہو اور اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو،  
وہ میری ماں ہیں کوئی اپنا فرض ادا کرے یا نہیں کرے،  
مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو..... میری عاقبت خراب  
کرنے کی کوشش نہ کرو۔“

”چلو تم اپنا فرض ادا کرتے رہو لیکن وہ نہیں بھائی  
اور جلال بھائی کہاں ہیں ویسے تو لمبی، لمبی تقریریں  
کرتے ہیں۔ بڑی سمجھتی کرتے ہیں لیکن ماں کی  
خدمت کرنا یا نہیں آتی، ان کو اپنا فرض یاد نہیں آتا۔“  
”سب نے اپنی، اپنی قبر میں جاتا ہے تم میری قبر  
خراب نہ کرو اور ہاں اپنی بھی قبر کے لیے تیاری کرلو۔  
ہر وقت دوسری بھابیوں کے ساتھ مل کر برائیاں کرتی  
رہتی ہو۔“ جلال جھنجھلا کر بولا۔ حنا بڑبڑاتی ہوئی اپنے  
کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

”جلال نہ جانے اماں کے کمرے میں کیا کھسر  
پھسر کر رہا ہے۔“ حنا نے سوچا۔  
”کر رہی ہوں گی بسوؤں کی برائیاں یا پھر کوئی  
فرمائش.....“ حنا کے دماغ میں اچانک آیا کہ۔ کیوں نہ  
آج اماں کو رٹے پاتھوں پکڑا جائے۔ آج تک اماں  
میرے ہاتھ نہیں آئی ہیں۔ یہ سوچ کر وہ دہرے کمرے  
میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی کھلی ہوئی  
تھی اور جلال، اماں سے بات کر رہا تھا۔ جلال کی پیٹھ  
کھڑکی کی طرف تھی اور دیوار کے مہارے اماں نے بھی  
ہوئی تھی دونوں حنا کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حنا نے سوچا  
آج بیوی بی کی ساری جالا کی نکال دوں گی اور ان کی  
باتیں سب کو بتا دوں گی ایسا کرتی ہوں کہ سوا بکل

رہتے ہیں اب دیکھو..... جلال بھائی آئے تھے دو دن  
پہلے..... کچھ دیر بیٹھ کر خالی باتیں بنا کر چلے گئے ان کو  
بھی اماں کے لیے وقت نکالنا چاہیے ان کی بھی تو ذمے  
داری ہے۔ کیوں غلطی میں کیا غلط کہہ رہی ہوں؟ حنا  
نے نند کو مخاطب کر کے کہا۔

”ہاں بھائی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن  
احساس دلانے پر بھی کسی کو خیال نہیں آئے تو پھر کہنا  
پکار ہے۔“ تھوڑی دیر غلطی رک کر چائے پی کر جانے  
لگی تو حنا نے روکا بھی.....

”بھئی کھانا کھا کر جاتا۔“ لیکن غلطی جلدی میں  
تھی اس کا ڈرائیور بھی آگیا تھا اس لیے وہ چلی گئی۔

☆☆☆

”اماں..... اماں ارے اماں کیا سو رہی ہیں؟  
دیکھیں تو دن نکل آیا اور دس بج رہے ہیں۔“ جلال نے  
گھبراتے ہوئے اماں کو پکایا۔

”ہاں بیٹا، ڈاکٹر کی دوا سے خیمہ آگئی  
تھی۔“ اماں ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔

”اچھا اماں یہ گرم، گرم دودھ پی لیں۔“ جلال  
روز صبح جاتے ہوئے اور رات کو واپسی پر اماں کو اپنے  
ہاتھ سے دودھ کا گلاس پلاتا تھا۔ اماں، جلال کو بہت  
دعا میں دیتی تھیں۔ جلال بھی بیوی سے چپ کر اماں کو  
کچھ نہ کچھ کھلاتا رہتا اور تمام باتوں سے اماں کو آگاہ  
رکھتا..... آفس۔ آنے کے بعد وہ زیادہ تر اپنی فیکلٹی اور  
اماں کے ساتھ رہنا پسند کرتا تھا کبھی انہیں اخبار کی خبریں  
پڑھ کر سنا دیتا کبھی فی وی کھول کر حالات حاضرہ سے  
اماں کو آگاہ کرتا اور اماں کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا۔  
جلال اماں کو دودھ دے کر جیسے ہی کچن میں خالی  
گلاس رکھنے گیا حنا نے جلال کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

”خوب کرو خدمت..... کتنا دودھ پلاؤ گے.....  
اپنے بچوں کا تو تم کو خیال نہیں سارا خرچہ اماں پر کرتے  
ہو..... ہائے میری قسمت ہی خراب ہے اماں سب کی  
ہیں لیکن سارا بوجھ ہم پر ہی ہے۔“ جلال نے بیوی کی  
چچ پکار پر ادھر ادھر دیکھا اور چپ کراتے ہوئے کہا۔

میں ریکارڈ کر لیتی ہوں اور سب کو سناؤں گی کہ دیکھو ہم تو خدمت کرتے ہیں اور یہ ہمیں کیا صلہ دے رہی ہیں۔  
حنانے ذہن میں شیطان منصوبہ تیار کر لیا تھا اور بہانے سے جا کر سواہل اندر رکھ آئی تھی اور خود آ کر وہیں کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔

”بچوں کی فیس کے لیے چھالیا کے ڈبے میں....  
نہیں ہزار رکھے ہیں خاموشی سے نکال لو۔“ چھلی دفعہ پچیس ہزار رکھے تھے لیکن اس مرتبہ دواؤں پر زیادہ خرچ آ گیا اب اتنے ہی لے لو۔ تمہارے باپ کی پشیمانی کے پیسوں سے اور جو دوسرے بھائی دیتے ہیں ان سے بچاتی ہوں۔“

”نہیں اماں نہیں..... میں نہیں لوں گا۔ تم ہر دفعہ اتنی بڑی رقم دے دیتی ہو ورنہ ان سب کو پڑھانا میری کم آمدنی میں تو ممکن نہیں تھا۔“

”ہاں بیٹا، ہر بھائی تمہارا اچھا کمار ہے صرف تو ہی ان سب میں مالی طور پر کمزور ہے۔ اس لیے میں تیرے لیے پس انداز کر کے یہ پیسے رکھتی ہوں۔ اگر کسی اور بیٹے یا بہو کو معلوم ہو جائے تو یہ سب میرے دشمن ہو جائیں گے۔“ بلال ماں کو گلے لگانے لگا تو وہ ایک دم کراہ اٹھیں۔

”بیٹا کل سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میری لمبیں بڑی تکلیف ہے، اب ایک گروہ زیادہ تکلیف دے رہا ہے۔“ اماں کراہتے ہوئے بولیں۔ ”بیٹا اب تو اس گروہ میں زیادہ تکلیف ہونے لگی ہے۔“ انہوں نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں اماں ایک گروہ تو تم نے مجھے دے دیا تھا۔ اگر نندیتیں تو میں مرجاتا ہوں.....“ بلال نے اماں سے کہا۔

”نہ بیٹا ایسی بات نہ کر، یہ بات صرف مجھے اور تیرے مرحوم باپ کو اور تجھے پتا ہے اور کسی کو کبھی نہیں پتا۔ تو میرا پہلا، پہلا بیٹا تھا تجھے پچانا تھا اور میرا گروہ تجھ سے بچ چکا ہو گیا۔ اس وقت اللہ نے تجھے زندگی دی بس یہ سمجھ لے کہ مجھے دوسری زندگی ملی۔ اب کبھی ایسا نہیں کہنا۔“ انہوں نے اسے گلے لگایا۔

”چھلی دفعہ جب ڈاکٹر کے پاس گئی تھی مادر کے ساتھ تو ڈاکٹر کچھ تفصیل بتانے والا تھا پر میں نے اس کو اشارے سے منع کر دیا تھا کہ مادر کے سامنے نہیں کسی کو نہ پتا چلے..... بس بیٹا میں تو اب زندگی کے آخری مراحل میں ہوں تم سب خوش آیا در ہو..... میری یہ تمام جائیداد تم سب میں برابر تقسیم ہوگی.....“ انہوں نے تمام قانونی مراحل پورے کر لیے تھے۔

”اور دیکھو میرا جو دوسرا پلاٹ ہے اس کے کاعدات میں نے تم کو دے رکھے ہیں وہ کسی نہیں پتا وہ پلاٹ بس اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے رکھ لیتا۔“ اماں نے تمام تفصیلات سے بلال کو آگاہ کیا۔

دوسری طرف حنا ایسے کھڑی تھی جیسے جسم میں لہو نہ ہو وہ اس وقت حیرت زدہ تھی، اس نے اپنے آپ کو کنٹرول کیا اور جب بلال کمرے سے باہر آیا تو اماں کے کمرے میں جا کر بیٹے سے دھم سواہل نکال اٹکی اور داخل طریقے سے بلال سے ادھر ادھر کا باتیں کرنے لگی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں ہو۔ آج اس نے اماں کی پسند کا کھانا بنایا اور کافی دیر ساس کے ساتھ بیٹھی ان کے پیر دباتی رہی۔

بلال حیرت سے اسے کھتا رہا پر بولا کچھ نہیں۔ رات کو حنا جب سونے کے لیے لیٹی تو اس کا ذہن ماضی کی طرف چلا گیا۔ اماں ان کی شادی پر کتنی خوش تھیں۔

اماں اکثر بلال کو وزن اٹھانے یا بھاری کام کرنے سے بھی منع کرتی تھیں، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اماں کے اور بھی بیٹے تھے لیکن اماں بلال کا زیادہ خیال رکھتی تھیں اس کے کھانے... اور پانی پر ہر وقت زور دیتی تھیں کہ پانی زیادہ پیو..... اور وہ کبھی بلال پر ناراض بھی نہیں ہوتی تھیں۔

اس نے کئی، کئی مرتبہ بلال کو الماری کی خفیہ دروازے میں کچھ رکھتے اور نکالتے دیکھا لیکن وہ کبھی شہر نہیں کرتا تھا اور اس کو بیش لاک کر کے رکھتا تھا۔ اس نے بھی کبھی کھوج کی کوشش نہیں کی لیکن آج کی بات کے بعد اس

ہو جاؤ۔" بلال نے کہا۔

"بلال یہ شمال میں اماں کو دے دوں؟" حنانے کچھ سوچ کر شمال کو دیکھا اور بلال سے کہا۔ بلال نے کمرے میں جاتے، جاتے رک کر اس کو حیرت سے دیکھا اور اس کی دماغی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، ایک لمحہ خاموش سا رہا اور پھر کہنے لگا۔

"تمہاری مرضی....." حنانے سوچا کہ صبح کو اپنے ہاتھوں سے میں اماں کو اوڑھا دوں گی۔ دوسرے دن وہ صبح سویرے اٹھ گئی گھر کے دوسرے کام۔ آج اس نے اماں کے اٹھنے سے پہلے مناد دیے تھے اس دوران وہ دو دفعہ اماں کے کمرے میں جھانک کر آ چکی تھی۔

"اماں، اماں اب تو اٹھ جائیں..... آج آپ کو کیا ہو گیا..... دس بج رہے ہیں..... چلیں انہیں....." ناشتا کریں اور دیکھیں میں آپ کے لیے کیا لے کر آئی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے شمال اماں کے اوپر ڈالی لیکن اماں کا وجود بے حس اور بے حرکت تھا۔ اس نے اماں کو ہاتھ لگا یا تو اماں کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

یہ دیکھ کر وہ چیخنے لگی اور اس دوران بلال اور دیگر لوگ بھی جمع ہو گئے۔ بھابیوں اور بچے سب بیچھے آ گئے تھے۔

آج حنانے اماں کی خدمت کا دل سے سوچا تھا اپنی زندگی کو بدلنے کا ارادہ کیا تھا اور اماں کے احسانات اتارنے کے لیے لاکھ عمل تیار کیا تھا لیکن اس سے پہلے اماں اپنا لاکھ عمل تیار کر چکی تھیں انہوں نے اس کے احسان کو لیٹا ہی پسند نہیں کیا اور اسے موقع ہی نہیں دیا کہ زندگی بھر کی بدسلوکی اور برے رویے کی وہ تلافی کر سکے۔

وہ بک، بک کر بین کر رہی تھی۔ ساری بھابیوں اس کے اس طرح رونے پر حیرت زدہ تھیں کہ حنا جو کبھی اماں کو گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی آج کس قدر بری طرح رو رہی ہے۔ یہ تو صرف حنا ہی جانتی تھی کہ حیرت زدہ وہ لوگوں کو نہیں کر رہی بلکہ اماں نے اسے حیرت زدہ بک شرمندہ کر دیا تھا۔ اس نے تو اماں کو گھاس نہیں ڈالی لیکن اماں اپنی تمام پونجی اس کے آگے ڈال کر چلی گئی تھیں۔

کا تجسس بڑھ گیا۔

ایک دن بلال کو آفس کے کسی کام کے لیے حیدر آباد جانا تھا اس نے سوچا کہ کیوں نہ کچھ کیا جائے..... اس نے اپنے تجسس کی خاطر اس دروازے کی خفیہ طور پر چابی بنوائی تھی اور چھپا کر رکھ دی تھی۔

بلال کے جانے کے بعد اس نے کمر اندر سے لاک کر دیا اور چابی سے دروازہ کھولی تو اس میں پلاٹ کے کاغذات، میڈیکل رپورٹس کچھ دواؤں کے نسخے..... اماں کا وصیت نامہ اور بینک کے چیک تھے۔ انشورنس اور سیونگ سٹوفیلیٹ وغیرہ تھے۔ اس نے سب کچھ پڑھ کر واپس اسی طرح رکھ دیا اور لاک کر دیا۔

حنانے ذہن سے تمام پردے اترنے لگے اس کی نظر میں اماں ایک قابل پرستش ہستی نظر آئیں اور اپنا وجود ایک کچرے کا ڈھیر اسے اپنے آپ سے شرم محسوس ہونے لگی۔ اب اس نے اپنی زندگی کو ایک نئے رخ پر ڈالنے کی کوشش کی۔

"جاؤ داوی بلارہی ہیں۔ وہ پانی مانگ رہی ہیں، ان کو پانی جا کر دو۔ تولیا جا کر دو۔ داوی ہاتھ پونچھیں گی۔ ان سے پوچھو کچھ چاہیے تو نہیں۔" دوسرے دن اس نے بچوں سے کہا۔

بچے حیران تھے اور دیکھ رہے تھے کہ امی کو کیا ہو گیا پہلے تو داوی کے پاس جانے سے روکتی تھیں۔

حنانہ بار بار سوبائیل آن کرتی اور اکیلے میں وہ تمام باتیں سنتی جو اماں اور بلال کے درمیان ہوئی تھیں اور بار بار اپنے وجود کو ایک معمولی کیزا سمجھتی اور افسوس کرتی اپنے آپ پر..... وہ سوچتی یہ سچ ہے کہ بدگمانی کے پودے بڑی جلدی بھٹتے پھولتے ہیں۔ تیسرے دن بلال واپس آ گیا تھا۔ وہ اس کے لیے شمال لے کر آیا تھا اور بچوں کے لیے بھی گفٹ لے کر آیا۔

"اماں کے لیے کیا لائے ہو؟" حنانے بلال سے پوچھا۔

"اماں کو صرف میری ضرورت ہے جس طرح مجھے اماں کی ضرورت ہے۔ بس تم یہ شمال لے کر خوش





قسط نمبر ۱۰

## رنگِ خلش کو

### رفاقتِ حیا وید

کتنی عجیب بات ہے کہ نہ ہی یہ کہی گئی کہ جس نے لکھی  
 یہی غمش کی قدر ہو جائے یہ اور یہ جوں جوں اس احساس کو مس لے  
 اندر گہرائیوں میں دفن کرے کی کو مس کر یہ یہی ہو غمش کہے سے حساب ہنگوں  
 کی پردہ شادی میں مضطرب کرے لکھی سے اور مکافاتِ عمل کی لکھی کہ جس نے بولی والا  
 مسئلہ شروع ہو جاتا ہے... گناہ چاہے حیوانی ہو یا... سزا و لازم و بیزوم ہے۔ اس  
 نے باوجود سدا سحر سے گہرا ربط و تعلق رکھتا ہوا یہی ہے اور غمات  
 و رنج غمت بھی ہے، نسا و ضل بھی اور وحدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں  
 دستِ گوتیر ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو



”عالیہ! رشتہ تو مجھے ہر لحاظ سے پسند ہے۔ لوگ بھی اپنے ہی جیسے ہیں۔۔۔۔۔ نمرہ کی یہی تو شرط ہے۔ کہ رزقِ حلال پر پلنے والا لڑکا ہو۔۔۔۔۔ دوسرے اپنی ہی ذات پات کے ہیں۔۔۔۔۔ نمرہ کے لیے اس خاندان میں ایڈجسٹ ہونا مشکل نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ اور پھر ہم دونوں بھی اس خاندان سے مراسم بڑھانے میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہیں کریں گے۔ بڑے گھر میں بنی کا رشتہ کرنا یوں سمجھو کہ بنی کو جیتے جی ہی درگور کرتا ہے۔ جس سے ملاقات بڑے گھر کے بڑے بزرگوں کی اجازت کے بغیر ناممکن ہو جاتی ہے۔“ رحمان نے نمرہ کے کئی رشتوں پر غور و خوض کرنے کے بعد بیوی سے کہا۔

”رحمان جی! آپ جیتے، میں ہاری۔۔۔۔۔ میں نے اپنی بچی کے لیے بہت دلنشین سنے دیکھے تھے۔ لگتا ہے کہ بنی بھی اپنا مقدر ان ہییرٹ کر لی ہے۔۔۔۔۔ مال کی زندگی حسرت و یاس میں ہی بیت مچی۔ بھلا بنی مہارانی کیسے بن سکتی ہے؟“ عالیہ کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے۔

”بیگم..... اگر تم اور میں رستے کا تعین ہی ایک دوسرے سے مخالف سمت میں کریں گے تو یہ رستہ کسی بھی موڑ پر ایک نہیں ہو سکے گا۔ اور رستے جدا ہونے کا مطلب تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم نمرائے کے لیے اچھا فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔ بچوں کے رشتوں میں کامیابی والدین کی ذہنی ہم آہنگی سے ہوا کرتی ہے۔ بعض اوقات میں دوسروں کی شخصیت کی کچھ خوبیوں اور خامیوں کو نظر انداز کر دیتا ہوں تو تم مجھے جھنجھوڑ کر چوکنا کر دیتی ہو..... یہی حال تمہارا ہے، ٹھنڈے دل سے ہمیں اپنی بیٹی کے لیے سوچ، سمجھ کے بعد فیصلہ کرنا ہے..... طعنے تشنے دے کر ایک دوسرے سے دور ہونا بیٹی کی بد نصیبی کو آواز دینے کے برابر ہے۔ اس وقت ہمیں ایک جان ایک قالب اور یک زبان ہونے کی ضرورت ہے۔“ رحمان نے ملائم سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اور تم اپنے دل سے عادل کے خیال کو یکسر نکال دو..... ہمیں باہم دلا دینا نہیں چاہیے۔“

”آپ نے درست فرمایا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات کہوں؟“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔  
 ”کہو عالیہ..... جو بھی ڈر اور خدشات تمہارے دل میں اس رشتے کے بارے میں ہیں، مجھ سے شیئر نہیں کرو گی تو کس سے کرو گی۔“ وہ نرمی سے بولے۔

”آپ نرا کے رشتے کے متعلق بہت سینسٹو ہیں..... میری کسی بات پر کان نہیں دھرتے..... اس لیے میں نے تو خود سے یہی عہد کر لیا ہے کہ اب اس معاملے میں کچھ نہیں بولوں گی۔“ وہ رو ہانسی ہوئی۔

”ماں نہیں بولے گی تو اور کون ہوگا جو مخلص اور بہترین مشورہ دے گا..... میری باتوں کو ٹیکھو مت لو..... اس وقت مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”ایک اور اعتراض بھی ہے مجھے۔ لڑکانہ کلاس فیلو ہے۔ اسی کا ہم عمر، ابھی تک جاب لیس ہے یعنی ماں، باپ کے فکروں کا محتاج۔ بیوی کی معمولی خواہش بھی پوری کرنے سے قاصر۔“

☆☆☆  
مجھے نرا کے لیے چار چھ سال بڑا لڑکا چاہیے۔ جو سیٹ بھی ہو اور اپنے والدین کا محتاج بھی نہ ہو..... اپنے فیصلے کرنے کے قابل ہونا کہ والدین کے اشاروں پر مٹنے والا ہو۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

”دوسرا مسئلہ قابل تشویش ہے۔ اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا کہ وہ تو ابھی تک جا ب لیس ہے۔ چھوٹی، موٹی تو کر رہا ہے مگر مستقل نہیں ہے۔ تم درست کہہ رہی ہو..... اچھا ہوا کہ تم نے چپ کاروزہ توڑا..... یقیناً جانو مجھے ان کے گھر کے ماحول کا قطعاً اندازہ نہیں ہوا۔ اور دوسرا پوائنٹ تو اتنا ویلنڈ ہے جس پر ہماری بنی کا فیوچر منحصر ہے۔ اس ملک میں بیروزگاری کا دور دورہ ہے۔ خوش فہمیوں میں رشتہ نہیں ہو سکتا..... انکار کر دو تم..... ایسا



## رنگِ خلش

سلتہ و طریقہ تو مجھ میں ہے نہیں۔ تم ہی دانشمندی سے سمجھا پھرا کر انہیں بال سکتی ہو۔ ان کی عزت بھی رہ جائے اور ہمیں بھی شرمندگی نہ ہو۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

”اب دوسرے رشتے کو دیکھ لیتے ہیں۔ لڑکا انجینئر ہے، برسرِ روزگار ہے، ہاں خاندانِ خوب لمبا چوڑا پھیلا ہوا ہے۔“

”مگر رحمان جی اٹھوتا بیٹا ہے۔“ اس نے ان کی بات کاٹی۔ ”میری نمرائیں اتنی ہمت کہاں کہ خاندان بھر کو مرتے دم تک نبھاتی رہے اور جوتے الگ کھاتی رہے۔ میری بچی تو اس خاندان کی ملازمہ بن کر رہ جائے گی۔“

”اچھا تو تیسرے کے بارے میں محترمہ کے کیا خیالات ہیں؟“ وہ سہمے ہوئے بولے۔ ”امید ہے یہ تمہیں ضرور بھاجائے گا۔“

”بھئی لڑکے کی ماں حیات نہیں..... چار عدد جوان بچے چھوڑ گئی ہیں..... نمرائیں بڑی بہو..... دو عدد دندوں اور ایک عدد دیور کی خدمتیں اور شادیاں کرتے ہی جوانی ٹاپ جائے گی..... کیوں رحمان جی.....؟ کیا انہوں نے اپنے بچے میری نمرائیں کے لیے پیدا کیے تھے؟“ وہ نخوت سے بولی۔

دونوں میاں، بیوی نمرائیں کے لیے آئے ہوئے دو تین رشتوں پر تبصرے کر رہے تھے۔ عادل کے رشتے کو انکار کرنے کے بعد عالیہ چاہتی تھیں کہ بس جلدی ہی کہیں نمرائیں کا رشتہ طے ہو جائے۔ ادھر رحمان ہر رشتے کی باریکیاں کھول کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا جب ہر رشتے میں عالیہ کو بے تحاشا منفی پہلو دکھائی دینے لگے تو رحمان اب کی بار چڑھ کر بولے تھے۔

”تو پھر عالیہ ایسے کرو۔ گھر داماد کے بارے میں سوچو..... اور انتظار کرو کسی میں تمہیں فیملی بڑی لگی اور کسی میں خوشحالی کا فقدان..... چلو تمہارے تمام ذلائل ول کو جانگے ہیں لیکن زندگی میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ شادی ایک ان دیکھے پہلے کا نام ہے۔ جس میں ہاتھ ڈالیں تو بھی ڈائمنڈ نکل آتا ہے تو بھی کوئلہ..... کبھی ریشم ہاتھ لگ جاتا ہے تو کبھی ٹاٹ کا کھردرا ٹکڑا..... جہاں تک میرا خیال ہے..... دور رشتہ بہت موزوں رہے گا..... لڑکا انجینئر ہے، ملٹی نیشنل کمپنی میں وی پی کے عہدے پر فائز ہے۔ دو ڈھائی لاکھ تنخواہ تو ضرور ہوگی۔ ماں، باپ کے پاس جو بھی جمع پونجی ہے وہ اسی کی ہے۔ نہ کوئی دوسرا حصہ دار ہے، نہ ہی کوئی اور در دوسرے..... اور تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہونی نظر آرہی ہے کہ نمرائیں چھ سات سال بڑا بھی ہے۔“ وہ اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولے۔ ”اور میں بھی دیکھنے میں بے حد سادہ اور شریف لوگ۔“ باطن میں کیا کچھ پوشیدہ ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہاں ہماری ذات کے نہیں ہیں۔“

”میں تو چاہتی ہوں بس میری بچی خوش رہے۔“ وہ ایک آہ بھر کر بولی۔ ”سچ سسرال تو ایسا کرب اور درد ہے کہ اپنا سر کاٹ کر ٹرے میں رکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا جائے تو بھی اسے فریب، مکاری اور چال بازی کا نام دیں گے۔“ وہ دھکی لہجے میں بولی۔ ”میری مثال آپ کے سامنے ہے۔ ساس، سسر، دندوں، دیوروں کے علاوہ بھی باقی سسرالی رشتوں کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا.....! مگر کیا انہوں نے قدر جانی؟ اپنا حق سمجھ کر میری خدمت، توجہ اور پیار کو وصول کرتے رہے۔ اب تو دل یہ چاہتا ہے کہ نمرائیں بچے دن سے ہی شوہر کے ساتھ الگ گھر میں بیاہ کر جائے اور پھر سب سے دنیا داری اور خاطر جوئی اتنی ہی کرے جتنی دوسری طرف سے ملنے کے امکان ہوں۔ میری طرح ہر ایک کو خوش کرنے کے چکروں میں اپنے دن کا چھین اور رات کا آرام قربان نہ کرے۔ یہی میری نصیحت ہوگی۔“

”ماشاء اللہ، خوب ٹریننگ کر رہی ہو..... اللہ کی بندی اسے سسرال کو جیتنے کے ٹر سکھاؤ۔ تاکہ مقابلے بازیاں اور بدتمیزیاں سکھا کر اس کی اور دوسروں کی زندگی حرام کر دو۔“ وہ تلخ لہجے میں بولے۔

”سر جھکانے والی، بہو قابلِ مذمت ہوتی ہے، جوتوں اور گھونٹوں کے قابل۔ جس کی گرون جی ہو، اسے کوئی ہاتھ لگا کر..... یا کچھ سنا کر تو دیکھے..... سب آپ جناب میں رہتے ہیں، اپنی عزت کے بچاؤ کی خاطر.....“ وہ تنک کر بولی۔

”اگر تمہارے بھی یہی خیالات رہے تو مجھے تو نمر کا مستقبل کچھ تاریک سا ہی لگ رہا ہے۔“ وہ متذبذب لہجے میں بولے۔

”شکل اچھی نہ ہو تو بات ہی حسین کر لیتے ہیں۔ میری نمر اراج کرے گی و دوسروں پر، نہ کہ دوسرے راج کریں اس پر۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”ویسے آپس کی بات ہے کہ تم عورتوں نے ڈھکوسلار چار کھا ہے مظلومیت اور ستم ظریفی کا۔ مظلوم تو مرد ہے بیچارہ..... جو اتنی ذرا سے باز دستی کے مجھے چڑھ کر دنیا کے سامنے تماشا بن جاتا ہے۔“ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے تو وہ بھی ہلکا سا مسکرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”اچھا تو آپس سیدھی پٹری پر آ جاؤ۔“ اب وہ سنجیدہ ہو چکے تھے۔ ”آخری رشتے کے نقوص ذرا سوچ سمجھ کر بتانا۔ لڑکا یونٹا میڈیشنز میں جاب کر رہا ہے۔ تحلوہ دولہا کھ سے زائد ہے۔ مع گاڑی تین شادی شدہ بہنیں..... ایک عدد عمر رسیدہ ماں..... باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ لڑکا اکھوتا ہے اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔“ وہ ہاتھ کو مائیک کی شکل دے کر اس کے لبوں کے نزدیک کرتے ہوئے پھر سے شگفتہ لہجے میں بولے۔

”اور اس کا نام بھی تمہاری پسند کا ہے، سلمان خان..... ہر لحاظ سے سننے میں بہترین لگ رہا ہے۔“

”ان کا گھریلو، رہن بہن اور طور اطوار دیکھ لیتے ہیں۔“ وہ ہاتھ کو پرے ہٹاتے ہوئے بولی۔ ”یوہی اسی اکلوتی بہو کے لئے پڑ جائے گی۔ یہ تاریک پہلو ہے۔“

”تو پھر بیگم ایسا کرو کسی خیم خانے کا دروازہ کھٹکتا ہے۔ جس بچے کا آگے پیچھے ہی کوئی نہ ہوگا وہی تمہارے لیے آئیڈل ثابت ہوگا۔“ وہ کسی نگاہ اس پر ڈال کر زہراؤ لہجے میں بولے۔ ”یا پھر ایک اور بھی طریقہ ذہن میں آیا ہے۔ شادی کے فوراً بعد ہی ماں کو زہر کھلا دیتے ہیں تاکہ وہ بیٹے کی ماں ہونے کا مزہ تو چکھ لے۔ جس پر وہ فخر و غرور سے شنی ہوئی تھی۔ اور پھر اس کے سر سہرا بننے کی آرزو کا خمیازہ بھی بھگتنا ضروری ہے ناں۔“

☆☆☆

”نمر! کب سے فون کر رہی ہوں..... کہاں ہو؟“ حمیرا نے خفگی سے کہا۔

”سمجھا کر دو، گھر میں بہت اہم مہمان تشریف فرما ہیں۔ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھی۔ حمیرا مجھے لوگ بہت خوب لگے ہیں، سلمان بھی بہترین لڑکا لگا۔ دل کو بھانپ گیا ہے، تم بھی اسے پاس کر دو گی۔“ وہ مسرت آگئیں لہجے میں بولی۔

”نمر! اللہ تعالیٰ تمہاری جھولی کو خوشیوں سے بھر دے۔ تمہارے لیے سب بہتر ہونے کے روشن امکان واضح ہیں۔ عادل بہت اپ سیٹ ہے۔ میں نے اس کے دل سے تمہارا خیال نکالنے کی حتی الوسع کوشش کی..... لیکن اس کی سوئی ایک ہی جگہ پر انک کر رہ گئی ہے۔ مجھے اس پر بے پناہ ترس اور پیار آنے لگا ہے۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ایسی محبت تو اب صرف فلموں اور کہانیوں تک ہی محدود رہ گئی ہے۔ نہ جانے یہ اس دنیا کے کس حصے کا

## انگ خلش

باشندہ ہے کہ تمہارے نام کا ورد بھی الفت و راحت میں تو کبھی تشریف و جنون میں جھپٹے نہیں تھکے۔ وائس چائسلر نے اسے اپنے آفس بلا کر اسے فارغ کرنے کی وارنگ دے دی ہے۔ اب تو وہ بیچارہ ہتھے سے ہی اکھڑ گیا ہے۔ اس کی عادت سیما ب میں شوریدگی بڑھ گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں خود کو کوئی جانی نقصان ہی نہ پہنچا لے۔ وہ افسردگی سے بولی۔

”یہی تو مجھے اعتراض ہے کہ وہ نارمل نہیں پاگل ہے۔ اسے پاگل خانے جمع کراؤ۔۔۔۔۔ اگر تمہارا دل اتنا ہی پیچ گیا ہے تو تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ وہ قدرے برہمی سے بولی۔

”تمہارے مشورے پر غور و خوض کیا جاسکتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ مجھے اس سے بالکل لگاؤ نہیں۔۔۔۔۔ ہاں ہمدردی ضرور ہے۔ حالانکہ وہ تمہارے لیے تو ایک انمول ہیرا ثابت ہوتا۔۔۔۔۔ میرے لیے تو کھوٹا سکے ہی ہے۔ اس کے باوجود مجھے اس کی جان کی پروا ہے۔ مجھے اسے سہارا دینا پڑے گا۔“ وہ شدت احساس سے بے دم ہو کر بولی۔

”فارغاؤ سب۔۔۔۔۔ اس کا غصہ بھی برا اس کا پیار بھی لعنت۔۔۔۔۔ اس سے دور رہو۔۔۔۔۔ مجھے تو اس پر رتی بھرا اختیار نہیں۔۔۔۔۔ اس کی دشمنی اور دوستی دونوں ہی قابلِ مذمت اور قابلِ مذمت ہیں۔“ وہ زہر آگئیں لہجے میں بولی۔

”میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے نہ۔۔۔۔۔“ حمیرا نے لاچاری سے کہا۔۔۔۔۔ ”وہ بہت بے ضرر اور صلح جو انسان ہے۔ تم نے اس دولت کو لات مار دی جو ڈھونڈنے سے بھی حاصل نہ ہو۔ فرعون کا خزانہ لٹانے سے بھی اس کا حصول ممکن نہیں۔“ یہ دلوں کے سودے اور لین دین کی باتیں ہیں۔“ وہ دھکی لہجے میں بولی۔

”اگر تم نے اپنے دل کی بیہودہ اور قابلِ مذمت آواز پر اپنی سوچ کو قربان کر ہی ڈالا ہے تو میں منع کرنے والی کون ہوتی ہوں۔ میری دعاؤں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ اب میرے اختیار میں صرف یہی رہ گیا ہے۔“ وہ آزر دگی سے بولی۔

”حمیرا دیکھو جو بندہ مجھے اپنے لیے پسند نہیں۔۔۔۔۔ بھلا میں اپنی بہن کے لیے اس کا انتخاب کیسے کر سکتی ہوں۔ تم نے میرا سکون غارت کر ڈالا ہے۔ پلیز حمیرا میری بات غور سے سنو۔ آج اس سر پھرے پر ترس کھانے کا مطلب جانتی ہو۔۔۔۔۔ آنے والے کل میں دنیا کے لیے قابلِ رحم بن جاؤ گی۔ اپنے جیسے مثالی وہم آہنگ خاندان کی بہو بننے کا سوچو۔۔۔۔۔ اس خاندان میں بے حساب مسائل ہیں۔ جن سے ہمیں نا بلند رکھا گیا ہے۔“

”ادکے۔۔۔۔۔ میرے مسکے سے باہر نکل کر اپنی طرف آ جاؤ۔ اب جو رشتہ آرہا ہے، اس میں تمہاری مرضی اور پسند کا دخل بہت اہم ہے۔ زندگی تمہاری ہے۔ اسے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی غلطی مت کرتا۔ اپنا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا دیکھو۔۔۔۔۔ ورنہ تمہارا بوجھ دوسرے لوگ اپنے کندھوں سے اتارنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔“ وہ سختی سے بولی۔

”فینک یو حمیرا۔۔۔۔۔ تمہارے مشوروں پر چلتی تو آج ایک پاگل کے ساتھ میں بھی پاگلانہ حرکتیں اور باتیں کر رہی ہوتی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اسے بار بار گل مت کہو نہ۔۔۔۔۔ میں نے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بس اس کی طرف سے آمادگی اور رضامندی کا انتظار ہے۔ اشارنا اسے اپنے دل کا پیغام دینے کی کوشش کر دوں گی۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ کتنا سمجھ پاتا ہے۔“ وہ شجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”اور قربانی کی بے زبان گائے صلابہ ذرا دھیرے، دھیرے اور دیان و گیان سے۔۔۔۔۔ بچی وہ کلیئر بات سمجھ نہیں پاتا۔ تمہارے اشارے کنائے کیا خاک سمجھے گا؟ اس کے سامنے کھل کر اعلان کرو۔۔۔۔۔ اس کے پلے کچھ



نہیں پڑے گا۔ اپنی بات پر مصررہے گا کہ مجھے نمر اچا ہے بس نمر اچا ہے۔ یہ تجربہ کرو کیجو۔ اگر میں جھوٹی ثابت ہوئی تو مجھے ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر اس کی ہو جانا۔ اگر تمہیں میری باتوں میں سچائی نظر آئی تو پھر تم اسے الوداع کہہ دینا بغیر کسی حیل و حجت کے۔“ وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔

”میرا خیال ہے نمر۔۔۔۔۔ تم تھوڑی جیلس ہوگئی ہو۔ بھی تمہیں وہ سوٹ نہیں کیا۔ میرے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میرے خاندان میں وہ خوب فٹ بیٹھے گا کیونکہ اسٹینس میں فرق نہیں۔“ وہ الجھ کر بولی تو نمر اٹھا موش ہوگئی۔

☆☆☆

سلمان اور اس کی ماں بہنیں اپنے چند قریبی رشتے داروں کے ہمراہ نمر کو انگوٹھی پہنانے سرشام ہی ان کے گھر پہنچ گئے۔ سلمان تو خوشی سے پھولا نہیں سہا رہا تھا۔ نمر اچھی شریک حیات عالیہ جیسی خوش مزاج ساس اور رحمان جیسا فرشتہ خصل سسر اسے خدائی انعامات سے کم نہیں لگتے تھے۔ اور ان کی طرف سے بھی یہی رد عمل اپنائیت و انسیت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ کیے جا رہا تھا۔

لش پیش کرتی ہوئی ڈائمنڈ کی انگوٹھی سلمان نے اس کے نازک اور دودھ کے مانند گورے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پہنا کر ہلکی سی سرگوشی کی۔ ”اس کے ذریعے میرا پیغام دل تک تو پہنچ ہی گیا ہوگا۔“ نمر اس کی بات پر ڈرا سا مسکرائی۔ اور ساس نے لڈو اس کے منہ کی طرف بڑھایا تو اس نے نخرے و نزاکت سے لب کھولے اور لڈو کا معمولی سا حصہ لے کر آہستہ آہستہ چباتے ہوئے دل ہی دل میں بولی۔

”اس لڈو کا ذائقہ کتنا مختلف ہے۔ سنا تھا کہ سنگنی کے لڈو میں محبت و چاہت کی چاشنی کی آمیزش سے اس کا ذائقہ بہت اچھا اور نرالا ہو جاتا ہے۔ آج میں نے ایسا ہی محسوس کیا ہے۔“

اگلا مرحلہ سلمان کو انگوٹھی پہنانے کا تھا۔ لڑتے ہوئے ہاتھوں سے نمر نے اس کا ہاتھ پکڑے بغیر اسے انگوٹھی پہنائی تو اس کی حیا و شرم و دیکھ کر رحمان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ سعود کی بے حیائی، بے باکی اور بے پردگی ان کے ذہن میں ورد کی لہروں سمیت دارو ہوئی۔

”کاش سعود تم بھی میری بیٹی ہوتے۔“ ان کے دل میں اضطراب اور بے تابی سامنی۔ اس کے فوراً بعد نمر وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور سلمان کا منہ لٹک گیا۔

”جی جاتی۔۔۔۔۔! پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ آپ کو قید یا مشقت کی سزا تو سنا دی گئی ہے۔ بس اب بے آپ کو کھٹکھٹانی زنجیروں میں قید کرنے کا اولین کام۔ وہ بھی بزرگوں نے سوچ رکھا ہے۔“ حیرانے سلمان کو چھیڑتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔

”بیٹا سلمان! بھائی صاحب اگلے مہینے کے آخری ویک اینڈ کی بات کر رہے ہیں۔ تمہیں چھٹی لینے میں پرہیز تو نہیں ہوگی؟“ سلمان کی والدہ محترمہ صاحبہ نے بیٹے کے قریب آ کر سرگوشی کی۔

”اسی مہینے کا آخری ویک اینڈ بہتر رہے گا۔“ وہ بے اختیاری سے بولا تو لاؤنج میں موجود تمام لوگ ہنسنے لگے۔ وہ نادم سا ہو کر گویا ہوا۔ ”در اصل چھٹی زیادہ نہیں مل پائے گی اس لیے میں نے عرض کی تھی۔ اس کا رخیہ سے جلد از جلد سبکدوش ہو جائیں تو بہتر رہے گا۔“

”بیٹی والے ہیں، کچھ تیاری وغیرہ کے لیے انہیں وقت چاہیے۔ ان کی مجبوری ہے حالانکہ میں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جس نے اپنے جگر کو ہماری جھولی میں ڈال دیا وہاں جہیز بے معنی دے دیتا ہو جاتا ہے۔“ ماں

نے سنجیدگی سے کہا تو سلمان نے سر اُٹاتے میں ہلادیا۔

”رحمان بھائی، اوکے کر دیا ہے سلمان نے۔“ ماں خوشی سے بولی تو کمرے میں موجود سب کے ہاتھ دھوئے... خیر کے لیے اٹھ گئے۔ مہمان ڈنر کے بعد خوشی، خوشی اپنے گھر چلے گئے۔ عالیہ اور رحمان تھکن کے باوجود اپنے بستر پر بیٹھے گنت و شنید کرنے لگے۔ پیسے کا جوڑ توڑ، تھوڑا بہت بینک سے قرض، کچھ چھوٹے بھائیوں سے مدد... دونوں نے مل کر تمام اسٹ تیار کر لی... کہ کہاں، کہاں سے پیسہ نکالا جاسکتا ہے۔ آخر بیٹی کی شادی تھی۔ جہیز دینا بھی لازم تھا۔ سعود کی کمی بدستور عالیہ کوڑ لاتی رہی۔ جس کا ذکر کرنا مناسب نہ لگا تھا۔

گھر کی خاموشی میں ایک خوشگوار سی رونق اور گہنا گہمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ حالانکہ ابھی تک گھر میں وہی تین لوگ تھے۔ شاپنگ نے ماحول کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ نر اور عالیہ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر جو نکلتیں تو شام کو رحمان آفس سے فارغ ہوتے ہی انہیں مخصوص جگہ سے پک کرتے اور تینوں کسی معمولی اور سستی جگہ سے کھانا پکڑتے اور گھر واپس آ جاتے۔ یہ خوشیوں بھرے دن یادگار رہتے جا رہے تھے جبکہ سعود کی کمی کا احساس تینوں کو اندر ہی اندر گھائل کر رہا تھا۔

مختار راجہ نے رحمان کو جو چند دن پہلے سعود کی رپورٹ دی تھی۔ وہ کافی تسلی بخش تھی کہ اس کا ویزا ری نو ہو گیا تھا۔ اور وہ ابھی تک مختار کے گھر میں رہائش پزیر تھا۔ وہ آگے کیا کرنا چاہتا تھا اور رحمان کی بیٹی سے بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کی غلطیوں کو معاف کرنے کا سوچ کر آگ بولہ ہو جایا کرتے۔ اس لیے مختار بھی ابھی انہیں اس کے بارے میں تفصیل بتانا نہیں چاہتے تھے جو ناقابل یقین تھی۔ ایک معجزاتی عمل کا زبانی کلاسی یقین کرتا بہت مشکل ہوتا ہے۔ رحمان نے اپنے بیٹے کو جس حد تک غلاظت کے ڈھیر پر ہوش و خرد سے بیگانہ دیکھا تھا۔ اب کانوں پر بھر وسا جہالت ہی لگتا۔ اپنی آنکھوں پر یقین کر کے ذہن و قلب کو اعتماد میں لینے کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

”مختار! اس ناخوار کو بتا دینا کہ اس کی بہن کی شادی کی ڈیٹ اگلے مہینے کی پچیس تاریخ کو فکس کی ہے۔ میں اسے بتانا ضروری سمجھتا ہوں، آخر وہ نر کا بھائی ہے۔ باقی اسے یہاں آنے سے روکے رکھنا۔ تم ہمیشہ کی طرح بہت فراخ دل اور صابر و شاکر انسان ہو جو اسے اتنے دنوں سے سینے سے لگائے بیٹھے ہو۔ میں تو اس پتی کو اپنا بیٹا کہتے ہوئے ڈوب مرتا۔“ رحمان نے مختار سے بات کرتے ہوئے اپنا ہنڈ پریشر ہائی ہوتا محسوس کیا۔

”رحمان تم اس کی فکر کرنا چھوڑ دو۔۔۔۔۔ یوں سمجھو کہ وہ میرا دوسرا بیٹا ہے۔ اللہ کرے گا ٹھیک ہو جائے گا۔ آخر تمہاری اور بھائی کی تربیت میں پروان چڑھا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا اثر ابدی نہ ہو۔۔۔۔۔ جوانی بڑی ظالم شے ہے۔ اچھے بھلوں کو رو ذلیل کر دیتا ہے۔ یہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ شیطان کے چکھے میں آ گیا۔ اسے معاف کر دو۔ جو ہوا سو بھول جاؤ۔ میں سعود کو اگلے مہینے کے شروع میں پاکستان بھیج رہا ہوں۔ گرمی کے بجائے نرمی سے کام لیتا، جوان بچوں کو پینڈل کرنے کے طریقے سیکھ لو، فائدے میں رہو گے۔ ان کے ساتھ ڈنڈے کا استعمال ہماری تربیت کی ناکامی ہے۔ اس کی نوبت ہی نہیں آئی چاہیے۔ سانپ بھی مر جائے لاش بھی سلامت رہے، جوان اولاد کے ساتھ یہی گڑھیں ان گنت پریشانیوں سے دوڑ رہا ہے۔ بس تھوڑے کو بہت سمجھو اور غلط کو تار سمجھو۔۔۔۔۔ اور تمہیں کیا سمجھاؤں۔“ وہ ہنس کر بولے تھے۔

”خدا کے لیے ہمیں ان نئے رشتے داروں کے سامنے شرمندہ مت کرنا۔ بس اسے وہیں میرا گیر پر لگائے رکھو۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ مجھے نہیں چاہیے سعود جیسا بیٹا۔ اور اس کی ماں کو کچھ خبر نہیں کہ اس

کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ ایک ہی دکھ اس کے لیے کافی ہے کہ وہ ہم سے خفا ہو کر بغیر بتائے واپس چلا گیا۔ آگے کے حالات سے بے خبری ہی بہتر ہے۔ سب قسمت کا لکھا ہے۔ بہت بے بسی ہے۔" وہ سچی انداز میں بولے۔

"کیا بھائی، بہن کی ڈوئی کو کنہہ دے نہیں آئے گا؟ کیسی عجیب باتیں کرتے ہو..... ویسے تم میں ہمیشہ سے اونٹ کی خصلتیں نمایاں رہی ہیں..... غصہ و درگزر کرنا سیکھو..... انتقامی جذبے نفرت و غصے سے بھر پور باتیں اور رشتوں سے کنارہ کشی بہت عظیم دکھ ہے۔ عمر کے اس حصے میں ان خباثتوں سے باہر نکل آؤ۔ ورنہ بلڈ پریشر اور شوگر لیول ہائی ہونے میں دیر نہیں لگے گی اور ہارٹ ایک تو سوتے ہوئے میں اپنا کارنامہ دکھا جائے گا۔" وہ نرم بات سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

"مختار تم پر بھی مغربی رنگ چڑھ گیا ہے جو اس کی حمایت ہو رہی ہے۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

"رحمان اپنا رویہ بدلو..... لعن طعن کے دن گئے۔ اس حقیقت کو جتنی جلدی تسلیم کر لو گے اضطرابی کیفیت سے چھٹکارا پا لو گے۔ میری ریکویسٹ پر غور کرو۔" وہ محل سے بولے۔

"اس نامراد کا حلیہ ناقابل برداشت اور اس کے اعمال ناقابل معافی ہیں۔ ہم اپنی بیٹی کی خوشیوں کے رنگوں میں بھنگ کی ملاوٹ نہیں کرنا چاہتے۔ اس کی سسرال والے ٹیک، طینت، نمازی، حاجی اور پرہیزگار لوگ ہیں۔ اس نمونے کو دیکھ کر رشتہ توڑ دیں گے۔ خاندان بھر میں بہت رسوائی ہو جائے گی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے ہم۔ تم یہاں کے کلچر کو کیوں بھول گئے ہو؟ ایسا کرو تم اور بھابی کیوں نہیں آ جاتے؟ اگر تمہارا بزنس اجازت دیتا ہے تو شادی سے دو بیٹے پہلے آ جاؤ، خوب مزہ رہے گا۔ تم سے ملے ہوئے بھی ایک عرصہ بیت گیا۔ یہاں سے ایسے گئے کہ کبھی لوٹ کر آنے کی خواہش ہی نہیں ہوئی۔" وہ دکھ اور مسرت بھرے انداز میں بولے۔

"بزنس تو خیر پرانا ہو چکا ہے، میری غیر حاضری میں بھی اب فرق پڑنے والا نہیں..... تمہاری بھابی سے مشورہ کر کے میں تمہیں اپنا پروگرام بتا دوں گا۔" مختار رضامندانہ انداز میں بولے۔

"یار تم بدلے نہیں، کیا اب بھی سانس لینے سے پہلے بھابی کی اجازت چاہیے ہوتی ہے تمہیں؟" رحمان نے شرارت بھرے لہجے میں دوست کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے..... ہاں، ہاں بالکل تمہاری طرح..... بھلا فطرت بھی کبھی بدلی....." مختار قہقہہ لگا کر بولے۔

"ماحول، جگہیں، رسم و رواج، تہذیب اور دوست احباب بدلنے سے فطرت بھی بدل ہی جاتی ہے۔" رحمان نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم کیوں نہیں بدلے، واقعی حیرت کی بات ہے۔ خیرل بیٹھیں گے تو ایک دوسرے کی تبدیلیوں کو پوائنٹ آؤٹ ضرور کریں گے۔ بس تم میری خوشی کو چار چاند لگانے کا پروگرام بناؤ..... اور آ جاؤ۔" وہ ہنستے ہوئے بولے۔

سگنل ویک ہونے کی وجہ سے فون کٹ گیا تھا۔ مزید گفتگو نہ ہو سکی۔

☆☆☆

"میں نے تمہیں کل دس بار فون کیا۔ ذرا موبائل پر مسد کال دیکھو..... اور فوراً سوری بولو....." عادل نے حمیرا کو فون پر سخت بیزار سے کہا۔

"سر میں کل نمرا کی سگنل کی رسم اینڈ کرنے گئی تھی۔ فون گھر پر ہی رہ گیا تھا ہمیشہ کی طرح..... آتے ہی میں نے آپ کی مسد کال دیکھ لی تھی۔ دیر ہو جانے کی وجہ سے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگا۔ صبح بارہ بجے تک سوتی رہی۔ ابھی سوچ ہی رہی تھی آپ سے بات کرنے کا کہ آپ کا فون آ گیا۔" حمیرا نے دھڑکتے دل سے اسے نمرا کی



سنگی کی خبر بھی سنائی۔  
 ”نہرا کی سنگی ہوگئی؟ یہ خوب رہی۔ مجھے بے وقوف بنا کر چلی ہے کسی اور کی دلہنیا بننے۔ میرا یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ تہر آلود لہجے میں بولا۔

”وہ تو سر ہو کر رہے گا۔ اس کی شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو چکی ہے۔ اب تو آپ اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کر لیں۔ آپ جیسے ہندسہ اور وجہہ انسان کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ آپ کسی طرف اشارہ تو کریں۔ اسے آپ کے قدموں میں لا کر کھڑا کر دوں گی۔“ حمیرا نے عادل کو جنون و دیوانگی کی حد تک مستعد پا کر معاملہ فہمی سے کام لینا چاہا۔

”حمیرا تم جانتی ہو۔۔۔۔۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت ہے۔ اس کے ٹھکرانے کے باوجود وہ میرے دل کے نہاں خانوں میں آباد ہے۔ راتوں کے اندھیرے میں وہ میرے ساتھ ہوتی ہے۔ دن کے اجالوں میں وہ میرے دم قدم چلتی ہوئی مجھے اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ میں اس کے بغیر خود کشی کر لوں گا۔ اسے میرا پیغام پہنچا دو حمیرا۔ پلیز۔۔۔۔۔“ وہ التجائیہ لہجے میں بولا۔ آنسو عورتوں کی طرح چھم چھم بہہ نکلے تھے۔ اور وہ مایہ بے آب کے مانند تڑپ رہا تھا۔

”سر۔۔۔۔۔ اودھ آپ سے نفرت کرتی ہے، آپ کیسے عجیب مرد ہیں کہ جو سامنے ہے وہ نظروں سے اوجھل ہے، حالانکہ وہ دل و جان سے قدا ہے۔ آپ کو اپنا نا چاہتا ہے مگر اس کی محبت کی حدت کو محسوس کرنے سے قاصر ہیں آپ۔“ وہ دھکی لہجے میں بولی۔ مگر ایسی گول مول بات اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

”حمیرا صرف ایک بار اس سے ملو اودھ کیلئے میں۔ اسے منا کر چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ میں نے پچھلے دو سالوں سے

**رات کا مسافر**

ساحل سے پیارے لوٹنے والے ایک مسافر کی ایسی مسافت کا احوال

**ظاہر جاوید مغل** کے قلم سے آخری صفحات پر سوغات

**قطب الدین ایبک**

تاریخ کے شہرے اور راق کا جادو۔۔۔۔۔ ابتدائی صفحات پر

**ڈاکٹر ساجد امجد** کا انداز بیان

**سودانہ طوں**

مسلمانوں کی جہد مسلسل کا دلخراش ماجرا۔۔۔۔۔ **ڈاکٹر**

**عبدالرب بھٹی** کے قلم سے تلخ حقائق کی نقاب کشائی

**ماروی**

اپنے محبوب کے بمقدم شکر یز رستوں پر گامزن چاہتوں کی

**محی الدین نواب** کا شاہکار

2015ء کی سہ ماہی

**سینئر ناٹسٹ**

**مزید**

خطوطِ حیاتِ محفل

محفلِ شاعر و سخن اور

مرزا امجد و بیگ کا دلِ لالِ انداز

151 ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2015ء

بڑے، بڑے پچھتے خانوں کو سیدھا کیا ہے..... نمر اکیا چیز ہے؟ اگر اس نے مان کے نہ دیا تو اسی کے سامنے خود کو گولی سے اڑا دوں گا۔ میں تو تم لوگوں کے درمیان نہیں ہوں گا اس کا حشر دیکھنے کے لیے میری بات یاد رکھنا زمانہ اس پر تھو کے گا۔“

اس کے دل میں جو بھی آ رہا تھا وہ بولے جا رہا تھا۔ حیرا ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔ اس وقت وہ اسے بالکل اپنے ہوش و خرد سے بیگانہ معلوم ہو رہا تھا۔

”سر! میں آپ کو نمرا سے بہ آسانی ملوا سکتی ہوں۔ لیکن آپ کا اس سے ملنے کے بعد کاروبار عمل کافی بھیا تک اور روح فرسا ہے۔ اس لیے میری تو پہلی ایسا قبیح فعل کرنے سے پہلے ہی میں مر جاؤں تو بہتر ہے، نمر ا میری بہت پیاری دوست ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے، آپ کو خوش خیالی کی دنیا میں پاگل و بے وقوف بنائے رکھا۔ یہ اس کا کمپلیکس تھا، احساس کستری یا احساس برتری تھا کہ آپ کو کوری جیکٹ کر کے کسی اور کے آگے کی رونق بننے جا رہی ہے۔ اس کی دیا کاری اور خود غرضی سے مجھے انکار نہیں..... لیکن میں اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔“ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز کسی گہری کھالی سے نکل رہی ہو۔ تمام شوخی رنچر ہو چکی تھی۔ تمام ہمدردی اور نرمی و عاجزی پر پانی پھر گیا تھا۔

”مطلب یہ ہوا کہ تم بھی دغا دے گئیں۔ حیرا اگر تم نے مجھے اپنا یہ روپ دکھایا تو یقین جانو یہ تو بے ہوداں بھی جز نہیں پائے گا۔ میں پہلے ہی اس کی کج روئی سے بہت مضطرب ہوں۔ اگلا انگ ورسے چور ہو کر گرا رہا ہے۔ تم نے تو اک مضبوط اخلاقی سہارا مجھے اس وقت دیا تھا۔ جب میں شکوک تھا۔ اس کے انکار پر..... خود مرکزیت کا شکار ہو کر شغلی جذبات کے دھارے میں بہتا جا رہا تھا۔ ذرا بے کوفہ کہ تم نے سہارا دے ڈالا۔ حیرا مجھے مرجانے دیا ہوتا۔ یہاں کسی کو میری ضرورت نہیں۔“ وہ آنسو گرا رہا تھا۔ آواز بھاری ہو چکی تھی۔

”سر۔ آپ اس کم ظرف لڑکی سے بدظن کیوں نہیں ہو جاتے۔ اپنی مردانگی کو بیدار کیجیے۔ غیرت وانا کو پکاریں۔ وہ آپ کے دل سے اتر جائے گی۔ اس کی گارنٹی دیتی ہوں۔“ اسے اس کی حالت پر بے پناہ ترس آیا اور غصہ بھی۔ ”انوکھا مرد ہے کہ اس کی بے رخی و بے اعتنائی کے باوجود اسے یاد کر کے رو رہا ہے۔ اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ جہنم رسید کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس سے ملاقات کے بعد مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اس کی بے قراری، شکستگی اور کم مائیگی کا احساس اتنا بڑھ جائے گا کہ برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بہتر ہے جو محبت کا چھپر اس نے کھولا تھا اسے ابھی بند کر کے مطمئن و پرسکون ہونے کی کوشش کرے..... میں جو اسے سہارا دینے کے لیے تیار ہوں۔ میں اس کی میا سحی بنوں گی۔ نمر ا تو بے وقوف نکلی..... جس نے اس سادہ انسان کو کوری جیکٹ کر ڈالا۔ ایسی فطرت اور مزاج کے شوہر ہی تو اپنی بیوی کو بے پناہ خوشیاں دے سکتے ہیں مگر کم بخت کو میں نظر آؤں تو بات ہے۔ اسی کا ورد پڑھنے سے فرصت ملے تو اپنے حقیقی اور سچے پر خلوص مسیحا کو اپنے دل کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے محسوس کرے۔“ وہ منہ میں بددلی جیسے عادل نہ سمجھ سکا۔

”تو پھر وعدہ کرو کہ کب اور کہاں ملاقات کروا رہی ہو؟“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ یہی تو اس کی سب سے بڑی خامی تھی کہ ایک بات پر اڑ جاتا تو پھر کسی کی سننا گوار نہیں کرتا تھا۔ نمر ا کا اعتراض اس کے کانوں میں چٹائی بن کر گونجنے لگا..... وہ گہری سوچ میں چلی گئی۔

”سوچنا پڑے گا۔“ وہ گھو خلاصی کرنے کے لیے بولی۔

”بس جلد ہی بتانا۔ انتظار میں سوئیں پاؤں لگا کہ تم کیا جانو۔“ وہ آہ بھر کر بولا۔

”اس سے ملاقات مشکل اور نئی لڑکی دھونڈنا آسان لگ رہا ہے مجھے..... کیوں نہ ہم یہ نیک کام کریں۔ آپ کی مہم کا بھی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بیٹے کا گھر آباد دیکھنے کی ہر ماں کو بہت چاہ ہوتی ہے۔ آپ اپنے ذہن کو کسی اور طرف مائل کرنے کی کوشش کریں۔ نمراب پرانی ہے بلکہ وہ کبھی آپ کی بھی ہی نہیں۔“ وہ نرمی سے بولی۔

”وہ میری ہے حمیرا۔“ وہ کسی کی نہیں۔“ وہ زور سے چیخا اور فون بند ہو گیا۔

”پاگل کہیں کا یہ تو حد درجے کا بے غیرت اور بے عزت لنگا۔۔۔۔۔۔“ سچ کچھ ذہنی مریض ہے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی، اتنا مارا کھپانے کے بعد اس کا سر پکرا گیا تھا۔ فرنچ کھول کر اس نے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور ایک ہی سانس میں غٹا غٹ جیتی چلی گئی۔

”نمراب کا فیصلہ درست تھا۔ میں چلی تھی ہمدردی کرنے۔ لعنت میری عقل پر اس سے شادی کرے گی میری جوتی..... یہ انسان تو دو گھنٹوں میں مجھے پاگل کر دے گا۔ آج کے بعد اس پاگل سے رابطہ بند.....“ نمراب کی باتیں اور نصیحتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں، اس نے مستحکم اور اٹل فیصلہ کیا تو دل سکون و طمانیت سے بھر گیا۔

☆ ☆ ☆

شادی سے تین ہفتے قبل نمراب کے مایوں کی رسم گھر میں ہی نہایت سادگی سے منائی گئی۔ اس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ اس کی نکاح فیلوز اور سہیلیوں میں سے صرف حمیرا کو مدعو کیا گیا تھا جو اس کے بہت قریب تھی۔ پیلے رنگ کے جوڑے میں اس کا گورا صندل اور سندور کی آمیزش میں پنک لٹکارے مارتا ہوا رنگ اور نکھر گیا تھا۔ دھڑا ہوا سر سے، کاہل اور لپ اسٹک سے عاری چہرہ پیلے رنگ کے دوپٹے کے بالے میں ایسا پاکیزہ اور معصوم لگ رہا تھا کہ عالیہ عالم وارنگلی میں بار بار اس کی نظر اتارے جا رہی تھی۔ رحمان بھی مطمئن اور خوش نظر آ رہے تھے۔ حمیرا نے رات نمراب کے ساتھ ہی گزار دی۔ دونوں طلوع سحر تک کالج اور یونیورسٹی کی پرانی یادوں کو کریدتے ہوئے کبھی اداس ہوتیں تو کبھی اپنی کئی بے وقوفیوں اور نادانیوں پر قہقہے لگاتے تھیں۔ اسی گفتگو کے دوران عادل کا نام بھی کئی بار اچھا..... جسے نمراب نے مضحکہ خیز انداز میں پرے پھینک ڈالا تو حمیرا نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”دیسے میں تمہاری دانشمندی، دور اندیشی اور چالاکی کی داد دیتی ہوں کہ تم نے خاموش رہ کر نہ تو اس کی محبت کا اقرار کیا نہ ہی انکار کو ضروری سمجھا..... اپنا مطلب نکالا اور اسے خبیث کا دکھا کر ڈگری بھی حاصل کر لی بلکہ اپنی کلاس میں ٹاپ کر گئیں۔“

”حمیرا تمہیں غلط فہمی ہے، میرے والدین کی طرف سے سوچ بچار اور فیصلہ کرنے میں دیر ہو رہی تھی۔ مجھے تو ہر حال میں خاموش ہی رہنا تھا۔ ان کا فیصلہ ہاں میں ہوتا تو بھی مجھے خاموش ہی رہنا تھا۔ جب ابو جی نے میری آمادگی جاننا چاہی تو میں نے انہیں اپنے دل کی سچائی کھول کر بیان کرنا ضروری سمجھا۔ کیونکہ میں ان سے جینٹل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرے اور ابو کے خیالات ایک دوسرے سے خاصی مشابہت رکھتے تھے۔ جبکہ امی اس کے برعکس تھیں..... میں نے سر عادل کو دھوکا دیا کہ وہ میری اصل حاصل نہیں کی۔ اگر وہ میرا جی پنا اے بڑھا رہے تھے تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ میں آج بھی اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ سر عادل نے مجھے دوسروں کے سامنے شرمندہ بھی کیا اور مجھے میری نظروں میں گرا بھی دیا۔ میں جو بھی تھی جیسی تھی اصل اور خالص تھی، خواہ مخواہ میری ڈگری میں غفلت اور ندامت بھر دی۔ میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی اور تم بھی دوسروں کی زبان بول رہی ہو کہ میں نے چالاکی اور ہوشیاری سے بے مثال کامیابی حاصل کر لی..... حمیرا تم نے آج کے بعد مجھے ایسی بات



کہی تو خدا کی قسم تمہیں چھوڑ دوں گی ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے..... مجھے کسی کی باتوں کی پروا نہیں..... لیکن تمہاری باتیں مجھے ہرٹ کرتی ہیں۔“ وہ احتجاجاً بولی۔

”آئی ایم سوری نمرا..... میں نے تو مذاقاً کہا تھا تم سیریس ہو گئیں۔“ حمیرا نے نادم ہوتے ہوئے کہا تو نمرا نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ بندہ کھسکا ہوا ہے، کیا سمجھتا تھا کہ مجھے احسانات کے بوجھ تلے دبا کر زمین کی گہرائیوں میں اتار دے گا اور میری سوچ پر خود کو مسلط کر کے اپنی خواہش پوری کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہ خوش خیالی تھی اس کی..... میرا نام بھی نمرا ہے جو کسی کے رعب و اب میں آنے والی نہیں..... وہ راہ راست پر گامزن رہتی ہے اور اسے اپنی عزت کروانا خوب آتا ہے۔“ وہ غصے اور غظ کی سی بولی۔

”مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اس کے باوجود وہ بے غیرت انسان تمہیں ابھی تک بھلا نہیں پایا..... تمہیں یاد کرتے ہوئے بچوں کی طرح رونے لگتا ہے، میں نے بھی ہر حربہ استعمال کیا کہ وہ تمہیں دل سے نکال دے..... کیونکہ ایسے ہی پاگل لوگ جب انتقام لینے کی ٹھان لیتے ہیں تو پھر انہیں اپنی پروا رہتی ہے نہ دوسرے کی عزت و جلال کا خیال رہتا ہے۔ وہ تم سے کتنا پیار کرتا ہے، میں نہیں جان پائی مگر اب اندازہ کر سکتی ہوں۔ تمہاری نفرت بجا ہے۔“ وہ نچوٹ سے بولی۔

”آئی ڈونٹ تو حمیرا..... اسے پاگل پن، دیوانہ پن نہ کہوں تو اور کیا کہوں.....؟ اس کے دل میں میرے لیے جتنی تیزی سے محبت حملہ آور ہوئی تھی۔ اسی رفتار سے کافور بھی ہو سکتی ہے۔ میری شادی ہو جانے دو، پانی کے ٹیلے کی طرح اس کی محبت کا نشہ بیٹھ جائے گا جس محبت کا ڈھنڈورا بٹا دیا جائے وہ تو ذلت اور اذیت ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ یونیورسٹی کے ہر فرد کی زبان پر عا دل کی محبت و لگن کی اور میری بے وفائی دریا کاری کی داستان ہوگی۔ عورت کی عزت بہت نازک ہوتی ہے، سلمان تک اس کی یہ باتیں پہنچ گئیں تو نہ جانے کیا قیامت آجائے۔“ وہ رو پڑی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو..... اگر وہ نارمل ذہن کا مالک ہوتا تو اپنے احساسات و جذبات کو یوں بے مول و بے قیمت تمہاری جھولی میں ڈالنے کی کوشش نہ کرتا..... بچے کی طرح ضد کہ کھیلن کو مانگے چاند۔“ حمیرا نے بھی نفرت آمیز لہجے میں کہا ابھی کبھار اس سے میری بات ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی حالت پر مجھے اس پر بہت ترس آنے لگا تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے اندر وحشت و درندگی کا بیج بھی اتنا ہی گہرا ہے جتنا تمہاری محبت کا..... اب میں نے اس سے رابطہ بند کر دیا ہے۔ تمہارا فیصلہ سو فیصد درست تھا۔ بس میری دعا ہے کہ تم نے اب جو بے غرضانہ سودا کیا ہے۔ اس میں کبھی خسارہ نہ ہو پھر بھی حفظاً و تقدم کے طور پر سلمان کے گوش گزار دو، اس کی حماقت اور نادانی۔“ وہ دعا یہ انداز میں بولی۔

”حمیرا! حماقت میری تھی جو اس کم عقل کے بلانے پر فرسٹ ٹائم اس کے آفس چلی گئی اسے تو شل گئی اپنی محبت جتانے کی..... پھر اس نے کیسے، کیسے مجھے ذلیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تم تو جانتی ہو، فیل کر کے بھی اور پاس کر کے بھی..... دونوں طریقے سراسر ذلت اور ندامت سے بھر پور تھے۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ اس نے میری شرافت، صبر، مروت اور لحاظ کا غلط مطلب لیا۔ جب سوچتی ہوں تو دل کو کچھ کے اور تازیانے لگنے لگتے ہیں۔“

”چھوڑو نمرا..... ہم گزرے ہوئے وقت کی خوب صورت اور ناقابل فراموش یادوں کو آواز کیوں نہ دیں۔“

حمیرا نے ہستے ہوئے کہا۔







”حمیرا بیٹی! آج نمرائے کے پاس تمہاری موجودگی بہت ضروری ہے۔ اسی لیے تو میں شادی سے دو دن پہلے مایوں کی رسم کرنے پر زور دے رہی تھی کہ مایوں کی دلہن کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن کیا کروں.....؟ میری کوئی بات سننے والا تو ہو..... یہ سن کر تندیں، بھابیوں اور دیورائیاں تو کاٹ کھانے کو دوڑیں کہ ہمارا رواج مہینہ بھر پہلے مایوں بٹھانے کا ہے۔ کیونکہ لڑکی پر شادی کے جوڑے میں روپ خوب آتا ہے۔ میری نمرائے کا پہلے ہی روپ بھر بھر جاتا ہے۔ اسے دن رات امین رگڑنے کی ضرورت تو ہے نہیں۔ بس سب نے مجبور کر دیا۔ میں نے تو پھر مین ہنسنے پہلے اسے بٹھا لیا بس اب بیٹا میں وقتاً فوقتاً تمہیں تک کرتی رہوں گی۔ کیونکہ نمرائے کو اکیلا چھوڑنا درست نہیں۔“ عالیہ نے حمیرا کو فون پر نمرائے کے پاس رہنے کے لیے کہا۔

”بعد شوق..... آپ تنگ کریں..... میری خوش نصیبی ہے آنٹی..... ورنہ آپ کے بہن بھائیوں کی بیٹیوں کی کمی تو ہے نہیں..... یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی ہے کہ مایوں کے بعد دلہن کو تنہا چھوڑنے میں کیا قباحت ہے؟“ وہ حیران کن لہجے میں بولی۔ ”ضرور پرانی ہتھ ہوگی۔“

”بیٹا ہم بزرگوں کی زبانی سنتے آئے ہیں کہ مایوں کے جوڑے میں دلہن پر ہر طرح کے بھوت پریت، جن اور پریاں عاشق ہوتی ہیں۔ وہ ہر وقت اس کے تنہا رہنے کا انتظار کرتی ہیں۔ اگر ایک لمحے کو بھی وہ انہیں اکیلی نظر آجائے تو اس پر حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ دلہن مر بھی سکتی ہے۔ بے ہوشی میں بھی جاسکتی ہے اور عمر بھر کے لیے اپنا بچ بھی ہو سکتی ہے۔“ عالیہ کے لہجے میں خوف عمود کر آیا تھا۔ حمیرا اس کی مصیبت پر قلقل ہنسنے لگی۔

اس نے عالیہ کو سمجھانے کی کوشش کی نہ ہی دلائل دیے۔ آنے کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کر دیا۔ جب سے اس نے عادل سے شادی کرنے کے ارادے کو دل سے گھر ج کر نکال دیا تھا۔ وہ پھر سے نمرائے کے بہت قریب ہو گئی تھی۔ اور عالیہ سے حالاتِ حاضرہ، سیاست اور ملکی حالات پر زور شور سے گفتگو ہونے لگی تھی۔ ان دنوں موضوع بدل چکا تھا۔ تمام وقت شادی کے پروگرام بنانے میں مگن رہ گیا کرتا تھا۔

☆☆☆

رحمان، مختار کو ریسو کرنے اور پورٹ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے کہ عالیہ بھی پرس اٹھائے ساتھ جانے کے لیے چل پڑی۔ رحمان نے حیرت سے بیوی کی طرف دیکھ کر استغناء مہ لہجے میں کہا۔

”تمہارا تو ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ نمرائے پر اکیلی بیوی یا وہ بھی ساتھ چل رہی ہے۔ وہ بھی بیٹے مایوں کے جوڑے میں.....؟“

”حمیرا آنے ہی والی ہے۔ فکر کی بات نہیں۔ آپ مجھے مارکیٹ ڈراپ کرویں۔ نمرائے کا ویڈیو ڈریس تیار ہو گیا ہے اور جیولری کا بھی فون تمہیں چار بار آچکا ہے۔ سوچا دونوں کام آج ہی کیے دیتی ہوں۔ آپ کی جب بھی ازپورٹ سے واپسی ہوگی۔ مجھے فون کر لیجیے گا میں آپ کو شاپ کا پتا بتا دوں گی، وہیں سے مجھے پک کر لیجیے گا۔ ایک پنچھ رو کا ج..... کیسا لگ میرا پروگرام۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”بہت خوب، ورنہ کل میری شامت آگئی ہوتی۔ بھئی اب بازار کے پھر ختم کرو، گھر میں مہمان آرہے ہیں، کچھ ان کی خاطر تواضع کا سوچو۔ مگر پلیز جان کی قربانی سے باز رہنا۔“ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے تو دونوں مین زور سے ہاں نکلنے سے پہلے واپس پٹنے۔ نمرائے کے کمرے میں رحمان نے جھانکا۔ وہ ایپ ٹاپ پر بڑی تھی۔

”بیٹا..... میں ڈور لاک کر لو..... حمیرا بھی پہنچنے والی ہے۔ تمہیں اکیلے میں ڈر تو نہیں لگے گا؟“

عالیہ نے بھی اندر جھانک کر کہا تو نمرائے ٹاپ ساؤنڈ ٹیبل پر رکھ کر اٹھ گئی۔

”ای پہلے بھی تو ہزاروں بار اسی گھر میں اکیسی رہی ہوں۔ آج مجھے ڈر کیوں لگنے لگا ہے؟“ عالیہ ذرا سا مسکرائی اور دونوں باہر نکل گئے۔ نمرابا ہر ہی رک کر انیس گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پیار سے دیکھنے لگی تو عالیہ نے اندر جانے کا اشارہ کیا تو وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی مین ڈور لاک کر کے پھر اپنے کمرے میں آگئی۔

☆ ☆ ☆

حمیرا الماری میں سر دیے کبھی ایک ڈنگر باہر نکالتی تو کبھی دوسرا..... کیا مجال ہے کہ ایک ڈر لیس بھی پسند آ رہا ہو۔ اور موبائل کی رنگ نے تو کمرے میں پچھل چار کھی تھی۔

”اس موبائل کو دل چاہتا ہے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک آؤں۔ کم بخت جب سے ایجاد ہوا ہے۔ دن اور رات کا سکون ہی غارت ہو گیا ہے۔ اب تو کوئی اور ہم سفر ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں..... یہی کم بخت اسی کا ردِ دل ہے کرتا ہے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی ڈر۔ سڑکو وہیں چھوڑ کر مزی اور سائنڈ ٹیبل سے فون اٹھا کر نمبر دیکھے بغیر آن کر دیا یقین تھا کہ نمبر اکا فون ہوگا۔ اس نے دوسری طرف سے ہیلو کی آواز کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔

”مجھے علم تھا کہ تمہارا ہی فون ہوگا۔ بس ایک گھنٹے میں تمہارے پاس ہوں گی..... تیار ہونے ہی جا رہی تھی اپنی ضرورت لہنیا کے لیے آکس کریم اور برگر بھی لیتی آؤں گی۔ آخر چند دنوں کی مہمان ہو۔ بس پہنچ رہی ہوں مجھے معلوم ہے تم اکیلی ہوگی..... پر ڈرنے کی کی کوئی بات نہیں۔ جب تک اپنے ہونے والے دولہا میاں کو فون کرلو۔ گپ لگاؤ، تمہیں تنہائی کا احساس ہوگا نہ ہی میری کمی محسوس ہوگی۔“ حمیرا دانی سے بولے جا رہی تھی کہ دوسری طرف سے فون کٹ گیا۔

”بالکل ہی ڈر پوک ہے۔“ وہ فون وہیں پر رکھ کر پھر الماری کی طرف بڑھ گئی۔

راہِ صبرِ عادل نے حمیرا کا تمام پروگرام اور نمبر کے حالات سن کر کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا تھا۔ ذہن میں لاوا الیچے گئی مہینے ہو گئے تھے۔ اب وہ بھٹنے کو تیار تھا۔ حمیرا کی خاموشی پر بھی بے پناہ قہر و جلال تھا کہ وہ بھی اب نہ تو فون کرتی تھی نہ ہی اس کی کال ریسیو کرتی تھی۔ محی اپنے گھر اور یونیورسٹی کے درمیان گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔ گھر پر شوہر کی بیماری، بیمار داری اور یونیورسٹی میں لیکچرر کی ڈیمانڈ اور سمسٹر کا اشارٹ اور اینڈ کو پھناتے ہوئے عادل سے ملنے نہ آ پائیں۔ فون پر ہی رابطہ تھا، وہ بھی کبھی کبھار..... یونیورسٹی سے عادل کو ریزائن کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا کیونکہ اس کی آئے دن کی چھٹیوں نے سمسٹر ہی لیٹ کر دیا تھا۔

عادل کو دنیا کے ہر بندے سے شکایت تو پہلے سے ہی تھی۔ اب اسے رینکشن کا جان لیوا کرب ستانے لگا تھا۔ روز بروز زخموں کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے طبیعت میں انتقام و بدلے کا جذبہ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے فون بند کیا اور غصے سے اسے سامنے والی دیوار پر دے مارا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ لفٹ تک پہنچتے ہوئے اس نے خود کو ہوش دلانے کی کوشش کی مگر سر میں خناس بھرا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے نمر ا کو غلیظ اور بے ہودہ کالیوں سے نوازتے ہوئے گاڑی اشارٹ کی اور ہوا کی رفتار سے اڑاتا ہوا ریڈلائٹس کر اس کرتا ٹریفک پولیس کی پروا کیے بغیر نمر ا کے گھر کے گیٹ پر گاڑی روک کر باہر نکلا، اوپر ہو کر گیٹ کھاندا۔ ہاتھ ڈال کر اس نے گیٹ کھولا اور اندر چلا گیا۔ مین ڈور پر پہنچ کر اس نے ٹیل دی تو نمر ا قلا نہیں بھرتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور مین ڈور کھولنے سے پہلے بڑبڑائی۔

”ای تو کہہ رہی تھیں کہ تم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچنے والی ہو۔ آج تو تم نے کمال ہی کر دیا۔ دیر سے آنے والی حمیرا میں اتنی جستی اور پھرتی کیسے آگئی۔ حیرت کی بات ہے۔“ وہ خود کلامی کرتی دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ مین ڈور

## انگ خلیش

کھولتے ہی اس کی چیخ خلق میں پھنس گئی۔ سامنے عادل خونخوار طبعی میں کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی سوال کرتی۔ عادل نے اسے ہلکا سا دھکا دیا اور تیزی سے اندر آ گیا۔ اور دروازہ لاک کر کے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے آیا۔ سکتے کے عالم میں وہ کم صبر سی ہو گئی تھی۔

”تو چیخ سکی نہ ہی اس غصے کی وجہ پوچھ سکی۔ حملہ اتنا جلد اور شدید تھا کہ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کے منہ میں اسی کا پیلا مایوں کا دو پٹا ٹھوسا ہوا تھا اور وہ مابی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

☆☆☆

حمیرا نے گیٹ کھلا دیکھا تو حیران و پریشان ہوتی ہوئی گاڑی پورچ تک لے گئی۔ مین ڈور کا ایک پٹ بند لیکن دوسرا ہلکا سا کھلا دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ نمرا کو آوازیں دیتی ہوئی اس کے کمرے تک چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا مگر لاک نہ نہیں تھا۔ حمیرا نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو نمرا کو بستر پر نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر چیخی۔

”نمرا، نمرا آنکھیں کھولو..... کیا ہوا ہے؟ مجھے کچھ تو بتاؤ۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔“ نمرا نے بے بس ولا چار اجڑی ہوئی آنکھیں کھولی اور پھر بند کر لیں۔ عالیہ آنٹی کی باتیں حمیرا کے کانوں میں گونجنے لگیں، جنہیں وہم و توہمات سمجھ کر وہ فہم دی تھی۔

”نمرا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں..... جلدی اخو، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“ وہ اس کے بالوں کو ماتھے سے ہٹاتے ہوئے بولی۔ ”پہلے کپڑوں میں سرسوں کا پھول لگ رہی ہو۔ تمہیں اچانک ہوا کیا ہے؟ ابھی تو میری تم سے بات ہوئی تھی۔ مگر اس وقت بھی تمہاری طرف سے کوئی رسپانس نہیں تھا۔ خاموشی تھی اور پھر تم نے فون بند کر دیا۔ کیا اس وقت بھی تمہاری یہی حالت تھی؟ ایک بار ایک دو لفظوں سے اپنا حال تو بتا تم میں تیار ہوئے بغیر پہنچ جاتی۔“ وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی مگر نمرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھٹی، پھٹی نگاہوں سے چھت کو گھورتی رہی۔ حمیرا نے کبل ٹھیک کیا اور اس کا سر آہستہ، آہستہ دبانے لگی۔ کافی دیر بعد حمیرا نے اپنے موبائل پر ٹائم دیکھا۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ شاید فلائٹ لیٹ ہو۔ ”وہ بڑبڑائی۔“ آنٹی بیچاری بازار میں خوار ہو گئی ہوں گی۔ انگل کا انتظار کرتے، کرتے۔“ اس نے ہمدردی و خلوص سے سوچا اور عالیہ کو فون کر دیا۔

”میں تمہیں فون کرنے ہی والی تھی۔ دراصل فلائٹ تین گھنٹے لیٹ ہے۔ اس لیے میں تو اس وقت ٹیکسی میں بیٹھ رہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں پہنچتی ہوں۔ تم میرے آنے تک نمرا کے پاس ہی رہنا۔ اسے اکیلا نہیں چھوڑنا بلکہ آج نمرا کے پاس ہی رہ جاؤ۔ وہ بھی خوش ہو جائے گی۔ بائیل کا دوڑا چھوڑنے پر بہت ادا اس ہے۔“ وہ تاکیداً بولی تو حمیرا نے اسے دل کھول کر تسلی دی۔ نمرا کی خراب طبیعت کا ذکر کرنا مناسب نہیں لگا۔ کیونکہ وہ ادا اس ہے۔ بیمار نہیں..... اسے یقین ہو چلا تھا تقریباً آدھے گھنٹے بعد عالیہ گھر پہنچ گئی۔ نمرا ابھی تک آنکھیں بند کیے ساکت و جامد لیٹی ہوئی تھی۔ عالیہ دیکھ کر تڑپ گئی۔ جلدی سے گرم دودھ میں شہد ملا کر لے آئی۔ اسے سہارا دے کر بٹھایا اور زبردستی اسے دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی لیکن نمرا کی طرف سے بے حد خاموشی تھی۔ عالیہ ہلک اٹھی۔

”بیٹا اپنے گھر خوشی خوشی جاؤ، جانتی ہوں والدین کا در چھوڑنا آسان ہرگز نہیں..... لیکن یہ دکھ تو سہنا ہی پڑتا ہے۔ دیکھا... حمیرا اتیری دوست کو حاسدوں کی نظر لگ گئی۔ میں نہ کہتی تھی کہ مایوں کے لباس میں دہن پر جن بھوت عاشق ہو جاتے ہیں، میں کل ہی حضرت جی کو گھر بلانوں گی۔ کسی نے جاو کر دیا ہوگا۔ کیونکہ بغض و عناد میں شریک مر رہا ہے۔ بس رات خیریت سے گزر جائے۔“ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اوٹ پٹا لگ بولے جارہی تھی۔ اور



حمیرا اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہی تھی کہ اس نے آنے میں دیر کیوں کر دی؟ آنٹی کی بات تو سچ ہو گئی کہ اسکیلے پن میں اس کی طبیعت ہی خراب ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کسی جن یا چڑیل نے قبضے میں لے لیا ہو۔

☆☆☆

”گاڑی اتنی تیز رفتار تھی کہ ایک سیڈنٹ ہونا لازم تھا۔“ پولیس مین نے سائرہ کو افسردہ سے بتایا۔ ”تنگم صلابہ آج کل کے لڑکوں پر، جوانی بھی عجیب ہی طریقے سے آئی ہے۔ نہ بڑوں کا لحاظ نہ چھوٹوں کی تمیز۔۔۔۔۔ اس لیے جوان لڑکوں میں ایک سیڈنٹ کی تعداد خاصی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے اشارے پر رکنا اپنی توہین سمجھتے ہیں، گالی دے کر گزر جانا ان کا شیوہ ہے اور آج کی لڑکیاں تو ان سے چار ہاتھ آگے ہیں۔ بس جی ایم نے بھی اسی سڑک پر کیسے، کیسے مزاج کے لوگ دیکھے ہیں۔ قومیت، انسانیت اور شرافت نام کی چیز نہیں رہی کسی میں۔ نفسا نفسی کا عالم ہے، بالکل ایسے ہی جیسے ہر کوئی چاہتا ہے کہ میں آگے جانے والی گاڑی سے آگے نکل جاؤں اور ٹھٹھا ہی چلا جاؤں۔ تمام گاڑیاں میرے پیچھے ہوں، یہی حال ہے اس وقت ہمارے معاشرے کا۔۔۔۔۔ کرسی پر بیٹھے والوں کا۔۔۔۔۔“

سائرہ نے دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا اور خدا حافظ کہہ کر اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ عادل کی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو سڑک کے درمیان سے ہٹا دیا گیا۔ گاڑی کی موجودہ حالت دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ اس گاڑی میں سوار ایک فرد بھی زندہ نہیں بچا ہوگا۔ سائرہ نے ہاتھ جوڑ کر اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگی اور اس کا شکر ادا کرتی ہوئی اسپتال کی طرف چل دی۔ تمام راستے اس کے آنسو بہتے چلے گئے۔ عادل کی پیدائش سے قبل۔۔۔۔۔ اور بعد کے دن فلم کی طرح ذہن کے پروجیکٹر پر تیزی سے سامنے آنے لگے۔

”آف میرے بچے کا بچپن، لڑکپن اور جوانی حسرتوں کی آماجگاہ بنی رہی۔۔۔۔۔ میری ایک یادیدہ، انجانی معمولی سی غلطی کی سزا میرے اس تختہ جگر کو بھگتنی پڑے گی۔ کاش مجھے اس کا علم ہو جاتا۔ میرے رب میرے بچے کو عمر و راز بخش۔ اور اسے بہترین صحت عطا فرما۔ اس کے ذہن و قلب کو اپنے نور سے روشن کر دے۔ اس کی حرکات و سکنات کو اپنی پسند کے مطابق ڈھال لے اور اسے سکون دے دے۔ اس کے غمخواروں اور سہارا مزاں کا رخ تسکین وطمینانیت کی طرف موڑ دے۔ آج تو نے اس کی زندگی بچا کر مجھ پر احسان عظیم کر دیا ہے۔ میرے مولا میں تیرا شکر ادا کرنے والی زبان سے ہی محروم ہوں، مجھے وہ زبان عطا کر دے۔ جو سوائے شکرانے کے اور کسی لفظ سے آتش نہ ہو اور میرے گناہوں کی سزا میری اولاد سے ہٹا دے۔ میرے مالک تو، تو دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔“ وہ اسی عالم میں دعائیں کرتی اسپتال کی پارکنگ میں پہنچ گئی اور بو جھل قدمیوں سے چلتی ہوئی آئی سی یو کے باہر نرس سے عادل کی رپورٹ معلوم کرنے لگی۔

☆☆☆

رحمان نے وی آئی پی لاونج کے ریسپشن پر اپنا انٹری کارڈ دکھایا۔ امر پورٹ سکیورٹی سسٹم کی تمام فارمیٹیو پوری کرنے کے بعد وہ لاونج میں آگئے۔ صوفے پر بیٹھے وہ سامنے گئے ہوئے پلازما کی اسکرین پر ٹاک شو دیکھتے ہوئے مہمانوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ پیرے نے چائے کی پیش کش کی تو انہوں نے مسٹر دکر دی اور نظریں پھر ٹی وی پر جم گئیں۔ انہیں وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب مختار راجا کی آواز سامعین میں گونجی تو وہ اچنبھے سے کھڑے ہو گئے۔ مختار سے ملنے کے بعد راحت بھابی سے علیک سلیک ہوئی اور ان کا اور بچوں کا حال دریافت کیا تو مختار نے آگے بڑھ کر اپنا بیٹا، لگاؤ اور محبت سے بھرپور سلجھ میں کہا۔

”رحمان میرا بیٹا بھی میرے ہمراہ ہے، ان سے ملے ان کا نام بھی بہت ہی خوب صورت ہے ان کی شخصیت و

کردار کی طرح، ”رحمان نے ان کے قریب کھڑے ہو جان کی طرف دیکھا۔

”آئی کانسٹیبل لیواٹ۔۔۔۔۔“ ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔۔۔۔۔ سعود ایک مہذب پاکستانی شہری لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ لبوں پر ندامت بھری مسکراہٹ اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ رحمان سمجھنے کے عالم میں خواص باختہ سے ہو کر اسے دیکھنے جا رہے تھے۔ آخر تھوڑے وقفے کے بعد سعود کے لب پر مشکل پھڑپھڑائے۔

”ابو جی آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔ میں نے آپ کو خوشیاں دینے کے بجائے بے حساب دکھ دیے۔“ آواز پر وہ ایک دم سے چوٹے اور گردن کو جنبش دی۔ کافی دیر وہ خود کو ٹارٹل کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ ”رستہ کھوجانے والے بھولے بسرے جب راہ مستقیم پر آتے ہیں تو باری تعالیٰ انہیں معاف فرما دیتے ہیں۔ ہم تو پھر اس کے بندے ہیں۔“ یہ مشکل بولتے ہوئے وہ صوفی پر آکر بیٹھ گئے۔ سب ان کے سامنے ہی براجمان ہو گئے۔۔۔۔۔ وہ دھیمے سہجے میں گویا ہوئے۔ ”اور میں تو بہت ماجرا اور حقیر انسان ہوں۔ میری مجال نہیں بیٹا کہ تمہیں معاف نہ کروں۔۔۔۔۔ بلکہ میں اسی مراجعت پر تمہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں لیکن تمہیں یہ بتا دوں کہ میری بخش رک گئی تھی، دل کی دھڑکن جواب دے گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی شان کا یہ روپ دیکھ کر۔“ وہ اسے گلے لگا کر خوشی سے اٹھکھارہوتے ہوئے بولے تو راحت بھالی اور مختار کی آنکھیں بھرتائیں۔

”رحمان تم جو بھی دیکھ رہے ہو اس میں ہمارا کمال نہیں۔۔۔۔۔ اوپر والے کو اس معصوم اور بھولے بھالے بچے پر رحم آگیا اور اس نے مجھے بھی ایک صبح ایسے ہی شاکہ کر دیا تھا جیسے آج تم ہوئے ہو۔ یہ اس کی اپنی چوائس تھی، میرا پریشہر گز نہیں تھا۔“

”مختار تم نے میری نسل کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا۔ میرے نام کو ابدی بنا ڈالا۔ اللہ تعالیٰ یہ نیک کام تمہارے ہاتھوں کروانا چاہتا تھا۔ ورنہ انسان کی مجال کہاں کہ پتھر کو موم بنا ڈالے۔ مان گیا ہوں ماشاء اللہ مختار تم تو بہت عقلمند نکلے۔ بیوش کی طرح مجھے آج بھی پچھاڑ کر خوش ہو رہے ہو۔۔۔۔۔ راحت بھالی آپ ہی اسے بیٹا کہنے کی سزاوار ہیں۔ محض پیدا کرنے والے ہی والدین کے رعبے کو حاصل نہیں کرتے۔ اس مرتبے پر آپ جیسے والدین بھی فائز ہو جاتے ہیں۔ جب وہ کسی کی بھڑی ہوئی اولاد کو راہ راست پر لا کر ان کی زندگی کے مقصد کو بدل ڈالتے ہیں تو ان کا مقام فرشتوں اور پیغمبروں کے برابر ہو جاتا ہے۔“ وہ عقیدت مندانہ انداز میں بولے جا رہے تھے اور سعود ابھی تک باپ کے گھٹنوں پر سر رکھے معصوم بچے کی طرح بیٹھا ہوا تھا اور مختار اور راحت یہ منظر جو اک یادگار بن گیا تھا دیکھ کر محفوظ ہو رہے تھے۔

سامان کی کلیرنس ہونے کے بعد سب گاڑی میں آکر بیٹھ گئے تو مختار نے خوشی سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے بیٹے کی مزید پروگریس رپورٹ دینا چاہتا ہوں۔ میرے بیٹے نے یونیورسٹی دوبارہ جوائن کر لی ہے، اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔۔۔۔۔ فیس کا انتظام اس نے بذات خود کیا ہے، پڑھائی جاری رکھنے کا فیصلہ بھی اسی کا ہے۔ اس نے اپنے لیے ہر فیصلہ خود کیا۔۔۔۔۔ جاب سے لے کر یونیورسٹی تک کا سفر اس نے اکیلے طے کیا ہے۔ کسی کا ساتھ تھا نہ ہی رہنمائی تھی۔ اپنا رہنما اور مسیحا اس کی اپنی ذات ہی تھی۔۔۔۔۔ اور فقط اپنے مالک کی مددگاری شامل حال تھی کیونکہ نیت نیک اس نے باندھی تو رہنمائی مالک نے کر دی۔ اس لیے رحمان تم اس کے اس حیلے کو عارضی مت سمجھنا۔ وہاں کے اسلامک سینٹر کا ہر دلعزیز ممبر ہے میرا سعود۔“ سعود دلنشیں مسکراہٹ سے باپ کو دیکھنے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہوں آپ کو ایسے ہی بیٹے کی چاہ تھی جس کے پیدا ہونے کی آپ نے خواہش کی تھی۔

”یہ معجزہ اس ذات کی طرف سے مجھ تا چیز پر کیسے نازل ہو گیا؟“ رحمان نے اسٹیرنگ تھماتے ہوئے حیرت و اشتیاق سے کہا۔ ”مختار مجھے اپنی قسمت پر یقین کیوں نہیں آ رہا۔ میری آنکھیں اور میرے کان بھی حیرت زدہ ہیں۔“

”آج تمہیں اللہ تعالیٰ نے چھپر پھاڑ کر بے حساب رزق سے نوازا ہے کیونکہ تم نے کروڑوں کے حرام سے اپنے لیے رزق حلال چھان لیا۔۔۔۔۔ بھابی کے صبر و تحمل کے شیر نے اسے پروان چڑھایا۔ آپ دونوں کی یہ قربانیاں میرا مولانا نکال کیسے کرے۔۔۔۔۔ وہ تو رزق حلال پر اکتفا کرنے والوں کا ساتھی ہے اور صبر کرنے والوں کو بہترین اجر سے نوازنے کا اس نے وعدہ کر رکھا ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ!“ مختار نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا تو رحمان کے اندر کی سختی اور انتشار میں تخفیف ہوئی تو وہ توقف کے بعد بولے۔

”سعود۔۔۔۔۔! بیٹا مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ درست ہرگز نہیں تھا اس وقت میرا ایمان کمزور اور اعتقاد بہت دھیمہ پڑ گیا تھا جو خود کو یہی سب کچھ سمجھ بیٹھا اور تمہیں چنا تھا سدھارنے۔۔۔۔۔“ لہجے میں کچھ ستاؤ اور شرمندگی تھی۔

”ابو آپ بے قصور تھے، میں نے کبھی آپ کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور باپ بھی ہوتا تو وہ ایسے ضیٹ بیٹے کو زہر دے کر مار ڈالتا۔ آپ سے ایسا کوئی جرم اور گناہ سرزد نہیں ہوا۔۔۔۔۔ میں ہی قسمت کا مارا اور پاک ذات کا دھتکار ہوا انسان تھا کہ اپنی جنت کو چھوڑ کر جہنم کا انتخاب کر لیا۔ اگر حق رانگل نہ ہوتے تو ابو میں عمر بھر جیل سے باہر نہ نکل پاتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کسی غیر مذہب سے دوستی مت کرو، وہ آہستہ آہستہ تمہیں اتنا کمزور اور لاغر کر دے گا جیسے لکڑی کو کھن اندر ہی اندر چاٹ کر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ابو جی میں نے اس گناہ کی سزا بھگت لی ہے، آپ نے ہمیں زندگی کے نشیب و فراز میں سہارا اٹھا کر جینے کی تربیت دی تھی، خود داری اور غیرت کا درس دیا تھا، حسین سلوک، اخلاقیات اور وضع داری کی مثال قائم کر کے ہمیں راہ راست پر چلانے کی بے پناہ کوشش کی تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ کی اس شاندار تربیت کی صوفیانی ہماری شخصیت سے مفتو ہو جاتی۔ ابو اسی نور اور اسی روشنی کی چھاپ میرے گناہوں پر ثبت ہو کر مجھے پُر نور کر گئی۔ آپ کی محنت رانگیاں نہیں گئی۔ اللہ تعالیٰ مجھے ثابت قدم رکھے۔“ یہی میری دعا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں مانگتا۔ جسے اپنے رب اور نبی پاک کا قرب حاصل ہو گیا اس کی تو جھولی فضل و کرم اور رحمتوں سے بھر گئی ناں۔۔۔۔۔“ سعود اپنی ہی لے میں بولے جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہی نہیں ہوا کہ وہ اپنے ابو کو غیر محسوس طریقے سے لکچر دیے جا رہا ہے۔ اس کی زبان سے ادا کردہ ہر لفظ میں سچائی تھی۔ کہیں بھی جھوٹ اور مکاری نہیں تھی۔ خوشامد نہیں تھی۔ رحمان کی آنکھوں سے جو آنسوؤں کی جھڑی گئی تو رکنے کا کام نہیں لے رہی تھی۔ یہ وہ خوشی تھی جس میں دو جہانوں کی کامیابی ہی کامیابی تھی۔ آج رزق حلال کا مطلب کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ فخر کے بجائے رحمان میں عاجزی و انکساری نے ڈیرے جما لیے تھے۔ حالانکہ رحمان کے چہرے پر بھی داڑھی اور شلو اور ٹخنوں سے اونچی اور سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح نہیں تھی مگر اعتقاد و ایمان رگ و ریشہ میں بسیرا کرتا تھا۔ ظاہر نہ روپ سے بڑھ کر انہیں اسلامی عقیدوں و اصولوں پر چل کر خود کو بہترین مسلمان کہلانا تھا۔ وہ اسی راستے پر گامزن تھے اور مختار بھی ایسی ہی فطرت کا تھا۔ فقط قواعد و ضوابط پر اکتفا کرنے والا وہ بھی نہ تھا۔ اپنے اخلاقیات و دینی سلوک دروئیے کا ہمیشہ سے قائل تھا اور یہی ان کی اصل قوت تھی جو سعود کو اپنے دین خالص کی طرف واپس لے آئی تھی۔

جاری ہے





## پرنذہ

نسر ج طہار

”سوئے کا نوالہ کھلا کر شیر کی نظر سے دیکھنے والی  
 بات سمجھ میں آتی ہے مگر یہ روکھی سوکھی کھلانے کے بعد  
 شیر سے بھی زیادہ غضب ناک نظر سے دیکھنا بھلا کہاں کا  
 انصاف ہے؟“ وہ جو بڑے انتہاک سے قمیص پر سوئی  
 سے کڑھائی کر رہی تھی اس کی بات سن کر وہیں ہاتھ  
 روک کر نا سمجھی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔  
 ”اب یہ تمہارے دماغ میں کون سے کیزے نے  
 حرکت کی ہے جو کورٹ پکچری کرنے بیٹھ گئی ہو؟“

”تمہیں تو جیسے کچھ پتا ہی نہیں بہت معصوم ہو تم!“ خاصا جل کر جواب دیا میرا تھا۔

”کچھ پتا دو گی تو مجھے بھی پتا لگ جائے گا اور تمہاری بھڑاس بھی نکل جائے گی۔“ اب کی بار اس نے سوئی اور فریم ایک طرف رکھ کر پوری توجہ اس کی جانب مبذول کی تھی۔

”ابا نے کالج میں داخلہ لینے سے منع کر دیا ہے۔۔۔۔۔ کہہ رہے ہیں بس میٹرک کر لیا یہ کافی ہے۔ اب گھر بیٹھ کر گھر داری سیکھو۔“ برا سا منہ بتائے اس نے ساری تفصیل اس کے گوش گزار کی تھی جسے سن کر اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے دوبارہ سے فریم اٹھا کر سوئی ہاتھ میں پکڑ لی اور بولی۔

”تو کیوں پڑھنا چاہتی ہو اتنا زیادہ۔۔۔۔۔؟“

”میرا شوق ہے بہت سارا پڑھنا۔“ اپنے شوق کا اظہار کرتے وقت اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے۔

”شوق رول دیتے ہیں رعنا، مت اسنے اونچے شوق پالاکر۔“ اس سے خود اس کی اپنی آواز میں وہی حسرتیں سن سکتی محسوس ہوئی تھیں۔

”یہ تمہاری سوچ ہے ورنہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔“ اس کی بات کو رد کرتی وہ فوراً بولی۔

”تم شوق پال کے دیکھو، تمہیں حسین خوابوں کو پانے کی لگن محسوس ہوگی تو زندگی بھی حسین محسوس ہونے لگے گی۔“ زرین نے بس ایک نظر اس کے جوشیلے انداز کو دیکھا پھر سر جھٹکتی بولی۔

”میں ہمیشہ اپنی چادر دیکھ کر شوق پالتی ہوں۔ اگر تمہاری طرح اونچے شوق پالنے لگ گئی تو چادر سے نکلتے پاؤں میری شخصیت کو بد صورت بنا دیں گے۔“ اس نے اپنی سر اٹھاتی حسرتوں کو بڑی آسانی سے جھڑکا تھا۔ ”تمہارے لیے بھی یہی اچھا ہوگا جیسا ابا چاہتے ہیں ویسا کرو۔“

”وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس چادر یواری میں

بھی سانس نہ لیں۔“ اس کا انداز ایک دم تیزی لیے ہوئے تھا۔

”ہاں تو پھر مت لو سانس۔“ اس نے تو جیسے حد ہی کر دی۔

”زرین۔۔۔۔۔؟“ حیرت و دکھ کے سطرے جھٹکنا اثرات لیے اس نے کہا۔ ”تم میری سگی بہن ہو کر ایسی بات کیسے کر سکتی ہو جبکہ تم خود سب جانتی ہو۔“ پھٹی آنکھوں کے ساتھ وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ”سگی بہن ہوں تمہاری جیسی تمہیں سمجھاتی ہوں۔ تم خود کیوں نہیں سمجھ جاتیں۔۔۔۔۔ ہم مولوی عظیم اللہ کی بیٹیاں ہیں جنہیں خدا نے دو بیٹیاں دے کر گویا زندگی بھر کی آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔“ اس نے بڑی تلخ حقیقت بیان کی تھی۔

”انہوں نے خود ہمیں اپنے لیے آزمائش بتالیا ہے ورنہ خدا کبھی بیٹیوں کو آزمائش بنا کر پیدا نہیں کرتا۔“ وہ اس تلخ حقیقت کی نفی کم کر رہی تھی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ۔۔۔۔۔ اس بار زرین نے اختلاف نہیں کیا اسے چپ دیکھ کر وہ مزید کہنے لگی۔

”جنگ آگئی ہوں میں اس ٹھنڈے زدہ ماحول سے۔ ابا کی بے جا سختیوں اور فضول کی روک ٹوک سے۔ دیکھنا جس دن میری برداشت ختم ہو گئی چھوڑ کر بھاگ جاؤں گی اس ماحول کو بھی اور ابا کو بھی۔“ تنفر سے کہتی وہ اسے دہلائی تھی۔

”ایسی باتیں مت کیا کرو رعنا مجھے ڈر لگتا ہے۔“ ”اوسہ!“ اس کے خوف کو کسی کنتی میں نہ لیتے ہوئے وہ سر جھٹکتی اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ زرین کنتی ہی دیر اس کے نقش پا کو دیکھتی ہوئی رہی۔ خود کو اس کے وقتی غصے کا دلاسا دیتی دوبارہ سے اسی فیصہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جو اسے آج رات مکمل کر کے دیٹی تھی۔

﷞ ﷞ ﷞ ﷞ ﷞ ﷞

مولوی عظیم اللہ حد سے زیادہ وقیانوی انسان

اس کی سبھی عادتوں سے خوب واقف تھی اس لیے اس بار اس نے اسے ٹوکا نہیں تھا وہ خود چاہتی تھی وہ اس کے سامنے اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لے تاکہ اس کا غصہ ختم ہو جائے مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بتی اماں کی پاٹ دار آواز محسن سے بلند ہوگی۔

”ارے رعنا، کہاں ہو تم..... ذرا یہ کپڑے تو چھت پر پھیلا آؤ۔“ رعنا کو فوراً ہی اعتراض کا ایک اور موقع ہاتھ لگ گیا تھا۔

”یہ دیکھو، اب یہ ہر چھوٹے کام کے لیے بھی چوبیس گھنٹے رعنا، رعنا ہوا کرے گی۔ رعنا کی شکل میں جیسے کل وقتی ملازمہ ان کے ہاتھ لگ جائے گی اب۔“

”اپنے گھر کا کام کرنے سے کوئی ملازم نہیں بن جایا کرتے رعنا۔“ زرین ذرا سا مسکرائی تھی۔

”ہاں، پتا ہے مجھے اپنے گھر کے نام پر تم سارا دن کون سے کام کر رہی ہوئی ہو۔“ اس پر بھی نظر ڈال کر اس نے باہر کی جانب قدم بڑھائے مگر چوکھٹ پر رک کر دوبارہ اس کی طرف پلٹی بولی۔ ”مگر یاد رکھو تم..... میں چند روپوں کے عوض وہ سب نہیں کروں گی جن سب میں تم اور اماں سارا دن رات لگی رہتی ہو۔“ اس کا صاف اشارہ کڑھائی اور سلاخی کے ان کپڑوں کی طرف تھا جو اماں اور زرین اجرت پر لوگوں کو تیار کر کے دیا کرتی تھیں۔ رعنا بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکلی اور عیب اٹھا کر میزھیاں پھلانگی چھت پر چلی آئی۔

تار پر کپڑے پھیلاتے ہوئے یونہی اس کی نظر سامنے اٹھی تو وہ دنگ رہ گئی۔ سامنے کا مکان جو عرصے سے خالی پڑا تھا کی ایک کھڑکی پر ایک لڑکا بڑی فرصت سے کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا جو نیچے اس کی نظر پڑی تو وہ دلکشی سے مسکرا دیا۔

”ہائے اللہ.....“ وہ ایک دم دیوار کی اوٹ میں ہوئی تھی۔ ”بدتمیز کیسے دانت نکال رہا ہے۔ ابھی جو اگر ابا دیکھ لیتے تو یہی چھت میرے لیے شہر خوشاں

تھے۔ مولوی صاحب لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے لکھانے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کے مطابق لڑکیاں زیادہ پڑھ لکھ جائیں تو ماں باپ کو آنکھیں دکھانے لگ جاتی ہیں یہی وجہ تھی انہوں نے زرین کو آنکھوں کے بعد گھر بٹھا لیا تھا پھر جب رعنا نے آنکھیں جماعت پاس کی تو اسے بھی گھر بٹھانا چاہا مگر اسے ضد اور بھوک ہڑتال جیسی مشقتوں کے بعد بالآخر نویں جماعت میں داخلہ لینے کی اجازت مل گئی۔

یہی وجہ تھی اس نے زرین سے دو جماعتیں زیادہ پڑھ لی تھیں۔ مولوی صاحب ان پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ان کی ان بے جا سختیوں اور روک ٹوک نے ان دونوں کا اعتماد بری طرح مجروح کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں ہی اپنے ماحول سے سخت الگ تھیں مگر چونکہ زرین نہایت کم گو اور صابر واقع ہوئی تھی اس لیے وہ اس ماحول سے بھی سمجھوتا کر لینے کو تیار تھی مگر رعنا..... وہ زرین کے بالکل برعکس تھی۔ حد سے زیادہ صاف گو اور اپنے ماحول سے ناپسندیدگی کا کھلم کھلا اظہار کر دینے والی۔ وہ ہر اس بات پر اڑ جاتی تھی جو اس کے مزاج کے خلاف ہوتی مگر اس بار اس کی تمام ضد اور بھوک ہڑتال سب بیکار گئی۔ مولوی صاحب نے کان لٹ جانے کی اس کی شدید خواہش کو سختی سے رد کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب انتہائی خراب موڈ کے ساتھ منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔

”سمجھ میں نہیں آتا جب ابا کو بیٹیوں کی چاہ ہی نہیں تھی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹیاں دی ہی کیوں؟“ وہ غصے میں کچھ بھی بولے جا رہی تھی۔

”پاگل ہوئی ہو کیا۔“ کچھ بھی اول نول کہے جا رہی ہو۔“ زرین نے اسے ٹوک دیا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں میں۔ بیٹیاں نہ ہوئیں ہم موم کی گڑیاں ہو گئیں جنہیں زمانے کی ہوا نہ لگے جن پر کسی کی نظر نہ پڑے۔“ وہ جب بھی غصیلے موڈ میں ہوتی بھرپور دل کی بھڑاس نکالتی۔ زرین



اُدھر دیکھے نیچے چلی آئی۔ سلیم خود کو نظر انداز کر کے نیچے جانی رعنا کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

رعنا اپنی پشت پر اس کی نظروں کو خوب محسوس کر رہی تھی مگر وہ اسے اپنی اس بے رخی کی وجہ نہیں بتا سکتی تھی پھر وہ اسے بتاتی بھی تو کیسے کہ آج ابا صبح سے گھر پر ہیں اور کسی بھی وقت اسے پکار سکتے ہیں ایسے میں اسے فوراً نہ پکارا نہوں نے طوفان کھڑا کر دیا تھا۔

خط کو مٹھی میں دبائے وہ نیچے آ کر دبے پاؤں اپنے اور زرین کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔ زرین کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے بے تابگی سے خط کو کھولا۔ ابھی اس کی نظریں چند سطروں کو ہی پڑھ سکی تھیں کہ زرین کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس نے ایک بار پھر تیزی سے خط کو توڑ مروڑ کر مٹھی میں قید کر لیا اور خود کو مصروفِ ظاہر کرنے کی خاطر پاس پڑا ابا سے چھپا کر لیا گیا پر اتنا سالا اٹھا کر پڑھنے لگی۔

”کیا پڑھا جا رہا ہے؟“ زرین اس کے برابر آن بیٹھی۔

”کیوں، تمہیں نظر نہیں آ رہا کیا؟“ اپنی چوری کو چھپانے کی خاطر اس نے بڑا ٹیکھا سا جواب دیا۔ زرین نے ایک دم بہت غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا میرے سینک نکل آئے ہیں؟“ اسے مسلسل اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ جھنجھلائے لگی تھی۔

”دیکھ رہی ہوں کہ آج کتنے دنوں بعد تم اپنے پرانے میں موڈ میں نظر آئی ہو ورنہ تم جس طرح چپ ہو کر رہ گئی تھیں میں سمجھی کہ تم نے اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے پھر تم نے کالج جانے پر بھی اس طرح ضد نہیں کی جس طرح نویں جماعت میں داغ دہا لیتے وقت کی تھی.....“

”اپنے ان حالات سے سمجھوتا تم کر سکتی ہو میں نہیں۔“ اس نے بڑی نخوت سے سر جھجکا۔

بن جاتی۔“ دھڑکتے دل کے ساتھ بڑبڑاتی ہوئی وہ سبز حیاں اتر آئی تھی مگر پھر اس کا کچا باغی ذہن اسی ایک بل میں انکار رہ گیا تھا وہ کتنی ہی دیر اکیلی بیٹھی چپکے، چپکے اس لڑکے کو سوچتی رہی تھی۔ شام کو اماں کے کہنے سے پہلے ہی وہ چھت پر سے کپڑے اتارنے چلی آئی۔

اس بار اس کی نظر نے جان بوجھ کر سامنے کے گھر تک کا سفر کیا تھا۔ وہ حیران رہ گئی وہ لڑکا اب بھی اسی جگہ کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں، اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر لڑکے نے ہاتھ بلا کر جیسے اسے ہوش کی دنیا میں لانے کی کوشش کی وہ ہڑبڑا کر جیسے ہوش میں آئی اور تیزی سے تار سے کپڑے اتار کر دوبارہ نیچے چلی آئی۔ پھر اگلے دن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خود کو اس چور راستے پر قدم رکھنے سے روک نہیں سکی تھی اور پھر ابا کا رعب و جلال بھی اس کے ان بڑھتے قدموں کو روک نہ سکا تھا۔

سلیم کے ابو ایک فرم میں ملازم تھے۔ ماں کا انتقال اس کی پیدائش کے وقت ہی ہو گیا تھا۔ سلیم نے بی اے کیا ہوا تھا اور آج کل ملازمت کے لیے جدوجہد کر رہا تھا، بات اشارے کنایوں سے خطوط تک آپہنچی تھی۔ وہ رعنا کو اور رعنا اسے دل و جان سے پسند کرنے لگے تھے اور اب دونوں شادی کر لینا چاہتے تھے مگر جب سلیم کے والد اس کا رشتہ لے کر مولوی صاحب کے پاس حاضر ہوئے تو مولوی صاحب نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ سلیم تک ان کا انکار پہنچ چکا تھا اور اب وہ اس انکار کی خبر رعنا تک پہنچانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

رعنا اپنے مخصوص وقت پر دبے پاؤں چھت پر آئی تو پھر میں لپٹا سلیم کا خط اس کے قدموں میں آن گرا۔ جسے اس نے فوراً جھک کر اٹھایا اور بنا اُدھر

کر سکتی ہے۔ ان کو اپنی تربیت پر بے حد ناز تھا مگر وہ شاید نہیں جانتے تھے کہ ماں باپ کا اعتماد بچوں کو غلط راہوں پر جانے سے باز رکھتا ہے اور والدین کی بے جا سختی وار بے اعتمادی اولاد کو بدگمان کر دیتی ہے۔ زخم اتنا گہرا تھا کہ ہر دم ہی رستا رہتا تھا۔ مولوی صاحب کا بوڑھا ناتواں وجود اتنے گہرے زخم کی تاب نہ لاسکا اور وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ ایک طرف اماں کو بدنامی کا داغ لگا تھا تو دوسری طرف ان کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ ان کو تو جیسے چپ سی لگ گئی ایسے میں سارا ستم ٹوٹا بچاری نازک سی زرین پر اماں سے کہیں زیادہ سختی اور روک ٹوک اماں نے اس پر کی تو وہ نازک سی لڑکی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔

نہ جانے وہ کب تک اماں کے اس عتاب و نفرت کا نشانہ بنی رہتی کہ ایک دن رشتے کروانے والی خالہ زرین کا رشتہ لے کر اماں کے پاس آئیں۔ "صادق! قسم سے لڑکا بہت شریف ہے اور اونچے عہدے پر بھی فائز ہے اور ماں تو بہت ہی سیدھی سادی خاتون ہے، اللہ کا دیا سبھی تو ہے ان لوگوں کے پاس پھر بھی غرور نام کو نہیں ہے۔" خالہ نے سارا پس منظر ایک سانس میں بتا ڈالا تھا۔

"مگر خالہ ہمارا تو اپنا گزر بسر مشکل سے ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ ایسے میں زرین کی شادی کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔" اماں کو خرچے کی فکر نے آگھیرا تھا۔ "نہیں صادق! تم خرچے کی بالکل فکر مت کرو۔ ان لوگوں کو جینے نہیں چاہیے، وہ تو مجھے کہہ رہی تھی کہ میرے بیٹے کے لیے کوئی اچھی اور نیک لڑکی ڈھونڈ دو اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔" خالہ نے فوراً ہی ان کی فکر ختم کی اور سروتے سے چھالیا کترتے ہوئے مزید کہا۔ "نہ تو نند کا جھگڑا نہ دیور کا مٹنا، تمہاری بیٹی عیش کرے گی عیش۔" انہوں نے زرین کے مستقبل کی سنہری جھلک دکھائی تو اماں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس رشتے کے لیے

آج کل جن ہواؤں میں وہ اڑ رہی تھی اس نے اسے اپنے ماحول سے، سب سے، یہاں تک کہ خود سے بھی بیگانہ کر کے رکھ دیا تھا اور زرین سمجھ رہی تھی کہ اس نے سمجھوتا کر لیا ہے۔ کتنی ہی بار اس نے اپنے اور سلیم کے تعلق کے متعلق زرین کو بتانے کا ارادہ کیا تھا مگر زرین کی ہر بات اماں کو بتا دینے کی عادت کا سوچ کر ہر بار اس نے اپنا راز شیر کرنے کے خیال کو اپنے اندر ہی اتار لیا۔

دو پہر سے اب تک جانے کتنی ہی بار وہ سلیم کا خط پڑھ چکی تھی جس میں ابا کا ان کی شادی سے انکار بڑے صاف اور واضح لفظوں میں تحریر کیا گیا تھا۔ ہر بار اس انکار کو پڑھ کر اس کے دل میں پہلے سے کہیں زیادہ باغی خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ جانتی تھی ابا کبھی اس کی شادی سلیم سے نہیں کریں گے۔۔۔۔۔ اور ابا ہی جیسے کسی مولوی سے شادی کرنا وہ ہرگز بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ صرف سلیم سے شادی کی خواہش مند تھی۔۔۔۔۔ سارے دن کی سوچ بچار کے بعد اس نے وہ فیصلہ کیا جو عام حالات میں وہ صرف سوچ ہی سکتی تھی۔ رات کی تاریکی میں اس نے چپ چاپ اپنا گھر چھوڑا اور سلیم کے ساتھ فرار ہو گئی۔

☆☆☆

"مولوی علیم اللہ کی بیٹی بھاگ گئی۔۔۔۔۔" جس نے سنا حیران رہ گیا اور حیران تو خود مولوی صاحب بھی تھے انہیں بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کہ انہوں نے ایسا کون سا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا جس سے چور آپا چوری کر کے بھاگ بھی گیا اور کسی کو خبر بھی نہ ہونے پائی۔ رعنا کہاں گئی کچھ پتا نہ لگ سکا۔ سلیم اور اس کے والد اسی رات وہ گھر چھوڑ گئے۔ مولوی صاحب کی غیرت پر ایک تازیانہ لگا اور وہ بستر سے لگ گئے۔ انا کا بت چکنا چور ہو جائے تو اس کی کرچیوں سمٹنا تو درکنار ان کی طرف دیکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی بیٹی ایسا بھی

رضا مندی دے دی۔

”ٹھیک ہے خالہ مجھے کوئی اعتراض نہیں..... اماں کے اقرار کے کچھ دنوں بعد زینؑ شاہد کی زندگی میں داخل ہوئی۔

ہر غم کے ساتھ خوشی جڑی ہوتی ہے۔ جب غم کا موسم گزر جاتا ہے تو خوشی کا وجود جنم لیتا ہے۔ زینؑ کے غم کا دور گزرا تو خوشیوں نے اس کی زندگی میں قدم رکھ دیا۔

شادی کے بعد زینؑ کی ساس نے زینؑ کو پھولوں کی طرح رکھا اور شاہد بھی اس کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ ایک ساتھ اتنی خوشیوں کو پانے کے بعد زینؑ خدا کے حضور جھک جھک جاتی تھی۔ ابھی تک اس کا آنگن بچوں کی کھکاریوں سے نہیں گونجتا تھا مگر قدرت نے اسے زیادہ انتظار نہیں کروایا تھا اور اپنی نعمت جمل کی صورت اس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ وہ جمل کو پا کر پھولے نہیں سماتی تھی۔ اس نے دل میں عہد معہم کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو وہ سب کچھ دے گی جو اس کے والدین اس کو نہیں دے سکے تھے۔

زینؑ نے جمل کو ہر طرح کی آزادی دی کبھی زیادہ روک ٹوک نہ کی اور یوں جوانی کو پہنچے تک جمل نہایت نڈر اور بے باک ہوئی۔ زینؑ ہمیشہ اپنی بیٹی کو اتنے اعتماد سے بات کرتا دیکھ کر خوش ہوتی تھی مگر زینؑ کی ساس ہمیشہ زینؑ کو سمجھاتی کہ لڑکی ذات کو اتنی آزادی مت دو کہ وہ جان بوجھ کر غلط راہوں کو اپنالے مگر زینؑ ہمیشہ ان کی باتوں کو فہم کرتا ہی اور کہتی۔

”اماں میں جو کرتی ہوں مجھے کر لینے دیا کریں، میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کسی بھی طرح کی گھٹن کا شکار ہو.....“ اور اسی گھٹن کا شکار ہو کر کل کو رعنا کی طرح ماں باپ کا سر نہ جھکا دے۔ مجھے اپنی نزہت پر بہت بھروسہ ہے اماں۔ میری بیٹی غلط راہ پر نہیں جاسکتی۔“ وہ باقی کا جملہ دل ہی دل میں پورا کرتی۔

”وہ تو ٹھیک ہے بچے۔“ مگر ہیرے کو تراش کر

پھینک نہیں دیتے بلکہ اس کی نوک پک بھی ستواتے ہیں، اس کو ایک اچھے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اولاد کو اچھے برے کی تمیز سکھا کر اس کو اتنا کھلائیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ چادر کتنی بھی صاف ستھری کیوں نہ ہو اگر باہر اسے کھلا چھوڑ دی تو گرد پڑ ہی جائے گی۔ ویسے بھی اولاد پرندے کی طرح ہوتی ہے۔“

زینؑ نے رعنا کے واقعے کا اتنا اثر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ ان کی جمل کے متعلق کہی گئی سبھی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی مگر پرندے کی مثال اسے کبھی سمجھ نہ آتی تھی۔ جمل نے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کیا تو اس کے کہے بغیر ہی زینؑ نے اس کا داخلہ کالج میں کروا دیا۔ کالج آ کر وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُر اعتماد دکھائی دینے لگی تھی۔ شکل صورت سے تو ویسے بھی خدا نے اسے بڑی فیاضی سے نوازا تھا، اوپر سے اس کا نڈر اور بے باک انداز..... سب باتوں نے مل کر ایسے تک چڑھا اور قدرے مغرور بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی اس نے کالج میں صرف عدیلہ سے دوستی کی تھی خود عدیلہ بھی اس کی ہم مزاج تھی اس لیے دونوں کی دوستی ہر گزرتے دن کے ساتھ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اسے یک چوائس سے کچھ ضروری ٹوٹس لینے تھے اسی لیے جب چھٹی کے وقت عدیلہ کالج سے نکلنے لگی تو وہ بھی اس کے ساتھ باہر چلی آئی۔ عدیلہ کی گاڑی روڈ کے دوسری طرف کھڑی تھی اور خود اسے بھی روڈ کے دوسری طرف ہی جانا تھا۔ اسی لیے وہ اس کے ساتھ چلتی روڈ کر اس کر آئی تھی۔ عدیلہ کا بھائی گاڑی کے باہر کھڑا اس کا منتظر تھا۔

”بھائی آج آپ مجھے کیسے لینے آ گئے۔ آپ کو تو یہ کام بالکل پسند نہیں؟“ اس نے بھائی کو سامنے دیکھا تو حیرت سے سوال کیا۔

”ڈرائیور بھی کے ساتھ گیا ہوا تھا اس لیے مجھے



## ماں

ماں

تیرے جانے سے

میرا میکا

موتی، موتی ٹوٹ رہا ہے

سب میں الفت اب ہے کم، کم

آنکھیں اپنی ہیں بس نم، نم

پیار کی باتیں خواب ہوئی ہیں

وہ میل ملاقاتیں نایاب ہوئی ہیں

میں کی ہی گردان لگی ہے

سب کو اپنی، اپنی پڑی ہے

پیار کی ماں

ملک عدم سے لوٹ آؤ بارہ

اور پھر سب کو باندھ دے

اپنے پیار کی زنجیروں سے

کلام: شگفتہ شفیق، کراچی

بجائے بجل ناز سے مسکرا دی تھی کیونکہ اس طرح  
مسکراتا اس کا حق بنتا تھا۔

☆☆☆

نئی غی محبت کے ثمار میں ڈوبی ابھی وہ عادل  
کے پیار کی ناؤ میں بیٹھی محبت کی حسین دنیا کی پوری  
طرح سیر بھی نہ کر پائی تھی کہ اپنی ناؤ طوفان کی زد  
میں آ کر ہچکولے لیتی محسوس ہونے لگی۔

”بجل بیٹا..... مجھے تم سے ضروری بات کرنی

ہے۔“ شاید صاحب نے ٹھانے کی میز پر کھانا  
کھاتے ہوئے بجل کو مخاطب کر کے کہا۔

آنا بڑا۔“ اس کو جواب دیتے ہوئے اس کی نظریں  
مسلل بجل پر جمی تھیں۔ جسے محسوس کرنے کے باوجود  
نظر انداز کر لی وہ بک شاپ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن عدیلہ اس کے سامنے بیٹھی اس کے  
لیے اپنے بھائی کی بے تابی کا ذکر زور شور سے کر رہی  
تھی اور وہ اس طرح بے پروائی سے بیٹھی وہ سب سن  
رہی تھی جیسے اسے پہلے ہی اس سب کی خبر ہو اور اسے  
خبر کیسے نہیں ہوتی کیونکہ خدا جب حسن دیتا ہے تو  
نزاکت بھی ساتھ ہی عطا کرتا ہے۔ وہ بھی اپنے من  
کی دلکشی سے خوب واقف تھی۔ جانتی تھی کہ کوئی  
بھی اسے دیکھ کر اس طرح دیوانہ ہو سکتا ہے۔ اس  
نے عدیلہ کو خاص توجہ سے نہیں نوازا تھا مگر شاید عدیلہ  
کا بھائی واقعی سیریس تھا اور خود عدیلہ نے بھی بارہا  
مانی تھی۔ ایک دن دو دن پھر بہت سے ایسے دن  
گزر رہے تھے جن میں عدیلہ جان بوجھ کر اپنے بھائی  
کا ذکر کر کے اس کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی  
کوشش کرتے لگی۔ آخر وہ کب تک نظر انداز کر سکتی  
تھی۔ چاہے جانے کی خواہش تو ہر ایک کو ہوا کرتی  
ہے اور یہاں تو اسے وقت سے پہلے وہ سب کچھ مل  
رہا تھا جس کی اس نے ابھی خواہش بھی نہیں کی تھی۔  
عدیلہ کی مسلسل کوششوں نے اور خود اس کے بھائی  
کے کالج میٹ پر بجل کو ایک نظر دیکھ لینے کی خاطر  
گھنٹوں باہر کھڑے رہنے نے اس کے دل میں خود  
بخود ان کے لیے نرم گوشہ پیدا کیا تو وہ خود کو عادل کی  
محبت میں گرفتار ہونے سے نہیں روک سکی تھی۔ اس کی  
رضامندی کو پا کر عدیلہ نے سب سے پہلے بڑے  
مان کے ساتھ اس کے کان بھینچے تھے۔

”تم نے بڑے پاپڑ ملوائے ہیں بجل، ذرا  
بھائی بن کر میرے گھر آ جاؤ مگن، مگن کر بد لے لوں  
گی تم سے۔“

اس کے شکوے کے جواب میں کچھ کہنے کے

”جی پاپا.....“ بھل نے فوراً ہی سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”ابھی تم کھانا کھاؤ..... جب فارغ ہو جاؤ تو میرے کمرے میں آنا۔“ شاہد صاحب کھانا کھا چکے تھے اس لیے رو مال سے ہاتھ پونچھتے انھہ کھڑے ہوئے۔  
”او کے پاپا۔“ اس نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

”پاپا آپ نے بلایا تھا؟“ کچھ دیر بعد وہ باپ کے کمرے میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”ہاں۔“ بیٹھو بیٹا۔“ انہوں نے بہت پیار سے اسے اپنے برابر میں بٹھایا پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ ”میری بیٹی اتنی جلدی بڑی ہوئی مجھے پتا بھی نہیں چلا۔“ انہوں نے جیسے کچھ کہنے سے پہلے تمہید باندھی تھی وہ کچھ کبھی نہیں تھی اسی انداز میں ہنستے ہوئے باپ سے شرارت کرنے لگی۔

”سوچ میں پاپا..... دوسرے لفظوں میں آپ خود کو بوڑھا کہہ رہے ہیں۔“ اس کی شرارت پر وہ خود بھی مسکرا دیے تھے پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔  
”ہاں بیٹا، جب اولاد جوان ہو جائے تو ماں باپ بوڑھے تو ہو جاتے ہیں۔“

”پاپا..... کیا ہوا ہے؟“ اس بار اس نے ان کی سنجیدگی کو محسوس کیا تھا۔

”بات دراصل یہ ہے بیٹا کہ اب میں تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔“  
”مطلب.....؟“ اس نے حیرت و نا سمجھی کے ملے جلے تاثرات لیے ان کی طرف دیکھا تھا۔

”مطلب یہ بیٹا کہ اب میں تمہاری شادی کر دینا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں کو دور کیا تھا۔

”میری شادی..... وہ بھی اتنی جلدی؟“ وہ بری طرح گھبرا گئی۔ ”ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں پاپا.....“ ابھی وہ عادل سے بات کیے بغیر اس کا نام

سامنے لانا نہیں چاہتی تھی اس لیے فی الحال پڑھائی کو آڑ بیٹا مگر پاپا نے بھی فوراً ہی اس کی اٹھائی اس کمزور سی آڑ کو گرا دیا۔

”بھل بیٹا اچھے رشتے مقدر سے ملا کرتے ہیں۔ یہ تو ہم پر خدا کا کرم ہے کہ تمہارے لیے اتنا اچھا رشتہ آرام سے مل رہا ہے..... آفندی میرا بہت پرانا دوست ہے۔ اس کا بیٹا محبت آفندی ابھی امریکا سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لے کر آیا ہے۔ میں خود ملا ہوں محبت سے بہت سلجھا ہوا ذہین اور شریف لڑکا ہے۔ میں بہت متاثر ہوا ہوں اس سے۔ خود آفندی کئی بار اشارے کتابوں میں مجھ سے تمہارے لیے بات کر چکا ہے۔ جلد ہی وہ گھر بھی آئیں گے۔“ انہوں نے پوری تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں اس سے اس کی رضا جاننی چاہی تھی اور ساتھ ہی اپنی مرضی بھی بتادی تھی۔

”بھیس تو اس رشتے پر..... کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اب تم کہو کیا کہتی ہو؟“ اب وہ اس کی مرضی جاننے کے متنی تھے۔ اسے یہ رشتہ منظور ہی نہیں تھا اس لیے دو ٹوک انداز میں باپ کے سامنے انکار کر دیا۔  
”پاپا مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔“

”مگر کیوں؟“ انہوں نے حیرت بھری استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پاپا..... کیوں سے جھگڑے کی ابتدا ہوتی ہے۔“ وہ اپنے اسی انداز میں اعتماد سے بولی تھی۔ انہیں اس کا انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔

”مگر مجھے یہ رشتہ پسند ہے اس لیے تم بھی اس کے متعلق سوچ لو۔“ انہوں نے قدرے ناگواری سے حکمیہ انداز میں کہا تو وہ ایک جھٹکے سے ان کے پاس سے اٹھتی کمرے سے نکل گئی۔

اگلے دن کالج پہنچ کر اس نے عدیلہ کو اس رشتے کی خبر دی وہ کچھ پریشان سی ہو گئی پھر ذرا دیر کچھ سوچ کر اس نے بھل کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے

## اجھا لگتا ہے

گہرے بادل  
سڑک کنارہ  
ہلکی، ہلکی بوند باندی  
دھیرے، دھیرے چلنا  
بھیگتے جانا  
خشک پتوں کو ہوا کا  
چوم جانا  
ان کا اڑ جانا  
سنوا چھا لگتا ہے  
چودھویں کا چاند  
صبح کا ستارہ  
میز پر بکھری کتابوں  
کا ڈھیر  
چائے کا آدھا کپ  
منٹو کے افسانے  
عمیرہ احمد کے ناول  
گھڑی کی ٹک ٹک  
بال پوائنٹ  
تنبہا بیچ پر  
چپ، چپ، بیٹھنا  
سوچتے رہنا  
ہاں! سب اچھا لگتا ہے

از: سدرہ کلثوم مردت، لکلی مردت

کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

”میرے ساتھ چلو۔“

”مگر کہاں؟“ وہ حیران دکھائی دے رہی تھی۔

”میرے گھر.....“ اس کا انداز فیصلہ کن تھا وہ

مزید حیران ہوئی۔

”اس وقت..... پہلا پیریڈ شروع ہونے میں

بس کچھ ہی منٹ باقی ہیں۔“ اس نے جیسے اسے کچھ

احساس دلانا چاہا تھا مگر اس نے ارادہ نہ بدلا۔

”ہمارے لیے ابھی یہ پیریڈ اتنا اہم نہیں ہے

جتنا یہ مسئلہ۔ تم چلو فوراً میرے ساتھ۔“ اسے ساتھ

لیے وہ کالج سے باہر آئی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر

کی طرف چل دی۔ ٹیکسی عدیلہ کے گھر کے سامنے

رکی تو ان کی محل نما کوٹھی کو دیکھ کر ایک گونہ اطمینان اس

کے دل میں آن پڑا۔ وہ عدیلہ کے ساتھ اس محل میں

داخل ہوئی۔ سترکش بھری نظروں سے اطراف کا

جائزہ لیتے وہ اس کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

جہاں عدیلہ نے اسے ذرا دیر بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا

اور خود شاہد عادل کو اپنے آنے کی خبر کرنے وہاں

سے چلی گئی تھی۔ ابھی اسے وہاں بیٹھنے زیادہ دیر نہیں

گزر رہی تھی کہ پرجوش سا عادل ڈرائنگ روم میں

داخل ہوتا شوخی سے بولا۔

”زبے نصیب..... آج تو دل کے حکمرانوں

نے ہمارے غریب خانے کو رونق بخشی ہے۔“ عدیلہ

اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہوئی تھی اس لیے اس کی

خوشی پر فوراً ہی اس نے کہا تھا۔

”اتنے خوش مت ہوں بھائی..... محل کو میں

زیربستی اپنے ساتھ لائی ہوں تاکہ یہ آپ سے بات

کر لے کیونکہ اس کے پاپا اس کا رشتہ کسی اور جگہ طے

کر رہے ہیں۔“ اس نے جیسے دھماکا کیا تھا عادل

چونک گیا۔

”ایسے کیسے کسی اور سے رشتہ طے کر سکتے ہیں

وہ..... جب ہم دونوں میں کٹمنٹ ہو چکی ہے؟“ اس



کی نظر میں بھل پر جمی تھی۔

پھر کہاں گئی تھیں؟ وہ جواب میں کچھ نہیں بولی تھی۔

”خالی کمنٹ سے کچھ نہیں ہوتا عادل۔۔۔“

”بھل میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔۔۔ بتاؤ۔“

شادی کے لیے گھر رشتہ لے کر آتا پڑتا ہے۔ بھل نے ذرا کھل کر اس کو بات سمجھائی چاہی تھی جس پر وہ فوراً ہوا تھا۔

”ہاں تو رشتہ لے آنے پر مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔۔ میں تو تمہاری پڑھائی کا سوچ کر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا رہا تھا۔“ اس کا جواب سن کر بھل ایک دم پرسکون ہو گئی۔

”تھک ہے، میں آج ہی گھر جا کر مکی پاپا کو تمہارے متعلق بتا دوں گی۔“ دوسرے لفظوں میں اس نے اسے رشتہ بھیجنے کا اشارہ دیا تھا۔ عادل نے اس کا اشارہ سمجھ کر مسکرا کر سر ہلا دیا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

”تم ایسے نہیں بتاؤ گی۔“ چپ کھڑی بھل کو دیکھ کر ان کے غصے کا گراف مزید بلند ہونے لگا تو وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے۔ انہیں بھل کی طرف غصے سے بڑھتے دیکھ کر کب سے خاموش تماشائی بنی کھڑی زرین ایک دم ان کے سامنے آئی تھی۔

باتی سارا وقت اس نے وہیں عہدہ اور عادل کے ساتھ گزارا تھا۔ عادل کی مکی نے بھی اس سے ملاقات کی تھی۔ وقت خوشگوار مگر بہت جلد ہی ختم ہو گیا تھا پھر جیسے ہی کالج کی چھٹی کا ٹائم ہوا تو وہ واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب اس کے کہنے پر ہی عادل نے اپنی گاڑی میں اسے اس کے گھر سے ڈرائیو سے ڈراپ کیا تھا۔ خوشگوار موڈ میں وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو خلاف معمول گھر میں چھائی ہوئی خاموشی کو محسوس کر کے حیران ہوئی آگے بڑھی۔ سب سے پہلے اس کا سامنا باپ سے ہوا تھا جو خوشنکین نگاہوں سے اسے گھورتے اسی کے منتظر تھے۔

”کیا کرتے ہیں شاید۔۔۔ جوان بچی پر ہاتھ اٹھائیں گے۔“

”تم ہاتھ اٹھانے کی بات کرتی ہو۔۔۔ آج یعنی ذرا ت میں نے برواشت کی ہے اس کے بعد تو میں اسے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔“ وہ شدید غصے میں تھے زرین بہت زیادہ ڈر گئی۔

”آپ بیٹھیں۔۔۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔“

”کہاں سے آرہی ہو۔۔۔؟“ سوال بالکل غیر متوقع تھا۔

”تم کیا بات کر دو گی زرین بیگم۔۔۔ تمہاری ذہیل ہی نے تو آج یہ دن دکھائے ہیں۔“ انہوں نے ایک تیز نظر اس کے حوالے کر کے دوبارہ بھل کی طرف دیکھا۔

”کالج سے۔۔۔“ اس نے صفائی سے جھوٹ بولنا چاہا۔

”تم درمیان میں مت بولو۔۔۔ اس سے جواب میں خود بولوں گا۔“ وہ ہرگز بھی ٹٹلنے کے موڈ میں نہیں تھے اور خود بھل کی ہمت کب سے ان کی عدالت میں مجرم بنے کھڑے اب جواب دینے لگی تھی اس لیے جب انہوں نے دوبارہ اپنا سوال ڈھرایا تو اس نے دل کڑا کر انہیں سچ بتا ہی دیا۔

”جھوٹ مت بولو۔ میں خود تمہیں لینے کالج آیا تھا مگر تمہاری کلاس فیلو نے بتا دیا کہ آج تم نے کوئی کلاس امینڈ نہیں کی بلکہ صبح ہی کالج سے چلی گئی تھیں۔ ابھی تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اگر کالج نہیں گئی تو

”میں عادل بھائی کے گھر گئی تھی۔“ اس کی

## پیاری امی کے حضور

کھڑکی جنت کی تیری قبر میں ٹھہری رہے  
 آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے  
 اے وہ ہستی جس کے وجود کا حصہ ہوں میں  
 اے وہ ہستی جس کے خون جگر سے سپنجی گئی  
 ہوں میں  
 اے وہ ہستی جس کے دامن میں ملیں  
 رحمتیں ہزار  
 اے وہ ہستی جس کی دعا بلا دیتی ہے عرش بریں  
 اے وہ ہستی جس کی ناراضی ہمیں گوارا نہیں  
 اے وہ ہستی جس کے پاؤں تلے ہے  
 جنت میری  
 اے وہ ہستی جو ہمارے درمیاں تھی امانت  
 رب کی  
 پیاری امی آپ کا رتبہ وہاں بھی سب سے  
 اعلیٰ رہے  
 اور یہاں آپ کے بچوں پہ رب کا سایہ رہے  
 بھائی بھی ہیں اور بہنیں بھی پر میری ماں  
 تجھ سار ہیرا ب ہمیں ملے گا کہاں  
 تیری خود داری کا آتا ہے جب خیال  
 اشک و اشک کراٹھتے ہیں تیرے سب عیال  
 اپنی خود داری کا ماں تو نے لوہا منوالیا  
 جا خدا حافظ کہ تو نے خدا کو پالیا  
 آنکھوں کی ٹھنڈک تیری کرتی ہے رب  
 سے التجا  
 نقشِ پا حیرے میں زندگی بھر ہمارے رہنا  
 کلام..... قرۃ العین  
 مرسلہ: حمیرا یا سمین، کراچی

آواز میں ذرا سی لرزش نمایاں تھی مگر اس کے لفظوں  
 میں کچھ تو ایسا تھا جس نے شاید کے ساتھ، ساتھ  
 زرین کو بھی اپن جگہ ساکت کر دیا تھا۔

”کون عادل ہدائی؟“ سرسراتے لہجے میں  
 انہوں نے استفسار کیا تھا۔

”میری کلاس فیلو کا بھائی ہے، ہم دونوں  
 شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ اس کا تمام ذرا ایک دم  
 جانے کہاں جا سوا تھا بھی وہ کھل کر ان کے سامنے  
 بول پڑی تھی۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو کچل تم ہوش میں تو  
 ہو؟“ جوان بیٹی کے منہ سے کسی اجنبی کا نام سن کر  
 زرین حواس باختہ سی بول رہی تھی۔ اس بار شاید  
 صاحب نے اسے بولنے سے نہیں روکا تھا بلکہ انہوں  
 نے خود ایک بار پھر کچل سے سوال کر دیا تھا۔

”کیسے جانتی ہو تم اسے؟“ ذرا دیر پہلے والے  
 غصے کے بجائے اب ان کے انداز میں محسوس کی  
 جانے والی برف کی سی ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ کچل نے  
 ان کے سوال کا جواب پہلے ہی دے دیا تھا مگر شاید  
 انہوں نے غور نہیں کیا تھا اس لیے وہ دوبارہ بولی۔

”وہ میری دوست کا بھائی ہے۔“ چھوٹے  
 سے جملے میں اس نے جسے ساری کہانی سنا دی تھی۔  
 شاید صاحب نے انگارہ آنکھوں سے ذرا دیر کو اس کی  
 طرف گھورا پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر وہ دم سا دھسے  
 کھڑی زرین کی طرف ملے۔

”باپ کی عزت کا جنازہ تو یہ بڑی اچھی طرح  
 نکال چکی ہے اب کسی عادل سے میں اس کی شادی  
 ہرگز نہیں کرواؤں گا۔۔۔۔۔ ویسے بھی آفندی کو زبان  
 دے چکا ہوں۔ اب تم اس کی رخصتی کی تیاری کرو۔“  
 اتنا کہہ کر وہ جانے کو ذرا سا آگے بڑھے مگر دوسرے  
 ہی قدم پر پلٹ کر دوبارہ سے بولے۔

”اب اس کا کالج جانا بھی بند ہے۔۔۔۔۔ کچل سے  
 یہ کالج نہیں جائے گی۔“ بات مکمل کر کے وہ جواب

سننے کے لیے رکے نہیں۔

پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر اس نے بڑی خاموشی سے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔ وہ اب اس گھر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کو دیکھنے کی نیت سے کمرے میں آتی زرین اسے اس طرح پینگنگ میں مصروف دیکھ کر ایک ہل کو وہ ہیں جم ہی گئی تھی۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو بھل؟“ دوسرے ہی ہل حواسوں میں آتے ہی وہ چہل کی طرح اس کی طرف لپکی تھی۔

”جو کچھ آپ لوگ میرے ساتھ کرنے جا رہے ہیں یہ میری برداشت سے باہر ہے، اسی لیے میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ زرین نے بس ایک ہل کے لیے اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھا دوسرے ہی ہل اس نے سمجھ کر اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا تھا۔

”چناخ....“ اس کا اپنا حوصلہ جیسے جواب دے گیا تھا۔ گال پر ہاتھ رکھے کھلنے نے بڑی بے یقینی سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ جس نے آج تک پیار سے بھی اسے نہیں جھڑکا تھا۔ بس ایک ہل... اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے سامان کی طرف متوجہ ہوتی تیزی سے پینگنگ کرنے لگی۔ زرین نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پرے دھکیلا تھا۔

”اس دن کے لیے نہیں بڑا کیا تھا بھل کہ تم ہمارے سروں پر خاک ڈالو۔“ اس پر جیسے کوئی اثر ہی نہ ہوا تھا۔

”ٹھیک کہتے ہیں تمہارے پاپا.... میری ڈھیل نے ہی آج ہمیں یہ دن دکھائے ہیں۔“ اس کا انداز افسوس سے پُر تھا۔ ”کاش میں اماں کی بات سن لیتی۔“ وہ مزید کہہ رہی تھی۔ ”مگر میں نے تمہیں اتنی ڈھیل اس لیے نہیں دی تھی کہ تم غلط راہوں کو اپنا کر ہمارا سر نیچا کر دو، بھل میں تمہیں ہرگز بھی ایسا کرنے نہیں دوں گی۔“ اس کا انداز جستی تھا تو دوسری طرف بھل نے بھی دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔

زرین بے سدھ کی کھڑی کچھ بول ہی نہیں پاری تھی۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی احتیاط کے باوجود اس سے کہاں چوک ہوگئی جو آج اسے یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ساس صحیح کہتی تھیں کہ ہیرے کو تراش خراش کر اس کی بے حد حفاظت بھی کی جاتی ہے مگر اولاد پرندے کے مانند کیسے ہل سکتی ہے، کیا قید میں یا پھر.... اس سے آگے اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ اس سے پہلے وہ کچھ بولتی بھل کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”ممی میں عادل کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی یہ بات آپ پاپا کو سمجھا دیں اور اگر پاپا نے زبردستی کرنے کی کوشش کی تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔“ زرین کی سانس ایک دم رکی تھی۔ وقت نے جیسے اپنا آپ ڈہرایا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس کے سامنے اس کی بہن رعنا کے بجائے اس کی بیٹی بھل کھڑی اسے دہرا رہی تھی۔ اپنا فیصلہ سنا کر وہ کب کی جا چکی تھی اب کمرے میں صرف زرین تنہا کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ایک سرد جنگ تھی جو گھر میں جاری تھی۔ تین دن سے بھل کا کالج جانا بھی بند ہو چکا تھا اور اس کا سیل فون بھی باپ نے اپنے قبضے میں کر کے گویا اس کے لیے ہر راستے کو بند کر دیا تھا۔ خود جب سے اس نے گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکی دی تھی زرین ہر وقت اس کا پہرہ دیتی دکھائی دیتی تھی۔ اس ساری صورت حال نے بھل کو بری طرح پریشان کر دیا تھا اور پرے اس کے نکاح کے سلسلے میں گھر میں ہوتی تیاریوں کو دیکھ کر وہ مزید پریشان ہوگئی تھی۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ عادل سے رابطہ نہیں کر پا رہی تھی مگر یہ تو طے تھا کہ اس نے شادی صرف عادل ہی سے کرنی تھی۔ ان سب تیاریوں سے اسے کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک دن مزید اس نے چپ کر کے یہ سب برداشت کیا تھا



ڈھٹائی سے انہیں خطا وار ٹھہرا کر وہ خود بری الذمہ ہو گئی تھی۔ زرین منہ کھولے حیرت سے بت بنی اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی محل کو دیکھے جا رہی تھی۔ جس نے بڑی آسانی سے ان کی نادانستہ غلطیوں کی نشان دہی کر کے انہیں ہی غلط قرار دے دیا تھا۔

☆☆☆

”اولاد کو اچھے برے کی تمیز سکھا کر اس کو کھلا نہیں چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ چادر کتنی ہی سفید کیوں نہ ہو باہر کھلا چھوڑ دینے سے اس پر گرد پڑ ہی جاتی ہے۔“ اس کی ساس کے کہے لفظوں نے اس کی سماعتوں پر دستک دی تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ اس کی اپنی کوتاہی کی بدولت اس کی سفید چادر پر بھی گرد بڑ چلی تھی۔ ماضی کے جس ڈر کی بدولت اس نے محل کو ہر طرح کی آزادی دی تھی آج وہی آزادی ایک بار پھر ماضی کو دہرانے کو تیار کھڑی تھی۔ محل کے تئو رہتا رہے تھے کہ جیسا وہ کہہ رہی ہے وہ ویسا ہی کرے گی۔ ویسے بھی اب کچھ بھی کہنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہونے والا تھا اس لیے زرین بنا کچھ کہے کمرے سے نکل آئی۔ اب اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا جہاں اسے شاہد کو سمجھانے کا فریضہ انجام دینا تھا کیونکہ واقعی وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ اولاد صرف ایک پرندے کے مانند نہیں ہوتی کہ جسے پنجرے ہی میں قید کر کے رکھا جائے بلکہ وہ تو ایک جیتا جاگتا انسان ہے ایک عقل و شعور رکھنے والا معاشرے کا ایک فعال اور کارآمد فرد کہ جس کی تربیت پر اچھی نسل کا دار و مدار ہوتا ہے۔ شاید کہ زرین کی کوششیں بار آور ثابت ہوں اور وہ ایک اعتدال کا راستہ نکال لے۔

کاش والدین اپنی بہترین تربیت سے یہ موقع ہی نہ آنے دیں کہ اولاد کوئی انتہائی منفی اقدام اٹھانے کا سوچ بھی پائے..... اے کاش!

”کس غلط راہ کی بات کر رہی ہیں می آپ؟ یہ غلط تو نہیں ہے می۔ عادل کو میں نے پسند کیا ہے تو اس میں برا کیا ہے؟ پہلے بھی تو میری ہر چیز میں آپ لوگ میری پسند کو اہمیت دیا کرتے تھے پھر اس بار اتنا اختلاف کیوں کیا جا رہا ہے؟“ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی آج سے پہلے زندگی کے ہر مقام پر اسے آزادی دی گئی تھی مگر اب اس مقام پر آ کر جو ایک دم اس کی آزادی اس سے چھیننے کی کوشش کی جا رہی تھی تو اس کا احتجاج کرنا بڑا فطری سا امر تھا۔

”میری زندگی کا اتنا اہم فیصلہ میری مرضی کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ آپ کی نظر میں یہ آپ لوگوں کا پیار ہے میرے لیے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ ”مگر میں بتا رہی ہوں می مجھے صرف اور صرف عادل ہی سے شادی کرنی ہے۔“ کس قدر بے حیا ہو گئی تھی وہ اس کا اندازہ آج زرین کو ہوا تھا۔

”گڈے گڑیا کا کھیل سمجھ رکھا ہے تم نے شادی بیاہ کو جوائی ضد کر رہی ہو؟“ اس نے غصیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر مزید بولی۔ ”ہر ضد پوری کرنے کی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی تم اب بچی رہی ہو کہ نفع نقصان کی پروا کیے بنا ہم تمہاری ہر ضد اور فرمائش کو پورا کرویں گے۔“ اس نے سر جھٹکتے ہوئے بیڈ پر پڑے اس کے بیگ کو اپنی طرح کھینچا تھا۔

”ہمارے لڑ پیار کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ تم.....“ محل ایک دم ہلنریہ ہو گئی۔

”عادل سے شادی میری ضد نہیں ہے می بلکہ میرے دل کی خواہش ہے اور اپنی اس خواہش سے میں کسی صورت دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوں۔ اس لیے آپ لوگ چاہیں تو اپنی خوشی سے میری اس خواہش کو پورا کر دیں ورنہ دوسری صورت میں اپنی خواہش کی خاطر اگر میں کوئی غلط قدم اٹھاتی ہوں تو اس کے ذمے دار خود آپ لوگ ہوں گے۔“ بڑی



ناریسائی

ناریسائی

امریکین

”یہ..... کیا کر رہی ہو زویا؟“ کوئل نے  
حیرت سے اسے دیکھا جو بیگ میں سے میک اپ کا  
مختلف سامان نکال کر مہارت سے اس کا استعمال  
اپنے چہرے پر کر رہی تھی۔ جس تیزی سے اس نے وہ  
سب نکالا تھا لگنے کے بعد اب دوبارہ بیگ کے خفیہ  
خانے میں منتقل کر دیا تھا۔

”ہوں..... اب بتاؤ تم کیا کہہ رہی تھیں؟“  
ذرا سی توجہ سے وہ نوخیز کلی لمحوں میں گل کر گلاب لگ





رہی تھی..... بیک کی زپ بند کر کے اس نے حیرت سے خود کو دیکھتی کوئل سے سوال کیا۔

”میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم شاید بھول رہی ہو کہ ہم اس وقت کالج میں ہیں اور یونی فارم میں تو پہلے شاید بھی تم نے یہ سب یوز بھی نہیں کیا۔“ کوئل حیرت دے رہی تھی سے ایک کے بعد ایک سوال کرنے لگی اور اس کی الجھن کو سمجھ کر زویا ایک عجیب سی ہنسی ہنس دی۔ کچھ لمحے اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی عجیب و غریب حرکتوں پر کوئل ایک بار پھر بری طرح پریشان ہو گئی۔

”کیا ہوا ہے زویا مجھے بھی کچھ بتاؤ گی یا یونہی پراسرار حرکتیں کرتی رہو گی؟“

آج صبح معمول کے مطابق وہ کالج آئی تھی۔ دونوں نے معمول کے مطابق تمام کلاسز اینڈ کی تھیں۔ آج کا دن قدرے تھکا دینے والا اور مصروفیت لیے ہوئے تھا۔ کیمسٹری، فزکس کے لگاتار دو پریکٹیکس کے بعد دس منٹ کی بریک تھی پھر لگاتار ہیریڈز کے بعد اب آخری ہیریڈ جو کہ بائیولوجی کا تھا کی ٹیچر نہیں آئی تھیں سو سب لڑکیاں گراؤنڈ میں یہاں وہاں سرما کی دھوپ کا مزہ لینے پھیل گئی تھیں ویسے بھی کچھ دیر میں چھٹی ہونے والی تھی سو ایسے میں کوئل اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اسے کالج کی پچھلی طرف والے گراؤنڈ میں لے آئی تھی جہاں درختوں کے جھنڈ ہونے کے باعث دھوپ کم آتی تھی۔ اس وقت وہاں اکا دکا لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ اس کو... لیے کونے میں.... آ کر بیٹھ گئی اور کوئل حیران پریشان بس سوال ہی کیے جا رہی تھی۔

”تم چپ رہو بس کل آ کر بتا دو گی کہ میں کہاں گئی تھی۔“ اس نے مبہم لہجے میں کہا تو کوئل کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

”کیا مطلب کہاں گئی تھیں؟ بل بچ گئی ہے

گاڑی آنے والی ہے اور اب ہم گھر جانے والے ہیں، تم کہاں جا رہی ہو؟“ اپنے منہ سے اس نے سوال کیا تو وہ ایک بار پھر ترنگ میں آ کر مسکرا دی۔

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا رہی مجھے کہیں اور جانا ہے اور اب یہ مت پوچھنا کہ کہاں..... یہ میں کل آ کر بتاؤں گی۔“ دین میں سب کو بتانا کہ مجھے میرا کزن لینے آیا تھا میں اپنی تانی کے گھر گئی ہوں۔“ یہ کہتے ہی وہ جلدی، جلدی بیک میں سے چادر نکال کر اوڑھنے لگی تو کوئل کو بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوتا پڑا حالانکہ دماغ میں کئی سوال کھلبلا رہے تھے۔ زویا جیسی اچھی، سلجھی ہوئی لڑکی اور ایسی مشکوک سرگرمیاں..... کوئل سے یہ سب بالکل مبہم نہیں ہو رہا تھا۔ زویا اب تیز، تیز چلتی ہوئی میکس سے باہر نکلتے جہوم میں شامل ہو گئی اور وہ سائڈ پر ہو کر کھڑی ہو گئی تاکہ ان کی دین کی باقی لڑکیاں بھی آجائیں۔ آتے ہی تقریباً سب نے ہی زویا کا پوچھا۔ ابھی وہ اس کا دیا گیا جواب دینے ہی والی تھی کہ اس کے دماغ میں ایک دم دھماکا ہوا کہ اس کی توفانی اماں حیات ہی نہیں تھیں نہ ہی ایسے کسی کزن کا وجود تھا۔

”وہ..... اس کی امی کی طبیعت خراب تھی تو اس کے پاپا اسے جلدی لے گئے۔“ ان سب کو تو اس نے مطمئن کر دیا تھا پر ذہن میں ان محنت سوال کھلبلا رہے تھے۔ دس سال کا ساتھ تھا ان دونوں کا۔ کوئل اس کی فیملی کو جانتی تھی کئی بار ان کے گھر جا چکی تھی، اچھے کھاتے پیتے اور شریف لوگ تھے۔ والد کی ایک اچھی پوسٹ پر جاب تھی جبکہ والدہ بھی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ یہ تو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے ابو اکلوتے اور امی بھی اکلوتی تھیں۔ انھیال اور دوھیال میں کوئی نزدیکی رشتے دار نہیں تھا تو پھر آج یہ تانی اماں اور کزن کہاں سے آگئے تھے۔ انہی خیالات میں کب اس کا گھر آ گیا پتا بھی نہ

روانی سے چہرہ بھگوتے چلے گئے۔ اس کی طرف سے  
کی گئی ہر کوشش اور ہر عمل اس شخص کو جو قسمت سے اس  
کا شوہر تھا۔ خوش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ کھانا  
کھانے کے بعد اس نے سعید احمد کو دودھ کا گلاس دیا  
اور خود باہر آگئی۔ ایک نظر دونوں بچوں کے کمروں  
میں ڈالی۔ ہنی کا آدھا مبل اور پر آدھا نیچے تھا۔ وہ  
ٹھیک کر کے دروازہ بند کرتی سنی کے کمرے کی  
جانب آگئی۔ وہ بھی بے خبر سو رہا تھا۔ بیرونی  
دروازے کا لاک اور کچن کا لاک چیک کرنے کے  
بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ سعید احمد اپنی جگہ پر  
لیٹ چکے تھے، وہ آہستہ سے چلتی بیڈ کی پانچ کی  
طرف آگئی اور پاس بیڈ کران کے پاؤں دبانے لگی  
کہ برسوں سے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا  
تاؤنٹیکہ وہ گہری نیند میں نہ چلے جائیں۔ کمرے میں  
گہری ہوتی سانسوں کی آواز نے یقین دلایا کہ وہ  
سو چکے ہیں تو اس نے ہاتھ روک دیے اور ایک نظر  
اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔ سوتے ہوئے ان کا چہرہ  
کسی قسم کے غصے اور تیوریوں سے پاک ہوتا ان کے  
ساتھ گزارے سترہ سالوں میں بہت کم دلتا اس کی  
زندگی میں ایسے تھے جب اس نے اس شخص کو  
مسکراتے دیکھا تھا۔ صبح کا تھکا ہارا جسم اور دماغ کسی  
پرسکون نیند کے منتظر تھے لیکن لفظ سکون کا لفظ برسا  
برس بیت گئے ان کو برتے ہوئے اب وہ اس لفظ  
سے آشنا تو تھی پر جانتی نہیں تھی کہ وہی سکون نام کس  
چیز کا ہے۔ اس کا ذہن وقت و زمانے کی بھیڑ چال کو  
بھلاتا کئی سال پہلے کے اس کے آگن کی طرف چلا  
گیا جہاں بھلے غربت تھی پرسکون تو تھا۔

انسان بھی عجیب مخلوق ہے رب کی دی گئی بے  
شمار نعمتوں کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا ہے اس کا  
احسان اتارنا تو ایک طرف شکر کا ایک کلمہ بھی اس کی  
زبان سے ادا نہیں ہوتا اور اپنے جیسے انسان کے کیے  
گئے احسان کو اس حد تک یاد رکھتا ہے کہ بعض دفعہ اس

چلا۔ وہ تو ساتھ اترنے والی لڑکی نے اسے ٹھوکا دیا تو  
وہ بھی ہزبڑائی اور اپنے گھر والی سڑک دیکھ کر نیچے  
اتر گئی۔

☆ ☆ ☆

ڈورٹیل کی تیز آواز پر صوفے سے ٹیک دگا کر  
بیٹھی خدیجہ ہزبڑا کر جاگ گئی۔ جو بھی تھا بیل پر ہاتھ  
رکھ کر گویا بھول گیا تھا۔ اس نے بوکھلا کر جلدی سے  
سلیپر پاؤں میں اڑے اور تیزی سے دروازہ کھولنے  
چل دی۔

”اپنے آرام اور سکون کے علاوہ اور کوئی پروا  
ہے تمہیں کہ خاوند تھکا ہارا گھر آئے گا تو گھنٹا بھر  
دروازہ ہی پینتا رہے لیکن تمہیں کیا پروا۔“

اس کے دروازہ کھولتے ہی سعید احمد کا بیزار اور  
غصیلہ چہرہ دکھائی دیا۔ جو اس کی ہلکی سرخ آنکھیں  
ان کے انتظار میں اونگھ آ جانے کے باعث تھیں کو دیکھ  
کر شروع ہو گئے تھے۔

”کھانا کھائیں گے؟“ ساری کڑواہٹ اپنے  
اندر اتار لینے کے بعد خدیجہ نے ڈرتے، ڈرتے سوال  
کیا۔ مبادا کوئی اور بہانہ کر کے مزید گرجے لگیں۔

”ہاں تو باہر تمہارا باپ میرے لیے خوان سجا  
کے بیٹھا تھا چاہل عورت..... صبح کا ناشتا کر کے نکلا ہوا  
ہوں۔ درمیان میں صرف ایک کپ چائے اور گندا  
سابر گرہی کھایا ہے اور اب ٹائم دیکھو رات کے گیارہ  
بج گئے ہیں اور پوچھ رہی ہو کھانا کھائیں گے۔“ اس  
نے بیوی کو لتاڑتے ہوئے اس کی نقل اتاری۔

”ہونہہ..... وہ اور عورتیں ہوتی ہیں جن کے  
دم سے گھر جنت بن جاتے ہیں یہاں تو تمہاری  
جہالت اور نخوت نے نرا جہنم بنا رکھا ہے گھر کو۔ میرا  
منہ کیا دیکھ رہی ہو جاؤ لے کر آؤ کھانا۔“ غصے میں  
وہاڑ کر کہا گیا تو کسی روبرو کی طرح خدیجہ چلتی ہوئی  
کچن میں آگئی۔ یہاں آکر روبرو میں جیسے کسی نے  
احساسات کے سیل ڈال دیے تھے۔ اس لیے آنسو

احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش میں وہ انسانی جذبات جیسی گرافٹر دولت کو بھی اپنے پاؤں تلے روند ڈالتا ہے۔ خدیجہ اور سعید احمد کی زندگی کی کہانی بھی رشتوں اور احساسات کے جوڑ توڑ کی کہانی تھی۔ سعید احمد کے والدین ان کے بچپن میں کسی حاوٹے میں وفات پا گئے تھے۔ خدیجہ کے ابا ایک تعلیمی ادارے میں کلرک تھے انہوں نے یتیم بچے کو اپنی زیر کفالت لے لیا تھا۔ اس وقت سعید احمد آنکھوں جماعت کا اور خدیجہ پانچویں کی طالبہ تھی۔ خدیجہ جو اپنے اکلوتے پرن سے تنگ تھی دوسرا ہٹ میسر آنے پر بے طرح خوش تھی۔ حالات و واقعات کی اکھاڑ پھھاڑ اور انسانوں پر اس کا اثر جانے بغیر وہ خوش تھی کہ کبھی کبھار کسی موقع یا تقریب میں ملنے والا تک چڑھا کر ان کے گھر ہمیشہ کے لیے آ گیا ہے۔ تک چڑھا تو وہ تھا اب بہت خاموش طبع ہو گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ وہ ان کے گھر اور مکینوں سے مانوس ہوتا چلا گیا۔

سعید احمد کے یونیورسٹی آجانے تک خدیجہ اس کے نزدیک صرف ایک چچا زاد تھی پر خدیجہ کے نزدیک یہ کھٹا میٹھا سا تعلق کوئی اور رنگ اختیار کر گیا تھا وہ اپنے اس مغرور کزن کو دل میں جگہ دے نہ سکتی تھی۔ ابا اب ریٹائر ہو گئے تو اس نے چچا پر مزید بوجھ نہ بنتے ہوئے چھوٹی موٹی ٹیوشنز کر کے اپنا تعلیمی خرچ خود اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ انہی دنوں یونیورسٹی میں اسے اپنی ایک کلاس فیلو بے طرح پسند آ گئی اور اس کی طرف سے ملنے والے مثبت رد عمل نے اسے آسمان تک پہنچا دیا۔ سعید احمد کا انجینئرنگ کا آخری سال تھا کہ اس کی چچی یعنی خدیجہ کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ادھر خدیجہ تو جیسے دنیا کی بھیڑ میں تنہا پڑ گئی۔ اس پر سعید احمد کی باتوں میں فاریہ کا تذکرہ اور بے حد تذکرہ اس کا دل بھی میں لے لیتا۔ فاریہ اور سعید احمد کے تعلقات اس بچے تک آ جائیں گے اب وہ اس

رشتے کو کوئی نام دینا چاہتے تھے پر فاریہ کے والد اگرچہ اس محنتی نوجوان سے متاثر تو تھے پر اتنے نہیں کہ اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ ایک بے روزگار کے ہاتھ میں تمنا دیتے سوتلے بڑب کا شکار تھے۔

انہی دنوں قسمت نے پلٹا کھایا اور سعید احمد کو اس کا لرشپ مل گئی اور وہ فاریہ کو دو عددوں اور امیدوں کے کئی جگنو تھما کر دو سال کے لیے اسپیشلائزیشن کے لیے باہر چلے گئے۔ خدیجہ نے بی اے کر لیا تھا اب مزید پڑھائی سے اس کا دل اجاڑا ہو گیا تھا۔ ابا بیمار رہنے لگے تھے وہ گھر پر رہ کر ان کی خدمت کرتی ایسے میں کبھی اس سنگدل کا خط آ جاتا تو دونوں اڑی، اڑی پھرتی حالانکہ اس نے خدیجہ کے جذبات کو کبھی پزیرائی نہیں بخشی تھی وہ انجان تھا یا جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا خدیجہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ لے بے چوڑے خط میں اس کے نام کی صرف ایک لائن..... خدیجہ کیسی ہے؟ اسے بھی سلام کہیے گا اسے ہفتوں سرشار رہتی۔ فاریہ اور سعید احمد کا رابطہ مسلسل تھا۔ اب تو بیٹی کی ضد سے ہار مان کر اس کے والدین بھی اس کی شادی سعید احمد سے کرنے کو تیار تھے کچھ امریکا پلٹ مھنتی لڑکے کا روشن مستقبل نظر آ رہا تھا پھر اکیلا لڑکا تھا سے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ ویسے بھی ان کا سب کچھ ان کی بیٹی کا ہی تھا۔ سعید احمد کو جب فاریہ کے والد کی رضامندی پتا چلی تو وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے اڑ کر پاکستان پہنچنا چاہتا تھا تا کہ چچا جان کو بھیج کر اپنی محبت کو اپنے نام کر دالے لیکن زندگی اگر اسی بچے پر گزرتی جس پر انسان نے سوچ رکھا ہے تو خدا کے ہونے کو تو کوئی نہ ماننا۔ وہ بہت خوش، خوش وطن واپس لوٹا تھا پر لوں سے ہی چچا کی بگڑتی طبیعت نے اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے، اپنی آخری سانسوں میں انہوں نے مانگا بھی تو کیا..... اس کی زندگی ہی تو مانگ لی۔ اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا



میں تادیب کرے کہ وہ آئندہ پھر ایسا ویسا قدم نہ اٹھائے لیکن زویا کے کسی بھی عمل سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کوئی پکھتاوا ہے یا یہ کوئی غلط کام ہے؟ وہ پونی کو جھلاتے، چیونگم چباتے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے کوئل یہ سب باتیں اسے نہیں کسی اور کو سنارہی ہو۔  
”زدیا..... میں تم سے مخاطب ہوں۔“ اب کے کوئل نے اس کا باقاعدہ بازو ہلایا تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

”ہوں..... تم نے مجھ سے کچھ کہا؟“ اس کی بے نیازی دیکھنے لائق تھی۔

”ہاں، تم جیسے پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔“ کوئل نے دانت پیسے۔ ”کیا بکواس کر رہی ہو کون ہے وہ لڑکا؟ تم سے کہاں ملا اور تم اس سے ملنے کیوں نکلیں؟“ کڑے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

”ہمارے بلاک سے اگلے بلاک میں رہتا ہے۔ ایک دن ہمارے بلاک میں موجود اپنے انکل کے گھر کسی کام سے آیا تھا جب اس نے مجھے دیکھا اور میرے حسن جہاں سوز کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہونے کے قریب ہو گیا۔“ وہ فخریہ انداز میں ہنسی۔ ”اس کے بعد پورے ایک ہفتے تک وہ میرے راستے میں آکر کھڑا ہوتا رہا۔ کچھ ہمت بندھی تو میرے پیچھے، پیچھے گئی تک آ گیا اور مسلسل دو ماہ سے وہ ملنے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ اس کے بے حد اصرار پر تنگ آ کر کل میں اس سے ملنے چلی گئی اور میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا وہ ایک شریف اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ مجھے پسند کرتا ہے بلکہ محبت کرتا ہے مجھ سے۔“ فخریہ انداز میں اپنی تھوڑا سا محبت کے قیے سناتی وہ اسے سخت زہر لگی۔

”گلی، محلوں اور سڑکوں پر ہونے والی محبت، محبت نہیں ہوتی، رسوائی کی طرف جانے والی منزل کا پہلا قدم ہوتی ہے اور تم اتنی، اتنی دیر بات کرتی تھیں تو کوئی دیکھتا نہیں تھا نہ کسی نے نوٹ کیا تم دونوں کو

تھا کہ مرنے سے پہلے وہ دونوں کو نکاح کی ڈور میں باندھ دینا چاہتے ہیں اور بچا کے احسانات کے آگے اس کے وعدے، محبت، وفا کیں اور خواب سب دھڑلے کے دھڑلے رہ گئے۔ نکاح کے تیسرے دن بیٹی کی زندگی سے شانت ہو کر بچا تو ملکِ عدم سدھار گئے پر اسے جیسے جلتے برزخ میں چھوڑ گئے تھے۔ اگلی بار جب وہ فار یہ سے ملا تو اس کی حیثیت بدل چکی تھی۔ نولے ہوئے لہجے میں ساری تفصیل اسے بتاتے وہ رو دیا تھا۔ روئی تو فار یہ بھی بہت تھی اور بغیر کچھ کہے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ وہی ایک لمحہ پھیل کر اس کی پوری زندگی پر محیط ہو گیا۔ خدیجہ کا پیار، والہانہ لگاؤ، مہنی کی پیدائش، سنی کا دنیا میں آ جانا کچھ بھی خدیجہ کے جرم کو کم نہ کر سکا..... وہ جرم جو اس نے اس کی زندگی میں آ کر کیا تھا سترہ سالوں کا طویل عرصہ دونوں نے بردہ نہ پا کر گزارا تھا۔ سعید احمد نے چاہت کو کھودینے اور اُن چاہے ساتھی کے زندگی میں شامل ہو جانے کے دکھ میں اور خدیجہ نے اس کے بدل جانے کی آس میں۔

سعید احمد نے کروٹ بدلی تو خدیجہ ماضی کے اس سفر سے واپس لوٹی جس کی یاد اسے یونہی رات، رات بھر جگاتی تھی۔

☆☆☆

”مگر زویا یہ غلط ہے جس طرح کی روش تم نے اپنائی ہے وہ سوائے بربادی کے کچھ نہیں..... اور میں تو حیران ہوں تم جیسی سنجیدہ اور معاملہ فہم لڑکی اس قسم کی فضولیات میں پڑ کیسے گئی؟“ کوئل تو یہ جان کر ہی شکوہ رہ گئی کہ کل وہ کسی لڑکے سے ملنے گئی تھی اور اب سخت لہجے میں اسے کافی کچھ سنا بھی ڈالا تھا۔

”ادمانی گاڈ، تم نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ تمہارے پیش کش کو ہٹا چل گیا تو اور..... اور اگر وہ تمہیں کہیں اور لے جاتا تو..... کون ہے؟ تمہیں کہاں ملا؟“ پریشان ہوتی کوئل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کن الفاظ

سر راہ کھڑے ہوئے، کوئل نے طنز یہ پوچھا۔  
 ”لو میں بھلا کوئی پاگل ہوں جو سر راہ کھڑے  
 ہو کر ہمیں لڑاؤں کی لینڈ لائن نمبر لے لیا تھا اس نے  
 ہمارا۔ فون پر بات ہوتی تھی۔“ وہ مسکرا کر بولی تو کوئل  
 بے ساختہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اسے یقین  
 ہو چلا کہ فون نمبر بھی زویا نے خود ہی دیا ہو گا۔

”میں تو پھر بھی یہی کہوں گی زویا کہ کچھ دن  
 پہلے تک تم خود ایسی لڑکیوں کا مذاق اڑاتی تھیں جو  
 ماں باپ کے اعتماد کو دھوکا دے کر ایسے ویسے کام  
 کرتی ہیں چنانچہ کیا وجہ تھی کہ تم بھی انہی لڑکیوں کی  
 صف میں جا کھڑی ہوئیں، مجھے یقین نہیں آ رہا۔“  
 تاسف سے لگی کوئل کی بات پر زویا کو غصہ آ گیا۔

”کیا مطلب کوئل ایسے..... ویسے... میں نے ایسا  
 کوئی کام نہیں کیا جس پر مجھے شرمندگی ہو۔“ تیوری پر مٹل  
 ڈال کر اس نے کوئل سے کہا تو وہ کچھ دیر اس کا باغیانہ  
 انداز دیکھتی رہی پھر طویل سانس لے کر گویا ہوئی۔

”تم میری بہت اچھی دوست ہو سوا چھا برا بتانا  
 میرا فرض تھا۔ مہم غوری کی کلاس ہے اگر چلنا ہے تو چلو  
 نہیں تو میں جا رہی ہوں۔“ کپڑے جھاڑ کر کتا بنیں  
 اٹھاتے کوئل نے کہا۔ زویا ان سنی کر کے منہ دوسری  
 طرف پھیرے بیٹھی رہی گویا اس کی بات سے اسے کوئی  
 سروکار نہ ہو۔ دو تین منٹ کھڑے رہنے کے بعد کوئل  
 اسے وہیں چھوڑ کر کلاس لینے آگے بڑھ گئی تو زویا بھی  
 سامنے والے گراؤنڈ سے اٹھ کر پچھلی طرف آگئی نہیں تو  
 ہیڈ گرلز جو مختلف کلاسز کی تھیں کی نظروں میں آ جاتی۔  
 انتظامیہ کی طرف سے ان کو سخت تاکید تھی کہ کلاسز کے  
 اوقات میں کوئی بھی لڑکی کلاسز تک کر کے بیٹھی نظر نہ  
 آئے اور یہ زویا کی پہلی کلاس تھی جو اس نے بنک کی  
 تھی شاید آگے یہ سلسلہ طویل ہونے والا تھا۔

☆☆☆

”ہاں بھئی ہئی، آج چھٹی ہے تو بتاؤ کھانے  
 میں آج کیا بناؤں بلکہ ایسا کرو سنی سے بھی بھاگ کر

پوچھ آؤ کہ لچ میں مینو کیا ہوتا چاہیے؟“ خدیجہ اپنے  
 گھر کے ماحول اور بچوں کی تربیت پر اپنے سرد  
 تعلقات کا سایہ نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔ جانتی تھی  
 کہ ایسا ممکن نہیں ہے، ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے  
 کئی بار سعید احمد بچوں کے سامنے بلاوجہ اسے جھاڑ  
 دیتے تو وہ خفت سے دو چار ہو جاتی، جب تک بچے  
 چھوٹے تھے سہم جاتے تھے پر اب جب سنی کا لچ  
 اور سنی میٹرک میں آیا تھا وہ ایک عجیب سی لائق اور  
 بے رخی ان کے انداز میں محسوس کرنے لگی تھی۔ ایسے  
 میں اس کی کوشش یہی ہوتی کہ شوہر... کو کسی قسم کی  
 شکایت کا موقع نہ دے خصوصاً بچوں کے سامنے لیکن  
 ان کو بھلا برا ماننے کے لیے کب کسی شکایت کی  
 ضرورت ہوتی۔

ابھی کل ہی تو اس نے دبے لفظوں میں....  
 انہیں بتایا بھی تھا کہ تنہائی میں بٹھلے اسے جو کہہ سن لیں  
 بچوں کے سامنے اپنے رویے میں چلک پیدا کریں  
 لیکن نہیں جانتی تھی کہ دلوں کی جنگ ہارنے والا ایسا  
 پتھر دل ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی ضرب اس پر اثر نہیں  
 کرتی نہ لفظوں کی، نہ جذبات کی، نہ اعمال کی۔ سعید  
 احمد نے اننا اسے بے نقط سنائی تھیں۔

”تم..... تم جاہل عورت اپنی بد تمیز اولاد کو  
 سمجھانے کے بجائے مجھ سے باز پرس کرنے بیٹھ گئی  
 ہو۔ بیٹا ہے تو بات کرنے پر منہ کو آتا ہے۔ بیٹی کو اتنی  
 توفیق نہیں کہ باپ کو ایک گلاس پانی ہی پوچھ لے۔  
 میں کہتا ہوں میں ان کا باپ ہوں یا وہ میرے۔“ وہ جو  
 سمجھ رہی تھی کہ وہ بچوں کے بدلتے رویے سے بے  
 خبر ہیں اس کی غلط فہمی تھی۔ انہوں نے بھی اولاد کی  
 نظروں میں جھلکتی خفگی اور انداز کی برہمی کو بھانپ لیا  
 تھا پراسوس اس کی وجہ پر غور کرنے کی زحمت کیے بغیر  
 پچھلے ہر گناہ کی طرح یہ ہا کر وہ گناہ بھی اس کی ناقص  
 تربیت کے کھاتے میں درج ہو گیا تھا۔

”واہ ماما، آج تو مزے ہوں گے ہئی بتا رہی

میں نظر نہیں آتی۔۔۔“ وہ دونوں باپ کے روتے کے خلاف جی بھر کر بول رہے تھے۔ خدیجہ بہت چاہنے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ بولنے پر مجبور نہ کر پائی۔۔۔ پر اپنے بچوں کا باپ سے متنفر ہونا اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ انہیں کسی اور وقت سمجھانے کا تہیہ کر کے ان دونوں کو تیار ہونے کا کہہ کر وہ خود کچن میں آگئی۔

☆☆☆

”فارسی۔۔۔۔۔“ ماہ و سال کا طویل عرصہ جیسے ان کے بیچ آیا ہی نہیں تھا۔ فارسیہ ایک نیک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ لکھوں بعد اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ بھولی تو وہ بھی اسے نہیں تھی بس حالات و واقعات کی دھند نے کچھ سالوں کے لیے سب کچھ دھندلا ضرور کر دیا تھا۔

”سعید۔۔۔۔۔!“ اس کے لبوں سے سرسراہٹ ہوئے سعید احمد کا نام کسی سرگوشی کی صورت ادا ہوا۔ انہیں قطعاً پتا نہیں تھا کہ ہر ٹپا جس کی یاد نے انہیں زندگی کا صحیح معنوں میں لطف نہیں لینے دیا تھا وہ یوں سر راہ اچانک آنکرائے گی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک قریبی ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔

”کیا بتاؤں فارسی، تم سے چھڑ کر زندگی گزار تو دی پر جی نہیں پایا۔“ ادھوری اور بے کیف زندگی کا دکھ ان۔۔۔۔۔ کے لہجے میں آ رہا تھا۔ ”تم سناؤ فارسی، کیسی ہو؟ شادی کی؟ بچے کتنے ہیں؟“ اس کو بے قراری سے سکتے دیکھ کر وہ بے درپے سوالات کیے گئے۔

”کی تھی شادی ہاں ضرور کی تھی پر اولاد نہ دے سکنے کی پاداش میں اس شخص نے شادی کے محض پانچ سال بعد ہی مجھے چھوڑ دیا۔ پھر پاپا بھی چھوڑ کر چلے گئے مجھے۔۔۔۔۔ پھر تو شخص زندگی کا تنہا اور طویل سفر تھا اور میں تھی۔“ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھتی ہوئی آہستہ سے اپنے دکھ سناتی چلی گئی تو ان دکھوں کی تھکن اور جھمن کو اس نے اپنے دل پر محسوس کیا۔

”تمہارے کتنے بچے ہیں؟ بیوی کیسی ہے

ہے کہ وہ جابر حکمران آج گھر پر نہیں ہیں۔“ دفعۃً سنی کی پُر جوش آواز اسے خیالات کے ہجوم سے ہاتھ پکڑ کر حال میں لے آئی۔

”بری بات سنی، پاپا کے بارے میں کوئی الٹا سیدھا لفظ استعمال کیا تو میں بہت سختی سے پیش آؤں گی۔“ اس نے بہت سخت لہجے میں اسے ڈانٹا تو وہ منہ بنا کر رہ گیا۔

”ماما آج کتنے عرصے بعد تو موقع ملا ہے کیوں ناں لنچ باہر کرنے جائیں آج؟“ ہنی کی آنکھیں کسی خیال سے چمک اٹھیں۔

”ویری گڈ آئیڈیا ڈریس۔۔۔۔۔ کیا خیال ہے ماما؟“ ”خیال تو اچھا ہے پر تمہارے پاپا بتا کے نہیں گئے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ وہ آئیں اور گھر پر ہمیں نہ پا کر خفا ہو جائیں۔“ دونوں کے پُر امید چہرے دیکھ کر وہ قدرے ہچکچاہٹ سے بولی۔ بچوں کی خوشی دیکھ کر اس کا بھی دل نہ چاہا کہ ان کا دل توڑے بہت عرصے بعد یوں بے ساختہ فرمائش ان کے منہ سے نکلی تھی ورنہ تو اسکول، کالج کی لفٹ روٹین، باپ کا بیزار رویہ، ماں کی بے بسی پر مبنی تو اپنی ذات میں کم ہو گئی سنی نے بھی پتا نہیں کن مصروفیات میں خود کو گم کر لیا تھا۔

”افوہ ماما پہلے آپ کو اپنے شوہر ٹائدار بھی دن کی روشنی میں نظر آئے ہیں جو آج آئیں گے۔ آہمی گئے تو کون سا ہم کوئی ڈاکا ڈالنے جا رہے ہیں جو آپ یوں ڈر رہی ہیں۔ یا تو ان کے لیے کھانا رکھ جائیں یا پھر پیک کروالائیں گے اور ماما پلیز برا مت مانے گا یہ آپ نے ہی ان کو چپ رہا رہ کر سر پر چڑھا رکھا ہے ورنہ آج کل کے دور میں، میں سنے آپ جیسی سنی سادری قسم کی لیڈیز بہت کم دیکھی ہیں۔“ ”بالکل ٹھیک کہا تم نے ہنی بلکہ مجھے تو لگتا ہے صرف ماما ہی ہیں ورنہ آج کل ایسی دوسن صرف ڈراموں، فلموں کی حد تک محدود ہے۔ ریکل لائف



تمہاری؟ خدیجہ نام بتایا تھا غالباً تم نے؟“ چند لمحوں بعد وہ سنبھل گئی تو اس سے سوال کیا۔

”دو بچے ہیں بڑی بیٹی فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے جبکہ بیٹا میٹرک میں ہے۔ میرا تو گزرا تمام عرصہ پچھتاؤں کی کڑی دھوپ میں گزرا۔ ہر لمحہ ہر پل یہی سوچ کر ترپتا رہا کہ کاش چچا کو اسی وقت انکار کر دیتا تو نہ خود ان دیکھی آگ میں جلتا نہ ان کی بیٹی کو جلاتا۔ ان کے بے شمار احسانات کا بدلہ اتارنے کو زباں بندی کی میں نے..... پر جانتا ہوں ان کی روح تو آج بھی بے چین ہوگی اپنی بیٹی کو ناخوش دیکھ کر۔ آسودگی کا ایک لمحہ بھی تو نہیں دے پایا میں اس عورت کو۔ اتنی وسعت ہی پیدا نہیں ہو پائی دل میں کہ تمہیں بھلا کے اسے جگہ دے پاتا۔ اس ایک انکار سے وہ اس وقت ناراض ہو جاتے پر اتنی زندگیوں میں نا آسودگی تو نہ ہوتی ناں..... تم..... میں..... خدیجہ کوئی بھی تو خوش نہیں رہا۔“ وہ اعترافات جو آج تک صرف اپنے دل میں کرتے آئے تھے محرم کو سامنے پا کر لوک زبان تک آ کر اظہار کا راستہ پا گئے تھے۔ دو گھنٹے ان کو یہ دکھ سکھ کہنے میں لگ گئے یوں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چل سکا۔

☆☆☆

پورے سات دن بعد وہ ایک بار پھر ایک ہوٹل میں اس کے ساتھ موجود تھی۔

”بہت ٹائم ہو گیا ہے روحیل اب مجھے چھوڑ آؤ۔ زیادہ دیر ہوگئی تو ماما پریشان ہو جائیں گی۔“ وہ چادر کی اوٹ سے یہاں وہاں دیکھتی گویا ہوئی۔

”ابھی سے..... ابھی تو میں نے تمہیں جی بھر کے دیکھا بھی نہیں کہ تمہیں جانے کی پڑ گئی ہے؟“ وہ منہ بنا کر بولا تو خیز زویا گھبرا کر نظر جھکا گئی۔ گھر کے ماحول سے تنگ آ کر اس نے ایک قدم اٹھا تو لیا تھا لیکن روحیل کے التفات پر اس کے ہاتھوں سے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

”روحیل پلیز، کالج سے نکلے ہوئے ہمیں ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا ہے۔ ماما نے کسی کو بھیج کر وانیہ کے گھر سے پتا کروالیا تو بہت برا ہوگا۔“ اس نے اپنے بلاک کی ہی ایک لڑکی کا حوالہ دیا۔ ایک دفعہ بارش میں وین خراب ہوگئی تھی تو ماما ملازمہ کو ساتھ لے کر وانیہ کے گھر پتا کرنے چلی گئی تھیں۔ خوف اس کی آنکھوں سے مترشح تھا۔

”اچھا بابا صبر کرو، چھوڑ آتا ہوں پہلے تم یہ پکڑو۔“ اس نے ایک پکٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“ زویا نے ایک نظر اس پکٹ پر اور دوسری اس پر ڈالی پر لینے کو ہاتھ نہیں بڑھائے تھے۔

”موبائل ہے یا راتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔ لینڈ لائن نمبر سے پہلے تمہارے اماں، بابا کے سو جانے کا انتظار کرو پھر نہیں جا کر ترس، ترس کر تمہاری آواز سننے کو ملتی ہے۔ یہ سم ہے۔“ وہ ڈبا کھول کر موبائل نکال کر اسے اس کے آپریٹ کرنے کے طریقے کے متعلق بتانے لگا۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد زویا نے وہ سیل فون چار جرسمیت اٹھا کر اپنے بیگ میں ڈال لیا اور ڈبا واپس کر دیا۔ آج کی ملاقات کے بعد روحیل پر اس کا اعتماد کچھ اور بڑھ گیا تھا وہ جو کول کے الفاظ سے بظاہر بے نیازی برتنی دل ہی دل میں ڈر گئی تھی پریں مطمئن تھی۔

”اپنے ماں باپ کی ہی عزت کا خیال کر لو زویا۔ زمانہ بھلے جتنا ہی ترقی کیوں نہ کر جائے عورت کی عزت ہر زمانے میں شیشہ ہوتی ہے اور اس کا نادانستگی اور نادانی میں اٹھایا جانے والا قدم اس شیشے کی شفافیت کو خراب کر دیتا ہے۔ صرف یہی ایک بات تم سوچ لو کہ جنہوں نے لڑکی کو گھر کی عزت بنانا ہوتا ہے لوگوں کے سامنے اس کا نام تک زبان پر لانے سے ڈرتے ہیں کہ رسوائی کی دھول ان کے گردار کو گہنا نہ دے۔ وہ بلند و بالا تک دعوے

کبائٹ اسٹڈی ہے یا کبائٹ آوارگیاں..... وہ چمچہ پلیٹ میں بیچ کر دہاڑے۔

زویا کو اپنے اوسان خطا ہوتے محسوس ہوئے اس نے چیر کا سہارا لے لیا۔ اگر جو پاپا نے تھوڑی سی مزید انوسٹی گیشن کی تو اس کی ساری پول کھل جائے گی۔ اپنی پریشانی میں اس نے یاں کی تاویل نہیں سنی جو وہ اس کے باپ کو دے رہی تھیں۔ وہ بس نظریں نیچی جھکائے باپ کو مگر جتا برستان رہی تھی..... اور اگر پاپا نے چیک کر لیا تو..... اس نے بیگ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے چور نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ پاپا کی طرف سے اسے فون سننے پر بھی پابندی تھی کجا کہ سیل فون رکھنا اور استعمال کرنا۔ باپ کے پیٹھ پیچھے جتنا بھی بول لیتی ان کے سامنے اس کی ٹھٹھی بن جاتی تھی کیونکہ سعید احمد نے شفیق روایتی باپ کا رول بھی نبھایا ہی نہیں تھا گھر میں ہر رشتے کے لیے وہ ایک ڈکٹیٹر تھے جو ہمیشہ حکم چلاتے، چیخے چلاتے نظر آتے۔ وہ تو شکر کرتی کہ پاپا زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتے تھے ورنہ چونکہ اس گھر کی فضا پر سہم طاری ہوتا۔ باپ کا رویہ کرخت تھا تو ماں نے بھی سہم پاس بٹھا کر ان کے مسئلے مسائل جاننے کی کوشش نہیں کی تھی، نہ ہی ایک مخصوص بے تکلفی موجود تھی ان ماں بیٹی کے درمیان جیسا کہ عموماً ہوتی ہے۔ اپنے ہی گھر میں وہ دونوں انجینی بن کر رہتے سو جب پہلی بار توجہ اور تعریف ملی..... اپنے آپ کو بہت روکنے کے باوجود وہ اس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اپنے اندر کی گھٹن کو نکالنے کے لیے اس نے جو چور دروازہ

ڈھونڈ نکالا تھا بھلے ہی غلط تھا پر اس کی تعریف اور کیئر اسے آسمان پر اڑالے جاتی تھیں دو ملاقاتوں میں ہی وہ انجانے ویس کے کئی سفر اس کے ہمراہ کرائی تھی۔ مہنی مجھے صبح بتا کر گئی تھی کہ وہ لیٹ ہو جائے گی، میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے اور سنی بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ کل ان تین دوستوں نے یہاں مل

نہیں کرتے عمل کرتے ہیں۔ پارکوں، ہوٹلوں اور گھر سے باہر کی جانے والی ملاقاتیں رسوائی، بدنامی کا پیش خیمہ تو ہو سکتی ہیں محبت اور عزت کا نہیں۔“ کوئل نے اسے کہا تھا۔

اور وہ دل ہی دل میں ہزار ہا خدشات لیے اس کی کسی بات کا جواب دیے بغیر چھٹی ہوتے ہی کالج سے نکل کر سائڈ والی گلی میں آگئی تھی جہاں روہیل اس کا منتظر تھا۔ زویا کو اب کوئی پروا نہیں تھی کہ صبح دین میں اس کے ساتھ آنے والی لڑکیاں کیا سوچیں گی کہ وہ کہاں گئی ہے نہ ہی کچھلی پار کی طرح اس نے کوئل کو کوئی تاکید کی تھی۔

”بس یہیں روک دو۔“ اپنے گھر سے تین چار گھنٹے چھوڑ کر اس نے بائیک رکوائی تھی۔

”سنو، گیارہ بجے میری کال کا انتظار کرنا۔“ روہیل یہ کہہ کر چلا گیا تھا۔ زویا سرشاری گھر لوٹ آئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ دھک سے رہ گئی۔ خلاف توقع پاپا کھانے کی ٹیبل پر موجود تھے۔ اس نے ڈرتے، ڈرتے سلام کیا تو جواب دیے بغیر انہوں نے نظر اٹھا کر سامنے والے کلاک کو دیکھا۔

”یہ تم روز اس ٹائم کالج سے آتی ہو یا آج آرہی ہو؟“ کرخت لہجے اور غصیلے تیور اس کے ہوش اڑا گئے۔

”وہ..... وہ پاپا..... پریکٹیکل تھا آج تو لیٹ ہو گئی ہوں۔“ سفید چہرہ لیے بیگ کے اسٹریپ کو مضبوطی سے پکڑے اس نے اپنی ٹانگیں کاٹتی ہوئی محسوس کیں۔

”تم نے کبھی اولاد پر چیک رکھنے کی کوشش کی ہے یا یونکی شٹر بے مہار چھوڑا ہوا ہے؟ دو بجے چھٹی ہو جاتی ہے اور تمہاری بیٹی جا رہے گھر آرہی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج پریکٹیکل تھا بھی یا نہیں؟ بیٹا ہے تو اسکول سے آنے کے بعد کھا کھا کر کبائٹ اسٹڈی کے بہانے غائب ہے۔ کبھی بتا بھی کیا کہ

کراسٹڈ کی تھی آج ایک دوست کے گھرباری رکھی تھی۔“ خدیجہ ان کو دھیما کرتے ہوئے بولی۔ اور ایک شاکی نظر آنسو پتی بیٹی کی طرف دیکھا۔

”اچھا، اچھا بس تم جیسی مائیں ہی ہوتی ہیں جو اولاد کے بیسوں پر پروہ ڈال کر ان کو تباہی کے دہانے لگا کر اُکرتی ہیں۔“ انہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ خدیجہ گہری سانس لے کر رہ گئی بولتی تو بھی بری بنتی۔ نہ بولتی تب بھی پھنکار اس کی قسمت میں لکھی تھی۔

”بہر حال، یہ اس سال اس کی پڑھائی کا جنٹ ختم کرواؤ ایک دور شستے ہیں میری نظر میں۔“ تم اپنے کمرے میں جاؤ بیٹی۔“ خدیجہ کی نظر بیٹی کے آنسوؤں سے تر چہرے پر پڑی۔ شوہر کی بات ان سنی کرتے اسے کمرے میں جانے کو کہا۔ زویا آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔

”بچوں کے سامنے ہی کم از کم لحاظ کر لیا کریں اور بیٹی کی عمر ہی کیا ہے یہ مشکل سولہ سال کم از کم بی اے تو کرنے دیں۔“ بے بسی اور اہانت کے شدید احساس سے خدیجہ کی آواز جھج گئی۔

”ہاں تو اس وقت کا انتظار کروں جب تمہاری اولاد میرے سر پر دھول ڈال کر نکل جائے اور میں سر پینتارہ جاؤں۔ تیور دیکھے ہیں اپنی اولاد کے۔“ اپنے کمرے کا پینڈل کھولتے جو پاپا کی آخری بات زویا کے کان میں پڑی اس نے اس کے اندر بغاوت کی ایک شدید لہر کو دوڑایا خون کی جگہ جسم میں گویا شرارے دوڑنے لگے۔ جھٹکے سے دروازہ کھول کر اس نے دہاز سے بند کیا اور فیک لگا کر نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

کتنی حسرت سے وہ کول اور دوسری لڑکیوں کے گھر کے ماحول ان کے والدین کے باہمی تعلق، ان کے پرنس کی شفقت کے حال سنتی تھی پر اپنی ذہنی توڑ پھوڑ کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے اپنے باپ کو اپنی ماں پر ہمیشہ جھنجھٹا تھا، ان سے

بے رخی ضرور برتتے پاپا پر کبھی ان پر بظاہر ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا پر کچھ عرصے سے وہ اور سنی بھی ان کے عتاب سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ والدین اپنے بچوں خصوصاً بیٹیوں کو جو مان اور اعتبار دیتے ہیں وہ تو ہمیشہ سے ان کے لہجے اور رویے میں مفقود تھا ہی اب تو شک کی زہریلی چنگاریاں بھی لب لب لہجے میں لودینے لگی تھیں۔ بے رخی کے بیج کودل اور روح کی سرزمین پر ڈالا جائے اور اسے اہانت۔۔۔۔۔

بڑھتی باری اور نفرت کا پانی دیا جانے لگے تو دل کی زرخیز زمین پر بہت کم عرصے میں ہی تناور درخت آگ آتا ہے پھر اس چیز پر بغاوت کے پھل لگتے ہیں اور اگر وہ بے اعتباری ماں باپ میں سے کسی ایک یا دونوں کی طرف سے ہو تو انسان بہت جلد ہی وہ پھل کھا لیتا ہے۔ پھر قصور چاہے جس کا بھی ہو نقصان دونوں کا ہوتا ہے۔ وقت گزر جانے کے بعد اس قصور کا ماتم تو کیا جاسکتا ہے مدد انہیں۔ سعید احمد کی بے رخی، بے اعتباری سے بغاوت تو خدیجہ کو بھی ہوئی تھی پر اس نے اس بغاوت کو اپنی کم گشتہ محبت میں لپیٹ لیا تھا صرف اس کا دل ویران ہوا تھا۔ اس کا گھر، اس کی دنیا اور آخرت بچ گئی تھی پر افسوس بیٹی اور سنی کے دلوں میں باپ کی طرف سے محبت کے دو الفاظ تک کا زور راہ نہ تھا جس کو سہارا مان کر وہ بغاوت سے منہ موڑ لیتے، انہوں نے اس چیز کو خوب بھٹنے پھونے دیا اور اب اس کا پھل تیار تھا۔ نقصان کہاں اور کس کا ہونا تھا یہ صرف کاتب تقدیر کو پتا تھا۔

☆☆☆

”قاری۔۔۔۔۔!“ ان کے لہجے میں جذبول کی تمام شدتیں تھیں۔ خدیجہ کے لیے آگ برسانے والی زبان میں اس وقت پھولوں کی سی نرمابھٹ تھی۔ ”آؤ قاری شادی کر لیں۔۔۔۔۔ ایک ہو جائیں۔ لہذا بن باس کاٹا ہے میں نے۔ ایک عرصہ رسائی کا دکھ سہا ہے۔ اب۔۔۔۔۔ اب زندگی کا باقی ماندہ سفر تمہاری ہمراہی



اور تو اور ایک دوسرے کو برتن یا کوئی چیز جو بھی سامنے نظر آئے دے مارتا بھی معمول کی بات ہے۔ ایک دو دن، ایک کامن مشرق کی جانب ایک کا مغرب کی جانب ہوتا ہے پر دو دن بعد یک جان دو قالب نظر آتے ہیں اور پھر کسی اگلی زبردست سی لڑائی کے لیے تیار۔ پتا ہے زویا، میں نے ہمیشہ ایک ایسی زندگی کا خواب دیکھا ہے جس میں، میں اپنے بچوں کو ایک آئینہ ماحول دوں۔ والدین کے درمیان اختلافات بھٹے جس سچ پر ہوں بچوں سے ان کو پوشیدہ رکھنا چاہیے ورنہ بچوں پر بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ والدین کا امیج تو بگڑتا ہے سو بگڑتا ہے اولاد کی اپنی شخصیت میں بھی کئی دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ ”وہ بولے کیا تو زویا کو ایسے لگا کہ اسی کے گھر کی کہانی اپنی زبان بیان کر رہا ہو۔ ان کے گھر بھی تو کم و بیش یہی ماحول ہوتا چوبیس گھنٹے بس فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے ماں باپ ٹکر کے تھے دونوں ہی بولتے جبکہ زویا کے پاپا ہی ماما کی زندگی اجیرن کیے ہوئے تھے۔ ماما کی مجال نہیں تھی پاپا کے سامنے کچھ بولنے کی ایک دوبار اپنے حق میں کچھ بولنا بھی چاہا پراختی سنا میں پاپا نے کہ اس دن کے بعد سے ان میں جرات نہ ہوئی کچھ بولنے کی۔ بس چپ چاپ سنے جاتیں۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔“

”اب یہی دیکھو زویا، ماما میری تعلیم مکمل ہونے کے بعد میری شادی میری خالہ کی بیٹی سے کرنا چاہتی ہیں اور بضد ہیں کہ منگنی ابھی کر دی جائے جبکہ پاپا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی بہن کی بیٹی کو میرے حوالے سے اس گھر میں بہو بنا کر لے آئیں اور میں..... میری کوئی پسند نہیں ہے گویا..... صبح شام لڑائی کے اس وراز ہوتے سلسلے کو دیکھ کر بس پریشان ہی ہوتا رہتا ہوں۔“ اس نے کسی سوچ میں کم زویا کو نئی صورت حال سے آگاہ کیا۔

”روحیل کل جب میں گھر واپس گئی تو.....“

میں گزارنا چاہتا ہوں۔ دل کی خوشی کیا ہوتی ہے کبھی برتا نہیں اس لفظ کو۔“ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے وہ نرمی سے بولتے چلے گئے تو فاریہ نے اپنے ہاتھ ان کی گرفت سے آہستہ سے نکال لیے۔

”اب تو وقت گزر گیا ہے سعید۔ تمہارا گھر ہے، بیوی، بچے ہیں۔“ وہ غم لہجے میں گویا ہوئی۔

”تو..... تو کیا ہوا فاری میں ان کو تو نہیں چھوڑ رہا۔ میرا بھی زندگی پر، اس کی خوشیوں پر کچھ حق ہے۔ بیٹی کی میں کچھ دنوں میں شادی کرنے والا ہوں۔ بچے کا شوق ہاڑا سڈیز کے لیے ایروڈ جانے کا ہے باقی رہی ضد بچہ تو اس کی طرف سے بے فکر ہو۔ پہلے تو ان کو پتا ہی نہیں چلے گا، چل بھی جائے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم نہ ملیں تو اور بات تھی تمہارے ہوتے ہوئے وہ بھی ایسی صورت میں جب تم اکیلی ہو..... میں ایسے کیسے رہنے دے سکتا ہوں تمہیں؟ اس طرح تنہا۔“ وہ دو ٹوک بولے اور جواب کے لیے منتظر نظروں سے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

”مجھے..... مجھے کچھ سوچنے کا وقت دو سعید..... زیادہ نہیں ہفتہ دو ہفتہ..... بزنس کے حوالے سے کچھ ضروری فیصلے کرنے ہیں۔“ فاریہ نے آہستہ سے کہا جیسے فیصلہ کرنے میں کسی تذبذب کا شکار ہو۔

”ہاں فاری لے لو ٹائم..... لیکن پھر فیصلہ میرے حق میں ہی ہونا چاہیے۔“ سعید احمد نے استحقاق سے کہا تو فاریہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ جسے دیکھ کر وہ خود بھی کھل اٹھے تھے۔

☆☆☆

”پتا ہے زویا، میں نے گھر میں ہمیشہ دولت کی تو ریل چیل دیکھ ہے پرسکون کا فقدان رہا ہے ہماری زندگیوں میں۔ بابا اور ماما کو ہمیشہ کسی نہ کسی بات پر لڑتے دیکھا ہے۔ لڑائی میں کچھ نہیں دیکھتے، اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلیم یافتہ وہ دو مہذب افراد لڑتے ہوئے ساری تہذیب ساکڑ پر رکھ دیتے ہیں

اور وہ آہستہ آہستہ ساری باتیں اسے بتاتی چلی گئی۔  
 ”پاپا کہتے ہیں کہ جلد ہی کوئی رشتہ دیکھ کر مجھے  
 رخصت کر دیں گے۔ میں ان کے نزدیک ناقابل  
 اعتبار ہوں۔ کہتے ہیں کہ زیادہ دیر گھر میں بٹھائے  
 رکھا تو ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا دوں گی۔ ان کی یہ  
 باتیں میرے دل و دماغ میں آگ لگائے ہوئے  
 ہیں۔ ایسے ہوتے ہیں والدین؟ ایسے ہوتے ہیں  
 باپ؟ میری کلاس فیلو زاپنے پیرئش کی محبت، گھر کے  
 خوشگوار ماحول کی باتیں کرتی ہیں تو مجھے لگتا ہے سب  
 مجھے چڑا رہی ہوں۔ میرا مذاق اڑا رہی ہوں۔ کبھی  
 کبھی تو میرا دل کرتا ہے کہ خودکشی کر کے اس دنیا سے  
 چھٹکارا حاصل کر لوں۔“ یاسیت سے وہ اپنے دل کی  
 حالت بیان کرتی چلی گئی۔

”ارے..... ارے ایسا غضب مت کرنا.....  
 خودکشی کر کے مرنے سے نقصان کس کا ہوگا..... تمہارا  
 ماں اور کسی کو کیا فرق پڑے گا۔ تمہارے پاپا خوش  
 ہو جائیں گے جان چھوٹ گئی۔ دیکھو یہ ہماری زندگی  
 ہے اس پر سب سے زیادہ حق ہمارا ہے۔ اگر ہمارے  
 پیرئش کو ہمارا خیال نہیں ہے تو ہم کیوں کسی کا  
 سوچیں۔ کیا ہمیں خوشیاں حاصل کرنے کا کوئی حق  
 نہیں؟“ جذباتی ہوتے ہوئے وہ اسے بغاوت کے  
 سنے اسباق پڑھا رہا تھا اور کئی باغی سوچیں زویا کے  
 ذہن کی دھرتی پر نمودار ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

”فاری میری زندگی..... میری جان میں آج  
 بہت خوش ہوں۔ دنیا جہان کی خوشیاں گویا میرے  
 قدموں تلے آ بسی ہیں۔“ وصل کے لمحوں سے سرشار  
 سعید احمد مدہوش سے لہجے میں بولے تو فاریہ بھی  
 مسکرا دی۔ سعید احمد کا التفات اور اصرار آخر اسے بھی  
 حتمی فیصلہ کرنے پر مجبور کر ہی گیا تھا۔ کل ہی ان کا  
 نکاح ہوا تھا۔ فاریہ کے بے حد اصرار پر وہ لوگ  
 فاریہ کے گھر پر ہی تھے۔

”اب جب ہم دونوں ایک ہو چکے ہیں سعید تو  
 پھر کیا حیرا کیا میرا.....“ انہوں نے جب فاریہ کو  
 نئے فلیٹ میں لے جانے پر اصرار کیا تو اس نے کہا  
 تھا۔ ”میں نے اپنا بہت سارا وقت یہاں گزارا ہے۔  
 میرے بابا کی یادیں ہیں سعید اس گھر میں..... میں  
 اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔“ فاریہ نے وجہ بتائی تو  
 وہ..... چپ ہو گئے تھے۔ خدیجہ سے ایک ہفتے کے  
 برنس ٹور کا کہہ کر وہ فاریہ کے ساتھ شمالی علاقہ جات  
 ہو کر آئے تھے۔ ہاں گھر میں ان کے تیور وہی تھے  
 پہلے جیسے۔ سنی کو البتہ ایک دن اسکول میں کسی کلاس  
 فیلو سے ان کی دوسری شادی کا پتا چلا تھا۔ وہ تو اس  
 لڑکے سے لڑنے مرنے کو آ گیا تھا۔ بس چھٹی ہونے  
 کا انتظار کیا تھا اور گھر آ کر اس نے غصے میں بہت توڑ  
 پھوڑ کی۔ بہت چیخا چلا یا۔ خدیجہ تو یہ سن کر ہی سناٹے  
 میں آ گئی۔

”سنی ایسے مت کر دینا، لوگوں کی تو عادت  
 ہوتی ہے فضول میں دوسروں کے گھروں میں تاک  
 جھانک کر کے معاملات بگاڑنے کی۔ تمہارے پاپا  
 آجائیں پھر ان سے پوچھ لینا کہ کیا بات ہے۔“  
 ”چالیس لڑکوں کی کلاس میں ایک مجھے ہی  
 کیوں کہا ماما اس نے کہ تمہارے پاپا نے ایک برنس  
 دومن سے شادی کر لی ہے اور لاسٹ ویک اس کے  
 ساتھ بھور بن گئے تھے۔ وہ تو بتا رہا تھا کہ کل اس کے  
 پاپا نے ان دونوں کو میریٹ میں ڈنر کرتے بھی دیکھا۔  
 میں کہتا ہوں کہ آخر ان کو ضرورت ہی کیا ہے جھوٹ  
 بولنے کی۔ ایک اور لڑکا کہنے لگا۔ ”واہ سنی تم لوگوں کے  
 تو دارے تیارے ہو گئے خوب صورت اور نئی تو ملی ماما  
 بھی مل گئیں اور ان کی بے شمار دولت الگ۔ تمہارے  
 پاپا نے کسی طور بھی گھانے کا سودا نہیں کیا یا۔“ مجھ  
 سے کلاس میں بیٹھنا دو بھر ہو گیا۔ ”اب کے وہ ماما کی...  
 خود..... میں مردے کر رہا ہوں۔“

”پاپا کو کیا ضرورت تھی ماما ایسے کرنے کی؟

برداشت نہیں کروں گا میں۔“ انگلی اٹھا کر وارن کرنے کے انداز میں انہوں نے سنی سے کہا اور ایک جتنا نظر خدیجہ پر ڈال کر اندر چلے گئے۔

”آئی بیٹ یو پاپا..... آئی بیٹ یو۔“ وہ بند دروازے کو دیکھ کر زور سے چلایا تو خدیجہ نے آگے بڑھ کر اسے قابو کرنا چاہا۔

”میں شوٹ کر دوں گا ماما اس عورت کو۔“ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور لہجہ بے حد باغی تھا۔

”اس کو شوٹ کر دو گے اور خود جیل چلے جاؤ گے؟“ ہنی نے سپاٹ انداز میں پوچھا۔

”ہاں چلا جاؤں گا جیل لیکن میرے دل کے اندر جو آگ لگی ہے وہ ایسے ٹھنڈی نہیں ہوگی۔ تم نہیں سمجھتی ناں ہمارے اسکول میں درنہ دیکھتیں ہر چہرہ جیسے میرا مذاق ازار ہا تھا اور ہر آنکھ خود پر ہنسی لگ رہی تھی۔“

”بس کرو..... خدا کے لیے بس کرو سنی۔ میرا ہی خیال کر لو۔“ خدیجہ میں اس سے زیادہ برداشت کرنے کی سکت نہیں تھی وہ کہتے ہوئے ہر صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ تمام کر رو پڑی۔ ہنی نے غصے سے بھائی کو دیکھا اور ماں کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور باں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا اپنے لمس سے ان کو تسلی دے بیٹھا ہو۔ سنی کا غصہ بھی ماں کو روتے دیکھ کر جھاگ بن گیا تو وہ بھی ان کے دوسری طرف آ کر بیٹھا۔

”آئی ایم سوری ماما..... میرا مقصد آپ کو دکھ دینا نہیں تھا لیکن بیوی بابا نے بہت برٹ کیا ہے۔ پوری لائف انہوں نے بغیر کسی وجہ کے آپ پر برستے گزاری اور اب جوان اولاد کے ہوتے ایسا شرم ناک اسٹیپ اٹھا لیا۔“ وہ ماما کے ہاتھ کو تھکتے ہوئے بولا۔

”کچھ بھی ہو جائے سنی تم وعدہ کر دو کہ کوئی بھی ایسا قدم نہیں اٹھاؤ گے جو مجھے دکھ پہنچائے۔ میرا سب کچھ تم دونوں ہو اور میری تمام امیدیں تم سے

انہوں نے ایک ہل کو ہمارا سوچا نہ آپ کا۔ کس چیز کی کمی تھی انہیں؟“ اس کے کسی سوال کا جواب خدیجہ کے پاس نہیں تھا۔ ابھی تو ہنی کالج سے نہیں لوٹی تھی اس کا رد عمل بھی کم و بیش ویسا ہی ہوتا۔ اس دن ہنی بہت لیٹ آئی تھی۔ ابھی خدیجہ اس سے باز پرس کرنا ہی چاہتی تھی کہ سعید احمد کی آمد ہوگئی۔ کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں جاتا ہی چاہتے تھے کہ سنی کسی کونے سے نکل کر ان کے سامنے آگیا۔

”کیا یہ بات سچ ہے کہ آپ نے دوسری شادی کر لی ہے؟“ اس کے اس سوال پر انہوں نے اپنے سامنے تن کر کھڑے سنی کو دیکھا ایک نظر اپنی سائنڈ پر کھڑی خدیجہ کو اور اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہنی کو۔

”اگر میں کہوں ہاں تو.....؟“ وہ اپنی طبیعت کے خلاف سکون سے بولے۔ خدیجہ وہیں ساکت ہوگئی۔ اس کی عمر بھر کی ریاضت رائگاں چلی گئی تھی جبکہ ہنی کے دل میں باپ کے خلاف نفرت کی ایک زوردار لہر نے سر اٹھایا۔

”کیوں.....؟“ سنی منھیاں بھیج کر حلق کے بل چیخا۔

”میں اس بات کے لیے تمہارا جواب دہ نہیں ہوں۔ وہ یہاں نہیں آئے گی نہ ہی تم لوگوں سے اس کا کوئی تعلق ہوگا۔ تمہاری ضروریات، طرز زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اس کے آنے سے۔“ وہ کہہ کر سائنڈ سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

”اور میں اپنی ماما کی جگہ کسی ایری غیری آوارہ عورت کو نہیں دے سکتا۔“ سنی نے ایک بار پھر چیخ کر کہا پر اس بار ان کے ہاتھ اس کے منہ پر لگنے والا پھنٹر اتنا شدید تھا کہ سنی گال پر ہاتھ رکھے لڑکھڑا گیا۔

”اس نے تمہاری ماں کی جگہ نہیں بلکہ تمہاری ماں اس کی جگہ پر چلی آئی تھی۔ میں وضاحتیں دینے کا قائل نہیں ہوں پر آئندہ اس قسم کی فضول گوئی



وابستہ ہیں۔“ اب وہ آنسو پونچھ کر بولیں۔

☆☆☆

سعید احمد کو سنی کے تور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہے تھے پر قاریہ کی رفاقت کچھ ہلکی کو انہیں ساری فکریں ضرور بھلا دیتی تھی۔ آج وہ دونوں لٹچ پر آئے تھے۔ قاریہ شادی کے بعد بہت خوب صورت ہو گئی تھی جیسے یونیورسٹی کے دنوں میں تھی۔ حقیقی خوشی کا عکس ایسے ہی چہرے پر روشنی بن کر چمکتا ہے۔ ابھی کھانا لگنے میں کچھ دیر تھی سو وہ دونوں یونیورسٹی کے دنوں کی خوشگوار یادوں میں مگن تھے۔ جب سعید احمد کی نظر کوٹنے میں رکھی ایک ٹیبل پر گئی اور واپس پلٹنا بھول گئی۔

”زویا یا اردو دن سے گھر نہیں جا رہا ہوں۔ سمجھ نہیں آتا کیا کروں، میری وجہ سے ماما اور بابا کا جھگڑا شدید نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ بابا کے کہنے کے مطابق پھوپھو اور ان کی دختر نیک اختر ہمارے گھر پر براجمان ہیں۔ بابا کا خیال ہے جلد از جلد میرا اور اس کا نکاح کر دیا جائے جبکہ ماما کا اصرار ہے کہ بابا سے چوری میں ماما کی بھانجی سے ارجنٹ نکاح کر لوں تاکہ بعد میں بابا کچھ نہ کر سکیں۔ میں نے آج تمہیں اسی لیے ارجنٹ بلوایا ہے کہ اب تمہاری محبت کے امتحان کا صحیح وقت آ گیا ہے۔ تم بتاؤ کہاں تک میرا ساتھ دے سکتی ہو؟“ پوری بات کرنے کے بعد وہ ڈرامائی وقفہ دے کر بولا تو زویا گھبرا گئی۔

”کیا مطلب روجیل، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو، میں سمجھتی نہیں.....؟“

”میں سمجھتا ہوں۔ میں اس طرح بغیر اپنے پیرنس کی کسی بھی قسم کی سپورٹ کے اگر تمہارے پیرنس کے پاس رشتہ لے کر آتا ہوں تو کسی بھی صورت قبول نہیں کیا جاؤں گا جبکہ ایک بار میں گھر واپس چلا گیا تو بابا یا ماما کسی کی بھی ایموشن بلیک میننگ مجھے کسی بھی ان چاہے رشتے میں بندھنے پر

مجبور کر سکتی ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں نکاح کر لینا چاہیے۔“ اطمینان سے اپنے فیصلے کے اسباب اور خدشات بتاتے ہوئے اس نے زویا کے سر پر ہنر بھروسہ ڈالا۔ زویا بہت دیر بعد کچھ کہنے کے قابل نہ ہو سکی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو روجیل، میرے بابا کبھی نہیں مانیں گے پر میں ایک دفعہ اپنی ماما کو ضرور اعتماد میں لینا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارا ساتھ ضرور دیں گی۔“

”پر یار جیسا تم نے بتایا تھا تمہاری ماما بہت ڈرتی ہیں تمہارے بابا سے اور گھر میں سارا ہولڈ تمہارے بابا کا ہی ہے تو تمہاری ماما بھی کچھ نہیں کر سکتیں نہ اسٹینڈ لے سکتی ہیں۔ ہاں نکاح ہو جانے کے بعد ہم انہیں بتا دیں گے پھر تو لازمی تمہاری اور میری فیملی کو سب کچھ ماننا ہی پڑے گا۔“ اس کا مثبت رد عمل دیکھ کر روجیل مزید پرجوش ہو کر بولا۔

”پر..... روجیل.....“ زویا کچھ تذبذب کا شکار تھی۔ ”سب سے چھپ کا یہاں تک چلے آنا ایک اور بات تھی پر نکاح جیسا انتہائی قدم..... اچھا میں تمہیں سوچ کر بتاتی ہوں۔“ روجیل کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر زویا کی جان پر بن آئی۔

”سوچنے کا ہی تو وقت نہیں ہے زویا۔“ وہ جھنجھلایا۔ ”تم ایسا کرو آج کی رات سوچ لو صبح مجھے کال کر دینا کہ تمہارا کیا فیصلہ ہے۔“ مگر زویا نے اس کی آخری بات سنی کہاں تھی۔ سامنے نظر پڑتے ہی اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ روجیل ارے، ارے کرتا اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا اور اس کے بے حد اصرار پر روجیل نے اسے جلدی سے گھر کے پیچھے والی روڈ پر اتار دیا اور اس کے بدلتے رویے کی وجہ پوچھتا ہی رہ گیا پر زویا اپنے حواسوں میں کہاں تھی وہ اس کی کسی بات کا جواب دیے بغیر جلدی سے

کہاں غائب ہے۔“ معید احمد کے نئے کچوکے نے خدیجہ بیگم کو توڑ ہی ڈالا۔

”یہاں سے تو اسکول کے لیے ہی جاتا ہے۔ اب مجھے کیا معلوم کہاں جاتا ہے؟ پہلے تو کچھ ایسا نہیں کیا۔“ وہ روہا کی ہو کر بولیں۔

”میں پہلے ہی لڑکیوں کی اتنی تعلیم کے خلاف ہوں۔ میٹرک کافی تھا تمہاری اس ناخلف اولاد کے لیے۔ مری جاری تھی تم کہ کالج میں داخلہ دلو اور اس دیکھ لیا نتیجہ اب کالج بھیجنے کا۔ اس سے کہو دفع ہو جائے، دور ہو جائے میری نظروں سے۔ کرتا ہوں کچھ بندوبست اس کا بھی۔“ وہ دھاڑ کر بولے تو زویا ایک کٹیلی نظر ان پر ڈال کر جلدی سے بیگ منہال کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ انتہائی فیصلہ جو وہ کرتے ہوئے سو بار سوچتی سعید احمد کی سختی، ان کے سخت الفاظ اور اہانت بھرے لہجے نے اس سے سیکنڈوں میں کروا لیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پہلا فون روہیل کو اپنی رضا مندی کا کیا اور پروگرام پوچھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ روہیل اسے آہستہ، آہستہ ساری تفصیل بتانے لگا۔ اس پل ایک لمحے کو بھی اس نے اپنی ماں کا نہیں سوچا جس پر زندگی کا دائرہ حیات پہلے ہی تنگ تھا اب زویا کے اس قدم سے کیا ہونا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔

بچی عمر کی سادہ لڑکی  
تم جو کچھ سوچ رہی ہو  
کرنے کو پر تول رہی ہو  
مینہی باتیں، سنہریے سننے  
طلسمی وعدے، رنکس چاہتیں  
ان دیکھا ایک جال ہے  
جس میں تم بھنس جاؤ گی  
پھر نکل نہ پاؤ گی  
بچی عمر کی سادہ لڑکی

☆☆☆

سڑک کر اس کر گئی۔ اسے ان سے پہلے گھر پہنچنے کی جلدی تھی پر آج شاید اس کے ستارے گردش میں تھے۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا اور داخل ہوتے ہی لاؤنج میں پہلی نظر ادھر سے ادھر ٹپکتے پاپا پر پڑی۔

”میں جھوٹ بولتا ہوں ناں تو پوچھو اپنی لاڈلی سے کہ کہاں سے، آوارہ گردیاں کر کے آرہی کالج کے بہانے سے۔ کون تھا اس کے ساتھ؟“ بے دردی سے زویا کا ہاتھ پکڑ کر سعید احمد نے اسے ایک طرف ہر اسماں کھڑی خدیجہ کے پاس دھکیلا۔ زویا کے حواس سن ہو گئے۔ اسے لگا قیامت کا لمحہ آچکا تھا۔ وہ جو کبھی بھی کہ انہوں نے اسے نہیں دیکھا، وہ ان کی نظروں سے بچ گئی تو وہ اس کی بھول تھی۔

”مہنی آپ کے پاپا کیا کہہ رہے ہیں؟ کہاں سے آرہی ہیں آپ؟“ خدیجہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف موڑا اور زویا کا نظریں چراگنا خدیجہ کا کلیجہ دھلا گیا۔

”آج سے اس کا کالج جانا، باہر نکلتا سب بند۔ کاظمی صاحب نے ایک دفعہ اپنے بیٹے کے رشتے کا ذکر کیا تھا میں آج ہی ان کا پتا کرتا ہوں۔ ایسی اولاد سے تو بے اولاد ہونا بھلا جو بڑھاپے میں رسوائی کا سامان کرتی پھرے۔ کس دیدہ دلیری سے اس آوارہ لڑکے کے ساتھ وہاں بیکھرے اڑانے لگی تھی۔“

”آپ بھی تو نئی ٹویلی کے ساتھ کچھ سے اڑانے میں مصروف تھے وہاں۔ ہونہ۔۔۔ اپنے لیے اور اصول اور دوسرے کے لیے دوسرے اصول۔“ ایک بانگی سوچ کی لہر زویا کے دماغ میں کروٹ لے کر بیدار ہوئی۔

”کون سے بچوں کی فوج لگی ہوئی تھی یہاں جو تم توجہ نہیں دے پامیں۔ دو ہی تو بیٹے تھے ان کی بھی تربیت نہ ہو سکی تم سے۔ بیٹا ہے تو تعلیمی قابلیت زیرو کل پرنسپل صاحب کا فون آیا تھا۔ نو دن سے غائب ہے وہ اسکول سے۔ کچھ پتا ہے کہ اسکول کے بہانے

سنی کے گھر لوٹنے پر اب ایک اور تماشا ہوا تھا۔ سعید احمد سنی پر خوب چلائے تھے جواب میں وہ کون سا کم تھا۔ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو بدو جواب دے تھے۔

”تمہیں لوگوں کی فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا کام ہوتا ہے باتیں بنانا۔ ایک دو دن ایک موضوع پر بات کر کے وہ تھک کر نئے موضوع کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ فضول لوگوں کی فضول گوئی کی خاطر تم اپنا گیر خراب کر دو گے کیا۔۔۔۔۔؟“ وہ دھاڑے۔ جواب سنی نے کہا کہ اسے کسی اور اسکول بھیجیں یا اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ سعید احمد کو بھی ٹھیک ٹھاک غصہ آیا تھا اس کی بات سن کر۔

”دماغ خراب ہے تمہارا، سیشن کے اینڈ پر جب تمہارے اینول ایگزام میں صرف دو ماہ رہ گئے ہیں۔ کون سا انشینیوٹ تمہیں داخلہ دے گا اس وقت؟“

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا پاپا۔ آپ نے ساری عمر ماما کو کوئی سکھ نہیں دیا اور عمر کے اس حصے میں آکر سب کچھ برباد کر دیا آپ نے۔ ہماری زندگی ہمارا گیر سب کچھ۔۔۔۔۔ آئی ہیٹ یو پاپا۔ آئی ہیٹ یو۔“ سرخ چہرے اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ جواب میں شوہر۔۔۔ کی بری بھلی سننے کو خدیجہ گئی جسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے گھر کے منشی شیراز سے کو کیسے سمیٹے۔ شوہر کی ستم ظریفیاں کم تھیں جو اب اولاد بھی ہٹ دھری پر اتر آئی تھی۔ دونوں باپ بیٹا اپنا غصہ اتار کر اپنے، اپنے کمرے میں بند تھے جب تکے، تھکے قدم اٹھاتی خدیجہ، زویا کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ بستر پر اوندھی پڑی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر زویا نے مندی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا منہ سرخ اور آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔

خدیجہ بھی آکر بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ ”میری محبت اور اعتبار میں کیا کمی رہ گئی تھی جو آپ ایسی راہ پر چل پڑیں جو قطعاً شریف بیٹیوں کا شیوہ نہیں ہے اور جس کا انجام رسوائی اور بدنامی کے سوا کچھ نہیں۔ اپنے پاپا کا نہ سنی آپ نے ایک بار بھی سزا نہیں سوچا کہ آپ کو تو جو رسوائی اور بدنامی ملے گی سو ملے گی کیا میں زندہ رہ پاؤں گی؟“ وہ رو پڑی۔ ”میری اس دکھی زندگی میں خوشی کے جو ایک دو جگہ ہیں تم دونوں کے دم سے ہیں۔ کون ہے وہ لڑکا؟ اور آپ کیوں لگیں اس کے ساتھ کہیں ہنی؟ سوچ، سوچ کر میری دماغ کی رگیں پھٹنے کے قریب ہیں کہ میری وہ ہنی جسے میں نے زمانے کی سخت ہوا سے بھی بچا کے رکھا آج اتنی باغی ہو گئی کہ ماں باپ کی نظروں میں دھول جھونک کر ایک انسان لڑکے سے ملنے چلی گئی۔“ غم دغصے سے اس کی آواز لرز رہی تھی اور آنکھیں نم تھیں۔

”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور میں بھی۔۔۔۔۔“ اب کے ساکت بیٹھی زویا کے وجود میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بول اٹھی۔

”ہونہ شادی۔۔۔۔۔ میں کالجوں، یونیورسٹیوں میں نہیں پڑھی نہ زیادہ دنیا دیکھی ہے پر میرا تجربہ اور مشاہدہ تم سے کہیں زیادہ ہے۔ پارکوں، سڑکوں، ہوٹلوں میں کی جانے والی ملاقاتیں بے راہ روی اور بے حیائی کے زمرے میں آتی ہیں۔ کوئی بھی مخلص بندہ اپنی عزت جسے بنانا چاہتا ہے اسے لے کر ادھر ادھر رلتا نہیں پھرتا۔ احترام سے اپنے والدین کے ذریعے بات کو بڑھاتا ہے۔ وہ بھی اگر مخلص ہوتا۔۔۔۔۔ تو اپنے ماں باپ کو بھیجتا۔ تمہیں اتنی سامنے کی بات دیکھ کر بھی عقل نہیں آئی۔ اپنے پاپا کی نظر میں تو اعتبار کھو ہی چکی ہوئی اب۔۔۔۔۔“

”تو ان کی پروا ہی کسے ہے۔ انہوں نے اپنی لائف سیٹ کرتے ہوئے ہم سے پوچھا تھا کیا اور



### عیب پوشی

☆ اگر تم کوئی عیب پاؤ تو یہ خلا پڑ کر دو..... بلند و بالا ہے وہ ذات جس میں کوئی عیب نہیں۔

☆ بعض لوگ خواہ مخواہ معاملات کو ان کے سائز سے زیادہ اہمیت دے کر اپنے اعصاب جلاتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی وہ خطائیں جو آپ کی نظروں سے پوشیدہ ہیں، انہیں کرید کر نکالنے کی کوشش نہ کریں۔ دوسروں کے عذر قبول کرنے میں کشادہ دلی کا مظاہرہ کریں۔

☆ جو اپنے بھائی کا عیب تلاش کرتا ہے، اللہ اس کا عیب تلاش کرتا ہے اور جس کے عیب کے درپے اللہ ہو جائے تو وہ اسے اس کے گھر میں ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔

جی ہاں اغلیطیوں کا شمار نہ کیجیے..... لوگوں کے عیب تلاش نہ کریں..... کشادہ دل بننے کی کوشش کریں..... خاک اڑانے کی کوشش نہ کریں..... وہ جیٹھی ہے تو اسے بیٹھا رہنے دیں، البتہ اگر خاک اڑنے لگے تو آستین سے ناک ڈھک لیں اور اپنی زندگی کا لطف اٹھائیں۔

انتخاب: زندگی سے لطف اٹھائیے  
(از عبد الرحمن العریفی)

مرسلہ: ماہ نور خان، بہارہ کہو

آپ ان کی تو بات ہی مت کریں۔ مجھے نفرت ہے ان سے۔“ خدیجہ کی بات پوری ہونے سے قبل وہ بٹ دھرمی سے بولی۔

”روحیل کے ماما یا اس کی شادی اپنے اپنے ریلیٹو میں کرنا چاہتے ہیں اس پر بہت اسٹریس ہے ان کا۔ پلیز ماما مجھے روحیل سے شادی کرنی ہے، آپ ہمارا ساتھ دے دیں۔ اس کے ماما یا باپ بھی ہمارے گھر رشتہ لے کر نہیں آئیں گے۔“ وہ اور بھی کچھ بولتی لیکن خدیجہ کا ایک تھپڑ دیا کو چپ کر وا گیا۔

”میں نے تمہاری ایسی تربیت نہیں کی تھی۔ ایک راہ چٹا لڑکا تمہیں جو بکواس کرتا ہے اس کا تم یقین کر لیتی ہو اور میں تمہاری ماں ہو کر سمجھنے سے تمہیں جو سمجھا رہی ہوں وہ تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔

تمہارے پاپا میٹرک کے بعد تمہیں پڑھانے کے حق میں نہیں تھے، یہ میں تھی جس نے تمہارے آگے پڑھنے کی راہ ہموار کی پر یہ نہیں جانتی تھی کہ رسوائی کا ایک گڑھا خود کھود کر تمہیں اس میں چھلانگ لگانے کو کہہ رہی ہوں۔ اب ان حالات میں، میں بھی تمہارے لیے کوئی اسٹینڈ نہیں لے سکتی۔ اس لڑکے سے کہو اپنے ماں باپ کو لے کر آئے۔ میں ایک بار تمہارے پاپا کو منانے کی کوشش کروں گی۔ اگر نہیں تو اسے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ اور کسی بھی جگہ شادی کے لیے تیار ہو جاؤ جہاں ہم چاہیں گے۔ تمہیں جتنا پڑھانا تھا وہ ہم پڑھا چکے، تم پر اعتبار کرنے کا صلہ بھی مل گیا ہمیں..... آئندہ کے لیے تمہارا کالج جانا بھی بند ہے۔“ خدیجہ نے ایک ساتھ کئی ہم زویا کے حواسوں پر گرائے اور قطعی لہجے میں کہتی اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ زویا کی آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں سے لبریز ہوئیں اور اس نے کچھ سوچ کر اپنے کچھ دیر قبل کے فیصلے پر حتمی مہر لگا دی۔

”آپ بھی پاپا کی طرح چٹکیں۔ ماما ایک بار بھی میری خوشی کا خیال نہیں کیا۔“ پاپا سے تو بچے بچے ہی

اب ماما بھی بچی نہ رہ سکی تھیں۔ وہ ساری رات زویا کی آنکھوں میں کئی تھی۔ اذانوں کے بعد اس نے وضو کر کے نماز پڑھی اور استقامت اور راہ ہدایت مانگنے کے بجائے محبت مانگی تھی۔ ماما نماز کے بعد تھوڑی دیر قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے بعد کچن میں ناشتا بنانے کے لیے آ جاتی تھیں وہ ایسے وقت میں جانا چاہتی تھی گھر سے جب ماما پاپا اپنے کمروں میں ہوں۔ تو اسے یہی وقت مناسب لگا۔ اس نے کالج بیگ کو بکس سے خالی کیا اس میں اپنا ضروری سامان رکھا اور دھڑکتے دل سے بیگ کو تھامے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ابھی تک کمروں سے کوئی بھی باہر نہ نکلا تھا ہر طرف ہوکا عالم تھا وہ موقع غنیمت جان کر تیز، تیز قدموں سے چلتی باہر آ گئی۔ شوخی قسمت کہ گیٹ پر چوکیدار بھی موجود نہ تھا وہ چھوٹا گیٹ کھول کر باہر نکل آئی اور گلیوں میں سے گزرتی مین روڈ تک آئی جہاں روجیل گاڑی لیے اس کا منتظر تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اشارت کر دی۔ ایک حوا کی بیٹی آدم کے بیٹے کے دکھائے ہوئے پُر فریب جال میں پھنسی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

خدیجہ نماز و قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہو کر باہر آئی اور زویا اور سنی کے کمروں کے دروازے بجائے کہ اٹھ کر نماز پڑھ لیں۔ زویا تو اٹھ جاتی تھی لیکن سنی سستی کر جاتا تھا۔ سعید احمد الہیہ صبح کی نماز کا تکلف ذرا کم ہی کرتے تھے۔ وہ آفس جانے سے بیس منٹ پہلے اٹھتے اور ناشتا کر کے تیار ہو کر آفس سدھارتے۔ خدیجہ کچن میں آ کر ناشتا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اپنے مخصوص ٹائم پر سعید احمد بھی نیبل پر آ گئے اور خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ سنی سے ہونے والی رات کی ٹڈ بھڑ کے بعد موڈ ابھی تک گبڑا ہوا تھا۔ خدیجہ نے بھی خاموشی میں عافیت جانی۔ ان کے ناشتے کے لوازمات پورے کرنے

کے بعد وہ ایک بار پھر بچوں کے کمروں کی جانب آ گئی۔ سنی کا دروازہ بجانے پر اس کی نیند میں ڈوبی آواز آئی کہ وہ آرہا ہے جبکہ زویا کے دوازے پر دستک دی ہی تھی کہ بے آواز حرکت کے ساتھ دروازہ کھل گیا انہوں نے یونہی دروازہ کھول کر زویا کو آواز لگائی اور خود بھی آگے بڑھ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ بے شکن بستر اس بات کا گواہ تھا کہ رات اس پر کوئی سویا ہی نہ تھا نہ جانے کیوں خدیجہ کا دل دھک سے رہ گیا، کسی برے خدشے کے تحت اس نے آگے بڑھ کر داش روم کا دروازہ کھولا تو خالی داش روم اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔ وہ حواس باختہ واپس لوٹنے لگی جب سائڈ ٹیبل پر رکھے گلدان کے نیچے ایک سفید پرچہ دبا نظر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر تیزی سے وہ اٹھایا اور اس پر نظریں دوڑانے لگی۔

”ماما“

مجھے نہیں پتا کہ پاپا سے آپ کا کیا اختلاف تھا۔ پاپا آپ کو کیوں ناپسند کرتے تھے پر آپ کی ضد میں انہوں نے اپنی اولاد کو کبھی وہ پیارا، اعتماد اور محبت دی ہی نہیں جو ایک اولاد کا حق ہوتی ہے۔ انہیں راضی کرنے کے چکر میں آپ ہمیں بھی بھول گئیں مگر مجھ میں نہ تو اتنا حوصلہ ہے نہ اہمیت کہ آپ جیسی زندگی گزاروں کہ ایک مرد کو خوش دیکھنے اور خوش کرنے میں ساری زندگی اس کے ماتھے کی تیوریاں گننے، زبان کے تیرول پر سہنے اور ذلت کو اپنی روح پر محسوس کرنے میں گزار دوں۔ زندگی کی خوشیوں پر میرا بھی حق ہے اور میں زندگی سے وہ خوشیاں وصول کرنے نکلی ہوں۔ وہ بہت اچھا ہے، مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو وہ زندگی کبھی نہیں دیں گے جو آپ لوگوں نے ہمیں دی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا اور دعا کیجیے گا کہ میں نے جو خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر بھی پاسکوں۔ آپ کی بیٹی زویا“

## اجھا

استاد شاگرد سے۔ ”تم حساب میں کتنے کمزور ہو۔ میں جب تمہارے جتنا تھا میرے سو میں سے سو نمبر آتے تھے۔“  
شاگرد۔ ”یہ ضرور آتے ہوں گے آپ کو کوئی اچھا استاد پڑھاتا ہوگا۔“  
از: زرین زبیر کوٹھاری، کراچی

ہی ایسا سیاہ نکھڑا تھا یا میری کرنی کے پھل تھے جو نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے کھانے پڑے اور آج ان کی بدولت میں تہی داماں رہ گیا ہوں۔ ”وہ اس کی تصویر کے آگے کھڑے خود کلامی میں مصروف تھے۔“

”یہ جاننے کے باوجود کہ غلط فیصلے ہمیشہ

زندگیوں میں برپا دیاں لاتے ہیں۔ میں بے درپے غلط فیصلے کرتا ہی چلا گیا اور آج پچھتاؤں کی فصل کاٹ کر بیٹھا ہوں۔ خدیجہ سے شادی اول تو مجھے کرنی ہی نہیں چاہیے تھی کہ بھی لی تھی تو اسے نبھانے کا حوصلہ بھی اپنے اندر پیدا کر لیتا تو آج تنہائی کا روگ

جان کو لگائے اکیلانہ ہوتا۔ ساری زندگی اپنے بیزار رویے کے باعث اس بھلی مانس عورت کو سولی پر لٹکائے رکھا پھر جس کے لیے میں نے خدیجہ کا دامن خوشیوں سے خالی رکھا مجھے وہ عورت زندگی کے سفر میں دوبارہ ملی تو اب کی بار میں اسے گنوانے کی حماقت نہ کر سکا اور اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔

ایک اور غلط فیصلے نے میرے بچے جو پہلے ہی میرے رویے اور میری سخت اور کنھور طبیعت کے باعث مجھ سے دور تھے اور دور ہو گئے۔ پہلے وہ مجھ سے بیزار تھے پر اب ان کے اندر نفرت اور بغاوت کے بیج پھوٹ نکلتے تھے۔ اس روز خدیجہ کو امیر جنسی پہنچانے کے بعد میں نے اپنی بیٹی کا خط پڑھا اور خدیجہ کی جان

لیوا بے ہوشی کی وجہ جان گیا۔ وہ عورت جو اٹھارہ سال میری بے رخی، تنفر اور بیزاری کو گھونٹ، گھونٹ سال میری بے رخی، تنفر اور بیزاری کو گھونٹ، گھونٹ

فط نہیں تھا ایک آتش فشاں تھا جس نے پھٹ کر ان کے وجود کو خاکستر کر ڈالا تھا۔ اپنے سر کو تھام کر خدیجہ وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ کاغذ اس کے ہاتھ سے پھسل کر دور جا پڑا۔ اپنے کسی کام کے لیے ماں کو آواز دیتا سنی ڈھونڈتا جب کمرے میں آیا تو حواس باختہ ہو گیا۔ زدیا کے کمرے میں اس کے بستر کے پاس گری ہوئی ماماؤہ زور، زور سے پاپا کو آواز دینے لگی۔ سعید احمد بھی پریشانی میں بھاگتے چلے آئے۔ خدیجہ کو بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے انہیوں نے پاس پڑا کاغذ اٹھا کر سرسری سا پڑھ کر جلدی سے اپنی جیب میں گھسوا اور خدیجہ کو اٹھا کے تیزی سے گاڑی تک آئے۔ اتنا نام نہ نہیں تھا کہ ذرا سیور کو بلا پاتے۔ خدیجہ کو کچھ سیٹ پر لٹا کر خود ہی ڈرائیونگ سیٹ پر آئے۔ سنی بھی فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گیا۔

”پاپا..... کیا ہو گیا؟ ماما کو کیا ہو گیا؟ وہ ابھی تو ٹھیک تھیں۔ مجھے آواز بھی دی مانتے کے لیے۔“ سنی تھا تو بچہ ہی ناں ناں کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا اور رو بانے لہجے میں سعید احمد کو دیکھ کر سوال کرنے لگا۔

”پتا نہیں بنا، آپ حوصلہ رکھو۔ اسپتال جا کر صحیح صورت حال پتا چلتی ہے۔“ انہیوں نے ایک نظر پریشان بیٹے پر ڈال کر تسلی دی۔ اس پل وہ دونوں اپنے اختلافات بھول کر صرف خدیجہ کے لیے پریشان تھے۔

”بہنی..... بہنی کہاں ہے پاپا..... اس کو تو بتا دیجے پریشان ہوتی رہے گی۔“ وقتاً سنی کو زویا کا خیال آیا تو وہ بار بار ماں کی طرف رخ موڑ کر دیکھتے ہوئے باپ سے بولا۔

”گھر میں ہی ہوگی اسپتال پہنچ کر آپ اسے کال کر دیتا۔“ انہیوں نے سنجیدگی سے کہا اور گاڑی کی اسپید تیز کر دی۔

”میں سعید احمد آج زندگی کے سودوزیاں کا حساب لگانے بیٹھا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میرا نصیب



اپنے اندر اتارتی رہی تھی۔ میرے سبب اولاد کے اٹھائے گئے ایک غلط قدم کا بوجھ نہ سہار سکی اور دونوں کو سہ میں رہنے کے بعد تیسرے دن زندگی کی بازی ہار گئی۔ میرے کندھوں تک آتا میرا جوان بیٹا اس سارے قصے کی وجہ میری دوسری بیوی فاریہ کو سمجھتا اور موقع پاتے ہی اس نے ہمیں سے لوڈ ریوالور حاصل کیا اور دو گولیاں فاریہ کو مار کر خود اس نے اقبال جرم کر لیا۔ کچھ عرصے بعد اسے عمر قید کی سزا ہو گئی۔ پے در پے ٹوٹنے والے صدموں کے بعد زویا کا میرے نام آنے والا خط تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

”بہت ہی پیار۔، پاپا اور ماما

میں اپنا گھر، اپنی جنت بنانے نکلی تھی اور انجانے میں جہنم خرید بیٹھی۔ روحیل نے مجھ سے نکاح تو کر لیا پر نبھانہ کر سکا۔ میں جو ایسا گھر بنانے اور بسانے کی خواہش رکھتی تھی جہاں محبتیں ہوں، اعتماد اور اعتبار ہو۔ آج وہاں گالیاں ہیں، کوٹنے ہیں۔۔۔۔۔ بے اعتباری ہے، روحیل نے صرف چھ ماہ ہی محبت کی بارش برسائی پھر اس کے بعد بے اعتباری کے پادل ہمیشہ کے لیے میرے آگن میں ٹھہرے گئے۔ عام سے بھی عام نکلا وہ مرد جو عورت اس کے لیے سب کچھ چھوڑ کر آئی تھی اسی ایک لغزش کو اس نے اس کی زندگی کا آزار بنا ڈالا۔ وہ کہتا ہے کہ جولوڑ کی اپنے ماں باپ کا وقار اپنے قدموں تلے روند کر ایک انجان کے سنگ نکل آئی ہے اس کا کیا بھروسہ کہ وہ کل کسی اور کی باتوں میں آکر مجھے نہیں چھوڑے گی۔ پہلے اس نے مجھے برقع پہننے کو کہا اب مجھے نہیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے ماں باپ نے مجھے آج تک قبول نہیں کیا۔ اس نے مجھے ایک الگ گھر میں رکھا ہے۔ باہر جاتے وقت تانا لگا کر جاتا ہے۔ ماں باپ کا دل دکھانے کی میری یہ سزا کم تھی جو اب اللہ نے مجھے ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ میرے اس فعل کی بدولت

روحیل اپنی بیٹی سے بے حد نفرت کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ بیٹیاں بہت بری ہوتی ہیں۔ ماں باپ کے سر جھکا کر ان کو زندہ درگور کر دیتی ہیں۔ کل مجھے پتا چلا ہے کہ روحیل کے ماں باپ نے اس کی شادی اپنی مرضی سے کر دی ہے۔ اس بار روحیل آیا تو بہت اکھڑا ہوا تھا۔ اپنے اعمال کی بہت حد تک سزا میں نے پائی لی ہے اب آپ سے گزارش ہے کہ دعا کیجیے گا بھلے نفرت کرے۔ حقارت سے دھکارے یا ٹھکڑے لگائے میں سب برداشت کر لوں گی۔ بس مجھ سے اپنے نام کی چھت نہ چھینے۔

آپ کی بد نصیب بیٹی

زویا!

خط پڑھ کر مجھے لگا کہ ہوا میں سے آسمان کسی نے کم کر دی ہو۔ میرا دم گھٹنے لگا پر نہیں ابھی کہاں۔۔۔۔۔ مجھے مرنا ہے۔ میرے فیصلے کئی زندگیوں کی بربادی کا باعث بنے۔ جب تک وہ لوگ دکھی ہیں مجھے کیسے موت آسکتی ہے۔ جیل میں سستی سے ملنے جاتا ہوں تو وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اپنا سر جیل کی سلاخوں سے ٹکرانے لگتا ہے۔ میں نے اس کی تکلیف کے ڈر سے بہت دن ہوسے وہاں جانا چھوڑ رکھا ہے۔ اتنے بڑے گھر میں، میں ہوں یا میری تنہائی اور آپ سب کو شاید میری آخری بات پر ہنسی آئے کہ قدرت کا ایک اور امتحان ابھی باقی تھا جو مجھے خدیجہ کے مرنے کے بعد اس سے شدید قسم کی محبت ہو گئی ہے۔ میں جو اسے دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ اب اس کی شکل دیکھنے کو ترستا ہوں کہ کہیں سے ایک بار وہ آجائے۔ میں اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگوں۔“

خدیجہ کی تصویر کو دیکھتے دیکھتے ان کے سامنے تصویر دھندلا گئی کہ آنسوؤں کی دبیز نے آنکھوں کے آگے پردہ ڈال دیا تھا۔ مرتے دم تک نارسائی اور پچھتاوے ان کا مقدر تھے۔





## خوابِ آزادی

نسیم احمد بشیر

بیل جی تو میں نے دروازہ کھول دیا۔ کوڑ آئی  
تھی اور حسب معمول دیر سے آئی تھی۔  
”ہائیم دیکھا ہے؟ پونے نو بج رہے ہیں۔ تمہیں  
پتا بھی ہے مجھے نو بجے آفس پہنچنا ہوتا ہے پھر بھی دیر  
کر دیتی ہو۔ آج میں پھر لیٹ ہو جاؤں گی۔ بس تو تم  
چھوڑ دو۔ میرا کام، میں کسی اور کو رکھ لوں گی۔“ میں  
نے دروازہ کھولتے ہی اپنی صفائی والی کو اپنا روزانہ کا  
لیکچر پلانا شروع کر دیا۔

وہ ڈھیوں کی طرح سنی ان سنی کر کے جھاڑو ہاتھ میں پکڑ کر زور، زور سے زمین پر پھیرنے لگی۔ روز ہی یہ تماشا ہوتا تھا۔

”سوری باجی، آج تھوڑی سی دیر ہوگئی۔ آپ دیکھنا میں پندرہ منٹ میں ہی آپ کا سارا کام کروں گی۔ آپ فکر نہیں کریں۔“ میرے غصے کو قطعی خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ معمول کے مطابق جلدی، جلدی ہاتھ چلا کے صفائی کرنے لگی۔ یہ بھی روز ہوتا تھا۔

”آج کیا تکلیف ہوئی تھی.....؟ تم تو کل کہہ رہی تھی میں پورے آٹھ بجے آ جاؤں گی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”باجی آپ کو پتا ہے ناں... آج کل کا کے لیے لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں۔ بس صبح ہی دوسرے گاؤں سے ماسی رحمتاں آگئی، اس نے ایک لڑکی کا اتا پتا دیا ہے۔ کیا کروں اس کی باتیں ختم ہی نہیں ہونے میں آرہی تھیں اسی لیے دیر ہوگئی۔ سوری باجی۔“ اسے اپنی دو چار لفظ کی انگریزی کو گامیہ بگا ہے استعمال کرنے کا بہت شوق تھا اور وہ اسے سچ اور مناسب وقت پر استعمال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

”ایک تو یہ تیرے کا کے نے بڑی جان کھائی ہے۔ کب سے تم اس کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہو۔ ہمیں کوئی پسند ہی نہیں آتی۔“ میں اس کے اس کا کے یعنی اس کے بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کے مشن سے بہت تنگ آ چکی تھی۔ جب دیکھو کا کے کے لیے فلاں شہر لڑکی دیکھنے جا رہی ہے یا فلاں گاؤں کا سفر طے ہو رہا ہے۔ کوثر بیگم کو اپنے بھائی کے لیے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی۔ بڑا اونچا اسٹینڈرڈ تھا ان کا۔۔۔

”ہائے باجی میرا بھائی تو شہزادہ ہے شہزادہ..... اس کے لیے لڑکی بھی تو اس کے جوڑ کی ہونی چاہیے ناں.....“ وہ حسب معمول اپنے بھائی پر

صدقے داری ہونے لگی اور میں جلدی، جلدی دفتر جانے کی تیاری کرنے لگی۔

میں کوثر کو کئی بار یہ دھمکی دے چکی تھی کہ میں اسے نکال کر کسی دوسری کام کرنے والی کو رکھ لوں گی مگر وہ جانتی تھی کہ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ کئی سالوں سے میرے گھر کام کر رہی تھی۔ ایمان دار، محنتی اور ہمدرد طبیعت عورت تھی۔ میں اور وہ ایک دوسرے کی عادی ہو چکی تھیں۔ بس گزارہ ہو رہا تھا۔ میری ڈانٹ ڈپٹ کا وہ قطعاً برا نہیں مانتی تھی۔

سارے گھر کا کام منٹوں میں پنا دیتی۔ ساتھ، ساتھ ہنستی، باتیں کرتی اور محلے بھر کے قصے سناتی رہتی تھی۔ چھٹی والے دن میرے اور اس کے تعلقات

بہت اچھے رہتے کیونکہ اس دن میں اسے جلدی نہ آنے پر کچھ نہ کہتی تھی۔ وہ بڑے آرام سے ساڑھے نو بجے تک آتی اور مجھے ناشتا بھی بنا کر دیتی۔ میں چائے پیتی، اخبار پڑھتی اور وہ سارے گھر میں پڑے کھارے سمیٹنے لگتی۔

کبھی کبھار اخبار میں چھپی تصویروں، فلمی اشتہاروں کے بارے میں سوال بھی کر دیتی۔ کسی قسم کے ہم دھماکے، زلزلے یا دہشت گردی کی خبر سے اسے بہت دلچسپی ہوتی اور اس کا اصرار ہوتا کہ میں اسے اس کے بارے میں ساری معلومات دوں، تفصیل سے بتاؤں کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا؟

اپنے بھائی کا کے کو اس نے بچپن سے اپنے ہی گھر میں پالا تھا۔ وہ اس کا لاڈلا بگڑا ہوا وہ بچہ تھا جس کی ہر جائز و ناجائز فرمائش پوری کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔ کا کا کبھی اس سے پیسے مانگ کر لے جاتا، کبھی کام سے بغیر بتائے چھٹی کر لیتا۔ دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی یا سینما دیکھنے چلا جاتا، غرضیکہ جو جی میں آئے کرتا مگر کوثر نے کبھی اس کے بارے میں شکایت نہیں کی تھی۔ وہ ہمارے گھر کے ساتھ ہی ایک کونہی میں مالی کا کام کرتا تھا مگر وہاں سے بھی اکثر غائب



گلتی، اس طبقے میں محبت کی قدریں اب بھی کچھ، کچھ سانس لیتی ہیں۔ یہ لوگ ابھی تک ایک دوسرے کے کچھ نکتے رہنا چاہتے ہیں جبکہ ہم مہذب، پڑھے لکھے لوگ اپنے، اپنے کامیاب گھرانوں میں گرفتار، اپنی، اپنی دنیا کی بھول بھلیوں میں مصروف منہ اٹھائے نہ جانے کس سمت دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس طبقے کے لوگوں میں ربط ہے، تعلق ہے، رشتہ نانا ہے، برابری ہے۔ اسی لیے ان میں اب بھی محبتوں کے ریت رواج سانس لیتے ہیں۔

اس روز دفتر سے چھٹی تھی۔ میں ذرا ریلیکس ہو کر صبح سویرے حسب معمول اخبار پر نظر دوڑا رہی تھی۔ ”چج..... چج.....“ یک دم ایک خبر اور تصویر دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”کیا ہوا باجی.....؟“ کوثر نے ڈسٹنگ کرتے کرتے لکھت ہاتھ روک لیا۔

”ہائے بڑا افسوس ناک واقعہ ہے..... تو بہ۔“ میرا دل غم سے پھٹنے لگا۔ کوثر میرے بالکل قریب آ کر کھڑی ہوئی اور اخبار میں چھپی تصویر پر نظریں گاڑ دیں۔ تصویر میں کھلے آسمان تلے دو عورتیں کھڑی جلتی نظر آرہی تھیں۔

”ہائے رہا یہ کیا ظلم ہوا؟ باجی پڑھ کر سنائیں کیا ہوا ہے؟“ اس نے اصرار کیا اور میں نے اسے خبر اور تصویر کے بارے میں بتایا۔

جلنے والی عورتوں کے نام حاکم زادی اور زیب النساء تھے۔ یہ سندھ کی دوہاری عورتیں تھیں۔ چند سال پہلے ان کے گاؤں میں ایک بڑا افسر تعینات ہو کر آیا اور اس نے ان کے علاقے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ وہ افسر بہت شقی القلب شخص تھا۔ اس نے کام کرنے والے غریب ہاری مزدوروں، کسانوں پر بہت ظلم کیے اور ایک روز غصے میں آ کر نو افراد کو قتل گھر میں کر کے گولی سے اڑا دیا۔ مرنے والوں میں ایک نوجوان ان دو بد نصیب عورتوں کا بھائی تھا۔ یہ

رہتا وہ لوگ کوثر کو بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کرتے مگر اس کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔

”کوثر تم نے اس کا کے کو اتنا سر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ کیا دے گا نہیں یہ؟“ ایک دن میں نے تنگ آ کر کوثر سے کہا۔

”لے باجی.....! میں نے اس سے بھلا کیا لیتا ہے، بہن بھائی کے رشتے میں لین دین تو ہوا ہی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا بچہ ہے ناں ابھی۔ اسی لیے تو اس کی شادی کر دینا چاہتی ہوں اس کو سنبھالنے والی آئے گی تو خود ہی سدھر جائے گا۔“

”اب اتنا بچہ بھی نہیں جوان ہو گیا ہے، تبھی تو تم اس کی شادی کا سوچ رہی ہو ناں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا کروں جی..... اماں تو بچپن میں ہی اسے اور میری چار بہنوں کو چھوڑ کر مر گئی تھی۔ ابانے فوراً دوسری کر لی اور جلدی، جلدی میرا بھی رشتہ میری پھوپھی کے ہاں کر دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا..... بس ابھی سے میں نے اپنے بہن بھائی کو اپنے پردوں تلے لے لیا۔ آخر میرا ہی فرض بنتا تھا ناں..... سب سے بڑی جو بھی گھر میں۔ شکر ہے بہنیں تو سب اپنے، اپنے گھر کی ہو گئیں بس یہ کلا کلا دیر ہی رہ گیا ہے۔ اب تو اس کے سر پر سہرا سجا دیکھنے کے لیے ہم سب بہنیں تڑپ رہی ہیں۔“ کوثر کے چہرے پر ماتا کا نور ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

میں سوچنے لگی، ہم چار بہنوں کا بھی ایک بھائی ہے جو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سات سمندر پار رہتا ہے۔ اب ہم لوگ آپس میں بہت کم ملتے ہیں، ایک دوسرے کی زندگی سے تقریباً ناواقف ہیں اور جب ملتے ہیں تو آپس میں بات کرنے کے لیے کھوئے ہوئے حوالوں کے سرے ڈھونڈتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات کریں۔ مجھے کوثر اور اس کے بھائی سے کبھی، کبھی حسد سا ہونے لگتا۔ میں سوچنے

باتیں۔ خواہ مخواہ بندے کا سارا دن برا رہتا ہے۔“  
اس نے مجھے ٹوکا۔

”اچھا دیکھ، دھیان سے صفائی کرنا..... اور  
ہاں میرے کاغذ ادھر سے ادھر نہ ہوں۔ پتا ہے  
ناں.....“ میں نے اسے اپنے لکھے ان لکھے کاغذوں  
کی احتیاط کرنے کی تاکید کی۔

”پتا ہے جی..... میں نے کبھی آپ کے منہ بلا  
کو چھیڑا ہے بھلا؟ مجھے پتا ہے آپ کو اپنے ان  
کاغذوں سے بڑا پیار ہے مگر باجی جی..... یہ بھی کوئی  
ٹھیک بات نہیں ہے۔ کاغذوں سے اتنا پیار.....  
چھوڑیں جی..... یہ کاغذ آپ کو کیا دیتے ہیں؟ جب  
دل گھبراتا ہے تو آپ کا ہاتھ تو نہیں تھام سکتے ناں۔“  
”اچھا چھوڑو فضول باتیں نہ کیا کرو..... بس  
میرے کاغذوں کا دھیان رکھنا۔“

”یہ کاغذ نہ ہوتے تو شاید..... شاید میں جی نہ  
باتی۔“ میں نے یہ جملہ اپنے دل میں مکمل کیا۔ اس  
پہلی کو کیا بتاتی کہ یہ کاغذ ہی تو میرے چہینے کا سہارا  
ہیں۔ زندگی کے اتنے برس گزار لینے کے بعد ایک  
کاغذ ہی تو رہ گئے ہیں جن سے میں سچ بات کہہ سکتی  
ہوں۔ جن سے مجھے ذرا نہیں لگتا، جو میری ہر بات سن  
لیتے ہیں اور اسے اپنے سینے پر رقم کر لیتے ہیں۔ یہی تو  
محبوب ہیں میرے..... انہی کی تو محبوب ہوں میں۔

”باجی..... میں تو سیدھی بات کہوں گی۔ آپ  
کو کاغذوں کی نہیں کسی جیتے جاگتے بندے کی  
ضرورت ہے..... اور وہ آپ کو کاغذوں میں تھوڑا ہی  
ملے گا۔“ ماہر نفسیات نے پل بھر میں میری تحلیل نفسی  
کر کے رکھ دی۔

”چل زیادہ بک، بک نہ کر..... بڑی آئی  
بندے والی..... تو اپنا بندہ سنبھال میری فکر نہیں کر۔“  
میں نے اسے جھوٹ موٹ ڈانٹ دیا۔ مجھے ڈر سا  
لگنے لگا..... یہ گھریلو کام کرنے والی ان پڑھ سادہ  
لوح غورث دلوں کے راز کیسے پڑھ لیتی ہے۔

دونوں بہنیں اور ان کی بوڑھی دکھیااری ماں اس  
صدے سے تقریباً پاگل ہو گئیں۔ اس ظلم پر لوگوں  
نے بہت احتجاج کیا۔

انہوں نے انصاف کے لیے بڑے بڑوں کے  
دروازے کھٹکھٹائے، عدل کی زنجیریں ہلائیں مگر ان  
کی کہیں کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اخباروں  
میں دہائی دی، فریاد کی، شور مچایا مگر ظالم کے ساتھ  
ہمیشہ یا اثر افراد کی طاقت ہوتی ہے اس لیے اسے  
پکڑنا آسان نہیں ہوتا۔ جج آکر ان دونوں بہنوں  
نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر اس افسر کو سزا نہ دی گئی تو وہ  
فلاں تاریخ کو ہائی کورٹ کے آگے اپنے جسموں پر  
مٹی کا تیل چھڑک کر جان دے دیں گی۔

وہ دن بالآخر آ گیا اور ان دونوں باہمت،  
اصولی، بات کی چکی منظم عورتوں نے اپنے کسے کا  
پاس رکھتے ہوئے مقررہ تاریخ کو ہائی کورٹ کی  
بلڈنگ کے آگے کھڑے اپنے، اپنے معمولی بھٹے  
پچانے کپڑوں میں لمبوس، تن شلٹ پر مٹی کا تیل چھڑکا  
اور موت کے لاؤس کو دو گئیں۔

تصور میں وہ دونوں شعلوں میں لپٹی، جلتی  
ہوئی نظر آ رہی تھیں پاس ہی ان کی بد نصیب ماں اپنی  
لاڈلیوں کو ہولناک شعلوں کی خوراک بننے دیکھ کر  
غالباً سوچ رہی تھی میں نے ایک مٹھی راکھ اور دو مٹھی  
دھواں بھلا اپنی کوکھ سے کب، کیوں اور کیسے جتا تھا؟  
”ہائے باجی انہیں بھی اپنا کا کا بہت پیارا ہوگا

ناں.....؟ سب ریاں..... اپنے دیر پر سے قربان  
ہو گئیں۔“ کوثر میری زبانی یہ کہانی سن کر کتنی ہی دیر  
آزردگی کی تصویر بنی بیٹھی رہی۔ ”یا اللہ کسی کے دیر کو  
تقی ہوا نہ لگے۔“ وہ دعائیں مانگتی بڑبڑاتی، اپنے آپ  
سے باتیں کرتی اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا باقی کا کام  
خپنانے لگی۔

”توبہ باجی..... آپ بھی صبح صبح کیا یہ منحوس  
اخبار لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ نہ پڑھا کریں ایسی

## آؤناں

بادل بن کر چھاؤناں  
پیار کا مینہ برساؤناں  
مستی بھری ان شاموں میں  
مگیت وفا کا گاؤناں  
رنگوں سے آنچل بھر دو میرا  
ست رکتے پھول کھلاؤناں  
یت جھڑ جیتا آئی بہار  
گھل کر تم مسکاؤناں  
مہک اٹھے میرے من کا آئین  
تم خوشبو بن کر آؤناں  
شاعرہ: یاسمین اقبال، لاہور

زیب التما کے جسموں سے اٹھنے والے شعلوں نے  
میرا ہاتھ جلادیا اور میں نے بے اختیار اس اخبار کو اٹھا  
کر اپنے سے دور بیخ دیا۔

اگلے روز کوڑا آئی تو خوشی سے زمین پر اس کے  
پاؤں نہ نکلتے تھے۔ کھلی کھلی جا رہی تھی۔ ”بابی کا کے  
کے لیے مجھے ایک لڑکی پسند آگئی ہے۔ بالکل اس کے  
جوڑکی ہے۔“

”اچھا جی مبارک ہو آپ کو..... شکر ہے آپ کا  
ایک ضروری کام تو بننا۔ مصیبت ذالی ہوئی تھی تم  
نے۔“ میں نے طنز یہ لکھ میں اسے مبارک باد دیتے  
ہوئے کہا۔

”بابی..... بڑی اچھی ہے لڑکی..... یہ موٹی،  
موٹی آنکھیں بالکل آپ جیسی..... صحت مند گول  
مثول بھرا بھرا جسم، بالکل میرے جیسا..... بڑی گنوں  
والی ہے جی..... اس کی ماں بتا رہی تھی شادو ایک  
ساتھ دو، دو دریاں دھو کر کوٹھے پر سو کھنے ڈال سکتی  
ہے اور پندرہ جنوں کا آٹا منٹوں سنگھوں گوندھ کرنے  
مارتی ہے پھر سجاؤ اتنا اچھا کہ ہر ایک سے ہنس، ہنس  
کر باتیں کرنا مگر نظریں پنی رکھنا۔“ وہ اپنی ہونے

”نہیں بابی جی..... میں سیریس ہوں۔“ کوڑ  
نے پھر اپنی پاؤ بھراگریزی بگھاری۔  
”آپ کو دیکھ کر بڑا سوچتی ہوں۔ گھر جا کر شبیر  
کو بھی بتاتی ہوں کہ بابی کی زندگی بھی کوئی زندگی  
ہے۔ دفتر جاؤ، گھر آؤ پھر کتابوں کاغذوں سے سر  
کھپاؤ..... میرا شبیر تو آپ کو پتا ہے ناں..... کتنا اچھا  
ہے، وہ بڑی فکر کرتا ہے جی آپ کی۔“  
”اچھا تم اپنی فکریں اپنے پاس سنبھال کر رکھو.....  
میں بالکل ٹھیک ہوں اور ہاں گھر جا کر اپنے میاں سے  
میری باتیں نہ کیا کرو..... سن لیا؟ یہ مجھے بالکل پسند  
نہیں۔“ میں نے اسے جھاڑ دیا۔ لو بھلا اپنے خاوند سے  
نہ جانے کیا، کیا کہتی ہوگی میرے بارے میں۔

”وہ میرا میاں تھوڑی ہے، ہم دونوں تو  
دوستوں کی طرح ہیں۔ آپس میں ساری باتیں  
کر لیتے ہیں۔ جو چاہوں لا کر دیتا ہے، مارتا بھی  
نہیں..... مجھے رانی بتا کر رکھا ہوا ہے اس نے۔“

ایک چاہی جانے والی عورت انتہائی تمکنت  
سے میرے سامنے کھڑی میرے جھوٹے برتن  
دھو رہی تھی، میرے فرش پر ٹاکی لگا رہی تھی اور مجھے  
اپنے راج پاٹ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس  
لمحے میں نے خود کو بہت غریب اور تہی دامن محسوس  
کیا..... وہ میری طرف دیکھ کر شاید جان گئی تھی۔

”میں اگلے جمعے شاہ جمال کے مزار پر جا کر دعا  
مانگوں گی کہ اللہ آپ کو بھی میرے شبیر جیسا کوئی بندہ  
دے دے۔“ وہ پیار سے بولی۔

میں نے دوبارہ اخبار کے صفحے پر  
نظریں نکا دیں۔ وہ اخبار اب تک سالم کیسے تھا؟ وہ تو  
کاغذ تھا اور کاغذ تو بڑے درد مند ہوتے ہیں۔ آپ  
کے سارے دکھ اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ اس اخبار  
میں تو آپ جگہ جہاں دوزندہ گوشت پوست کی عورتیں  
جل رہی تھیں، سوراخ ہو جاتا چاہے تھا۔ یہ کیسا کاغذ  
تھا جو اتنا بے درد اور بے حس تھا۔ حاکم زادی اور



والی بھابی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے  
ملانے لگی۔

”اچھی بات ہے۔“ میں نے اس کا دل رکھنے  
کے لیے تھوڑی سی دلچسپی کا اظہار کر دیا۔

”اور اس کا باپ پتا ہے کیا کہہ رہا تھا، کہہ رہا  
تھا کہ کا کے کو سبزی کی دکان ڈال کر دیں گے۔ آج  
کل تنخواہوں میں کیا بنتا ہے بھلا۔۔۔۔۔ میں نے کہا بھی  
اس سے اچھی بھلا کیا بات ہو سکتی ہے۔ اپنا نکبھس  
ہوگا، عیش کرے گا عیش۔۔۔۔۔“

ماہر اقتصادیات نے ٹاکی لگاتے، لگاتے اپنا  
تجزیہ سنا دیا۔

کوثر نے کا کے کی شادی بڑی دھوم دھام سے  
کی۔ بڑے چاؤ سے بھابی کو بیاہ کر لائی۔ میرے بھی  
یہ سنا سنا کر کان پکا دیے کہ کس نے کس کو کیا دیا۔  
کون، کون سی ریمیں ہوئیں اور کون سی پوری ہونے  
سے رو گئیں۔ میں نے سو دفعہ کہا مجھے نہ پتا، مجھے اس  
تذکرے سے کوئی دلچسپی نہیں مگر وہ گھوم پھر کر بات  
ہے بات کا کے کی شادی کا قصہ کسی نہ کسی بہانے چھیڑ  
ہی دیتی اور پھر بولتی چلی جاتی۔

شادی کے بعد کا کا پروگرام کے مطابق علیحدہ  
ہو گیا اور اپنے سر کے ساتھ سبزی کے  
نکبھس (بزس) کے خواب دیکھنے لگا۔ کبھی کبھار وہ  
پہلے اسے بھی سائیکل پر بٹھا کر چھوڑ جایا کرتا تھا مگر  
اب دور چلے جانے کی وجہ سے وہ اسے چھوڑنے نہ  
آ سکتا تھا۔ کوثر پیدل آتی اکثر لیٹ ہو جاتی اور مجھ  
سے ڈانٹ کھاتی۔

”تو اپنے میاں سے کیوں نہیں کہتی کہ تجھے  
سائیکل پر چھوڑ جایا کرے۔“ ہانگوں میں درد کی  
شکایت کرتے سن کر ایک دن میں نے کہا۔

”کیسے کہوں باجی۔۔۔۔۔ وہ بڑا عجیب ہوتا ہے، آخر  
دیکھیں ناں صبح صبح قربان لین سے ڈیفنس پہنچنا  
آسان تو نہیں ہے ناں۔۔۔۔۔ بیچارے ڈرائیور کی

زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ پہلے سائیکل پہ مجھے چھوڑے  
پچھلے اپنے کام پہ پیڈل مارتا جائے۔ مشکل ہوتی  
ہے ناں۔۔۔۔۔“ وہ اپنے چہیتے خاوند کو تکلیف نہیں دینا  
چاہتی تھی۔

”تو تو کہتی ہے بڑا دیوانہ ہے تیرا۔۔۔۔۔ تیرے  
لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”کرنا تو ہے۔۔۔۔۔ پر باجی بندے تو بس پھر  
ایسے ہی ہوتے ہیں ناں۔۔۔۔۔ آپ کو تو پتا ہے آپ تو  
اتنی پڑھی لکھی ہیں، ویسے پتا نہیں آج کل کیا بات  
ہے، میرا دل کچھ گھبرا رہا ہے۔ شبیر مجھے کچھ بدلا بدلانا  
سائیکل رہا ہے۔ جیسے وہ کوئی اور شبیر ہو میرے والانہ  
ہو۔“ وہ خلاؤں میں گھورنے لگی۔

”ایسے ہی تجھے وادم ہو گیا ہوگا۔ خود ہی کہتی ہے  
اس جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور پھر خود ہی اس میں  
نقص نکالنے لگتی ہے۔“

”باجی۔۔۔۔۔ عورت کو پتا چل جاتا ہے جب اس  
کا بندہ اس کا نہیں رہتا۔“ اس نے بڑی سیانی بات  
کی اور میں نے بھی بل بھر کے لیے دلی ہی دل  
میں اس کی تائید کی۔ واقعی عورت کو پتا چلا جاتا ہے  
جب ایسا ہوتا ہے۔ وہ سارے کا سارا پیار یا تو اپنے  
آپ سے کرنے لگ جاتا ہے یا پھر کسی دوسری عورت  
سے۔۔۔۔۔ کچھ تو تبدیل ضرور ہوتا ہے۔

شادی کے بعد بھی کوثر اپنے بھائی کو اکثر اس  
کوٹھی میں فون کر کے اس کا حال حال ضرور پوچھتی۔  
اس کی طرف سے وہ مطمئن تو ہو گئی تھی مگر پھر بھی اس  
کی خیر خبر رکھنا اس کی عادت بن چکی تھی۔

”بھئی بڑی دیوانی ہے تو اپنے بھائی کی۔ دیکھ  
لیتا ایک دن تجھے بھول کر سارے کا سارا اپنی بیوی کا  
ہی ہو جائے گا۔“ میرے اندر کی حاسد بہن رہ نہ سکی  
اور کہہ دیا۔

”ہائے باجی۔۔۔۔۔ میرا کا کا ایسا نہیں ہے۔ دیر تو  
بہنوں کے لیے چھاؤں ہوتے ہیں جی وہ تو میری

لین سے کام کے لیے آنے والی کسی عورت کو پکڑوں اور اس سے گھر کی کم از کم صفائی ہی کروالوں گھر کا برا حال ہو رہا تھا۔ اچانک میری نظر شکیلہ پر جا پڑی۔ شکیلہ، کوثر کی محلے دار تھی اور کبھی کبھار کوثر اور وہ مل کر اپنے گھروں سے کام پر آیا کرتی تھیں۔ میں نے شکیلہ کو ہاتھ کے اشارے سے اور آنے کو کہا اور وہ آگئی۔  
 ”دیکھو شکیلہ! جب تک کوثر واپس نہیں آتی مجھے

کسی سے کام تو کروانا ہی ہے تو تم ہی کر دیا کرو۔۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اسے؟ چھٹیوں پر چھٹیاں کیسے جا رہی ہے۔ اس کو جا کر بتا دینا باجی بہت غصہ ہو رہی تھی۔ اب کی بار تو میں اس کے پیسے بھی کاٹوں گی۔“  
 میں نے شکیلہ کو کوثر کے حصے کی سناؤ الیں۔

”باجی۔۔۔ کوثر تو اب نہیں آئے گی۔“ شکیلہ نے عجیب سے انداز میں مجھ سے کہا۔

”نہیں آئے گی کیا مطلب۔۔۔۔۔؟ کہیں چلی گئی ہے کیا؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”باجی آپ کو نہیں پتا؟“ شکیلہ نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

”کیا۔۔۔ کیا نہیں پتا مجھے؟“  
 ”کوثر تو مر گئی ہے۔“ شکیلہ کی آنکھیں بھگی گئیں۔

”مر گئی۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟ ابھی کچھ دن پہلے تو اچھی بھلی تھی۔۔۔ کیا کہہ رہی ہے تو؟“ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”وہ تو جل کر مر گئی ہے باجی۔۔۔۔۔ اس نے اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑک لیا تھا۔“

”کیا، کیا۔۔۔۔۔؟ کیسے جل گئی۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہوا؟“ مجھے تو کسی نے نہیں بتایا۔ ”مجھے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین مٹکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔“ لیکن یہ سب ہوا کیسے؟“ میں پوری بات جاننے کو بے تاب تھی۔

”بھڑی قسمت اور کیا جی۔۔۔۔۔“ شکیلہ قالین پر میرے سامنے بیٹھ گئی اور ٹھنڈی، ٹھنڈی سائیس بھرنے لگی۔ ”باجی آپ کو تو پتا ہے اسے اپنے

چھاؤں ہے۔ مجھے اس پر بڑا یقین ہے اگر مجھے کوئی مصیبت پڑے گی تو میں اس کے پاس ہی تو جاؤں گی ماں۔۔۔۔۔ وہ مسکرا کر بولی۔

اس طبقے میں بہنوں کو بھائیوں پر کتنا مان ہوتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کل کل کل کرتے

خسہ کے سپنوں کے لیے کاٹھا دبانے کی کوشش کی۔ اگلے روز میں کوثر کا انتظار کرتی رہی مگر وہ نہ

آئی۔ گندے برتنوں اور کھاروں سے اٹا گھر بند کر کے دفتر جاتے ہوئے میں نے سوچ لیا۔ اب اس کوثر

کی بچی کی چھٹی کر دوں گی۔ بڑی ڈھیٹ ہے، اس پر کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ خد ہونی ہے کسی

بات کی۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے بڑی ایماندار اور قابل اعتبار ہے مگر ہو سکتا ہے کسی اور کام کرنے والی میں بھی یہ

سب خوبیاں مل جائیں۔ کل آئے گی تو میں اسے صاف، صاف جواب دے دوں گی۔“ میں نے دل

ہی دل میں پکا فیصلہ کر لیا۔ اس طبقے میں ذتے داری نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں نے ہزار دفعہ کہا ہے کہ

نہ آتا ہو تو کسی بچے کے ہاتھ پیغام بھجوادیا کرے یا کم از کم کا کے سے کہہ کر فون ہی کروادیا کرے مگر تو بہ

ہے۔۔۔۔۔ جب مرضی لیٹ آتی ہے اور جب دل چاہے چھٹی کر لیتی ہے آکر سو بہانے بتائے گی کہ پھوپھی کا

سرفوت ہو گیا تھا یا خالہ کی دیورانی کا بہنوئی دینی جا رہا تھا، اسے الوداع کہنے کی وجہ سے نہیں آئی تھی

وغیرہ، وغیرہ۔“ میں دل ہی دل میں اسے کوستی رہی۔ دوسرا دن اور پھر تیسرا دن بھی گزر گیا۔ کوثر کام

پر نہ آئی۔ مجھے کچھ، کچھ تشویش ہونے لگی۔ کہیں خود یا کوئی بچہ بیمار نہ ہو گیا ہو۔۔۔۔۔ ویسے اس طرح وہ کبھی

کرتی تو نہیں تھی کہ بغیر بتائے اتنے دن کے لیے غائب ہو جائے اور کسی کے ہاتھ کوئی پیغام بھی نہ

بھجوائے۔ کئی دن میں تہذیب میں گرفتار رہی، نہ جانے کہاں دفنان ہو گئی تھی۔

ایک صبح کھڑکی میں کھڑی ہو گئی اور سوچا قربان

بندے پر کچھ شک ہو گیا تھا کہ اب وہ کسی دوسری عورت کے پاس جانے لگا ہے۔ وہ آئے دن اسی بات پر اس سے جھگڑا کرتی اور فساد پچائے رکھتی تھی۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ اس کے بندے نے پہلے تو اسے آرام سے سمجھایا مگر جب وہ نہ مانی تو اس کو مارنے لگا۔ بس جی وہ تو مار پیٹ کر کے گھر سے چلا گیا مگر اس کے جاتے ہی کوثر نے اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑک لیا اور خود کو آگ لگائی۔ بھڑی بد نصیب اپنے بچوں کے دیکھتے، دیکھتے سڑ کے سواہ ہو گئی۔ "شکیلہ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"اُف خدا یا۔" میرا سر غم سے پھٹنے لگا۔ میرا دل اس کہانی کو سچ ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ "یقیناً اس کے میاں نے یا ساس، دیور، کسی نے اسے آگ لگائی ہوگی۔ کیا پولیس نے تفتیش نہیں کی۔ کوئی اسے اسپتال نہیں لے گیا؟" عورتوں پر جبر و تشدد کے خلاف احتجاج کرنے والی انقلابی عورت یک دم میرے اندر سے باہر نکل آئی اور اس کہانی کو سچ ماننے سے انکار کرنے لگی۔ "اس کے بچوں سے کسی نے کچھ پوچھا؟"

"بچوں نے بھی یہی بتایا کہ اماں نے خود ہی اپنے آپ کو آگ لگائی تھی۔ پولیس پھر کیا کرتی؟ بس رپٹ لکھ کر واپس چلی گئی۔" شکیلہ نے یہ بھی یہ بتایا کہ کوثر کو اسپتال لے جایا گیا مگر وہ اتنی زیادہ جل گئی تھی کہ جانبر نہ ہو سکی۔

کوثر کا غم مجھے چمٹ کر رہ گیا۔ شکیلہ کے جانے کے کتنی دیر بعد تک میں رہ، رہ کر اس کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ "ہائے اس کے بچوں کا کیا حال ہوا ہوگا؟" ایک دم مجھے کا کے کا خیال آ گیا۔ "اُف اللہ کا کا کتنا پریشان اور دکھی ہوگا۔ اسے پوری حقیقت کا پتا ہوگا۔ اس سے تو یقیناً پتا چل جائے گا کہ کوثر خود جل مری تھی یا اسے کسی دوسرے نے جلایا تھا۔" یہ سوچ کر میں نے کا کے کو فون کر دیا۔

"کا کے۔۔۔ میں نے ابھی ابھی کوثر کے بارے میں سنا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔" میں نے دلگیر لہجہ میں اس سے اظہار افسوس کیا۔

"بس بیگم صاحبہ، اللہ کو یہی منظور تھا۔" وہ مختصر آہ بولا۔ "کہیں اس کے ساس، سرسریا خاوند نے تو اسے نہیں جلایا اور بچے بھی دباؤ میں آ کر ان کے کہے پر بیان دے رہے ہوں؟ ایسا تو نہیں ہے؟" میں نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

"نہیں جی۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔ کوثر آپنی نے خود ہی۔۔۔"

"لیکن خیر۔۔۔ ایسی کون سی بات ہو گئی تھی، مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" میں نے کریدا۔

"کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ آپنی اپنے آپ کو ختم ہی کر ڈالے۔ آپنی کا اپنا ہی تصور تھا۔ خواہ مخواہ اپنے بندے پر شک کرنے لگی تھی۔ بھائی نے لاکھ قسمیں کھائیں، بات منوانے کی کوشش کی مگر آپنی تو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ آخر وہ مرد ذات تھا اسے غصہ آ گیا اور اس نے آپنی کو مارنا شروع کر دیا۔ لیکن آپنی کی زبان کا تو آپ کو پتا ہی ہے کتنی لمبی تھی۔ آگے سے بولتی جاتی، بولتی جاتی تھی۔ وہ ٹھک ہار کر گھر سے باہر چلا گیا۔ بس جیسی آپنی نے یہ حرکت کی۔۔۔ بے وقوفی تھی جی اس کی۔"

"لیکن یہ تو ظلم ہے۔ اس کے میاں نے اسے مارا کیوں؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"بیگم صاحبہ، عورت کو بھی تو چاہیے ناں کہ اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھے۔" پٹاخ سے جواب دیا۔

"اچھا غلام محمد، خدا حافظ۔۔۔" میں نے اسے پہلی بار اس کے اصلی نام سے پکارا اور پھر فون رکھ دیا۔ مجھے خیال آیا، کوثر کا کا کا کتنا بڑا ہو گیا تھا، پورا مرد بن گیا تھا وہ۔





# محبت رنگ ہے ایسا

## سعدیہ ریس



سب طرف چھائے ایک نامحسوس سے سوگ  
 سے گھبرا کر وہ اپنے بند کمرے سے باہر نکل آئی جہاں  
 ہر سو اجالا پھیلا ہوا تھا مگر اس کے من میں اندھیروں  
 نے بسیرا کیا ہوا تھا۔ وہ تو بس یہ سمجھتی رہی کہ جس  
 راستے پر وہ چل رہی ہے وہ درست ہے لیکن دراصل  
 وہ درست سمت میں نہیں چل رہی تھی۔ اب من کا  
 اندھیرا چھٹا تو اس نے انجان اور اجنبی نظروں سے  
 اس جگہ کو دیکھا جہاں اس کا بچپن بیتا تھا جہاں اس

نے ایک عمر گزاری تھی لیکن اب اسے ان درو دیوار  
میں اپنے لیے کوئی منجائش نظر نہیں آ رہی تھی۔  
اس نے ہر مرتبہ اپنی مرضی کا در پچھول کر اپنی  
ہی پسند کا منظر دیکھا تھا مگر اب اس کی دھندلی  
آنکھوں میں ایک بوسیدہ سا منظر آٹھرا تھا۔

☆☆☆

”اے لڑکی! کیوں اپنے ساتھ، ساتھ سب کو  
بتاہ کرنے پر تلی ہو۔ آخر کس چیز کا بدلہ لے رہی ہو اس  
ہری بھری نرم نرم چمکیلی گھاس سے۔“ معا اس کے  
قریب ہی آواز ابھری۔ لمحاتی طور پر وہ اپنی دیوانگی  
سے باہر آ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی لیکن پھر اگلے  
ہی پل اس کا سابقہ جوش اور غصہ پھر اس پر حاوی  
ہو گیا اس کے کٹاؤ دار لبوں نے خفیف سی جنبش  
کی..... شاید وہ اس غصہ و کیفیت میں خود کو بولنے پر  
مشکل سے رضامند کر پا رہی تھی۔

”تم سے مطلب.....؟“ اس کے گلابی  
ہونٹوں سے ایک شعلہ سا نکلا۔

”ایک تو تمہاری یہ من مائیاں اور بد تمیزیاں  
اب بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ بھی ڈھنگ سے اور پیار  
سے بھی بول لیا کرو۔ جب دیکھو غصہ ناک پر دھرا  
رہتا ہے۔ ہزار بار بتایا ہے کہ لڑکیوں کو یہ لہجہ سوٹ  
نہیں کرتا۔“ اس نے سادہ لہجے میں بڑے گل سے  
اسے سرزنش کی جیسے وہ کوئی چھوٹی ننھی سی بچی ہے۔  
اور وہ خود بڑا سمجھدار اور عقلمند.....

”اور میں نے بھی ہزار بار کہا ہے کہ میری  
دادی اماں بن کر ہر وقت مجھے نصیحت نہ کیا کرو..... نہ  
ہی آئندہ کبھی میرے معاملے میں مداخلت کی کوشش  
کرتا۔“ ذرا بھی مرعوب ہوئے بغیر اس نے دو بدو  
اسے جواب دیا۔

”کیوں، کیوں.....؟ یہ صرف تمہارا معاملہ تو  
نہیں..... اتنی ہری بھری نرم گھاس کو چل کر تم خراب  
کرنے پر تلی ہوئی ہوا اور اسی سبزے سے تمہیں اچھی نفا

میسر آتی ہے۔ واہ.....! یہ اچھی رہی جو درخت پھل  
دیتا ہے جو ہزہ سانسوں کو تازگی دیتا ہے تم اسی کو روند  
کر برباد کر رہی ہو۔ بے وقوف ہوتے ہیں وہ لوگ  
جو جس شاخ پر بیٹھتے ہیں اسے ہی کاٹ ڈالتے  
ہیں۔“ غصے سے اس کی گندمی رنگت سرخ پڑ گئی مگر وہ  
ضبط کا دامن تھامے رہا ورنہ سامنے کھڑی اس پانچ  
فٹ کی لڑکی کو دیکھ کر دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ کس کر دو  
چار ہاتھ لگا دیتا۔

”بہت شکریہ اس نصیحت کا..... بڑے  
ابا۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر نہایت بد تمیزی  
سے کہا۔ عامر کا خون اگلنے لگا۔ وہ روز بروز ان سب  
کے لیے پراہم چائلڈ بنی جا رہی تھی۔ اپنی مانو کی شہ  
پر وہ ایسے ہی سب پر غرائی تھی اور ہر وقت لڑنے  
مرنے کے لیے تیار رہتی تھی۔

”ابھی دو دن پہلے ہی میں نے ساری گھاس  
ٹھیک کروائی تھی۔“ اس پر کچھ اثر نہ ہوا تو وہ بگڑ کر بولا۔  
”تو دوبارہ ٹھیک کروالینا..... پیسے میں دے  
دوں گی۔“ اس نے بڑے شاہانہ سے انداز میں اسے  
پیشکش کی۔

انہی پیسوں کے بل پر تو وہ اکڑتی تھی کیونکہ کسی کی  
دست نگر جو نہ تھی۔ سیما ب باقاعدہ اسے خرچہ دیتی تھی مگر  
وہ اسے بھی کبھی خاطر میں نہ لاتی۔ اسے اپنے سامنے بھی  
کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا اور یہ اس کی زندگی کی سب سے  
بڑی غلطی تھی جس سے وہ لاعلم تھی۔ اس نے تاسف سے  
بے پروا انداز میں کھڑی ایمان کو دیکھا۔

”دادو نے اسے ڈھیل دے کر اچھا نہیں کیا اور  
سیما ب پھپھو نے بھی اس کے ناز اٹھا کر اسے ساتویں  
آسمان پر پہنچا دیا ہے۔“ عامر صرف سوچ کر رہ گیا۔

لیکن اپنی ان تمام خصوصیات کے باوجود وہ  
اسے اچھی لگتی تھی۔ اس نے ایک نظر روندی ہوئی  
گھاس پر ڈالی اور دوسری نظر اندر جاتی ہوئی اس۔  
سرخری لڑکی پر..... تاسف، ہمدردی اور غصے کے ملے

جس کے سر پر کچھ ہٹا ہی نہیں ہو۔ وہ اسے اپنے تمام تر اکھڑیں سمیت اچھی لگتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کی ساری پریشانیاں اور الجھنیں خود میں سمیٹ کر اسے مطمئن کر دے۔ اسے اپنا یقین اور اعتبار دے کر اپنا اسیر کر لے۔

اس نے جو خود ساختہ قید تھائی سزا کے طور پر اپنے لیے منتخب کی تھی وہ اسے اس سے نجات دلوانا چاہتا تھا مگر فی الحال تو اسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے کیونکہ وہ ہر شخص کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ وہ تو جیسے چلتی ہواؤں سے بھی لڑنے لگتی تھی۔

”وہ ہرٹ ہوئی ہے امی..... اور یہ دکھ محرومی بن کر دل میں جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ اس کے اندر بھی جڑیں گہری ہو گئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سب کر کے وہ خود بھی خوش نہیں ہے۔“ بلا وجہ ہی اس نے بے اختیار اس کی دکالت کی۔

منصورہ نے چونک کر کچھ شکی نظروں سے بینے کی طرف دیکھا اور خطرے کا الارم ان کے ذہن میں گونجنے لگا۔

”مجھے نہیں کیوں فضول میں اس سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ کوئی بچاری نہیں ہے وہ..... ایسی خود پسند لڑکیوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ کوئی ظلم نہیں ہوا اس کے ساتھ۔ اسے مظلوم تو وہ بچے ہوتے ہیں جنہیں نہ ماں، باپ کی گود میسر آتی ہے اور نہ گھر کا عیش و آرام ملتا ہے۔ اس کے پاس تو سب کچھ ہے۔ سب رشتوں کے ہوتے ہوئے انہیں ٹھکرار ہی ہے اور اپنی ماں سے بھلا کون ناراض ہوتا ہے، بد نصیب ہے کہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی مستی سے محروم رہ رہی ہے۔ آفرین ہے سیماب پر جو اتنی ثابت قدمی سے اس کی نافرمانی اور بد تمیزی برداشت کر رہی ہے۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو اب تک دماغ درست کر چکی ہوتی اس کا۔ زندگی میں ابھی اس نے دیکھا ہی کیا ہے جو اتنا کڑ رہی ہے۔ اسے کیا معلوم زمانے

جملے جذبات کا ابال ایک ساتھ ہی اٹھا۔ وہ اپنے پورشن میں آیا تو منصورہ لاؤنج میں فراغت سے جھنجھی اپنا من پسند چمیل دیکھ رہی تھیں۔

”کیا آج پھوپھو آئی تھیں امی؟“ اس نے دریافت کیا۔

”ہاں، میرا خیال ہے کہ وہ آئی تھی آج مگر میں اس سے مل نہیں پائی۔ لیکن اس کا آنا ہمیشہ کی طرح بیکار ہی رہا۔ اس کے تو جیسے مزاج ہی نہیں ملے۔ عجیب فطرتی لڑکی ہے جسے اصل رنگوں کی پہچان ہی نہیں ہے۔“ ایمان کے ذکر پر ناگوار سے مل ان کی ہموار پیشانی پر بڑ گئے جو اکثر اسے دیکھ کر بھی پڑ جاتے تھے۔ اس گھر میں قطعی ناپسندیدہ اور اضافی ہستی تھی وہ ان کے لیے۔

”اچھا بھلا اپنا گھر چھوڑ کر کون پرانے گھر میں رہنا پسند کرتا ہے۔ جو سکھ اپنے گھر میں ہے وہ دوسروں کے گھر میں کہاں.....؟ اب ایسی بھی کیا ناراضی اور ضد.....“ اس کے خلاف بولنے کے لیے انہیں موقع مل گیا تھا۔

”امی پلیز..... یہ اس کا معاملہ ہے وہ جانے..... اور ہمارے کہنے کا اس پر اثر بھی کیا ہوتا ہے۔ اسے داد دینے چھوٹ دے رہی ہے۔ پھر پھوپھو کی طرف سے بھی کوئی سختی نہیں..... اس طرح تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید اس کے متعلق بولتیں اس نے انہیں ٹوک دیا۔

اس کی اس روش سے وہ بھی خاصا مایوس تھا مگر دل ناداں باڑا ہمار اس کی طرف جھکتا تھا۔ خصوصاً جب وہ روٹھی ہوئی خفا، خفاسی ہوتی تو اسے لگتا کہ وہ سارے زمانے سے شاکی ایک معصوم اور مظلوم سی خوب صورت گڑیا ہے۔ جس کی آنکھوں میں کسی بے جان گڑیا کی سی سختی جھلکتی ہے۔ جس کے سیاہ چہرے پر اچھے بکھرے رنگوں کے چھینٹے اسے کسی تجریدی آرٹ کا نادر شاہکار نظر آتے تھے۔ ایسا پورٹریٹ



”یہ کیا کر رہی ہیں دادو؟“ اس نے مٹر کی طرف اشارہ کیا۔

”ایمان کا دل مٹر پلاؤ کھانے کو چاہ رہا تھا۔ سوچا کہ مٹر پلاؤ پکالوں، تم کو بھی مٹر پلاؤ بہت پسند ہے ناں..... سوچ رہی تھی کہ تمہیں کسی سے کہلوا بھیجوں گی، اب آگئے ہو تو کہہ رہی ہوں کہ کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔“ مٹر کے دانے نکالتے ہوئے انہوں نے رمان سے کہا۔

”کیا ضرورت ہے دادو اتنی محنت کی، امی بھیج تو دیتی ہیں کھانا پکا کر..... پھر کیوں خواہ مخواہ خود کو تھکا رہی ہیں۔“ وہ محبت سے ان کے شانے ہو لے، ہو لے دبانے لگا۔

”ارے بیٹا میں کون سا کوئی کام کرتی ہوں، وہ آجاتی ہے رحمت، سارا وقت تو وہی سنبھالتی ہے سب کچھ۔ بڑے دن بعد کچھ کرنے بیٹھی ہوں، عادت چھوٹ گئی ناں، اب ایسا لگ رہا ہے جیسے انگلیاں جام ہو رہی ہیں.....“ وہ انگلیاں کھول، بند کر کے ورزش کرنے لگیں۔ ان کے برابر سے اٹھ کر وہ ان کے سامنے آ بیٹھا اور ان کا جھریوں بھرا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر ہو لے، ہو لے دبانے لگا۔

”یہ کام تو ایمان بھی کر سکتی ہے دادو، اس عمر میں آپ کام کرتی اچھی نہیں لگتیں۔“ وہ غفلی سے بولا۔

”ارے کام ہی کیا ہے..... آدمی پھلیاں تو چھل ہی نہیں باقی بھی اب تم سے باتوں میں چھیل لی جائیں گی۔“ وہ اس کی بات سمجھے بغیر سادگی سے بولیں۔

”دادو۔۔۔ کچھ ایمان کو بھی سکھا دیں۔ وہ تو کبھی کچھ کام کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ لڑکیاں اپنے والدین کے گھر ہی سب کچھ سیکھتی ہیں۔ والدین کے گھر رہتا اسے گوارا نہیں اب اگر وہ یہاں سے تو آپ ہی اسے سب کچھ سکھائیں اور سمجھائیں۔ اگلے گھر جائے گی تو دوش تو سب آپ کو ہی دیں گے

کی اونچ نیچ کا، وہ کیا جانے اچھا برا..... کیا وہ ہم سے، سیماب سے یعنی اپنی ماں سے بھی زیادہ عقلمند ہے؟ تمہاری دادو کی وجہ سے چپ ہو جاتی ہوں میں، ورنہ تو ایسی خبر لوں لاؤ رانی کی کہ طبیعت صاف ہو جائے۔“ منصورہ جو بولنا شروع ہوئیں تو بولتی ہی چلی گئیں۔ ان کے سامنے ذکر چھیڑ کر وہ الگ پچھتایا۔ دل مجروح پر جیسے کند چھری کے وار چل گئے۔ وہ یہیں اسی گھر کی چھت تلے اس کے آس پاس ہی رہتی تھی مگر اس تک رسائی بہت مشکل تھی۔ منصورہ کو وہ سخت ناپسند تھی اور ادھر وہ خود بھی کچھ کم نہیں تھی۔ وہ دل سے اس کی توجہ اور الفت کا طالب تھا مگر اس کی بے نیازی عروج پر تھی۔

☆☆☆

اسے معلوم تھا کہ وہ ضدی نہیں ہے بلکہ ضدی بن گئی ہے۔ جو زخم اسے ملا تھا اسے بھرنے میں ایک طویل وقت درکار تھا۔ وہ اس کے زخم پر مرہم رکھنا چاہتا تھا۔ اپنی محبت سے اس کی ساری بدگمانیوں کو دھونا چاہتا تھا مگر وہ اسے ہی کیا کسی کو بھی درخور افتنا نہ جانتی تھی۔ اسے کسی کے خلوص پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ اس کا نام تو ایمان تھا مگر وہ کسی کی بھی محبت اور خلوص پر ایمان نہ لاتی تھی۔

اور عامر اسے چاہتا تھا، وہ اس کی نظروں کے سامنے رہتی تھی مگر اسے پانا ناممکنات میں سے تھا۔ دل الجھا..... تو اس پر یک دم ہی بیزاری اور... جڑ جڑا ہٹ چھا گئی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے چھت پر چلا آیا۔

دیر تک وہ اس کے بارے میں غور و خوض کرتا رہا اور سرگرم پھونکتا رہا لیکن کوئی حل بھی ذہن میں نہیں آیا۔ نیچے اترتا تو بلا ارادہ ہی دادو کے حصے میں چلا آیا۔ وہ مٹر چھیلنے میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھا تو ایک شیشی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ عامر کو سفید دوپٹے میں لپی اپنی دادی بہت پروقار لگتی تھیں۔

وہ اپنی ماں کو نہیں گردان رہی تو میری کیا مانے گی۔ ارے اگر ابھی میں اس کی سرپرستی سے منع کر دوں تو بدگمان ہو کر وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ جذباتی بھی تو بہت ہے ناں..... میں تو بیچاری سیماب کے صبر اور حوصلے کی داد دیتی ہوں۔ کیسی بد نصیب ہے کہ اپنی ماما بھی اس پر ٹھہا اور نہیں کر سکتی لیکن دل میں جو ممتا اٹھتی ہوئی ہے اس کا کیا کرے۔ اسی لیے تو اس کا اتنا خیال کرتی ہے۔ لاکھ منع کیا مگر اس نے رحمت کو صبح سے شام تک کے لیے یہاں رکھ چھوڑا۔ منصورہ نے برا بھی مانا تھا مگر وہ مانی ہی نہیں اور کہہ دیا کہ اماں میری ایمان کی پرورش کر رہی ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں بھی اپنی ماں کا خیال رکھوں..... ہر ماہ باقاعدگی سے خرچہ بھی بھیجتی ہے۔ بہتیرا سمجھایا اسے کہ دیکھو ماں تمہارا کتنا خیال کرتی ہے مگر اس اتنی کھوپڑی پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ ”نلال کے رنگ ان کے لہجے میں نمایاں تھے۔

”آج آئی تھیں ناں پھوپھو.....؟“ اس نے تصدیق چاہی۔

”ہاں بیٹا آئی تھی وہ حراماں نصیب..... لاکھ پچکارا، ختمیں، خوشامدی کیں مگر یہ کنوڑا اس سے ملے بغیر منہ پھیر کر چل دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے سینے میں دل ہی نہیں پتھر ہے۔ بھلا بتاؤ، ماں سے بھی کوئی ایسے ناراض ہو سکتا ہے اور ماں بھی وہ جو اتنی صبر والی اور غم کھاتی ہوئی ہو۔“ اب ان کے لہجے میں ہلکا، ہلکا غصہ در آیا تھا۔ بیٹی کی محبت کے سامنے تو اسی کا طرز عمل انہیں بالکل غلط دکھائی دے رہا تھا ورنہ عمومی طور پر وہ اس کی ہمدردی میں ڈوبی رہتی تھیں اور یہی وہ موقع تھا جب لوہا گرم دیکھ کر اسے چوٹ مارتی تھی۔

”دادو، دراصل اسے آپ کی حمایت حاصل ہے۔ اس لیے وہ اتنا اکرٹی ہے آپ اس پر سختی کریں گی تو وہ سدھر جائے گی۔ آپ اسے مجبور کریں گی تو

ناں۔“ بیٹھے ہموار لہجے میں اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

دادو کے دل کے زخم پھر سے اُدھڑ گئے۔ انہوں نے اک گہری سانس بھری جس میں مایوسی پنہاں تھی۔

”ماہ..... ماہ..... نہ جانے کیسی تقدیر لکھوا کر لائی ہے، کچھ سختی ہی نہیں ہے۔ زیادہ کہو تو ناراض ہو جاتی ہے اور خفا ہو کر بھی خود ہی کو زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ میں نے تو خود کئی بار اس سے کہا کہ کوکنگ سیکھ لے۔ اسی لیے او دن بھی اپنے کچن میں سیٹ کروا دیا تھا تا کہ شوق میں آکر خود کچھ کرنے لگے مگر اپنے دکھ کا بدلہ وہ ہم سب سے ہی نہیں خود سے بھی لے رہی ہے۔ نہ اسے کوئی شوق ہے اور نہ کسی کی پروا۔ بھلا بتاؤ کون آئے گا اس کا ہاتھ تھامنے، لڑکی کی اتنی ہٹ دھرمی آگے چل کر اس کے لیے بھی مصیبت بن جاتی ہے۔ جس شاخ میں چک نہ ہو وہ بالآخر ٹوٹ جاتی ہے مگر وہ ہے کہ سختی ہی نہیں۔“ ایک ہمدرد کو سامنے پا کر دادو نے بیٹی آواز میں دل کے سارے دکھڑے کہہ سنائے۔ ان کے نورانی چہرے پر ایک گہرا کرب جھلکنے لگا۔ وہ اس کے لیے بہت فکر مند تھیں۔ عام کو ان پر بہت رحم آیا اور ساتھ ساتھ ایمان پر غصہ بھی آیا جو اپنے سوا کسی کو بھی نہیں دیکھتی تھی۔

”دادو آپ اس کی بڑی ہیں، اس پر سختی کر سکتی ہیں۔ اسے سمجھائیں اور زمانے کی اونچ نیچ بتائیں تا کہ اسے احساس ہو۔ کہ وہ غلطی پر ہے۔ وہ سب کے لیے ہی نہیں، اپنے لیے بھی مشکلات کھڑی کر رہی ہے اور اسے یہ بھی بتائیں کہ جو خود کو زیادہ عقل مند سمجھتا ہے وہ سب سے زیادہ بے وقوف ہوتا ہے۔“ ان کا ملائم ہاتھ چھوڑ کر منہ چھیلتے، چھیلتے اس نے سرگوشیاں انداز میں ان سے کہا۔

”کیا کروں..... کیسے سمجھاؤں اسے..... جب

وہ پھپھو سے ملنے لگے گی۔ اس طرح پھپھو کو بھی سکون ملے گا۔ دو چار دن اس سے بے رخی برتیں، لہن پھنکار کریں اور فحش دکھائیں ساتھ ہی اسے گھر کے کاموں کی طرف راغب کریں اور اسے مجبور کریں کہ وہ کوکنگ میں دلچسپی لے۔ اس طرح اس کا ذہن بے گاہہ کچھ مصروف ہوگی تو ہر وقت کی الٹی سیدھی سوچوں سے باہر نکلے گی اور پھپھو کی بھی طرف مائل ہوگی۔ وہ جوش میں آکر انہیں مختلف طریقے سمجھانے لگا۔

شاید جوش میں آکر اس کی آواز زیادہ ہی اونچی ہوئی تھی یا پھر اتفاقاً طور پر ایمان اس طرف آگئی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ آتش فشاں بنی اس کے سر پر کھڑی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ لگائی بجھائی کا یہ کام عورتوں کو ہی سوٹ کرنا ہے، بہت بھر لیے تم نے تانوں کے کان اب اٹھو اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔“ وہ تمام تر بدلتا فحش سے اس سے مخاطب ہوئی۔ دادو ہائیں، ہائیں کرتی رہ گئیں مگر وہ چپ ہو کر ہی نہ دی اور عامر کچھ شپٹا کر اور کھسکا کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

”ارے وہ تو مجھ سے ایسے ہی بات کر رہا تھا اس کا مطلب تمہاری برائی کرتا تھوڑی تھا۔ خواہ مخواہ اس پر گزر رہی ہو۔“ دادو نے تھوڑا گھبراتے ہوئے اس کی طرف سے صفائی دی۔

”خوب سمجھتی ہوں میں اپنا بھلا اور برا اور نہ ہی میں کوئی چھوٹی بچی ہوں عقل ہے میرے پاس۔ انہیں سمجھا دیں کہ آئندہ میرے بارے میں ذرا سوچ سمجھ کر بات کریں۔ کسی کو میری فکر میں دھلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ کسی لڑاکا عورت کی طرح اس پر برس رہی تھی۔

”ہائیں، ہائیں، ایمان... کیا بولے جا رہی ہو۔“ دادو نے اسے ٹوکا۔

”ہاں وہ تو نظر آ رہا ہے کہ تم کتنی عقل مند ہو

اسی لیے دادو سے زبان چلا رہی ہو، بڑے چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں تمہیں۔ پوری لڑاکا ڈوکی لگ رہی ہو اس وقت..... یاد رکھو جو لوگ صرف جذبات سے کام لیتے ہیں وہ تمہاری طرح خود ہی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔“ بوڑھی دادو کی بے بسی اور ضحیف دیکھ کر وہ بھی میدان میں کود پڑا۔

دونوں طرف بڑے خوفناک تاثرات چھا گئے تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے کو کڑے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ اس صورت حال سے دادو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”تم اندر جاؤ ایمان... چلو یہاں سے۔“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔

”اور اسے کچھ نہیں کہہ رہیں..... مجھے نہیں، اسے سمجھائیں آپ اور یہاں سے دفع کریں۔“ وہ ضبط کی آخری حدوں پر جا کر بکھرے لہجے میں بولی۔

”ایمان...“ دادو نے پھر اسے سرزنش کی۔

”ٹھیک ہے پھر آپ اسے ہی صحیح سمجھتی رہیں اگر میں آپ کو اتنی ہی بری لگتی ہوں تو چلی جاتی ہوں یہاں سے۔ بہت ہانسل ہیں اس شہر میں، کسی میں بھی رہ لوں گی۔“ اچانک ہی فیصلہ سنا کر وہ جھٹکے سے مڑ کر اندر کو چلی گئی۔

مگر اس سے پہلے ہی وہ قدم آگے بڑھ کر عامر اس کی راہ میں حائل ہو گیا اور اس کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ کر اسے واپس دادو کی طرف دھکیلا۔ اس کے ہٹکے سے دھٹکے سے وہ لڑکھڑا کر دادو کے پاس آگئی۔

”تم ہوتے کون ہو مجھے روکنے والے اور مجھ پر ظلم چلانے والے؟“ وہ غصے سے چیخ پڑی۔

”یہ میں تمہیں کچھ دنوں بعد بتاؤں گا۔ ابھی تو تم یہاں بیٹھ کر اپنی بد تمیزی پر دادو سے معافی مانگو..... تمہیں ذرا بھی کسی کا لحاظ نہیں..... وہ تم سے اتنی محبت کرتی ہیں۔ سب کی نئی لفتوں کو سہہ کر تمہاری پشت پناہی کر رہی ہیں اور تم نے ایک ہی جملے میں ان



## مصبت رنگ ہے ایسا

ایک نئے مشن کا آغاز بڑے ہی دلغریب انداز میں ہوا۔ وہ باقاعدگی سے ہر روز دادو کے پاس حاضری دینے لگا۔۔۔۔۔ اس کی آمد پر وہ لاکھ جھنجھلائی، پاؤں پختی مگر وہ اس کی ناگواری کو بالکل بھی خاطر میں نہ لاتا اور دادو سے باتیں مضارتا رہتا۔ اس دوران بھی اپنے ذہنی نعروں کی لپیٹ میں اسے بھی لے لیتا تب وہ اور زیادہ جھلجھلا جاتی۔

”آخر یہ یہاں روز، روز کیوں آرہا ہے؟“  
بھنا کر ایک دن وہ نا تو پرالٹ پڑی۔

”اے ہے میرا پوتا ہے، کیوں نہ آئے گا۔۔۔۔۔

جیسے تم میری نواسی ویسے وہ میرا پوتا۔۔۔۔۔ جتنا مجھ پر تمہارا حق بنتا ہے اتنا ہی اس کا حق بھی بنتا ہے۔“  
دادو نے اسے صاف، صاف جتا دیا۔

”بلکہ میرا زیادہ حق بنتا ہے کیوں کہ میں ان کا پوتا ہوں۔ شرعی لحاظ سے بھی اور خون کے لحاظ سے بھی میرا ذیل حق بنتا ہے۔ دادو کی ہر چیز اور ہر شے پر میرا ذیل حق بنتا ہے۔ میں جب چاہوں وہ چیز لے سکتا ہوں۔“ نہ جانے وہ کب وہاں آیا تھا اسے خبر ہی نہیں ہوئی اور اس کی ساری باتیں بھی اس نے سن لیں۔ اس کے کرارے سے جواب پر ایمان کو بے حد غصہ آیا۔ خواہ مخواہ کا حق جتانے جو آ گیا تھا۔

”ابو یں حق بنتا ہے، منہ دھور کھوا پنا۔۔۔۔۔ یہاں سے کوئی بھی چیز تم بلا اجازت اٹھا کر نہیں لے جا سکتے۔ یہاں میں بھی رہتی ہوں اور میری چیزیں بھی یہاں ہوتی ہیں۔“ اس نے لٹھ مار کر خاصی گرمی سے جواب دیا۔

اور کسی خدشے کے تحت احتیاطاً ٹیبل پر رکھی ڈرائی فروٹ کی برتی اٹھا کر کچن کی طرف چل دی کہ کہیں وہ زبردستی سارا میوہ نہ اڑالے جائے۔ ویسے ہی اس کی زیادہ آمد و رفت سے وہ چڑ رہی تھی۔ اب تک نانوکے ساتھ بلاشرکتہ غیرے رہ رہی تھی اور چار روز سے وہ اپنا حق جتانے آنے لگا تھا اسی لیے اسے خدشہ

کی محبت کو پامال کر دیا۔ ”دادو کے بوڑھے مگم صم سے چہرے پر ایک نظر ڈال کر وہ ڈپٹ کر اس سے بولا۔ اس وقت اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اپنے بکھرے بال چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس نے ایک نظر افسردہ سی نا نو پر ڈالی پھر انہی کی گود میں منہ چھپا کر سکنے لگی۔

”بے وقوف لڑکی۔۔۔۔۔ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔“ اس کے روتے چمکولے لیتے وجود کو دیکھ کر وہ بے چین ہو کر یہ آواز بلند بڑا دیا۔ اس سے اس کی سرخ سی آنکھوں میں چھپا ہوا راز ایمان کے دل کو ڈانواؤں کر گیا۔

☆☆☆

منصورہ کی طرف سے اسے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ وہ کسی صورت اس کے اور ایمان کے رشتے کے لیے راضی ہوں گی لیکن اس کا دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ اس کی بھرپور محبت اسے بدل ڈالے گی۔ اس کی ضد، خود سری اور بے اعتباری بھی ختم ہو جائے گی۔

اس روز کے بعد ایک دن موقع دیکھ کر اس نے دادو کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ دادو کو اور کیا چاہیے تھا وہ تو پہلے ہی اس کے رشتے کے لیے فکر مند تھیں۔ خوشی کے پُر مسرت احساس سے ان کی آنکھوں میں بجھتے دیے چمکنے لگے۔ وہ عامر کے فیصلے کو سراہنے لگیں۔

”بس دادو یہ بات ابھی آپ کے اور میرے درمیان رہے گی۔ ابھی امی، ابو کو اس کی خبر نہ ہو۔ ایمان کی عادتوں کی وجہ سے امی بھی اس سے بد دل ہیں اور نہ ہی ایمان سے اس بات کا ذکر کریں ورنہ خواہ مخواہ وہ فساد کھڑا کرے گی۔ میں اسے اپنے پیار اور توجہ سے رام کر لوں گا۔ اس کی عادتیں بدل دیں گی تو امی بھی خود بخود مان جائیں گی۔“ اس نے پوری تفصیل سے اپنا منصوبہ انہیں سنایا۔

دادو نے بھی اس کی بات سے متفق ہو کر اس بات کو راز میں رکھنے کی حامی بھری۔

☆☆☆

تھا کہ وہ میوے پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔

”تمہاری بھی ہر چیز دادو کی چیز ہی ہوئی کیونکہ تم خود بھی تو دادو کی لائق و فرمانبردار نو اسی ہو، اس لحاظ سے میرا تو تم پر بھی بہت حق بنتا ہے۔“ کینٹ کا دروازہ کھول کر وہ مرتبان اس میں رکھ ہی رہی تھی کہ وہ پیچھے پیچھے چلا آیا۔

اس کی بات پر ایک لمحے کو وہ سن سی رہ گئی جس کا فائدہ اٹھا کر اس نے میوے کی برنی اس کے ہاتھ سے لے کر بہت آرام سے منہی بھر میوہ نکال لیا۔

”کچھ زیادہ ہی خوش فہمی ہے تمہیں.....“ اس نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے برنی لی اور جلدی سے کینٹ کا دروازہ بند کر دیا۔

مگر جب آگے بڑھنے لگی تو اس نے اس کی کلا کی تھام لی وہ چاہنے کے باوجود اس کی گرفت سے کلائی نہ چھڑا پائی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ جھلا کر بولی۔

”جب کوئی سیدھی طرح بات نہیں سمجھتا تو زبردستی اسے جھڑپیاں لگانا پڑتی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے الجھ کر نہ سمجھنے والے انداز میں براہ راست اس کی طرف دیکھا مگر پھر اس کی آنکھوں میں ابھرتے جذبوں کو دیکھ کر کچھ خائف ہو کر نظر چمکائی۔

”اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ میں یہاں روز، روز کس کے لیے اور کیوں آتا ہوں۔“ اس کی گمبیر آواز نے اس کے دل پر باندھے گئے بند کو ایک ہلکے سے جھٹکے سے توڑ ڈالا۔

”فضول باتیں نہ کرو..... ابھی تانوا آگئیں تو سیدھا کر دیں گی تمہیں۔“ اس نے خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی بہت کوشش کی مگر آواز کی لرزش پر قابو نہ کر سکی۔ ہر لڑکی کی طرح اس موقع پر وہ بھی گنیووز ہو گئی تھی اور فطری مشرقیت نمود کر آئی تھی۔

”عامر..... عامر بیٹا.....“ اسی وقت دادو کی

آواز نے اسے چونکا کر دیا۔

وہ کچھ گھبرا کر اندر کی طرف پلٹا لیکن یہ نہ دیکھ پایا کہ ایمان کے چہرے پر بڑی خوب صورت سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ بڑا مثبت نتیجہ سامنے آیا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس کی جھلاہٹ اور چڑچڑاہٹ غلغلے میں بدل گئی۔ دادو تو اس معجزے پر حیران رہ گئیں۔ وہ اپنے پوتے عامر کی صلاحیتوں اور سمجھداری کی معترف ہو گئیں۔

وہ اکثر شام کو چلا آتا۔ دادو سے دیر تک باتیں کرتا ساتھ میں ایمان بھی شامل ہو جاتی۔ بڑے غیر محسوس انداز میں وہ اس کی طرف مائل ہوئی تھی۔ ایمان کے ساتھ مل کر وہ دادو کے بھی بہت سے کام کروادیتا تھا اور دعائیں بھی بونٹس میں ملتی رہتی تھیں۔ ایمان بھی اب اس کی عاوی ہو گئی تھی۔ اسے بھی عامر کا بدلا، بدلا اور مہمکتی سا روپ اچھا لگ رہا تھا ورنہ تو ہر شخص جیسے اس سے خفا تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر کسی کو اس سے ہمدردی نہیں تھی۔ سب اسے ہی غلط کہتے تھے اور اس سے بیزار تھے۔

☆☆☆

جہاں آرا اس کی نانی تھیں اور اپنے بڑے بیٹے جیل کے ساتھ رہتی تھیں جو اس کے سب سے بڑے ماموں تھے باقی دو ماموں الگ گھروں میں رہتے تھے۔ دو خالائیں شادی شدہ تھیں وہ بھی جہاں آرا سے ملنے آتی رہتی تھیں مگر ایمان سے سب ہی بیزار اور خفا، خفا رہتے تھے۔ اس کا دکھ کسی نے بھی نہ سمجھا بس اس کی یہاں رہائش پر کوئی خوش نہیں تھا۔ ان سب کے انہی رویوں نے اسے مزید سب سے بدگمان اور بددلی کر دیا۔ نتیجتاً وہ بد مزاج ہو گئی اور سب پر اسے اس کا اعتبار اٹھ گیا۔

کوئی بھی اس سے ہمدردی نہ کرتا تھا، خالائیں روکھے رویوں کا مظاہرہ کرتیں، مامیاں اسے اچھی نظر سے نہ دیکھتیں۔ کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر

## جینا پڑتا ہے

یہاں ہلہ، ہلہ جلنا پڑتا ہے  
ہر رنگ میں ڈھلنا پڑتا ہے  
ہر موڑ پہ ٹھوکر لگتی ہے  
ہر حال میں چلنا پڑتا ہے  
ہر دل کو سمجھنے کے لیے  
خود سے لڑنا پڑتا ہے  
کبھی خود کو کھونا پڑتا ہے  
کبھی چھپ، چھپ کے رونا پڑتا ہے  
کبھی نیند نہ آئے پھولوں پہ  
تو کبھی کانٹوں پہ سوتا پڑتا ہے  
کبھی تو خوشیاں لوٹ آئیں گی  
اسی آس پہ جینا پڑتا ہے

## کیوں

زندگی میں اس قدر تنہائیاں کیوں ملتی ہیں  
انگو حرفِ وفا تو رسوائیاں کیوں ملتی ہیں  
میری سوچ کی حدیں تو مجھ تک محدود ہیں  
پھر لوگوں کو میری ذات میں برائیاں کیوں ملتی ہیں  
میں ستاروں سے روشن اپنی ذات میں اتر کر دیکھوں  
تو اس قدر مجھے دیرائیاں کیوں ملتی ہیں  
ہزاروں لیوں کو مسکرائیں دے کر بھی  
اپنی ذات کی گہرائی میں اداسیاں کیوں ملتی ہیں  
مرسلہ: جگمگاتے بکھڑے، کراچی

اشارے کرتیں تب وہ دل برداشتہ ہو جاتی تھی۔ پہلے  
ایسا نہیں تھا جیسے تیسے وقت گزری رہا تھا شاید سب کو  
یہ امید تھی کہ وہ چند دن کی ناراضی کے بعد اپنی  
ماں کے پاس چلی ہی جائے گی مگر جب وہ اپنی ضد پر  
قائم رہی اور سب پر ابراجمان رہی تو سب کی تیوریوں پر  
مل پڑ گئے۔ چھوٹی موٹی رنجشوں اور کھٹ پٹ کا آغاز  
ہوا تو زندگی بری اور بہت بری لگنے لگی۔ وہ پہلے سے  
بھی زیادہ حساس اور سب سے بدظن ہو گئی۔

کئی کئی وقت بھوکی رہتی، سب کی ناگواری اور  
اپنے دکھ کا بدلہ اس نے اپنی ہی ذات سے لینا شروع  
کر دیا۔ جہاں آرا سے وہ سنبھالے نہ سنبھال رہی تھی  
اس کی صحت بھی روز بروز جھکتی جا رہی تھی۔ سیما ب  
سے تو اسے بات کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔ وہ آتی تو یہ  
کمرے میں بند ہو جاتی۔ ہر کوشش ناکام ہی رہی۔

اسے دیکھ، دیکھ کر جہاں آرا کا دل کڑھتا رہتا۔  
سب گھر والے ایک دوسرے سے ملتے اور ایمان  
سب سے الگ تھلگ کمرے میں بند رہتی۔ جہاں آرا  
بھی سب کے روئے دیکھ رہی تھیں۔ اسے نارمل  
زندگی کی طرف لانے کے لیے انہوں نے صرف اس  
کی خاطر اپنا پورشن علیحدہ سیٹ کر لیا تاکہ سکون اور  
چمن سے وہ واپس زندگی کی طرف مائل ہو۔ اپنا بچن  
بھی انہوں نے علیحدہ کر لیا تھا ان کے اس عمل سے  
سب کو بہت اعتراض ہوا خصوصاً ان کی بہو منصورہ  
نے بہت برا مانا چونکہ ایمان کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا  
تھا اس لیے وہ سب اس سے اور بھی کھینچ گئے۔ وہ  
سب ایمان کے زبردستی یہاں براجمان رہنے پر پہلے  
ہی خفا تھے اور اس کے سب سے بڑے ماموں نیل  
ماں پر تھوڑے برہم بھی ہوئے کہ وہ اس کی ضد میں  
اس کا غلط ساتھ دے رہی ہیں مگر وہ بھی تو اس کی محبت  
میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ سیما ب ان کی  
لخت جگر تھی تو ایمان ان کی کمزوری تھی اور پھر اگر وہ  
بھی سب کی طرح اس کا ساتھ چھوڑ دیتیں تو نہ جانے



اس کا کیا انجام ہوتا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ یہ سب کچھ اپنی نادانی میں کر رہی ہے۔ انہیں پوری امید تھی کہ کچھ عرصہ ان کے پاس رہ کر وہ سنبھل جائے گی اور ماں سے ناراضی ختم کر دے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کا غمہ اور ناراضی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب وہ اسکول گرل نہیں بلکہ کالج گرل تھی لیکن وہ اپنی ضد پر اب تک قائم تھی۔

☆☆☆

رحمت اس روز چھٹی پر تھی اور دادو ہفتہ صفائی منانے پر تلی ہوئی تھیں۔ پوری الماری خالی کر کے نئی ترتیب سے کپڑے رکھ رہی تھیں۔ ان کی اس بے وقت کی صفائی سے ایمان ٹالا نظر آ رہی تھی۔

”آج تو رحمت بھی نہیں آئی..... پھر بھی آپ یہ بکھیرا پھیلا کر بیٹھ گئیں۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”یہ کام رحمت کے کرنے کا نہیں ہے، اب میں اسے اپنی الماری میں تو گھسانے سے رہی۔ اس میں میری بہتری ذاتی چیزیں اور پیسے وغیرہ رکھے ہوتے ہیں اور یہ کام تو لڑکیوں کے کرنے کے ہیں تم نہیں کرو گی تو کون کرے گا۔ اس طرح ساتھ لگ کر کچھ نہ کچھ سکھ ہی جاؤ گی۔ اب تو مجھ میں وہ دم نہیں رہا ورنہ پہلے میں اکیلے دم سے دس کام نمٹا دیتا کرتی تھی۔ تمہارے دادا، خدا انہیں کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے، مجھ سے بہت خوش رہا کرتے تھے۔ اور بیٹا مرد بھی انہی بیویوں سے خوش ہوتے ہیں جو آگے بڑھ کر اس کا پورا کنبہ سنبھال لیتی ہیں۔“ وہ اسے لپکھ پلانے لگیں۔ یہ سب عامر کے کہے کا ہی اثر تھا کہ وہ اس کی تربیت کرنے پر تل گئی تھیں یا پھر وہ یہ چاہ رہی تھیں کہ ان میں میخوں سے گھبرا کر وہ سیماب کے پاس چلی جائے گی مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔

”افوہ نا نو.....! ایک تو آپ مجھے بہت چھوٹی سی بچی سمجھ کر سمجھاتی رہتی ہیں۔ سب آتا ہے مجھے اور پھر ملازم کس لیے رکھے ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں

نہیں آ رہا کہ آج رحمت کے چھٹی کرنے پر آپ نے یہ بکھیرا کیوں پھیلا لیا۔ اب یہ کارپٹ کو ویکلیم کرنے میں ہی اتنا وقت لگ جائے گا۔“ وہ بیچارگی سے بولی۔

”اوہو، تمہیں کچھ نہیں کرنا تو نہ کرو، جاؤ آرام کرو تم، میں خود ہی سب کر لوں گی۔“ وہ مصنوعی ناراضی سے بولیں۔

”اچھا بتائیں مجھے کیا کرنا ہے۔“ ان کی خفگی دیکھ کر اس نے مجبوراً پوچھا۔

”تم ایسا کرو کہ میرے کمرے کے پردے بدل دو۔ اتنے گہرے رنگ سے مجھے الجھن ہوتی ہے وہ جو فان گلر کے پردے ہیں ماں وہ ڈال دو اور ہاں ریڈنگ کو ذرا جھاڑن سے جھاڑ بھی لینا۔“ دادو نے جھٹ اسے کام بتا دیا۔

”اے یہ اتنے بھاری پردے ہیں..... میرا مطلب ہے اتنے قیمتی اور اچھے ہیں۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی مگر چہرے پر بے انتہا پریشانی کے آثار آ گئے۔

”اوہ، نانی، تو اسی آج صفائی میں لگی ہیں۔“ عین وقت پر عامر اندر داخل ہوا۔

ایمان کی بیزار صورت دیکھ کر ہنسی تو بہت آئی مگر ضبط کر گیا۔ بڑی کاریگری سے اس نے اسے اس جال میں الجھایا تھا۔

”رحمت کے سامنے یہ کام پھیلاتے ہوئے مجھے الجھن ہوتی ہے، اب تم آگئے ہو تو دو چار کام کرواتے جانا، ایمان غریب کب تک لگی رہے گی میرے ساتھ۔ تمہاری ماں نے جو کھانا بھجوا یا ہے وہ کچن میں رکھ دو۔“ انہوں نے مصروف سے انداز میں اسے ہدایات دیں کیونکہ وہی کھانا لے کر آتا تھا۔

”کھانا کہاں ہے دادو؟ اسی لیے تو میں یہاں آیا تھا۔ امی لوگ تو آج سب خالہ کی طرف گئے ہیں اور کھانا بھی نہیں رکا۔“ اس کی اطلاع تھی یا دھماکا۔ دادو سے زیادہ ایمان کی صورت دیکھنے والی ہو رہی تھی۔

”اے ہے، یہاں تو پہلے ہی بہت کام پھیلا ہوا

رفتہ زائل ہو رہی تھی۔

”چلو بھئی آلو ایل گئے، پہلے آلو چھیل لو پھر جیسے میں کہوں ویسے ان کو چڑھا دیتا۔“ دادو نے ظالم ملکہ کی طرح آرڈر دیا۔

”ہاں، ہاں ہم مل کر سب کر لیں گے۔“ اس کی صورت دیکھ کر عامر نے پیشکش کر دی۔ وہ دونوں بچن میں چلے گئے۔ آلو کا بھرتا منٹوں میں تیار ہو گیا تھا۔ وہ بچن سے باہر آئی تو عامر نے پائپ لگا کر اگلا براؤمدہ دھو ڈالا اس نے پتا پشالی پر ٹھکن لائے واپس سے سارا پانی سوت دیا۔ زندگی اتنے دلفریب رنگوں سے پُر ہے، یہ اسے آج معلوم ہوا تھا۔ عامر کے سنگ، سنگ ہر کام کرتے ہوئے بڑا اچھا لگا تھا۔

”ہاں بھئی کیسا رہا تجربہ میرے ساتھ کام کرنے کا؟“ کھانے کے بعد وہ از خود ہی چائے تیار کر کے لایا تو پوچھ بیٹھا۔

”آں..... کچھ برا تو نہیں.....“ اس نے کمال صفائی سے سرسری سے انداز میں کہا۔ ورنہ دل کی دھڑکنیں رک، رک سی گئی تھیں۔

”تو پھر کیا خیال ہے بندے کو ساری عمر کا غلام بنانے کے بارے میں؟“ بہت اچانک ہی اس نے بڑی بے باکی سے پوچھ لیا۔

وہ شیشا سی گئی اور اس کے چہرے پر بڑے خوب صورت سے رنگ بکھر گئے۔ عامر کے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کا مشن کامیاب جا رہا تھا۔

☆☆☆

اس روز وہ گھر میں داخل ہوا تو اسے ماحول پر بوجھل بن محسوس ہوا جیسے کسی کی سرد آہیں فضا میں حلول کر گئی ہوں۔ وہ گھبرا کر ماں کے پاس چلا گیا۔

”خیریت تو ہے، آج گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ ساری اسی کی فحوت ہے جب تک وہ

ہے، کیسے نئے گا سب؟“ دادو پریشان ہو گئیں۔

”ارے دادو فکر کی کوئی بات نہیں، میں مل کر سب کروادوں گا۔“ اس نے ایمان کی اتری ہوئی صورت کو کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

”میرا خیال ہے کہ کھانا بازار سے آجائے گا۔“ ایمان نے جھٹنجھوڑ دی۔

”ارے بازار جانے کا وقت کہاں ہے، گھر میں ہی کچھ سادہ سا پک جائے گا۔ ادھر ہنڈیا چڑھے گی ادھر کام بھی ٹھٹ جائیں گے۔“ دادو نے بھی عامر کا ہی ساتھ دیا۔

”مگر نا نو.....؟“ اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

”میرا خیال ہے کہ آلو پکالیں گے، وہ آسانی سے پک جاتے ہیں۔“ دادو نے ڈس بھی تجویز کر دی۔

”آلو کا بھرتا صحیح رہے گا دادو، اسے پکانے کا بھی مسئلہ نہیں ہوتا نہ اتنا پھیلاوا ہوتا ہے۔“ عامر نے فوراً ان کی بات سے اتفاق کیا۔

”ہاں، یہ صحیح ہے، جاؤ ایمان چھینکے میں سے آلو لے کر اچھی طرح دھو کر ابالنے کے لیے رکھ دو۔“ دادو نے بے نیازی سے آرڈر کیا۔

ان دونوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی وہ منہ بناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ عامر نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ دبائی۔

وہ آلو ابالنے کے لیے رکھ کر آئی تب تک وہ قالین پر ویکیوم کرنے کے بعد دادو کے شاہی گاؤں کے دیوار کے ساتھ سیٹ کر رہا تھا۔ دادو اب تھک تھکا کر اپنے پٹنگ پر آنکھیں موندے بے دم سی لیتی تھیں۔

اس نے ان کی الماری میں بقیہ کپڑے سیٹ کیے۔ عامر نے ان کے کمرے کے پردے اتار ڈالے وہ دادو کی پسند کے پردے لے کر آئی۔ اور ان کے ہک لگا کر عامر کے سپرد کر دیے۔ ان سارے کاموں کے درمیان وہ کوفت کا شکار رہی لیکن عامر کی باتوں نے ذرا بھی تھکن نہ ہونے دی اور کوفت بھی رفتہ

یہاں سے ایسا ہی ہوتا رہے گا، کیسی بے رحم اور نا فرمان لڑکی ہے، ماں کا دل دکھاتے اسے ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔“ انہوں نے ناگواری سے کہا۔

”اوہ مائی گاڈ.....“ اس نے تاسف سے سر تھام لیا۔ ”اتنی کوشش کے بعد تو وہ سنبھلی تھی اب پھر وہی سلوک اور سب کی طنز یہ نکا ہیں.....“ وہ سمجھ گیا کہ سیماب پھپھو آئی تھیں۔

”پھپھو تمہیں کیا ابھی ہیں؟“ وہ کچھ سوچ کر سوال کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ”رہنے دو..... تم بلا وجہ اس کے معاملے میں نہ بولو۔ ویسے بھی وہ دو منٹ میں آئے سے باہر ہو جاتی ہے اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ زیادہ ہی ادھر جا رہے ہو۔“ کئی دنوں کی تشویش کو بالآخر انہوں نے زبان دے ہی ڈالی۔

”ادھو امی، میں تو دادو کی وجہ سے وہاں جاتا ہوں۔“ اس نے کھپا کر وضاحت دی اور دوسرے پورشن کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سیدھا دادو کے پاس پہنچا۔ حسب توقع جہاں آرام صم فکر مند سی بیٹھی تھیں۔ ”میں نے اسے کئی بار منع کیا ہے مگر وہ ہر بار اس پتھر سے سر پھوڑنے چلی آتی ہے۔“ اضطراب ان کے چہرے کی شکنوں میں نظر آ رہا تھا جی اور نو اسی کی جنگ نے انہیں غمگین کر دیا تھا۔ وہ سیدھا ایمان کے کمرے کی طرف بڑھا اور آوازوں پر چونک کر رک گیا۔

”ایمان بیٹا، میرا یقین کرو میں نے صرف تمہاری خاطر یہ قدم اٹھایا تھا۔ تمہارا مستقبل ستوارنے کے لیے.....“ سیماب بہت لا چاری سے اسے وضاحت دے رہی تھیں۔ مگر وہ کھسور بنی کھڑی رہی۔ ”اپنے مفاد میں مجھے استعمال نہ کریں تو بہتر ہے۔ آپ کو خود اپنی زندگی مجھ سے زیادہ پیاری تھی۔ جبھی تو اتنی جلدی مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کر لی آپ نے۔“ وہ سگدلی سے بولی۔

”یہ غلط ہے ایمان، میرے سامنے صرف اور صرف تمہاری بہتری تھی، تم خود مجھے چھوڑ کر یہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہو، تمہارے ڈیڈی کو تمہارے“ میرے ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وہ اسے سمجھانے لگیں۔

”مت کہیں اس اجنبی شخص کو میرا ڈیڈی اور پلیز آپ مجھے بھول جائیں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مت آیا کریں یہاں پر..... آپ کی وجہ سے یہاں سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں، میرے ڈیڈی تو میرے لیے بہت پہلے مر گئے تھے اب میں ماں کو بھی صبر کر لوں گی اور وہ گھر جہاں آپ رہتی ہیں میرا نہیں آپ کے شوہر کا ہے۔“ وہ نفرت سے بولی۔

”ایمان تم سمجھنے کی کوشش تو کرو، یہ سب میں نے تمہارا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے ہی کیا ہے، ورنہ میرے تو دونوں ہاتھ خالی تھے۔ کوئی پر اپنی، کوئی بینک بیلنس نہ تھا، جو عزت اپنے گھر کی چھاؤں میں ملتی ہے وہ دوسروں کے در پر نہیں ملتی۔ میں نے انصاف سے شادی صرف اس وجہ سے کی ہے کہ تم دوسروں کے رحم و کرم پر نہ پلو..... انصاف کو بھی تمہارا بہت خیال ہے، تم میری بات پر غور تو کرو۔“ اس کے لاکھ بے رخی برتنے کے باوجود وہ اس کے لیے فکر مند تھیں۔

”نہیں کرنی مجھے آپ کے لائے ہوئے کسی بھی شخص سے شادی..... اپنی زندگی تو سیٹ ہو گئی ناں آپ کی، ٹھوکر دوں میں تو آپ نے مجھے رکھ دیا ہے اب پلیز مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔“ وہ انتہائی ترشی اور رکھائی سے بولی۔

اس نئی اطلاع پر عامر بری طرح چونکا۔ یہ نئی اطلاع ابھی ابھی اس کے علم میں آئی تھی۔ لیکن پھپھو کی بچاؤ کی اس سے دیکھی نہ گئی وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ ”ایمان..... یہ کیا حرکت ہے، ماں ہیں وہ تمہاری.....“ اسے بڑا مان تھا کہ اس کی بات وہ مزور سن لے گی۔



بیٹی کے لیے دل ڈگمگاتا رہا لیکن کچھ وقت کی آزمائش جان کر اس نے وہ وقت بھی گزار دیا۔

جس وقت اس کی انصاف سے شادی ہوئی ایمان دس بارہ سال کی تھی۔ یہ سب کچھ اس کے لیے قطعاً عجیب اور غیر متوقع تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی ماں کسی دوسرے شخص کی بیوی بن کر پرانی ہو جائے گی۔ وہ چپ چاپ خالی آنکھوں سے یہ سب دیکھتی رہی۔ شادی کے شروع دنوں میں جہاں آرا نے مصلحتاً اسے خود ہی سیما کے پاس نہ بھیجا۔ وہ چاہتی تھیں کہ سیما اپنے گھر میں سیٹ ہو جائے اور میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی ہو جائے اور کچھ وقت ایمان کو بھی ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے درکار تھا۔ لیکن ایمان کا ردِ عمل بہت شدید نکلا..... وہ تو سمجھ رہی تھی کہ ایمان بچی ہے، بھلانے پھسلانے اور سمجھانے سے سمجھ جائے گی لیکن ایمان کی توقعات کو شدید دھچکا لگا تھا۔ پہلے ہی وہ اپنے باپ سے محروم تھی اس نے خود ہی فرض کر لیا کہ وہ اپنی ماں کو بھی کھو چکی ہے، وہ سیما سے شدید ناراض ہو گئی۔

☆☆☆

”یہ کیا نیا چکر ہے دادو، کیا پھوپھا ایمان کے لیے کوئی رشتہ لائی تھیں؟“ اگلے ہی دن وہ دادو کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”یہ سارا ہنگامہ اسی کا تو تھا۔ ارے بھی کب تک وہ اتنی ٹھنی ٹھنی رہے گی، یوں نہ سہی تو یوں ہی سہی کہ وہ اپنے گھر ہی چلی جائے مگر اس نے تو طوفان کھڑا کر دیا۔“ دادو تو جیسے اسی کی منتظر تھیں کہ وہ آئے تو دل کا غبار نکالیں۔

”تو کیا ضرورت تھی پھوپھو کو اس سے یہ بات کرنے کی..... کیوں اس کے رشتے کے لیے ہلکان ہو رہی ہیں وہ..... کون سا وہ ان کی ہر بات مانتی ہے اور ان کی عزت کرتی ہے۔“ وہ اپنے مطلب کی بات پر جلد ہی آ گیا۔

”سوری مسٹر، یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے، بہتر ہے کہ اس میں تم نہ بولو اور پلیز مسز انصاف اب آپ جانتی ہیں۔“ اس نے عامر کو مخاطب کرنے کے بعد افسردہ سیما کو جیسی لہجے میں مخاطب کیا۔

عامر کو اس سے اس کی سنگ دلی پر بے تحاشا غصہ آیا وہ پھوپھو کو اپنے بازوؤں میں لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان کے سب حالات اس کے سامنے تھے۔ وہ مظلوم بھی تھیں اور قابلِ رحم بھی..... جہاں آرا نے اپنی چھوٹی بیٹی سیما کی شادی بڑے دھوم دھڑکے سے کی تھی مگر وہ مقدر کی کھوئی تکلیف۔ شادی کے پانچ ماہ بعد ہی ان کے شوہر نے ان پر بد چلتی کا الزام لگا کر انہیں طلاق دے دی۔ سیما کی جوانی پر داغ لگ گیا۔ وہ ماں بننے والی تھیں۔ دراصل یہ تو اس بے غیرت شخص کا ایک بہانہ تھا۔ وہ گھر بسانے والا آدمی ہی نہیں تھا۔ غلط کاموں میں تھا مگر ان لوگوں کو حقیقت پتا نہیں چل سکی۔ ایمان نے اپنی مائیں کے گھر میں ہی جنم لیا۔ اپنا بچپن اور زندگی کے خوب صورت ماہ و سال اس نے یہیں گزارے۔ ماموں، خالہ اس پر جان چھڑکتے تھے لیکن سیما کی بھری جوانی بھی ان سب کے لیے باعثِ تشویش تھی۔ ایک لمبی عمر اسے گزارنی تھی اس طرح تنہا کب تک گزارنی، سیما تو دوسری شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی تھی لیکن آٹھ دس سال گزارنے کے بعد اسے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ اپنا گھر پھر اپنا گھر ہی ہوتا ہے۔ ایک مرد کی سرپرستی بہر حال بہت ضروری ہوتی ہے، سب بھائی بہنوں کے اپنے اپنے گھر آباد تھے۔ سب ہی اس کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن کئی مرحلوں پر انہا نے میں ہی اس کی دل آزاری ہوئی تو اسے اپنی بے بسی کا شدید احساس ہوتا۔ اس نے گہرائی میں جا کر غور کیا تو ایمان کا مستقبل کسی گھرے اندھے کنویں کی طرح منہ کھولے نظر آیا۔ انصاف کا رشتہ آیا تو اس نے زیادہ چوں چراں نہ کی مگر

”بنا وہ ماں ہے اس کی، وہ نہیں سوچے گی تو کون سوچے گا۔ مجھ بڑھیا میں اتنا دم کہاں ہے کہ اس کی شادی کے لیے ماری، ماری پھروں، افضال بھلا آدمی ہے وہ اسے اپنی سرپرستی دینے پر بھی رضا مند ہے۔ مجھے تو سیما ب کا نکاح اس سے کیا تھا میں نے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ اتنا فساد ڈالے گی، پہلے۔ چوٹی تھی تو چلو میں نے یہ سوچا کہ ابھی اسے سمجھ نہیں ہے مگر اس نے تو ماں سے بیر ہی پال لیا ہے۔ وہ رشتہ بھی افضال کی معرفت آیا ہے لیکن یہ لڑکی..... چچ، چچ.....“ دادو نے دھیرے، دھیرے ساری بات بتادی۔

ان کے بولنے کے دوران وہ بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ دادو تو ایسے بن رہی تھیں جیسے اس کے اور ان کے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ شاید بڑھاپے میں ان کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے۔

”تو دادو آپ پھپھو کو میرے بارے میں بتادیں ناں۔“ ہولے سے کھٹکھٹا کر اس نے ان سے کہا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اس بات کو منظر عام پر لانے کا موقع آ گیا ہے۔

”اے لو، تم نے خود ہی تو منع کیا تھا کہ ابھی اس بات کو راز رہنے دو اگر سیما ب کو بتا دیتی تو وہ اسی وقت تمہارے لیے حامی بھر لیتی۔ بھتیجے سے بڑھ کر کوئی دوسرا کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر ابھی تمہارے اماں، باوا کی طرف سے کوئی سلسلہ شروع نہیں ہوا ان کی رضا مندی کے بغیر یہ بات منہ سے نکالنی غلط ہے اور سیما ب سے تذکرہ کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ افضال سے بھی اس بات کا تذکرہ کر دے گی۔ ابھی ایمان کی مرضی بھی نہیں معلوم..... نہیں بھیجی ایسے نہیں، سب کے علم میں بات لائی جائے گی تبھی کچھ ہوگا ورنہ تمہاری ماں کچھ کم شور نہیں مچائے گی اور میں نہیں چاہتی کہ اس کی زندگی کو مزید عذاب بناؤں۔“ دادو نے بڑی دور اندیشی اور سوچ بوجھ

سے اس کے سامنے حقائق بیان کیے جن پر اس نے ابھی غور نہیں کیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ امی، ابو سے بات کر لیں اور ایمان سے تو میں خود ہی بات کر لوں گا۔“ اس نے پوری، پوری آمادگی کے ساتھ کہا۔ گزرے دنوں میں وہ ایمان کو پرکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ اپنی محبت سے اس پر اپنا اعتبار قائم کر چکا ہے۔

”نہ بھی! میرے کندھے پر رکھ کر بندوق نہ چلاؤ، میں تو اس کی وجہ سے پہلے ہی بری ہوں کہ اس کی حمایت کر کے اسے سرچڑھا لیا ہے، اب یہ ہوگا کہ زبردستی ہمارے سر لا رہی ہیں، جو بھی کرو خود کرو، چاہے خود ان سے بات کر لیا اپنے کسی چچا یا پھپھو کے ذریعے کرواؤ..... میں نہیں بولوں گی خود سے۔“ دادو نے اپنا دامن صاف بچا لیا۔

عامر خنی سوچ میں پڑ گیا، وہ دادو کے کمرے سے باہر آیا تو ایمان اسے لاؤنچ میں ہی مل گئی۔ اسے دیکھا تو بے رخی سے رخ پھیر لیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”میں نے کیا کہا ہے جو تم مجھ سے بھی ناراض ہو گئیں بے اس نے پورے استحقاق سے پوچھا۔ اس کے بیضوی چہرے پر دکھ کی سفیدی سی اڑی اور خفا، خفا سے روپ میں خٹکے تین نقوش کچھ اور بھی دلکش لگنے لگے۔

”تم بھی تو انہی کی دکالت کر رہے تھے ناں.....“ وہ ناراضی سے بولی۔

”ایمان وہ ماں ہیں تمہاری..... معاف کر دو انہیں..... انہیں بھی ایک مخلص سہارے کی ضرورت تھی۔ کوئی غلط نہیں کیا انہوں نے، ہمارے مذہب میں تو شوہر کے مرتے کے بعد یا مغلغہ عورت کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے.....“ نرمی سے اسے اس نے قائل کرنا چاہا۔

”بس رہنے دو اپنا یہ لیکچر..... اگر وہ میری ماں ہوتیں تو اتنی خود غرضی کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔ انہوں

### بزرگ پالنا

بزرگ پالنا آسان نہیں۔ اہل مغرب ہر جانور پال لیتے ہیں مگر بزرگ پالنے کا ان میں بھی حوصلہ نہیں۔ وہ کہتے شوق سے پالتے ہیں بقول میرے دوست ف۔ ”کتوں کو گھر میں نہیں پالنا چاہیے۔ انسانوں کے ساتھ رہ کر ان کی عادتیں خراب ہو جاتی ہیں وہ مزید کتے ہو جاتے ہیں۔“

یونس بٹ کی شیطانیاں سے اقتباس  
مرسلہ: بابا بلوچ، میر پور خاص

انکار کر دیا، وہ تو اسے پہلے ہی اچھا نہیں سمجھتی تھیں کیا یہ کہ وہ ان کی بہو بن کر ان کے گھر میں دندنا پی پھرنی۔  
”یہ ناممکن ہے۔ قطعاً ناممکن۔۔۔۔۔“ انہوں نے فیصلہ صادر کر دیا۔

”امی وہ کوئی غیر نہیں ہماری اپنی ہے۔۔۔۔۔ ہماری پچھو کی بیٹی ہے، اس کی غلطیوں کو ہم ہی کو درست کرنا ہوگا۔ آپ دیکھیے گا کہ وہ ہم میں گھل مل کر بالکل صحیح ہو جائے گی۔“ عامر نے انہیں سمجھایا۔

”نہ بابا، جب وہ لڑکی اپنی ماں کو نہیں گردانتی تو ہماری کیا عزت کرے گی حشر نشر کر دے گی سارے گھر کا۔۔۔۔۔ سیما ب تو اس کے پیچھے خوار ہو کر بیمار پڑ گئی ہے۔ اس دن فون پر بھی بہت رو رہی تھی وہ۔“ وہ تو ایک فیصلہ بھی راضی ہونے کو تیار نہیں تھی۔

”امی، آپ ایمان کو چھوڑ کر اسے اپنے بیٹے کی خواہش سمجھ کر تو غور کریں نا، میں اس کی نادانی اور غلطی کو درست کرنا چاہتا ہوں۔ آہستہ، آہستہ وہ ٹھیک ہو جائے گی اور پچھو سے ناراضی بھی ختم ہو جائے گی۔“ اس نے ہر طرح سے انہیں متا نا چاہا مگر ناکام رہا۔

”مجھے ایسی ضدی لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنانا۔۔۔۔۔“

نے صرف اپنا گھر بسالیا۔ اپنی پروا کی۔۔۔۔۔ جب وہ میرے سامنے آتی ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ میری ماں نہیں بلکہ کوئی پرانی عورت ہے جو اپنے شوہر کے گھر میں کسی خوشی رہتی ہے۔ ”وہ خود کو زیادہ دیر مضبوط نہ رکھ سکی اور بے اختیار دل کی بات کہہ گئی۔ اس کی اداس آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے اور چہرے پر دکھ کی گہری گھنا چھا گئی۔ اس وقت عامر کو وہ بہت مظلوم اور خود ترسی کا شکار لگی۔ وہ اسے اس کیفیت سے جلد سے جلد باہر نکالنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے ایمان سے صاف، صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”اچھا چھوڑو اس بات کو۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ اگر میں ساری عمر کے لیے تمہارا ہاتھ تھامنا چاہوں تو انکار تو نہیں کرو گی؟“ بہت اچانک ہی اس نے بڑے سادہ سے انداز میں پوچھ ڈالا اور ایمان نے بری طرح جھینپ کر رخ موڑ لیا۔ دل کے تار بڑے ہو لے سے کسی نے چھوئے تھے۔

”کیا ہوا، کیا میں اتنا ہی برا ہوں کہ دیکھنا بھی گوارا نہیں۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں انکار ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ اس نے جلدی سے اس کی بات نفی کی۔

”اچھا تو تمہیں قبول ہے۔“ وہ ہنس دیا۔ ”تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا ایمان۔۔۔۔۔ ہر حال میں۔۔۔۔۔ ہر طرح سے۔۔۔۔۔ دیکھو ہماری راہ میں بہت رکاوٹیں ہیں۔“ اس نے خاص لہجے میں اسے باور کرایا۔ وہ اسے اس بھنور سے نکال کر ڈھیروں خوشیاں دینا چاہتا تھا اور اس کے اقرار نے عامر کے تن من کو نرم پھوار کے مانند سیراب سا کر دیا۔

آنے والے حالات اچھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ عامر کے منہ سے بات نکلنے کی دیر تھی کہ سارے گھر میں بھونچال سا آگیا۔ منصورہ نے صاف



بس۔" اس کی ہر دلیل کو رد کر کے انہوں نے اپنا قطعی فیصلہ سنا ڈالا۔ اور ان کے ساتھ سب ہی شامل تھے۔ جس نے بھی سنا اس کی بات کی مخالفت کی۔ اس نے باپ کی حمایت چاہی تو انہوں نے بھی معذرت کر لی۔ عامر کو معلوم تھا کہ اسے اسی سخت رد عمل کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے وہ ہر قسم کے امتحان اور صورت حال کے لیے تیار تھا لیکن بات پھیلی تو اس کی لپیٹ میں ایمان بھی آگئی اور سب پہلے سے بھی زیادہ اس کے خلاف ہو گئے۔ سارے گھر میں ایک ناپسندیدہ سی فضا چھا گئی کیونکہ سب کو سیما سے ہمدردی تھی اور ایمان کو وہ سب ہی غلط سمجھتے تھے۔

"عامر تم نے تو مجھے سب کی نظروں سے اور بھی گرا دیا، میں تو پہلے ہی بہت بری تھی۔" وہ عامر سے ملی تو سک پڑی۔ ان کا دلخیز و ترش باتوں نے اسے توڑ ڈالا تھا اور چند ہی روز میں اس کا روپ کھلا گیا تھا۔

"مجھے بھول جاؤ عامر.... میں واقعی اسی قابل نہیں ہوں، میری ماں نے اپنی زندگی سنوار کر مجھے ہمیشہ کے لیے برباد کر دیا ہے، میں واقعی بہت بری ہوں.... بہت بری۔" وہ روئی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تو اسے لگا جیسے اب سارے دروازے بند ہو گئے، اب کوئی راستہ کبھی نہیں کھلے گا۔ اس بند دروازے نے ایمان کی قسمت اور خوشیوں کو ہمیشہ کے لیے قید کر دیا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ اس بند دروازے کو توڑ ڈالے۔

☆☆☆

بالآخر وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا.... سب ایک دم ہی راضی ہو گئے۔ جیل احمد نے خود دادو سے عامر اور ایمان کے رشتے کی بات کی، نہ جانے عامر نے اس بار کیا پالیسی اختیار کی تھی کہ وہ سب لوگ مان گئے تھے۔ اسے عامر کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ معجزہ بھی ہو سکتا ہے۔ آخر یہ سب کیسے ہوا؟ وہ اس سے پوچھ بیٹھی۔

"یہ سب چھوڑو اور اچھی لڑکیوں کی طرح ہیا دیس جانے کی تیاریاں کرو۔" اس کی بات پر وہ شرما کر رہ گئی اور مزید کچھ نہ پوچھ سکی۔

دن ایک دم ہی بہت حسین ہو گئے تھے۔ طبیعت پر چھایا ہوا بوجھل پن رخصت ہوا اور ایک سرشاری سی اس کے پورے وجود میں دوڑ کر اسے شاداب بنا رہی تھی لیکن اس روز اس کی ساری خوش فہمی ایک جھماکے سے رخصت ہو گئی۔

"صرف اور صرف سیما کی وجہ سے میں اس جیسی ناخلف اور نافرمان لڑکی کو بہو بنانے کے لیے راضی ہوا ہوں، میری بہن اتنے دکھ سہ چکی ہے کہ اسے مزید دکھ دینا مجھے گوارا نہیں ہوا۔ اسی لیے اس کی بات مجھ سے ٹالی نہیں گئی۔ ورنہ ایمان کے اندر کوئی خوبی نہیں۔" جیل ماموں، ہاتھ کے پاس بیٹھے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

وہ ایک دم ہی آسمان سے زمین پر آگئی۔ وجود میں بھڑکتی چنگاریاں شعلہ بن کر اسے خاکستر کرنے لگیں۔ اسے اپنی نام نہاد ماں کا کوئی احسان لینا گوارا نہیں تھا خواہ اس کے لیے اسے اپنی محبت ہی سے محروم ہونا پڑتا۔ اس کے نزدیک ان کا جرم اتنا بڑا تھا کہ انہیں معاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ صرف ایک لمحہ لگا تھا اسے فیصلہ کرنے میں۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اس کے پاس گئی اور انگوٹھی اتار کر اس کے سامنے پھینک دی۔

"نہیں چاہیے مجھے یہ بھیک.... مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس رشتے کے لیے تم نے ان خاتون کو آڑ بنایا ہے جنہیں ہمیشہ اپنی خوشیاں ہی عزیز رہیں، ان کی سفارش پر طے کیے گئے اس رشتے کو میں خود اپنے ہاتھوں ختم کر رہی ہوں۔" وہ انتہاؤں پر جا چکی تھی۔

"ریلیکس ایمان.... آرام سے میری بات

## مصبت رنگ ہے ایسا

اس کی صدا نے دور تک اس کا پیچھا کیا مگر اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔

اس نے تو عامر کی بھی آنکھوں اور دھواں، دھواں چہرے کو بھی نہ دیکھا۔ محبت اسی کے لیے روگ بن گئی تھی۔ وہ لڑکی اسے زخم دے گئی تھی۔

پھر سب کچھ بہت جلدی میں ہوا..... اس کی ضد کوئی نہ توڑ سکا۔ منصورہ کے توسط سے آنے والے ایک قابل قبول رشتے کو اس کی رضامندی کے بعد قبول کر لیا گیا۔ وہ ساری یادوں، باتوں اور عامر کے ٹوٹے دل کی خواہشوں کو اپنے حنائی قدموں تلے روندتی ہوئی بڑی سنگدلی سے چل دی۔ پیچھے صرف اڑتے غبار کی دھول رہ گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جرمنی چلی گئی تھی اور عامر بھی دل برداشتہ ہو کر ملک سے باہر چلا گیا۔



اب سات سال بعد وقت نے اسے پھر اسی دلہیز پر لا کھڑا کیا تھا جہاں سے وہ چلی تھی۔ ایک گہرا حزن اس کی شخصیت پر چھایا ہوا تھا..... وقت نے اس کی سوچ، فکر اور شعور کو گہرائی بخشی تھی اور اس اور اک نے اسے اذیت سے ہمکنار کر رکھا تھا۔ ہار سنگار کے درخت تلے کھڑی وہ کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ بے قرار سراپا جو اس کے لیے دیوانہ وار وہاں آیا کرتا تھا اور اب ماں کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

یہ گھڑیہ دیوار دور جہاں اس نے ایک مہر بسر کی تھی اسے اب پرانے لگ رہے تھے کیونکہ اب وہاں بھی اس کے لیے وہ منجائش نظر نہیں آرہی تھی۔ فہد کی حادثاتی موت نے اسے بڑے عجیب حالات سے دوچار کر دیا تھا۔ مشکل دنوں میں فہد کی جائداد ٹھکانے لگ گئی تھی اور اس کی وفات کے بعد اس کا کاروبار اس کے بزنس پارٹنر نے ہڑپ کر لیا تھا۔ اس کے پاس زندگی بسر کرنے کو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اسے

سنو۔ "وہ اسے پکارتے لگا۔

"مجھے کچھ نہیں سنا....." وہ سخت لہجے میں بولی۔

"ایمان یہ حقیقی زندگی ہے، کوئی اسٹیج ڈراما نہیں ہے۔ آخر تم حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ تم نے میری محبت کو جھٹلانے کے بارے میں سوچا بھی کیسے؟ پھوپھی تم سے بہت محبت کرتی ہیں اسی لیے انہوں نے میری خواہش پر ابو سے تمہارے رشتے کی سفارش کی ہے۔" اس نے اسے سمجھانا چاہا۔

"یہ محبتوں کے ڈھونگ میں خوب جانتی ہوں، جب اپنا مفاد ہو تو لوگ محبتوں کو بھی بدل لیتے ہیں۔" وہ انتہائی تنفر سے بولی۔

"شفت، اپ ایمان، بہت سن لیں میں نے تمہاری الٹی باتیں، ختم کرو اس خود ترسی کو جس میں تم جی رہی ہو اور اپنے ساتھ سب کی زندگی عذاب بنارہی ہو، ہزاروں بچوں کے ماں، باپ دوسری شادی کرتے ہیں مگر کبھی کوئی تمہاری طرح ری ایکٹ نہیں کرتا۔ افضال انکل کی سگی بیٹیاں تک سیما ب پھوپھی کو اتنی عزت اور احترام دیتی ہیں اور تم ان کے ساتھ کیسا سلوک کر رہی ہو جبکہ افضال انکل کھلے دل سے تمہیں قبول کرنے کو تیار ہیں۔ مگر تم بہت کم ظرف اور تنگ دل ہو اسی لیے آج اکیلی ہو۔" اس نے ترش لہجے میں اسے حقیقت کا تلخ آئینہ دکھا ڈالا۔ وہ کچھ دیر ششدری سے دیکھتی رہی جیسے اس کے بدلے ہوئے لہجے پر اسے صدمہ ہو رہا ہو۔

"ہاں، میں کم ظرف ہوں، بہت بری ہوں اس لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے ایسی ماں کی محبت اور سفارش کی کوئی ضرورت نہیں جسے اپنا گھر پسانے سے مطلب ہو۔" وہ پوری شدت سے چلائی اور ایک جھٹکے سے مڑ کر واپس چلی گئی۔

"تم اچھا نہیں کر رہی ہو ایمان..... محبتوں کو کبھی ٹھکرایا نہیں کرتے..... ورنہ پچھتانا پڑتا ہے۔"

شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی ماں سیماب نے بھی کن حالات میں اور کس وجہ سے شادی کی تھی۔ ان چند سالوں میں اس کا سارا غرور، غصہ اور خناس نکل چکا تھا اب وہ ایک باری ہوئی اور ٹوٹی ہوئی شکستہ حال اسی راہ پر کھڑی تھی جس پر بھی اس کی ماں کھڑی ہوئی تھی۔

برسوں بعد وہ ماں کے درو سے آشنا ہوئی تھی لیکن اس سے اسی قدر شرمسار بھی تھی۔ اپنی نفرت اور غصے میں اس نے بھی ماں کے دکھ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”محبتوں کو کبھی ٹھکرایا نہیں کرتے ایمان، ورنہ پچھتانا پڑتا ہے۔“ عامر کی صدا کی بازگشت بڑی شدت سے اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔

اسی وقت ایک ہمدرد لکس اس کے شانے پر آٹھرا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو سامنے کھڑی کمزور اور خستہ حال سی ماں کو دیکھ کر اس کا سارا وجود بھر بھری ریت کے مانند پکھرنے لگا۔ ایک لمبے عرصے کی تھکن اس کے سارے وجود میں اتر آئی۔ وہ کسی محروم ننھے بچے کے مانند اس کی آغوش میں سمٹ کر رو پڑی۔

”مجھے معاف کر دیں ای..... مجھے معاف کر دیں۔“ وہ زار زار رو رہی تھی۔

”میں تو تم سے کبھی ناراض ہی نہیں رہی میری جان..... میں تو تمہارے لیے دعا کرتی رہتی تھی۔“ ممتا نے دل کھول کر اسے خود میں سمالیا۔

زندگی نے کایا پلٹ لی تھی۔ وہ اپنی ماں سے راضی ہو گئی تھی لیکن ایک بے سکونی اور کسک اسے چھین نہیں لینے دے رہی تھی۔ زندگی میں اس نے بے شمار غلطیاں کی تھیں مگر عامر کا دل دکھا کر وہ خود بھی تو خوش نہیں رہی تھی۔ عامر تو ایسا ملک سے باہر گیا تھا کہ پلٹ ہی نہیں تھا۔ منصورہ تو ترس گئی تھیں اس کے لیے۔ لیکن سیماب کے بلانے پر وہ فوراً ہی دوڑا ہوا

آگیا۔ اور سیماب کی انوکھی سی خواہش نے ایمان کو ایک بار پھر بے چین کر دیا۔ سیماب چاہتی تھیں کہ ایمان، عامر سے شادی کر لے لیکن وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی۔

”نہیں امی، مجھے کوئی حق نہیں کہ میں اپنی زندگی گزارنے کے لیے کوئی سہارا اپناؤں، ساری عمر میں آپ کو کہتی رہی..... میں کتنی خود غرض اور بے وقوف تھی اتنی سی بات بھی نہ سمجھی کہ یہ سہارے ہر عورت کے لیے معتبر ہوتے ہیں۔“ اس کے آنسو نکل پڑے۔

خود احتسابی کے عمل سے گزرنے کے بعد اس کے پاس سوائے شرمندگی اور پچھتاوے کے کچھ نہیں تھا۔ اب تک وہ محبتوں کو ٹھکراتی ہی آئی تھی اسی لیے اس نے سیماب کو سختی سے منع کر دیا لیکن عامر کے دل میں اس کے لیے اب بھی وہی محبت اور جذبہ موجزن تھے۔ محبت میں ناکامی کے بعد وہ خود بھی اس ملک میں نہیں ٹھہرا تھا اور اب تو منصورہ بھی رضامند تھیں کہ کسی بھی طریقے سے انہیں بیٹے کی خوشیاں لوٹائی جائیں۔ لیکن ایمان خود کو عامر کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔

”مجھے اندازہ ہے ایمان..... کہ تمہاری شرمندگی تم سے ایسا کروا رہی ہے لیکن انسان اپنی غلطیوں سے ہی سبق سیکھتا ہے جو غلطی تم پہلے کر چکی ہو اسے دوبارہ نہ گواراؤ۔ تمہاری بیٹی رطاب ابھی بہت چھوٹی ہے وہ ہم دونوں کے ساتھ یقیناً خوش رہے گی۔ مان لو کہ تمہیں میری ضرورت ہے۔“ ماں کی زبانی اس کا احوال سن کر وہ فوراً ہی آیا تھا اور اس کو محفوظ مستقبل کا یقین دلارہا تھا۔

اس سے ایمان کی آنکھیں تشکر کے موتی اور محبت کی چمک سے لبریز ہو گئیں۔ محبت کو ٹھکرانے کی غلطی وہ اب دوبارہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھ کر وہ محبت کے سچے رنگوں کو پہچان گئی تھی۔





# ایسی جان

## اور جسدِ عقیل



اماں کی ایک منہ بولی بہن کے ساتھ گھر آئیں، بڑی  
گریس فیل اور مشفق سی لگیں۔ بہت بردبار اور محبت  
سے گندھا ہوا نرم لہجہ تھا ان کا۔۔۔ اب تک جتنی بھی  
خواتین اس سلسلے میں آتی رہی تھیں یہ ان سے ذرا

ہماری مثلنی ہوئی تو دل نے خوشی سے بڑی  
اچھل کود مچائی کہ لو بھی آج ہم بھی اس قابل ہو گئے  
کہ کسی نے پسند کیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن معمول کے  
مطابق یہ خاتون میری ہونے والی ساس۔۔۔ ہماری

مختلف سی لگیں۔ والدہ سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے سادہ سی چائے پیش کی، ہمارے گھر میں اس زمانے میں فرشی نشست ہوا کرتی تھی، اس لیے ان کے آگے دسترخوان بچھا کر تمام چیزیں جن دی گئیں۔ ویسے سلیقہ سارا ہماری والدہ کا ہی تھا کیونکہ ان کے ہاتھ کے بنائے چھوٹے اور وہی بڑوں نے دسترخوان کو بنادیا تھا۔ میں تو بس چائے وغیرہ ہی بنا کر دے رہی تھی۔

اس سے پہلے کے تجربات خامے دلچسپ تھے۔ بعض خواتین کا اصرار ہوتا تھا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے یا مزید پڑھنا چاہتی ہے تو کیا ہوا آخر ہے تو لڑکی ذات ہی ناں..... لڑکے کے کاروبار کو دیکھنا چاہیے، چاہے وہ دسویں پاس ہی ہو مگر اس کا تجربہ اور کچھ بوجھ زیادہ ہوتی ہے۔ ایک صاحبہ کا خیال تھا کہ یہ آپ کی لڑکی کی گردن میں کیا ہے، کچھ عجیب سی لکٹی ہے۔ گویا کچھ کو اگر ہم نے رینجیکٹ کیا تو کچھ نے ہم کو چھوڑا۔

میں اس ساری ایکسرسائز سے خاصی پریشان تھی، میری گوانی نہ تھی مگر لوگوں کے خیال میں نکلی جا رہی تھی۔ کچھ لوگ تو باقاعدہ رحم اور ہمدردی کی نظر سے مجھے دیکھتے تھے تو کچھ کے خیال میں ہمارے والدین کی عقل شعیانگی تھی کہ ہر رشتے میں ”نی“ نکال دیتے ہیں۔

ایسے میں یہ خاتون، ان کی گفتگو، سادگی اور خاندانی پس منظر نے ہم سب کو بہت اچل کیا..... ان کے جانے کے بعد پھر ہم سب اپنے، اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دو، تین دن کے بعد وہی امی کی منہ بولی بہن کا فون آیا اور انہوں نے کہا کہ وہ لوگ پیام لے کر آنا چاہتے ہیں۔ یوں یہ رشتہ جھٹ پٹ طے بھی ہو گیا۔ بہر حال سال بھر کا عرصہ..... ہمیں انہیں سمجھنے یا دوسرے لفظوں میں شادی کی تیاری کے سلسلے میں لگا۔ اس دوران بہت

سے خدشات اور نت نئے خوف سر پر سوار رہے، ایک دفعہ تو میں نے والدہ صاحبہ سے یہی سوال کر ڈالا کہ اگر مجھے ان کے ہاں سب کے ساتھ یعنی بھرے بھرے خاندان میں رہنا پڑا تو کیا میں گزارہ کر لوں گی؟ ہماری والدہ بھی آخر والدہ ہی تھیں کہنے لگیں۔

”یہی تو تمہارا امتحان ہوگا..... شادی کا بندھن صرف ایک شخص کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے سارے خاندان کے ساتھ بندھتا ہے اگر تم اپنے دل میں گنجائش پیدا کر دو گی تو وہ سب بھی تمہارے لیے سراپا محبت ہو جائیں گے۔“ اس کے آگے نہ کچھ کہنے کی گنجائش تھی نہ سننے کی، گویا ساری ذمے داری میرے ہاتھوں کندھوں پر تھی۔ ”اگر میں صحیح سوچوں اور صحیح کروں تو ٹھیک ورنہ.....؟“ میری نیند مجھ سے روٹھ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ساری ذمے داریاں اور اچھائیاں جن کی لوگ مجھ سے امید کر رہے ہیں وہ میرے اندر ہیں بھی یا نہیں؟

”اپنا گھر چھوٹ جائے گا تو کیا ایک اچھی جگہ پر دل لگ جائے گا؟ وہاں کیا مجھے اپنی مرضی کے مطابق جینے کی اجازت ہوگی یا میں بھی ان بے شمار ”پچکی“ ہوئی لڑکیوں میں سے ایک ہو جاؤں گی۔ جنہیں دیکھ کر دل کہتا ہے کہ اس زندگی سے تو وہ زندگی ہی بھلی تھی۔“

☆☆☆

نئے گھر میں آکر سب سے خوشگوار بات تو یہ تھی کہ ان کی طرح ان کے سارے رشتے دار بھی بہت محبت اور چاہتوں کے ساتھ آؤ بھگت کر رہے تھے۔ کچھ ذرا خوف کم ہوا..... دل کو سکون بھی آیا..... چونکہ ماحول کا فرق بہت تھا اس لیے بہت سی باتوں پر حیرانی شاید میرے چہرے پر نظر آ جاتی تھی۔ آپا (ان کی بڑی بہن) ہنس کر کہنے لگیں۔

”گلتا ہے بیچاری ہرنی پکڑی گئی ہے۔ حیرانی

# رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

## ٹپ ٹریٹمنٹس

ٹی ٹی کی ٹپ ٹریٹمنٹس کو لیموں کی صورت میں کھائی جاتی ہے۔  
 سے رنگت کو نکھار دیتی ہے۔ اس کے ہاں وہ استعمال سے  
 ہے اور ساتھ ہی پھرے کے داغ دھبے، آکسین کے کھنکھناتے  
 جاتی ہیں۔ غواہین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے نکھارنے  
 کہ دھن اور کریمیں ملے پھر کر لیں۔ ٹپ ٹریٹمنٹس کے بارے میں

www.facebook.com/toptratments

### چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

## گھروٹال

ٹی ٹی کی گھروٹال ایک ہوسٹینٹک دوا ہے جو معر اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل  
 اجزاء انسانی جسم میں سوناٹروپن (نشوونما کا ہارمون) کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے  
 ہڈیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے  
 استعمال سے ہر دوا شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قدمیں ممکنہ اضافہ کر سکتا ہے۔

مگر اگر آپ 30 سال سے کم ہے تو



ٹپ ٹریٹمنٹس



ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سنٹر، ہومیو پیتھک سنٹر اور دوا خانے پر دستیاب

042-35789145&6, 0334-4266255

Email: toptratments@gmail.com, Website: www.toptratments.net

نسل کی صورت میں یا حریہ

معلومات حاصل کرنے کے لیے

II



سے بڑی بڑی آنکھیں کھولے ہر طرف ایسے دیکھتی ہے جیسے سچ کچھ کھوئی ہو۔" یہ ان کا انداز تھا compliment دینے کا۔

گھر میں ہم چند ہی افراد تھے، امی جان اور ہم دونوں اور بڑے بھائی، ان کی نیگم اور بیٹا۔ رشتے دار اکثر آتے رہتے، اکثر لوگ کئی کئی دن رہ جاتے۔ ہفتے بھر بعد ہی میں نے میٹھا بنایا اور گویا یہ طے کر دیا گیا کہ گھر کے کاموں میں حصہ لینے کی ذمہ داری بھی میرے ناتواں کندھوں پر آ پڑی ہے۔

ایسے میں جب میں تنہا ہوتی، گھر کے کام سارے پنٹ چکے ہوتے تو پھر اپنے بھی سارے کام خود ہی کرنے ہوتے، صحن سے برا حال ہوتا اور چپکے چپکے آنسو بہتے رہتے اور خیال وہیں بھٹکتا رہتا۔ اماں، ابا کے آس پاس، ان کے لاڈ پیار، شفقت صورتیں بار بار نگاہوں کے سامنے آ جاتیں، تصور کی فلم متواتر چلتی رہتی جس کا خاتمہ عموماً والدہ کے اس جملہ پر ہوتا۔ "یہی تو تمہارا امتحان ہے۔"

ایسے میں میری پیاری امی جان (ساس) کی ہستی میرے لیے بڑی دلجوئی کا سبب ہوتی۔ اکثر میں اپنے کام میں مصروف ہوتی تو وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو جاتیں اور خاموشی سے مجھے کام میں لگے دیکھتی رہتیں۔ میں ذرا سی دیر کو ان کے پاس آ کر بیٹھنے کی کوشش کرتی اور وہ کوئی نہ کوئی ادھر ادھر کا قصہ چھیڑ دیتی، ان کا دھیما شفقت بھرا لہجہ، مسکراتا چہرہ مجھے ہر لمحہ تسلی دیتا رہتا کہ میرے پاس میری اماں نہیں تو کیا ہوا، اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک اور بے غرض اور شفقت ماں سے نوازا دیا ہے۔

صبح کے وقت ناشتے کے بعد اکثر میں کوئی اپنی پسندیدہ کتاب لے کر بیٹھ جاتی اور اس میں سے دلچسپ حصے پڑھ کر انہیں سناتی، وہ بہت لطف اندوز ہوتی تھیں اور پھر ہم اکثر کہانی کے کرداروں پر رائے

زنی کیا کرتے، اس کے بعد میرے روزمرہ کے کام، معمول کے مطابق شروع ہو جاتے۔

دو سال بعد جب ایک ننھی سی گڑیا میری گود میں آئی تو امی جان کچھ اور کمزور ہو چکی تھیں مگر انہوں نے ننھی کی جو خوش منائی وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ تین چار ماہ کی طیبہ کو جو خوب گل تھو تھنی سی تھی وہ اپنے ہاتھوں سے اچھالتے نہ کھینکے اور کیسے، کیسے میٹھے بول اس کے کانوں میں انڈیلتیں۔ (آج طیبہ اور اس کی بہن وہی پیارے، پیارے گیت اپنے بچوں کو گا کر سناتی ہیں) میں چپکے، چپکے مسکرائے جاتی اور اللہ کا شکر ہر وقت زبان پر ہوتا۔

"یا اللہ تیرا کرم تو نے میری گڑیا سی بیٹی کو اتنی محبت والی، ہستی عطا کی اور یہ خوش نصیب ہے جو یہ کمزور اور ضعیف ہاتھ اس کے نازاٹھا رہے ہیں۔" تین سال اور چپکے سے سرک گئے، پتا ہی نہیں چلا اور طیبہ بی بی اسکول جانے لگیں، ان کی فرمائش تھی کہ انہیں بھائی یا بہن چاہیے۔ اور جب میں نے امی جان کو پھر خوش خبری دی تو انہوں نے حسب توقع بڑی سرت کا اظہار کیا اور دعائیں تو بے شمار۔ کچھ دن بعد میں ایسے ہی بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھیں تو میں نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

"امی جان، مجھے بڑی فکر ہوتی ہے اگر اس بار بھی لڑکی ہوئی تو.....؟" وہ جیسے چونک گئیں۔

"یہ تم نے کیا کہا.....؟ ارے لڑکی ہو یا لڑکا..... اللہ کی نعمت ہے، تم نے بھلی فکر کی..... لوگ تو اولاد کو ترستے ہیں، ہمارے اوپر تو اللہ کا خاص کرم ہے۔" میری حساس طبیعت کو جیسے پھر حوصلہ ملا..... اور واقعی اس بار پھر ایک پیاری سی، نازک گڑیا جیسی بیٹی سے اللہ نے مجھے نوازا..... اتنی نازک اور سندر سی بہن کو پا کر طیبہ بی بی بھی آپا کے درجے پر فائز ہو گئی تھیں اور ان کا پاؤں زمین پر خوشی سے ٹکنا نہیں تھا۔ امی جان کے ہاتھوں بھی واقعی ایک اور کھلوٹا آ گیا

سال بھر بعد اللہ کا کرم ہوا اور میں پھر اسپتال میں تھی اور اس دفعہ ”بھائی“ کی آمد کا سب کو انتظار تھا۔ امی جان اور والدہ دونوں ضعیفی کی وجہ سے اسپتال تو نہ آسکیں مگر طیبہ اور شیبہ اپنے بلواوریا کے ساتھ روز شام کو منے بھائی کو دیکھنے پہنچی ہوتی تھیں۔ اسپتال سے چھٹی ملی تو پہلے امی جان کے پاس گئی وہ مجسم شفقت اور انتظار تھیں۔ میں نے منے کو ان کی گود میں دیا تو انہوں نے جلدی سے نوکر کو دوڑایا، منھائی لانے کو۔ بچے کو پیار سے چمنائے ہوئے کافی دیر تک بیٹھی رہیں۔

”اب آپ تھک گئی ہوں گی، لائیں میں لے لوں۔“ میں نے کہا۔

”بس یہ میرا ہے۔“ انہوں نے جیسے اسے سینے میں بھر لیا اور چمنا کر بولیں۔

”ضرور۔۔۔“ میں نے کہا اور میرا دل ایک مرتبہ پھر تشکر اور اطمینان سے جیسے بھر گیا تھا۔

”اللہ میاں! میں اس قابل کہاں کہ میرے یہ ننھے منے اور میں محبت کی اتنی دولت سے نوازے جائیں، مالک حیرا بہت، بہت کرم ہے۔“

لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ امی جان شاید پوتے کا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ منے کی پیدائش کے بعد

کوئی چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ ضعیفی اور بیماری نے ان کی مہلت ختم کر دی اور وہ میری پیاری ہستی جو اپنی شفقتوں اور چاہتوں سے ہماری پور، پور بھگوائے رکھتی جو ہمارے لیے ایک گھنے درخت کے مانند تھی ہم سے رخصت ہو گئیں۔

وہ اب ہمارے پاس نہیں مگر ان کی چیدہ، چیدہ باتیں اور صبر، میرے عزیزوں، رشتے داروں سے

ان کا حسن سلوک ہر وقت یاد آتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ اللہ پاک ہمیں بھی اور ہمارے بچوں کو بھی ان کے جیسا بنا دے۔ (الہی آمین)

تھا۔ اب تک میری نظروں سے وہ منظر فراموش نہیں ہوتا جب وہ تین چار ماہ کی شیبہ کو اچھالی کر گدگداتیں اور شیبہ کھلکھلا کر ایک قلقاری مارتی۔

سال تو دیکھتے، دیکھتے گزر گئے۔ شیبہ کی قلقاریوں اور طیبہ کی پیاری پیاری باتیں زندگی

گزارنے کا حوصلہ دے جاتیں، اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کو کس قدر

انجوائے کرتی رہیں۔ طیبہ بیگم تو باقاعدہ بیٹھ کر امی جان سے کہانی کی فرمائش کرتی تھیں اور شیبہ بھی ان کے ساتھ بڑے مدبرانہ انداز میں بیٹھی ہوتی۔

اب کچھ دنوں سے ایک اور بات سننے میں آنے لگی تھی۔ اصل میں طیبہ کی ایک سہیلی کے ہاں

بھائی آیا تو ہمارے ہاں بھی یہ خبر بڑی دلچسپی سے سنی گئی۔ اس نے گھر آ کر شیبہ کو بتایا اور چند دن بعد ہی

”منا بھائی“ کی فرمائش دونوں کی زبان پر تھی۔

”امی اگر ہمارا ایک منا سا بھائی بھی ہو تو کتنا مزہ آئے۔“ طیبہ کہتی۔

”ہاں، تم امی کی ہیلپ تو کرتی نہیں ہو، منا بھائی بھی آگیا تو اتنا کام کون کرے گا۔“ میں جواب

میں کہتی۔

”میں اور شیبہ کریں گے ناں آپ کی ہیلپ۔“ وہ اپنی ننھی منی بانہیں میرے گلے میں ڈال کر بڑے

لاڈلے کہتی۔

”یہ کیسے ہیلپ کرے گی، اتنی ذرا سی تو ہے۔“

”امی، بھائی کے آنے تک یہ بھی بڑی ہو جائے گی۔“ وہ کہتی۔ اور ایک دن تو بڑا ہی لطف

آیا میں نے کمرے میں جھانکا تو دیکھا دونوں اپنی چھوٹی سی جانماز فرش پر بچھائے، میرے اسٹائل میں

اپنی دو پنیاں اوڑھے بیٹھی ہیں اور ہاتھ پھیلا کر دعا مانگ رہی ہیں، یہ سین تو میں نے فوراً محفوظ کر لیا کمرے میں۔ بچیوں کو یوں دعا مانگتے دیکھ کر بے



مکمل ناول

بہترین

اسیرِ وفا

زمزم پبلشرز

تیسرا حصہ

پہلی صبح ہی اتنی خوشگوار تھی، اٹھ کر آیا تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ مکن کا ماحول بہت خوشگوار تھا۔ دانیہ ڈانگ بیل پر تاشے کے لوازمات رکھتی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ آبی چولہے کے سامنے کھڑی تھیں اور آٹھٹ

بنارہی تھیں مکن، گولڈی اس کے ساتھ، ساتھ گھوم کر بار بار اسے متوجہ کر رہے تھے۔ اپنی اپنی پسند بتانے میں دونوں ہی ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے تھے۔





”چاچی..... میں تو فلیور ملک لیتا ہوں، گولڈی کو بلک اچھائی نہیں لگتا.....“ سنی نے یقیناً اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

”گولڈی کو بھی ملک اچھالے گولڈی کو معلوم ہے دودھ پینے سے یون اسٹرونگ ہوتی ہیں، ہائٹ بڑھتی ہے اور بازی میں جراثیم سے قات کر کے کی طاقت بڑھتی ہے۔“ وانیہ نے گولڈی کو بازوؤں سے اٹھا کر کرسی پر بٹھا کر سمجھایا۔ ”اب گولڈی بھی ملک لے گی ناں.....“ وانیہ جیسے ہی فریج سے دودھ کا ڈبا نکالنے لگی دروازے میں کھڑی مٹی کو دیکھ کر ٹھک کر رہ گئی۔

”میں بھی یہی سمجھاتی ہوں..... مگر سچے سمجھیں بھی اچھا اب تم بھی بیٹھو میں دیکھتی ہوں عصمی اور نانو ابھی تک کیوں نہیں آئیں..... بلکہ مٹی کو بھی... جگاتی.....“ آپلی بھی مٹی کو دیکھ کر حیران ہوئیں۔ ”واہ وانیہ تم نے تو ایک دن میں اس کی عادت بدل دی۔“

”ہاں تو دیکھ لیں، آپ کی تند کتنی ظالم نکلی..... صاف کہہ دیا، پہلی آواز پر نہ اٹھا تو ناشتا نہیں ملا کرے گا۔“ مٹی کی مصنوعی سنجیدگی پر وانیہ نے بھی حیرت سے دیکھا۔ اس نے ایسا کب کہا تھا۔

”ہاں، تم ایسے ہی سیدھے ہونا..... مٹی کے کہے میں آنے والے۔“ نانو اور عصمی بھی اندر آ رہی تھیں۔ ”السلام علیکم..... نانو.....“ وانیہ فوراً ان کی طرف بڑھی۔

”وعلیکم السلام..... جیتی رہو، آباد رہو..... یہ کیا پہلے دن ہی کچن میں لگ گئیں۔ کچھ دن تو آرام سے رہیں۔“

”نانو میں نے بھی منع کیا تھا مگر اسے تو کام میں سکون ملتا ہے، مجھ سے پہلے ہی کچن میں آ گئی تھی۔“ آپلی نے بھی ہنستے ہوئے جیسے شکایتی انداز میں کہا۔ ”یہ آپلی ابھی بات نہیں ہے کہ گھر والی نے گھر کی ذمہ داری سمجھ لی۔ آپ سبھی یہی تو چاہتے تھے، مٹکس گاڑ اب میں سارے الزامات سے بری ہو جاؤں گا۔ آئی ہو اب گھر کے کسی معاملے میں مجھے شکایتیں

نہیں سنی پڑیں گی۔“ مٹی اپنے فطری غیر سنجیدہ انداز میں بولتا ڈانٹنگ ٹینل کے پاس گھڑا ہوا۔ آپلی اس کے بولنے پر اسے گھور رہی تھیں جبکہ نانو مسکرا رہی تھیں۔ مٹی کی ہشاشمٹ اس بات کا پتا دے رہی تھی کہ وہ وانیہ کو ذاتی و فنی طور پر قبول کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

”بھائی..... سنی، گولڈی کی شکایتیں تو پھر بھی آپ کو ہی سنی پڑیں گی.....“ اُف تو بہ صبح دونوں نے چیخ کرتے ہوئے مجھے جتنا تنگ کیا ہے، میں بتا نہیں سکتی..... یہ دونوں صرف آپ ہی کی سنتے ہیں۔“ عصمی نے نانو کی وہیل چیئر میز کے قریب لگاتے ہوئے اسے اس کی بات کا جواب دیا تو مٹی نے دونوں کو پکڑ کر پوچھا۔

”اچھے، بچے پھوپھو تنگ کرتے ہیں؟“ ”نہیں چاچو، پھوپھو تنگ کرتی ہیں ہمیں..... ہے ناں گولڈی۔“ سنی نے تائید مانگی تو گولڈی بھی سر ہلا کر کہنے لگی۔

”ہاں..... پھوپھو نے مجھے آپ سے روم میں جانے نہیں دیا۔“

”میں نے اس لیے روکا تھا تم دانت برش نہیں کر رہی تھیں۔“ عصمی نے اسے یاد دلایا۔ آپلی کو پتا تھا اب ایک لمبی بحث چھڑنے والی ہے اس لیے انہوں نے درمیان میں ہی ٹوکا۔

”بس باقی باتیں بعد میں..... ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے، وانیہ تم بھی اب بیٹھ جاؤ۔ آئندہ دنوں میں تو تمہیں ہی سب کچھ کرنا ہے۔“

☆☆☆

آپلی، مٹی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی اس کے دن ہونے والے ویسے کے انتظامات کے بارے میں بات چیت کر رہی تھیں۔ باتوں کے دوران آپلی نے اچانک ہی موضوع بدلا تو وہ چونک اٹھا۔

”تم نے وانیہ کو رونمائی میں کیا تحفہ دیا؟“ ”رونمائی..... تحفہ.....“ وہ تجالت سے سر کھانے لگی۔ اپنی عجیب کیفیت و احساس کے باعث وہ وانیہ کے

مخاطب کیا۔

”دانیہ..... کل مجھ سے ایک غلطی ہو گئی..... بندہ بشر ہوں بھول چوک ہو سکتی ہے، ہو سکتی ہے ناں.....؟ وہ اس کے سامنے بیٹھا پوچھ رہا تھا اور دانیہ اس کے تاثرات سے پریشان ہونے لگی۔

”ایک بھول ہو گئی..... اور تم نے آپا سے میری شکایت کر دی؟“

”میں نے..... شکایت..... نہیں تو..... میں نے بھابی جان سے کچھ نہیں کہا۔“ وہ شیشا کر بولی۔  
”تمہیں شاید معلوم نہیں، تمہیں نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہنے کا فن آتا ہے۔“ ممی اس کی بوکھلاہٹ سے حظ اٹھا رہا تھا۔

”میرا یقین کریں..... میں نے ان سے کچھ نہیں کہا اور مجھے تو معلوم بھی نہیں ہے کہ آپ کس بارے میں کہہ رہے ہیں۔ صبح سب کی رونمن جاننے سے زیادہ میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔“ وہ آنکھوں کی نمی کے ساتھ دیکھتی اپنی طرف سے صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ گہرے اور ہلکے گلابی رنگ کے امتزاج سے بنے ہاتھ کی کڑھائی کے دوپٹے کا ہالہ اس کے چہرے کی ملاحات میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔  
”تو پھر انہیں کس نے بتایا کہ میں نے تمہیں رونمائی کا تحفہ نہیں دیا؟“

”جہ..... کی..... میں نے نہیں بتایا۔ میرا یقین کریں..... میں ان سے یہ بات کہہ کر خود ہی شرمندہ ہوئی..... آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں نے انہیں..... اس کی آنکھیں ٹپ، ٹپ برسنے لگیں تو ثعلب کو احساس ہوا کہ معاملہ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا ہے، ایک دم تاثر بدل کر بولنے لگا۔

”listen دانیہ..... پلیز رونا نہیں..... مجھے یقین ہے تم نے ان سے کچھ نہیں کہا..... انہیں ہی میری جاسوسی کی عادت ہے، میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔ اُدکے، میری طرف دیکھو.....“ ثعلب نے زبردستی ٹھوڑی اوپر کر کے اسے دیکھنے پر مجبور کیا۔

لیے کچھ بھی نہیں ملے پایا تھا اور نہ دانیہ نے اسے احساس دلایا تھا کہ یہ بھی رسم دنیا ہے۔

”تم نے اسے رونمائی میں کچھ بھی نہیں دیا.....؟“ آپا سنجیدگی سے پوچھ رہی تھیں۔  
”آپ سے..... دانیہ نے کچھ کہا۔“

”اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اس سے بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میرا اپنا اندازہ ہے، ممی تم اتنے نا سمجھ تو نہیں ہو۔ یہ رسم عورت کو سسرال اور میکے میں مستحضر کرنے کے لیے بنی ہے۔ شوہر سے ملنے والا چاہت و محبت بھرا تحفہ لڑکی کا مان بڑھاتا ہے۔ آخر ایک انگلی تو خرید سکتے تھے تم اس کے لیے..... کل کو ای جان یا اس کی کزنز اس سے پوچھیں گی تو وہ کیا جواب دے گی۔“ آپا کا سنجیدہ رویہ سرزنش بھرا تھا۔ وہ واقعی جخل ہو گیا۔

”خیال نہیں رہا مجھے، آپ یاد دلاتیں..... اُدکے کیا مسئلہ ہو گیا، چلیں میں آج کچھ دے دوں گا۔“  
”آگے مسئلہ نہ ہو..... اسی لیے تمہیں سمجھا رہی ہوں..... ابھی جاؤ فوراً اس کے لیے کوئی تحفہ لو..... کیونکہ کل کو نہ میں شرمندہ ہونا چاہتی ہوں نہ ہی دانیہ کو شرمندہ ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ آپا نے اسے انھنے پر مجبور کر دیا۔

”افوہ..... آپ بھی ناں..... اچھا بابا جارہا ہوں ناں..... نہیں ہوتا کوئی بھی شرمندہ.....“ وہ واضح بڑبڑاہٹ کے ساتھ اپنی جیس میں نولنے لگا۔ یقیناً گاڑی کی چابی اور والٹ چیک کر رہا تھا۔ ”جارہا ہوں بھی..... اب خوش.....“ اس نے معنوی چڑچڑاہٹ سے انہیں بھی چڑانے کی کوشش کی۔

”اصل خوشی تو مجھے اس دن ملے گی ممی جس دن تم دونوں مجھے ہنستے بولتے دکھائی دو گے.....“ آپا نے اس کے جانے کے بعد جیسے اپنے آپ سے کہا۔

☆ ☆ ☆

منی، گولڈی کو سلاتے کے بعد دونوں کمرے میں آئے تو ممی نے کافی سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اسے





تو جان بچنے لگتی ہے۔“

”اچھا... وہ بے ساختہ ہلکھلائی۔

”خداق نہیں کر رہا.....“ دو اس کے ہنسنے پر یقین  
 دلانے لگا۔

”تو میں تب کہہ رہی ہوں آپ مذاق کر رہے  
ہوں۔ وے میں کوشش کروں گی سچے جلدی بہن

جائیں۔۔۔۔۔ بانیِ دعوے مجھ سے شکایت کا خیال کیوں آیا۔“

لیے... تم ہر بار بہانہ کر دیتی ہو، میں آخر کس، کس کو مانلوں....“ مہی نے اسے روتے کی وجہ بتائی تو وہ بھی

”میں بہانہ تو نہیں کرتی، جہاں ساری فیملی مسئلہ سمجھ کر سنبھل گئی۔“

جاسکتی ہے جاتے تو ہیں ہم لوگ۔۔۔ اچھا آپ مینشن نہ  
میں۔۔۔ آپ جب کہیں گے، جہاں کہیں گے میں چل

پڑوں گی۔ خوش.....“

”اس فرمانبرداری کا بہت شکریہ.....“ جواباً مہی

نے اسی کے انداز میں کہا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔  
 ثعلب کو وہابیہ کی شگفت میں زندگی کا مزہ آنے لگا تھا۔

سارے خدشے سارے وہم وانیہ کی ذات کی خوبیوں نے دبا دیے تھے، اس نے جس خوبی و ماہرانہ صلاحیت

سے گھر اور گھر کے افراد کو سنبھالا تھا۔ غلبہ بھی قابل ہو گیا تھا۔ گھر کا ماحول بے حد خوشگوار اور پُر رونق تھا اور

ہر کے افراد بھی مطمئن آہستہ آہستہ عزیز و احباب کے ہاں دعوتیں بھی جاری تھیں۔ گھر کی سیٹنگ

میں بھی تبدیلیاں کرتے ہوئے وہ سب سے معذورہ کرتے ہوئے بھی کو بھی ہمنوا کرنے کی کوشش کرتی تو وہ

”میری اس شعبے میں معلومات بالکل زیر و

کرو۔ "وانیہ اس کے بیچ نکلنے پر بے بسی سے خاموشی رہ

جائی۔ جسے بحر وہ رومن کے کاموں میں ابھی رہی۔  
 شخص کی کے دن وہ التوا میں پڑے کاموں کو کرنا چاہتی تو  
 -۵۵۱-

کر رخصت ہو چکی تھیں۔ اب وہ تھی اور گھر سے وابستہ  
 ذمے دار ماں..... ہاں حائل کی محبت لٹائی مسکراہٹ اور

حوصلہ بڑھاتی آنکھیں اس کی رہنمائی کے لیے کافی تھیں۔ ثعلب سے متعلق سارے کام اس نے خود

سنبھال لیے تھے۔ اسے کب، کیا چاہیے وہ بتا کہے سمجھنے  
 لگی تھی۔ بچوں کو خوش رکھنا اسے آتا تھا۔ ان کی ہر

خواہش کو وہ وقت بے وقت پورا کر دیجیے عرصہ اسے

نظر انداز کر جاتی مگر ان کی بات کو رو نہ کرتی۔ وہ رات کو اس سے کہانیاں سنے بغیر نہ سوتے۔ کئی بار اسے

اپنے پاس سونے پر مجبور کر دیتے۔ غلبہ دانیہ کا انتظار کرنا کر کے تھک جاتا تو دونوں کمروں کے درمیانی

دروازے سے جھانک کر پکارتا۔ ”آ جاؤ اب۔۔۔۔“

”نیا پلیز جلدی سلا دیا کرو بچوں کو۔۔۔ میرا بھی  
کچھ حق ہے تم پر۔“ وانیہ بچوں کے کمرے سے اپنے

وہ پہلے کچھ حیران ہوئی پھر اس کے چہرے پر پھیلے

تاثرات دیکھ کر فریب جاتے ہوئے نرمی و محبت سے پوچھنے لگی۔

لکھا ہوا جی..... کچھ لکھا میرے نو جملہ  
 حقوق آپ کے نام ہیں..... کچھ چاہیے تھا؟“ قریب

”تمہاری تھوڑی سی توجہ“... ”عمی نے اس کا

”ابھی کوئی کمی ہے۔“ وانہی نے اسے جن نظروں

سے دیکھا ہی سرسندھ ہو گیا..... پھر اپنی بات سنا کے  
کی خاطر بولا۔

سب..... اور میرے لیے چائے بنا کر لاؤ۔“ وہ خالی  
بیکٹر ایک طرف سنبھالتی معمول کے لہجے میں بولی۔

”بتلاتی ہوں..... بس یہ بتائیں اس کارٹن میں  
آپ کی کوئی اپورٹنٹ چیزیں تو نہیں ہیں۔ ورنہ پھر میں  
اوپر والے اسٹور میں رکھوا دوں.....؟“ وہ مکمل طور پر اس  
کی جانب متوجہ ہو کر اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے  
اشارے پر مٹی نے نیچے کارپٹ پر پڑے ڈبے کو دیکھا۔  
اس کے اثرات ایک دم بدلے تھے۔ وانیہ اس کے رنگ  
بدلتے چہرے کو دیکھ کر قدرے پریشانی سے بولی۔  
”آپ کی ضرورت کی چیزیں ہیں تو میں سنبھال  
دیتی ہوں۔“

”نہیں، نہیں اس میں ایسی کچھ خاص چیزیں  
نہیں ہیں۔ بلکہ ایسا کرو، برکت علی (ڈرائیور) کو دے  
دو۔ یا میں خود ہی دے دوں گا۔ تم جاؤ میرے لیے  
چائے بنا کر لاؤ۔ پھر کچھ کرنا۔“

مٹی کا الجھا ہوا انداز اور لہجہ وانیہ کو سمجھ نہیں آ رہا  
تھا۔ آج پہلی بار وہ اس کے سامنے اس طرح بیزاری کا  
مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتی اس کے لیے چائے  
بنانے مکن میں آگئی۔ تا نو کو وہ پہلے ہی ان کے کمرے  
میں ناشتا دے چکی تھی۔ عصیٰ کے ایگزامز ہونے  
والے تھے وہ بھی رات دیر تک پڑھنے کی وجہ سے اب  
تک سو رہی تھی۔ بچے بھی دیر تک دھیما مستی کرتے  
رہے تھے۔ ویسے بھی چھٹی کے دن کی عموماً تمام گھروں  
کی یہی روشنی ہوتی ہے۔ وہ مٹی کے لیے چائے بنالائی  
تو بچوں کو مٹی کے ساتھ مستیاں کرنے میں مصروف پایا۔  
بچوں کا کوئی فرمائشی پروگرام تھا۔

”سوری..... سوری آج کہیں نہیں جانا۔ آج  
اپنی چاچی سے کہو وہ تمہارے لیے پڑا گھر پر ہی بنا دیں  
گی اور فن لینڈ ہم نیکسٹ سنڈے چلیں گے، اوکے؟“  
”مجھ سے تو آج چائینز کی فرمائش ہے اور وہ مس  
برنج میں بنا رہی ہوں۔“ وانیہ نے اسے چائے کا گلاس تھمایا۔  
”تو ہم شام کی بات کر رہے ہیں چاچی۔ چاچو  
نے ہم سے کل پراس کیا تھا۔“ سنی نے قدرے فطی

مٹی بہانوں سے روک دیتا۔ یا پھر بچوں کو پیچھے لگا دیتا  
اور وہ اسے فرمائش کر کے اپنے ساتھ آکس کریم یا برگر  
کھانے کے لیے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتے۔

وانیہ کے ذہن میں آج بھی بہت سے کام تھے  
اور وہ جانتی تھی مٹی اور بچوں کے جاننے کے بعد آج پھر  
کئی کام رہ جائیں گے۔ اس لیے وہ سب کے انھنے  
سے پہلے اپنے ڈرائنگ روم اور اسٹور کی ترتیب بدلنے  
کا سوچ رہی تھی۔ بدلتے موسم کے کپڑے جینز سے  
نکال کر وارڈ روب میں رکھنے تھے۔ گھڑی کی رفتار  
دیکھتے ہوئے اس نے جلدی، جلدی کام سینے کی کوشش  
کی۔ اسٹور روم میں اسے کئی بیکار اور بے ضرورت  
چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ مٹی کے جوتے، چمیلیں، کئی لی  
شرٹس اور خالی ڈبے تھے۔ ایک بڑا کارٹن کونے میں پڑا  
تھا۔ جسے نیپ کے ساتھ مہر بند کیا گیا تھا۔ ہلکا سا بکس  
اس کے ذہن میں ابھرا تو تھا مگر مٹی کی اجازت کے بغیر  
وہ اسے کھولنے کی جرأت نہیں رکھتی تھی۔ وہ ابھی ڈبے  
کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی کہ مٹی اٹھ کر اس کے سر پر  
آکھڑا ہوا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ نیند سے بوچھل آواز اور  
مندھی آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ کھٹ پٹ کی  
آواز سے ہی جاگا ہے۔  
”اسٹور کی صفائی.....“ وہ ہاتھ جھاڑتی گھڑی  
ہوئی۔

”جسہیں بھی چھین نہیں ہے، صبح ہی شور،  
کھٹ پٹ.....“  
”صبح.....؟ ذرا آنکھیں کھول کر گھڑی دیکھیں  
جناب..... گیرو بجنے والے ہیں۔“

”ایک چھٹی کا دن تو ملتا ہے مرضی سے سونے  
کے لیے۔“

”تو آپ سوئے رہیں، میں نے تو نہیں جگایا۔“  
وہ وارڈ روب کے سلائڈنگ ڈور کو دھکیلتے ہوئے پلٹ  
کر بولی تو مٹی نے اسے قدرے حیرت سے دیکھا۔  
”تو اور کیسے جگایا جاتا ہے۔ بس اب چھوڑو یہ





صفائی دی۔

”میں نے جو فیل کیا کہہ دیا۔ میں تو بہت آرام سے کام کر رہی تھی۔“ اس نے اپنے تھکے آنسو دوسرے ہاتھ سے صاف کیے۔ ”آپ کیوں لپ سیٹ تھے؟“

”بتایا تو ہے۔۔۔۔۔ اچھا بھئی سوری۔“ مٹی نے اپنے کان پکڑنے کے بجائے اس کے کان پکڑے تو وہ پہلے تو خفگی سے دیکھے مٹی پھر ایک دم ہنس دی۔

”آپ بھی ناں۔“

”شکر ہے تمہارے چہرے پر ہنسی تو نظر آتی۔ صبح سے سڑی شکل دکھا، دکھا کر بور کر دیا تھا۔“ مٹی نے اسے کندھوں سے تھام کر کہا تو وہ اس کے ہاتھ ہٹاتی اٹھ گئی۔

”میں تو نارمل تھی لفت تو آپ نہیں دے رہے تھے، مجھے ساتھ چلنے کے لیے بھی نہیں کہا۔“ دل میں آیا شکوہ وہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔ مٹی نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یار تمہیں کہنے کی ضرورت تھی؟ پہلے سے طے ہے کہ ہم سبھی ایک ساتھ جائیں گے تو تم نے کیوں انکار کیا۔ اچھا بس اب یہ مکمل شکوے ختم کرو اور ادھر آؤ میرے پاس۔“ مٹی کو بھی احساس ہوا کہ یہ بحث چھڑ گئی تو بہت لمبی جائے گی اور بد مزگی کا امکان بھی تھا۔

”میں آپ کے لیے صبح کا ڈریس نکال کر آتی ہوں۔ اسٹور میں بھی کچھ سامان بکھرا ہے وہ ایک طرف کر دوں۔ آپ اپنا کام کریں۔“

”اوکے۔“ مٹی نے سر ہلا کر اجازت دی۔ اس کے جانے کے بعد مٹی کسی گہری سوچ میں رہا۔ ذہن میں کئی خیالات پھیل چارے تھے جنہیں جھٹک کر بھی وہ جھٹک نہیں پارہا تھا۔ صبح اس ڈبے کو دیکھ کر اسے ماضی کے کئی لمحے یاد آئے تھے۔ کئی خوشگوار یادیں تھیں جنہیں وہ بھلانے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ رومانہ سے متعلق کئی تحائف اس ڈبے میں بند تھے اور وہ سوچ رہا تھا اگر وانیہ نے وہ ڈبا کھول لیا تو نہ جانے اس کا کیا رد عمل ہوگا۔ یہ چیزیں اب اس کے لیے زندگی کی تمنیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں لیکن وہ تمنیاں اس کی

جاتے ہوئے مٹی سے سوال کیا تو وہ مزے بغیر بولا۔

”ہم نے باہر ہی کھا لیا، بچوں کو بھوک لگی تھی۔“ وہ جواب دے کر چلا گیا تو عصی بھی معذرت کرنے لگی۔

”سوری بھائی۔۔۔۔۔ آپ کا بتایا پڑا نکل کھالیں گے ابھی بالکل منجائش نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے تم آرام کرو۔ چلو بچوں جلدی سے پیسج کرو، برش کرو اور سو جاؤ۔“ وانیہ نے بھی خندہ پیشانی سے کہتے ہوئے بچوں کو پکارتا۔ اسے معلوم تھا بچے باہر جا کر ضرور کچھ نہ کچھ کھائیں گے، اس نے پڑا ایک نہیں کیا تھا۔

وہ کمرے میں آئی تو ثعلب اپنے لپ ٹاپ پر کچھ کام کرنے میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر اپنی مصروفیت ترک کر کے اسے معمول کے لہجے میں مخاطب کرتے لگا۔

”کیا بات ہے آج میرے ساتھ کوئی ناراضی چل رہی ہے؟“ بکھری چیزیں سیٹ کر ان کی جگہ پر رکھتی وانیہ نے قدرے حیرت سے چہرہ موز کر اسے دیکھا پھر اس کی طرف رخ کر کے اپنی حیرت کا اظہار بھی کر دیا۔

”یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے، صبح سے آپ کا موڈ آف ہے۔“

”میرا موڈ آف۔۔۔۔۔ وہ بھی تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔؟“

یارا تا بڑا الزام تو نہ لگاؤ۔“ وہ سامنے سے لپ ٹاپ ہٹا کر اٹھا اور بیڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بستر پر اپنے سامنے بٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے مزید بولا۔ ”تمہیں ایسا کیوں لگا کہ میرا موڈ تمہاری وجہ سے خراب ہے؟“

”صبح آپ نے جس طرح ری ایکٹ کیا تھا۔“ اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”اوہ گاڈ۔۔۔۔۔ ٹوٹل مس انڈر اسٹینڈنگ۔ یاد آپ سیٹ تھا سونا چاہ رہا تھا۔ پہلے تمہاری کھٹ پٹ سے آنکھ کھلی پھر سویا تو بچوں نے آکر جگادیا اور تم۔۔۔۔۔“ ثعلب نے اس کا ہاتھ تھام کر بھرپور انداز میں

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

# گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز  
پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ  
(بشمول رجسٹرڈ ایک خرچ)

پاکستان: کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

برصغیر: کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 9,000 روپے

بقیمت مالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد  
رسالے کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے  
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے چتے پر  
رجسٹرڈ ایک سے رسالے بھیجنے شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مینی گرام کے  
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر  
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیے۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 II پکینیشن ویسٹ، راجستھانی میں، لاہور، پاکستان

فون 021-35895313، 021-35802551

موجودہ خوشگوار ازدواجی زندگی کی مناسبت میں کھلتی تو  
یہ بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ وانیہ کے ساتھ وہ اب بھر پور  
اور مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ ماضی کی محبت اس کے  
لیے اب کسی نادانی، حسرت جیسی تھی۔ اسی لیے وہ بے  
جان و بے ضرر چیزوں کو وانیہ کو اذیت دینے کا ذریعہ  
نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وانیہ واپس آئی تو وہ اپنی سوچوں  
سے نکل کر اسے دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرایا۔

☆☆☆

نانو کے پاس کوئی رشتے دار خاتون آئی بیٹھی تھیں۔  
وانیہ ان کے لیے چائے اور لوازمات کی ٹرالی لے کر خود  
آئی اور پھر انہیں اصرار کے ساتھ سر دیکھی کر رہی تھی۔ نانو  
کی بیٹی اس سے کافی متاثر نظر آرہی تھی۔

”ماشاء اللہ پچھو بھی کی دلہن نے بھی گھر سنبھال  
لیا ہے۔ اب تو آپ کو کوئی فکر نہیں رہی ہوگی۔“ وانیہ  
کے سامنے ہی انہوں نے تو صغی انداز میں کہا تو وہ  
جھینپ گئی۔

”الحمد للہ..... اللہ نے ہم پر بڑا کرم کیا.....  
ماشاء اللہ سے ہماری بچی بڑی سکھڑ اور سلیقہ مند ہے۔ ہم تو  
اس کے بغیر بالکل اوصورے ہیں۔“ نانو نے بہت  
شفقت و محبت سے پاس بیٹھی وانیہ کو چھتپایا تو وہ شرما کر  
اٹھ گئی۔

”نانو بلکہ میں آپ سب کے بنا اوصوری ہوں۔  
آپ میرا ساتھ نہ دیں تو میں گھر کی ڈتے دار بن کیسے  
سنبھال سکتی ہوں۔“ اس کی اٹھاری متاثر کن تھی  
”آئی پلیز آپ مائنڈ مت کیجیے گا مجھے کچن میں کچھ  
کام ہے۔ میں آپ کے پاس پھر آکر بیٹھتی ہوں۔“  
”کوئی بات نہیں بیٹا، تم جاؤ کام کرو۔ میں بھی  
بس تھوڑی دیر میں چلی جاؤں گی۔“

”بالکل نہیں آپ کھانا کھا کر جائیں گی۔ سات  
بجے تک ٹیبل بھی آفس سے آجائیں گے۔ آپ کو  
ذرا نیور گھر چھوڑ دے گا۔ آپ آرام سے نانو کے ساتھ  
بیٹھ کر باتیں کریں۔“ وہ انہیں یہ اصرار کھانے کے لیے  
روکنے پر مجبور کر گئی۔ اس کے جانے کے بعد شکیلہ آنٹی



نے مزید اسے سراہا۔

”وائقی پھوپھو جیسا سنا تھا مٹی کی دلہن اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ تمکین کی کمی ذرا بھی محسوس نہیں ہوئی۔“ نانو نے بھی فوراً ہی تائید کی۔

”ہاں بالکل تمکین کا ہی پرتو لگتی ہے۔ آتے ہی گھر کو منجبال لیا۔ اللہ میرے بچوں کا گھر اسی طرح شاد و آباد رکھے۔“

”پھوپھو، مٹی تو خوش ہے ناں اس شادی سے۔ میرا مطلب ہے رومی سے تو وہ شدید محبت کرتا تھا۔ اسے دل سے قبول کر لیا؟“ شکیلہ نے قدرے تجسس ظاہر کیا تو نانو کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ جب سے ثعلب کی شادی ہوئی تھی۔ ہر دوسری خاتون یہی سوال دہرائی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے دونوں ہی بہت خوش ہیں ایک دوسرے کی رفاقت میں۔ رومی سے محبت کی شدت تو تبھی ختم ہوئی تھی جب وہ ہمیں مشکل گھڑی میں چھوڑ گئی تھی۔ مرد کے لیے وہی عورت اہم رہتی ہے جو اس کے برے وقت کی ساتھی بنے۔“ نانو جان بوجھ کر انداز میں بات ختم کر دی۔ نانو اپنی بچی کی عادت سے واقف تھیں، جانتی تھیں خاندان کی باتوں کی ٹوہ لیتا اور پھر ان کا چرچہ عام کرنا ان کی خصلت میں شامل ہے۔ ابھی انہوں نے جلدی سے موضوع بدل دیا تھا۔ شکیلہ آنٹی بہت خوش، خوش رخصت ہوئی تھیں اور جاتے، جاتے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے رہی تھیں۔

شکیلہ آنٹی کو ذرا نیور برکت علی چھوڑنے گیا ہوا تھا۔ برکت علی کافی عرصے سے آفس میں ڈرائیور کی پوسٹ پر کام کرتا رہا تھا۔ جب سے نانو یہاں رہائش پزیر ہوئی تھیں ثعلب نے برکت علی کو مستقل گھر کے کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا اور اسے رہائش بھی سرونٹ کوارٹر میں دے دی تھی۔ سال پہلے ہی برکت علی کی شادی ہوئی تھی اور وہ اب گاؤں سے اپنی بیوی بھی لے آیا تھا۔ ایماندار اور قابل اعتماد تھا، اسی لیے

بچوں اور عرصی کو اسکول کالج سے لانے لے جانے پر بھی مامور تھا۔ نانو کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا بھی اسی کی ڈیوٹی تھی۔ اس کی فرض شناسی کی بنا پر مٹی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اپنی بہت سی استعمال شدہ چیزیں کپڑے وغیرہ اس نے پہلے بھی کافی دفعہ برکت علی کو دیے تھے۔ اب بھی وانیہ نے جو کچھ بھی چھانی کیا تھا وہ برکت علی اور اس کی بیوی کو ہی بھجوا دیا تھا۔ خصوصاً وہ بڑا سا کارٹن بھی برکت علی، شکیلہ آنٹی کو چھوڑ کر نانو کے لیے منگوائی ہوئی میڈیسن دینے آیا تو قدرے جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔

”بابی..... وہ آپ نے کل مجھے ایک ڈبا دیا تھا، مجھے لگتا ہے وہ مجھے غلطی سے دے دیا ہے۔“

”غلطی سے نہیں نہیں صاحب نے وہ تمہیں ہی دینے کے لیے کہا تھا۔ کیوں نہیں ہوا..... کیا بات ہے؟“ وانیہ اس کے بہم سے تاثرات پر قدرے چونکی سی ہوئی۔

”وہ..... اس میں صاحب کی کافی قیمتی چیزیں ہیں، اس لیے مجھے لگا کہ آپ پھر بھی صاحب کو ایک بار دکھا دیں۔ مجھے ان کے کام کی چیزیں لگتی ہیں۔“

”اچھا..... ہو سکتا ہے۔ ٹھیک ہے تم لاؤ میں دکھا دیتی ہوں۔“ وانیہ کو احساس ہوا کہ شاید وہ غلطی سے کچھ اور سامان نہ دے چکی ہو۔ بعد میں مسئلہ ہونے کا احتمال تھا جتنی دیر میں برکت علی وہ ڈبا لے کر آیا وہ وہیں لاؤنچ میں بیٹھی رہی۔ ابھی آرام سے اپنے، اپنے کمروں میں سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ بچوں کو وہ سلا چکی تھی۔ مٹی کمرے میں لیٹائی وی پر حالات حاضرہ کا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ وانیہ، برکت علی سے ڈبا لے کر اندرونی دروازہ مقفل کر کے کمرے میں آئی تو مٹی اس کے ہاتھ میں پھروٹی ڈبا دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا پھر قدرے جھلاتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

”یہ کیا اٹھالائی ہو برکت کو دیا نہیں ابھی تک؟“

”میں نے تو دے دیا تھا مگر وہ کہہ رہا ہے کہ اس میں آپ کا قیمتی سامان ہے۔ میں نے اسے غلطی سے

ایک دوسرے کے ساتھ وابستگی کی شدت کا احساس دلانے کے لیے کافی تھیں۔ اس کے باوجود دونوں کی جدائی..... وانیہ کی آنکھیں بے اختیار جھلک کر بہنے لگیں۔ مہی نے صرف اس سے ایک رشتے کی پائنداری کی خاطر اپنی ساری وفا میں، سارے جذبے، سبھی ارمان مہربند کر دیے تھے۔ اپنی ذات اپنی ہر وفا صرف اس کے لیے وقف کرنے کی خاطر اپنی زندگی کی انمول یادوں کو مہربند کر کے بے وقعت کر دیا تھا۔ احساس تشکر سے اس کے آنسو تسلسل سے بہنے لگے۔ وہ بے اختیار ہو کر اس کی جانب بڑھی اور اس کے بازو سے لپٹ کر اسے یقین دلانے لگی۔

”مجھے تو آپ پر ہمیشہ سے یقین ہے۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں ان چیزوں کی وجہ سے اپنا یقین نکودوں گی۔ جس طرح آپ کے لیے یہ سب کوئی وقعت نہیں رکھتیں، اسی طرح مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پلیز آپ انہیں رکھ لیں۔ استعمال کریں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ صرف میرے ہیں..... اور میرے ہی رہیں گے۔“ وہ اتنی شدت سے روئی کہ ثعلب بھی پریشان ہو گیا۔ اسے بھی جیسے سمجھ آئی کہ وہ کیا کر چکا ہے۔

”وانیہ..... چپ کر جاؤ..... بھئی اس میں رونے کی کیا بات ہے..... میں نے اپنی خوشی سے کیا ہے یہ سب.....“

”میں نے آپ کو مجبور کیا تھا ناں..... میں بے حد بری ہوں..... آپ کو کس قدر دکھ ہوا ہوگا۔“ وہ اس کے دل کا درد محسوس کر کے بلک ہی اٹھی تھی۔ مہی نے اسے بازوؤں میں سمیٹ کر سنبھالنے کی کوشش کی..... مگر وانیہ کے احساسات بری طرح چٹختے تھے۔

”ڈونٹ بی سلی..... نیا پلیز اب چپ کر جاؤ..... سنو۔“ مہی نے اسے جھنجھوڑ کر جیسے متوجہ کیا۔ ”سنو..... جب رومانہ سے میرا کوئی واسطہ، تعلق ہی نہیں رہا تو ان بے جان چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔ شادی کی پہلی رات تم نے مجھ سے جو باتیں کی تھیں..... میں نے

دے دیا ہے۔“ وانیہ نے ڈبا صوفے کے پاس پڑی میز پر رکھنے کے بعد بستر کی طرف قدم بڑھائے۔

”کچھ خاص جیتی نہیں ہے۔ بس دے دیا تھا تو..... واپس لینے کی کیا ضرورت تھی۔“ مہی مزید جھنجھایا تو وہ پلٹ کر اس کی جانب آگئی۔

”میں نے تو واپس نہیں مانگا..... وہ خود دے کر گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی کوئی اہم چیز ہو..... آپ ایک بار چیک کر لیں..... پھر اسے دے دیجیے گا۔“

”نہیں چیک کرنا مجھے..... کہہ دیا ہے ناں.....“ مہی کو اپنی جڑ جڑا ہٹ سے خود ہی ابھن ہوئی۔

”ثعلب..... کیا بات ہے، ایسا کیا ہے اس میں؟ کہیں آپ کی گرل فرینڈز کی نشانیاں اور لوئیرز تو نہیں۔“ وانیہ نے تو اسے مذاق سے چھیڑا تھا۔ ثعلب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ہاں..... ایسا ہی ہے..... تم دیکھنا چاہتی ہو تو خود دیکھ لو یا پھر میں دکھاؤں.....؟ اگر حوصلہ ہے تو.....“ ثعلب کی بات اور سنجیدگی اسے حیران کر گئی۔

”میں نے تو تم سے اپنی محبت و وفا کی پائنداری کے لیے ہر اس یاد کو مہربند کر دیا تھا جو ہمارے رشتے میں دراڑ ڈالنے کی کوشش کرتی۔ اب تم یہ پیٹھ دراہن کھولنا چاہتی ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ مہی کی آواز کسی کرب کے اثر سے بوجھل سی تھی۔ وانیہ جو مذاق، مذاق میں واقعی ڈبے کو کھولنا چاہتی تھی۔ وہ وہیں ساکت و جامد رہ گئی جبکہ مہی نہ جانے کس جذبے کے تحت ڈبے کی طرف بڑھا اور اس نے ایک دم سارا ڈبا میز پر الٹ دیا۔ ”دیکھو..... یہ ہے وہ قیمتی سامان جو اب میرے لیے کسی بلے کے ڈبیر کی طرح ہے، تم یقین کرو نہ کرو یہی حقیقت ہے۔“ وہ حیران نظروں سے بکھرے سامان کو دیکھ رہی تھی۔ کئی ٹاکی ہنر تھیں، گھڑیاں، مگالکڑ، ڈاکریاں، فوٹو البم، ہسی ڈیز، کیپ، وٹنگ کارڈز، نیم پیڈنٹ، پین، کی پین اور چین سیٹ، کف لکس اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ اتنی ساری چیزوں کے ساتھ ایک ہی ہستی وابستہ تھی۔ رومانہ..... یہ تمام چیزیں دونوں کی

انہیں دل سے قبول کیا تھا۔ میں واقعی رومانہ کو بھلاتا چاہتا تھا اور تمہارے دکھائے درگزر کے راستے پر عمل کر کے میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہوں۔ پلیز اب تم مجھے ماضی کی اذیت ناک یادوں کو پھر سے گلے لگانے کا مشورہ مت دو۔“ مٹی کے لہجے میں سچائی کی خوشبو تھی۔ دانیہ نے خود کو قدرے سنبھال کر اس کی جانب دیکھا تو مٹی نے مزید پُر اعتماد ہو کر اسے یقین دلایا۔

”سنو دانیہ..... مرد کی زندگی میں وہی عورت اہم مقام پاتی ہے جو اسے اور اس سے وابستہ مسائل سمجھ کر انہیں حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تم میری زندگی میں اسی اہم مقام پر ہو..... باقی سب بکواس ہے، بس اب رونا دھونا بند۔۔۔ یار آج جلدی سوتا چاہتا تھا مگر..... آج کی رات تمہارے نام.....“ مٹی نے سنجیدگی سے کہتے، کہتے اسے شرارت سے چھیڑا تو وہ تھلیپ کر اسے پیچھے دھکیل گئی۔

”شکر ہے تمہاری صورت بھی نظر آئی..... ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی تمہاری ناراضی کا ملال دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی۔“ طاہرہ بڑی تندگی بات سن کر قد رے جز بزی ہوئیں۔ ان کے شکوے نے کریم احمد کے چہرے کا رنگ بھی بدلا تھا۔

”کریم ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ اور میری آپ سے بھلا کیا ناراضی..... آپ بہن ہیں تو اپنے بھائی کا ہی ساتھ دینا تھا آپ کو.....“ طاہرہ نہ چاہتے ہوئے شکوہ کر گئیں..... کریم احمد نے بیوی کو گھور کر دیکھنے کے بعد بات کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں کریم..... اسے کہنے دو..... اپنوں سے ہی شکوے کیے جاتے ہیں۔ اچھا ہے کہہ سن کر دلوں کا غبار نکل جاتا ہے۔“ سعیدہ خانم نے خندہ پیشانی سے اپنی بھانجی کے روتے کو درگزر کیا۔

”تمہاری سونگن کا تو اب وجود ہی نہیں رہا۔ تم کیوں خواہ مخواہ جستی کڑھتی رہتی ہو۔۔۔ ویسے بھی ہم آپا کی مزاج پر ہی کے لیے آئے ہیں۔ گھر جا کر اپنے قصے منسلیمنا۔۔۔“ کریم احمد نے دبے دبے لہجہ میں یہودی کو کچھ باور کرایا۔۔۔ صبحی اسی وقت ٹرائی میں چائے کے لوازمات لیے سعیدہ خانم کے کمرے میں داخل ہوئی تو

سعی و خاتم کی طبیعت موسم کے زیر اثر کچھ خراب تھی۔ صبحی دل و جان سے ان کی تیمارداری کر رہی تھی۔ وانیہ کو بھی اس نے اطلاع دے دی تھی۔ کریم احمد بھی



میں کھچاؤ کیوں پیدا کرتی ہو..... کریم اپنی ذستے داری پوری کر چکا..... بچی اپنے گھر بار کی ہو چکی..... وہ اپنے گھر میں خوش ہے، تم دونوں بھی اپنے گھر میں خوش رہو..... بہو، بیٹیوں کو تماشا مت دکھاؤ۔“

”یہی بات تو میں بھی سمجھتا ہوں آپا.....“ کریم احمد نے پھر سے لا چاری ظاہر کی۔

”میں بھی بس یہی چاہتی ہوں کہ بار بار اپنی جیتی اولاد کا رونا رو، رو کر میری جان نہ جلائی جائے..... میں آج آئی بھی اسی لیے ہوں آپا کہ اس لڑکی سے کہیں..... بار بار فون کر کے میرے گھر کا سکون خراب نہ کیا کرے.....“ طاہرہ نے آخر اپنے آنے کا مقصد بیان کر ہی دیا۔ سعیدہ خانم حیرت سے بھائی کو دیکھے گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید بھائی کچھ کہے گا ان کی خاموشی محسوس کرے۔ سعیدہ خانم کو ہی وانیہ کا دفاع کرنا پڑا۔

”جی اپنے باپ کو فون نہیں کرے گی تو کس کو کرے گی..... کریم احمد اس کا باپ ہے، تم یہ پابندی دونوں پر نہیں لگا سکتی ہو۔ تم اسے اپنے گھر میں نہ آنے دینے کا اختیار رکھتی ہو طاہرہ..... کریم سے اس کا رشتہ ختم کرنے کا نہ تمہارے پاس کوئی اختیار ہے نہ حق.....“ نا حول ایک دم تاساز گار ہو گیا تھا..... دونوں بہن، بھائی ایک دوسرے سے نظریں جمائے کچھ دیر خاموش رہے آخر طاہرہ نے ہی وانیہ کے لیے جانے کا قصد کیا۔

☆ ☆ ☆

رات کے کھانے پر بھی جمع تھے۔ وانیہ حسب معمول بچوں کو اپنے دائیں بائیں بٹھائے بھی اپنے ہاتھ سے نوالہ کھلاتی، کبھی سب کو کھانے کی ڈش پیش کرتی، وہ سب کے لیے کسی ماں کی طرح فکر مند نظر آتی تھی جو اپنی ذات بھلائے دوسروں کی ضروریات و آرام کا خیال رکھ کر ہی مطمئن و پرسکون نظر آتی ہے۔ نانو اور ثعلب کے ذہن میں بیک وقت یہی سوچ تھی۔ کھانے کے دوران نانو نے ہی ایک بار پھر اسے اسلام

انہوں نے مزید سرگوشیاں انداز میں تنبیہ کی۔  
”بس..... اب آپا کی بہو کے سامنے کوئی گوہر افشانی مت کرتا۔“ طاہرہ نے نخوت سے سر جھٹک کر آپا کو دیکھا تو وہ بھی نظروں میں یہی اشارہ کر رہی تھیں۔

”ماموں جان..... آپ نے بہت اچھا کیا آج مامی جان کو بھی لے آئے۔“ صہبی نے نا حول کی کشیدگی محسوس کر کے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”اور تم نے تو ہماری طرف نہ آنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا ہے..... میری سوکن کی اولاد کو بھابی بنا کر غنی رشتے داریوں میں مجھے نیچا دکھانے کی خوب کوشش کی ہے۔“ طاہرہ بیگم دل کی بات دل میں رکھ لیں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ صہبی کے چہرے کا رنگ لمحے بھر کو متغیر ہوا..... لیکن پھر وہ خود کو سنبھال کر بولی۔

”مامی جان اس میں خدا نخواستہ آپ کو نیچا دکھانے والی کیا بات ہے۔ وانیہ کی شادی تو ماموں جان کو کرنی تھی۔ وہ آخر ان کی ذستے داری تھی..... اگر میرے بھائی کے ساتھ اس کا شوگ لکھا تھا تو اللہ کی مرضی..... آپ کو تو وہ ذستے داری اٹھانی بھی نہیں پڑی۔“ صہبی نے کافی رسائیت سے بات کی تھی۔ سعیدہ خانم نے بھابھ کے ماتھے کے بل دیکھ کر صہبی کو بہانے سے اٹھا دیا۔

”صہبی..... بیٹا دیکھنا ڈرائیور میری میڈیسن لے آیا ہے۔“

”جی امی جان..... میں دیکھتی ہوں۔“ صہبی ساس کا اشارہ سمجھ کر فوراً ہی وہاں سے چلی آئی۔

”میں کیوں اٹھاتی پرانی اولاد کی ذستے داری..... جس نے پیدا کیا تھا..... وہ جانے نہ جانے..... میں نیا سر درد کیوں پالتی۔“ طاہرہ نے جیسے جیسے انداز میں کہا تو دونوں بہن بھائی بے بسی کے طور پر سر ہلا کر رہ گئے۔ سعیدہ خانم نے بات ختم کرنے کے سے انداز میں نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بس پھر طاہرہ..... جب تمہارا اس بچی سے کوئی تعلق کوئی واسطہ ہی نہیں ہے تو تم کریم کی اور اپنی زندگی

آباد جانے کا مشورہ دیا۔

”وانیہ! بیٹا اب تو تمہیں جانا چاہیے۔ صہی فون پر بتا رہی تھی، سعیدہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔ تمہاری پھوپھو ہیں تمہیں ضرور جانا چاہیے۔“

”ہاں، میں نے بھی وانیہ سے کہا ہے۔ یہ اپنا پروگرام بنانے، میں نکت کروادیتا ہوں۔“ مہی نے بھی تائیدی انداز میں کہا۔

”میں اکیلی جاؤں گی؟ میرا مطلب ہے ہم سب کا تو اکٹھے جانے کا پروگرام تھا ناں اور.....“ وانیہ نے قدرے ترسو سے کہا۔

”اکٹھے بھی چلیں گے انشاء اللہ..... مگر ابھی تمہارا جانا زیادہ ضروری ہے..... تم اپنی پیکنگ کرلو.....

میں دیکھتا ہوں پرسوں کی کوئی سیٹ مل جائے۔“ مہی نے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ پھوپھو کی ناسازی طبع کا سن کر پریشان تو وہ بھی تھی، جانا بھی چاہتی تھی۔ لیکن گھر کے معمولات میں خلل کا سوچ کر ذہن میں گفتگو بھی تھی۔ اب مہی اور تانوں کے اصرار نے اس کی ہمت بندھادی تھی۔

ہم ہم ہم

گھر واپس جاتے ہوئے طاہرہ کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ وہ بولتے ہوئے گاڑی چلاتے ڈرائیور کو بھی فراموش کر چکی تھیں۔

”تم اسی لیے مجھے اپنی بہن کے گھر لائے تھے تاکہ سبھی مل کر مجھے ذلیل کریں۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ تم اپنی مرضی سے آئی تھیں اور دوسرے تم فضول میں ہر بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتی ہو۔ نہ تم صہی کو کوئی بات سناؤں نہ وہ تمہیں جواب دیتی۔“

”اس کے جواب پر تم تو بہت خوش ہوئے ہو گے، تمہارا ارمان پورا ہو گیا۔“

”میرے ساتھ بار بار اس موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے طاہرہ..... تمہاری وجہ سے..... ہاں صرف تمہاری وجہ سے میں نے اپنی بیٹی کو

وہ حق نہیں دیا جس کی وہ حقدار تھی۔ شادی کے بعد ہر لڑکی اپنے باپ کے گھر رہنے آتی ہے مگر میں تو رخصت کرنے کے بعد اسے ایک دن کے لیے بھی نہیں بلا سکا۔ اگر وہ میری خیریت معلوم کرنے کے لیے مجھے فون کر لیتی ہے تمہیں اس کی بھی تکلیف رہتی ہے۔“ کریم احمد کا پتا نہ صبر جیسے چھلک پڑا تھا۔

”ہاں..... ہوتی ہے مجھے تکلیف یہ سوچ، سوچ کر کہ تم نے میرا ہی نہیں میری اولاد کا بھی حق دوسری عورت اور اس کی اولاد کی جھولی میں ڈال دیا۔ میرے جیتے جی اب تم اسے کچھ نہیں دو گے..... نہ ہی اسے بھی میرے گھر میں آنے کی اجازت ہوگی۔“ طاہرہ بیگم جیسے چیخ اٹھیں۔

”تم نے ہی مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں دوسری عورت کی طرف جاؤں۔“ کریم احمد بھی چڑچڑ سے پن سے بولنے لگے تھے۔

”تمہاری اپنی نیت میں فتور تھا۔ تم جیسے مردوں کو بیوی سے ہمیشہ دور جانے کے بہانے چاہیے ہوتے ہیں۔ ایک سے دل جو نہیں بھرتا۔“

”بس کر دو طاہرہ ایسا نہ ہو تمہاری بکواس من، من کر میں کوئی ایسا قدم اٹھا لوں جس پر تمہیں باقی زندگی پچھتنا پڑے۔“ کریم احمد کا لہجہ سنجیدہ ہی نہیں سنگین بھی ہو گیا تھا۔ طاہرہ بہت حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ گھر آ گیا تھا۔ ڈرائیور نے جیسے ہی گیٹ پر گاڑی روکی کریم احمد اتر کر اندر بڑھ گئے۔

وانیہ رات کے سارے معمولات سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی تو ٹخنہ نے اسے اطلاع دی۔

”نیا صبح دس بجے کی سیٹ کنفرم ہو گئی ہے تمہاری، تم اپنی پیکنگ کرلو..... میں نے آپ کی کو بھی انفارم کر دیا ہے۔ وہ خود تمہیں ریسیو کرنے آ جائیں گی، اوکے.....“

”اتنی جلدی کیا تھی آپ کو؟“ وانیہ قدرے جھنجھلائی رزج ہوئی اس کے سامنے آنی لگی۔

”کیا مطلب.....؟ تم جانا نہیں چاہتیں؟“ مہی نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

وہائی دی۔ ”مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنی گہرائی سے سوچتی ہو۔ آئندہ میں اپنے سر ہر الزام لے لوں گا۔ تمہیں اپنی ننھی سی جان پر اتنا بڑا بوجھ لینے کی ضرورت نہیں۔ اب پلیز کچھ مت کہنا۔۔۔۔۔ جلدی سے اپنا سوٹ کیس پیک کر لو۔ مجھے واقعی بہت نیند آرہی ہے اور۔۔۔۔۔ انرپورٹ سے تم چاکلیٹس وغیرہ بچوں کے لیے لے لیتا۔“ مٹی نے اس کے بولنے کی کوشش پر اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے کندھوں سے پکڑ کر ڈریسنگ روم میں دھکیل دیا۔

سب ننھی نیند سو رہے تھے اور وہ کچن میں آئندہ کچھ دنوں کے لیے مختلف ڈشز بنا کر رکھنے میں مصروف تھی۔ اسے معلوم تھا بچے اور مٹی، شبنی بوا کے ہاتھ کے ساوے کھانے رغبت سے نہیں بلکہ مجبوراً کھاتے تھے۔ ناشتے سے پہلے، پہلے وہ فارغ ہونا چاہتی تھی اور آٹھ بجے تک ٹکنا بھی تھا وہ فجر سے اٹھی ہوئی تھی۔ شبنی بوا اپنے معمول سے اٹھ کر آئیں تو کچن میں مختلف خوشبوئیں پھیلی محسوس کر کے سرد ہنسنے لگیں۔

”ارے بیٹا، تمہیں بھی بس خط ہے کام کا۔۔۔۔۔ ارے مجھے جگا لیتیں۔۔۔۔۔ میں کچھ مدد کروا دیتی۔۔۔۔۔“ ”مدد تو بوا آپ ہی کو کرنی ہے میری۔۔۔۔۔ یہ سب ٹھنڈا ہو جائے تو فریزر اور فریج میں رکھ دیجیے گا۔۔۔۔۔ اور پلیز نالو کو روزانہ تازہ سوپ اور بچوں کو جوس ضرور دے دیجیے گا۔ یہ کچھ پکین دیکھ لیں کباب بھی بنا دیے ہیں۔ آپ فرائی تو کر لیں گی ناں۔۔۔۔۔ پتہ وانیہ نے مصروف انداز میں کہتے ہوئے پوچھا تو بوا جھٹ بولیں۔

”یہ بھی کوئی مشکل کام ہے، اتنا تو کر ہی لوں گی۔۔۔۔۔ بلکہ تمہارے آنے سے پہلے الٹا سیدھا جیسا بھی بنا تھا میں بنالیتی تھی۔ اب تم نے انہیں پختیاروں کی عادت ڈال دی ہے ابھی تو انہیں کچھ پسند نہیں آتا۔“ بوانے شکایت بھرے انداز میں کہا تو وانیہ مسکرا دی۔

”بواجی بچے اب فی دی پر جو چیزیں دیکھتے ہیں۔ وہی مانگتے ہیں، اچھا آپ جلدی سے ناشتا بنالیں۔ میں ذرا جانے کے لیے تیار ہو جاؤں۔“ وانیہ

”جانا تو چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ مگر اس طرح۔۔۔۔۔“ وہ کہتے، کہتے بھبکی۔

”کس طرح۔۔۔۔۔ کیا ہاتھی مکھڑوں کے ساتھ جانا چاہتی تھیں۔“ مٹی نے اس کی خاموشی پر اسے چھیڑا۔

”اس طرح۔۔۔۔۔ کا مطلب ہے، بلا ل اور طلال کے لیے کسی گفٹ کے بغیر۔۔۔۔۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔ ”وہ صرف میری پپو کا گھر نہیں ہے۔ مٹی بھابی، آپ کی بہن کا سسرال بھی ہے۔ آپ کے حوالے سے میری اب الگ حیثیت ہے۔ میں خالی ہاتھ وہاں منداٹھا کر چل دوں۔۔۔۔۔ کیا اچھا لگے گا؟“ وانیہ کے چہرے پر پریشانی کے اثرات بالکل حقیقی تھے۔ مٹی کچھ متاثر ہوا پھر اس کے قریب ہو کر کندھوں سے تھاتے ہوئے رسائی سے کہنے لگا بلکہ مصنوعی سنجیدگی سے اسے چھیڑا۔

”اوہو۔۔۔۔۔ یار۔۔۔۔۔ واقعی یہ تو بہت بڑی پرابلم ہے۔۔۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ سیٹ تو کفرم ہو چکی ہے، اوکے۔۔۔۔۔ ڈونٹ وری۔۔۔۔۔ میں آپنی سے خود ایکسکوز کروں گا۔“

”آپ تو ایکسکوز کر لیں گے۔ مگر میرے حوالے سے ہمیشہ کے لیے بات رہ جائے گی کہ مجھے رشتوں کے حساب سے ملنے پر تنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔“ وہ قہرے سنجیدگی سے کہتی سامنے سے اٹھ کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی تو مٹی ایک جست میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”سوئٹ ہارٹ۔۔۔۔۔ تم ٹینشن کیوں لے رہی ہو۔۔۔۔۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اوکے، ہاں ایک حل ہے تم وہاں جا کر بلا ل، طلال کی پسند سے انہیں گفٹ لے دینا۔“ ”میں ٹینشن نہیں لے رہی۔۔۔۔۔ بس ایک بات کہہ رہی تھی۔ شادی کے بعد بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ عموماً ملنے پر تنے کے معاملات میں مرد بری الذمہ ہی رہتے ہیں۔۔۔۔۔ شکایت پیدا ہوتی ہے تو بیوی کو ہی مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔“

”اللہ! میری زوجہ محترمہ میں کس صدی کی روح ڈال دی ہے تو نے۔۔۔۔۔“ مٹی نے اس کی سنجیدگی پر جیسے



نے کیا بول کی نرے کو پلاسٹک کور سے پیک کر کے  
فریزر میں رکھا اور پھر ہاتھ دھو کر جانے لگی تو یوانے  
پینچے سے پکار کر پوچھا۔  
”جینا! کتنے دن کے لیے جا رہی ہو..... جو اتنا  
کچھ بنا دیا؟“

”بواجی! دو تین دن میں آ جاؤں گی ہیں۔  
انشاء اللہ... اللہ پھوپھو کو صحت دے۔ میں تو ابھی نہ جاتی  
مگر کیا کروں جانا بھی ضروری ہے۔“  
”ہاں جینا! ضرور جاؤ۔ بلکہ تمہیں تو پہلے ہی  
جانا چاہیے تھا۔ گھر کی فکر مت کرو، میں سب سنبھال  
لوں گی۔“

”مجھے معلوم ہے بواجی آپ سب سنبھال لیں گی  
اسی لیے بے فکر ہو کر جا رہی ہوں۔“ وانیہ کو واقعی ان کی  
وجہ سے کافی اطمینان تھا اگر وہ نہ ہوتیں تو وہ جلنے کا  
سوچتی بھی نہیں۔ چلتے، چلتے وہ بار بار تانوکوشی کو مختلف  
ٹاکیدوں سے باندھ رہی تھی کہ وقت پر کھانا اور دوا کھانا،  
میں بچوں کو آفس سے آ کر پراپر ٹائم دے..... انہیں رات  
کو کہانیاں سنائے، اسکول ٹائم پر خود اٹھ کر انہیں دین  
میں بٹھائے۔ جس پر مٹی نے اسے جھینڑا تھا۔

”اتنی بھاری ڈیوٹی میں تو نہیں دے سکتا۔ اپنے  
لاڈلے، دلاڑوں کی عادتیں اتنی نہیں بگاڑنی تھیں  
تمہیں.....“ گاڑی میں بیٹھی ثعلب کے ساتھ...  
اٹرپورٹ جاتے ہوئے وانیہ نے خاصی حیرت سے اس کی  
جانب دیکھا۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں؟ میں نے ان کی عادتیں  
بگاڑی ہیں؟“

”تو اور کیا؟ بچے تمہارے بغیر سوتے نہیں،  
تمہارے بغیر کھاتے نہیں، اٹھتے نہیں..... تمہارے بغیر  
میں ادھورا ہوں..... اب بتاؤ بھلا کس کا قصور ہے؟“  
وانیہ آخری بات سن کر اسے خفگی سے دیکھ کر بولی۔

”اب ان باتوں کا مقصد..... میں نہ جاؤں؟“  
”یار اب کچھ کہوں گا تو لڑائی ہو جائے گی۔  
میرے بڑے کہتے ہیں، بیوی میکے جا رہی ہو تو اسے

روکنے کی کوشش بیکار ہوتی ہے۔“

”آپ ہی نے insist کیا تھا۔ آپ روک  
لیتے، میں نہ جاتی.....“ وانیہ اس کی فطرت سے کافی  
آگاہ ہو چکی تھی۔ اس کی چھیڑ چھاڑ کا برامانے بغیر جواب  
خوشدلی سے بولی تو ثعلب بھی مسکرا دیا۔

”ہاں..... تاکہ کل کو تمہارے میکے میں،  
میں ظالم شوہر کے نام سے مشہور ہو چاتا..... جو ان کی  
بیٹی کو ان سے ملنے نہیں دیتا۔“

”کوئی آپ کو میرے سامنے ایسا کہہ کر تو  
دکھائے..... میں اسے خود جواب دے لوں گی۔“ وانیہ  
نے فوراً سنجیدگی سے جواب دیا جس پر وہ مصنوعی حیرت  
ظاہر کرنے لگا۔

”واقعی.....؟ تم کسی اور کے سامنے بھی بول سکتی  
ہو؟ میں تو سمجھا تھا میری زوجہ محترمہ صرف میرے  
سامنے ہی بولتی ہے۔“ لہجے میں شرارت بھی وانیہ  
نے اسے قدرے خفگی سے دیکھا۔

”آپ کے کہنے کا مطلب ہے میں بہت زیادہ  
بولتی ہوں۔“

”میرے فرشتے گواہ ہیں، میں نے ایسا ہرگز  
نہیں کہا۔ اچھا چھوڑو، اب جاتے، جاتے ناراضی  
والا سین مت بناؤ۔ اٹرپورٹ آ گیا ہے، اب تو  
تمہیں جانا ہی ہے۔ بس پہنچتے ہی ایک کال ضرور  
کر دینا..... اور جلدی آنے کی کوشش کرنا..... آئی مس  
یو سو چی.....“ گاڑی اٹرپورٹ کی حدود میں داخل  
کرتے ہوئے ثعلب نے قدرے جذباتی ہو کر اس کا  
ایک ہاتھ تھاما تو وہ جھینپ کر جڑ بڑ ہوئی۔

”آپ بھی ذرا دھیان سے گاڑی چلائیں۔ زیادہ  
رومیٹک ہونے کی ضرورت نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔“  
وانیہ نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھینا۔

”کیا کہیں گے.....؟ میری وائف پہلی بار اپنے  
میکے جا رہی ہے، اتنا رومیٹک تو فرسٹ ٹائم پر ہر ہر بیٹہ  
ہوتا ہے۔ ہاں ذرا معاملہ پرانا ہو جائے تو بیچارہ شوہر گھر  
سے ہی رخصت کر کے شکر ادا کرتا ہے۔“ ثعلب نے

والا تھا، وہ اس سے معذرت کرنے لگی۔  
 ”میں آپ کو اسلام آباد انٹرپورٹ پر اتر کر کال  
 کروں گی۔“

”اوکے ٹیک کیئر... سوئٹ ہارٹ...“ وانیہ  
 کی آواز سن کر ساری کنگ معدوم ہو گئی تھی۔ وانیہ کی  
 محبت اتنی طاقتور ضرور تھی جو یوں بھر میں ماضی کی یادوں  
 کو دھویں کی طرح تحلیل کر گئی تھی۔

☆☆☆

”شکر ہے پھوپھا آپ بہتر نظر آ رہی ہیں۔ ہم  
 سب تو بہت پریشان ہو گئے تھے۔“ وانیہ، سعیدہ خانم  
 کے پہلو سے لگی اپنی فکر و چاہت کا ثبوت دیتی انہیں بے  
 حد پیاری لگی۔

”بیٹا تم سنچے تو یونکی پریشان ہو جاتے ہو  
 بڑھاپا آ گیا ہے ذرا سا سوئی نزل، زکام بھی جان کو آ جاتا  
 ہے۔ باحق سب کو فکر مند کر دیا صہیلی نے۔“

”ای جان! ہم صحیح فکر مند تھے۔ آپ کو وودن تو  
 ہوش ہی نہیں تھا اپنا... شہود نے بھی وودن آپ کے  
 سر ہانے بیٹھ کر گزارے ہیں۔“ صہیلی چائے کی ٹرالی  
 ملازمہ کے ہمراہ لے کر آئی تو سعیدہ خانم کی بات کا بڑی  
 رسائییت و اپنائیت سے جواب دیا۔

”ہوا کیا تھا پھوپھو کو...؟“ وانیہ نے چائے کا  
 کپ لیتے ہوئے پوچھا تو صہیلی بھی تفصیل بتانے لگی۔

”ای جان نے پچھلے دنوں کچھ زیادہ ہی پرہیز  
 کر لیا تھا۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا ان کی شوگر کو ہو گئی۔ بھی  
 یہ بے ہوش ہو گئیں... وہ تو اسپتال لے کر گئے تو  
 معوم ہوا۔“

”پھوپھا آپ اتنا بھی پرہیز نہیں کیا کریں... تھوڑا  
 بہت میٹھا لے لیا کریں۔ بابا کو بھی یہی پراہم ہے۔  
 میں تو بابا جان کو ای جان کے منع کرنے کے باوجود  
 سوئٹ ڈشز کھلا دیتی تھی۔“ وانیہ، پھوپھو کو مشورہ دے کر  
 اپنی یادیں بانٹنے لگی تھی۔ سعیدہ خانم نے بھی کوقدرے  
 طال سے دیکھا۔ باپ اسی شہر میں موجود تھا مگر باپ،  
 بیٹی کے ملنے پر پابندی تھی گزشتہ روز ہی کریم احمد نے

کار پارکنگ میں لگا کر اس کا چھوٹا سا سفری بیک ڈی  
 سے نکالا۔

”تو آپ میرے جانے کے بعد شکرانہ ادا کریں  
 گے؟“ وانیہ اس کے ہم قدم چلتے ہوئے اس کی بات  
 سے محکوظ ہوئی تھی۔

”ابھی مجھ پر وہ وقت کہاں آیا ہے۔ ابھی تو میں  
 تمہاری واپسی کی دعاؤں کروں گا... ہاں ایسا کچھ  
 عرصے بعد ہو سکتا ہے کہ تمہارے جانے کے بعد میں بھی  
 شکرانہ ادا کیا کروں۔“

”بے فکر رہیں، میں آپ کو ایسا موقع ہرگز  
 نہیں دوں گی... آئندہ آپ کے ساتھ جاؤں گی ورنہ  
 نہیں جاؤں گی۔“ وانیہ نے جواباً اسے حیران کر دیا۔

”رنگی! کرو وعدہ...“ ثعلب نے چلتے،  
 چلتے رک کر اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا یا تو وانیہ نے بھی  
 فوراً اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”وعدہ...“ ایک یاد کی سک لہجے بھر کو ثعلب کی  
 آنکھوں میں لہرائی تھی۔ رومانہ نے بھی کبھی اسی طرح  
 کچھ وعدے کیے تھے، قسمیں کھائی تھیں، جن کا وہ اسیر  
 ہوا تھا۔ وانیہ بیک لے کر ڈیپارچم لائن کی طرف  
 بڑھ کر الوداعی ہاتھ لہرائی تھی۔ ثعلب نے بھی میکا کی  
 انداز میں ہاتھ لہرا کر رخصت کیا تھا... واپسی پر اس کا  
 دل بھی بو بھل تھا اور ذہن بھی... ایک یاد کی کنگ تھی  
 دوسرے وانیہ کی جدائی کا احساس... اپنی یادوں کے  
 خیال پر وہ واپسی پر خود کو ملامت کر رہا تھا۔

”ثعلب فاران یہ تم کیا کر رہے ہو... تمہاری  
 شگت میں تمہاری بیوی تھی اور تم رومانہ کو سوچ رہے  
 تھے... اگر وانیہ جان جاتی تو کیا ہوتا... وہ تمہارے  
 لیے تمہارے گھر کے لیے اس قدر خلص و فکر مند ہے اور  
 تمہیں اس کے خلوص و محبت کے بجائے وہ لمحے یاد  
 آ رہے تھے، جن کا تعلق زندگی کی حقیقتوں سے نہیں  
 ہے۔ تم پھر سے کسی سراب کے گرداب میں پھنس رہے  
 ہو۔“ وہ خود کو سرزنش کرتا ڈرائیو کرتے، کرتے اپنے  
 سیل فون پر وانیہ کا نمبر ڈائل کر بیٹھا... جہاز اڑنے

مگنی۔ دو تین بار کی کوشش کے بعد بھی نتیجہ بھی رہا تو  
 دانیہ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ثعلب اس  
 کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ دانیہ کو سو طرح کے وہم و  
 خیال پریشان کرنے لگے تھے۔ سب سے پہلا خیال تو  
 نانو کی طبیعت کے حوالے سے آیا تھا یا پھر سنی، گولڈی  
 کے بارے میں..... دونوں بہن بھائی لڑنے پر آتے  
 تھے تو کسی کی نہیں سنتے تھے۔ سنی تو گولڈی کی چیزیں توڑ  
 پھوڑ دیتا تھا۔ یہ تو دانیہ نے ہی انہیں کافی سبھایا بھجایا تھا  
 تو وہ دونوں منع ہوئے تھے۔ وہ اپنی پریشان سوچوں  
 میں غلطیاں تھی اسی لمحے ثعلب کی کال آگئی۔  
 ”سوری یار..... تمہاری کال ڈسکنیکٹ کر دی  
 تھی۔ یہاں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔“ وہ کال ریسیو  
 ہوتے ہی بولا۔

”کیسا ہنگامہ..... خیریت ہے ناں.....؟“ دانیہ  
 حقیقی طور پر پریشان ہو گئی تھی۔  
 ”خیریت کہاں..... تم نے دونوں کے لیے جو.....  
 سرپرائز رکھا تھا۔ وہ گولڈی کے ہتھے چڑھ گیا..... اس  
 آفت کی پرکالہ نے سنی کے حصے کی چاکلیٹ بھی کھالی  
 اور اس کی اسٹوری بک پر لائٹ بھی لگا دیں۔ اب سنی  
 بھی بدلے لیے بغیر اسے بخشے پر تیار نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ  
 اس کے ڈول ہاؤس کو توڑ کے سوئے گا۔“ مٹی اسے  
 وجوہات بتانے لگا۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔ حالانکہ میں نے دونوں  
 کے الگ۔ الگ پیکٹ بنائے تھے۔ میں اسی لیے کہتی  
 ہوں کہ بچوں کو الٹے سیدھے کارڈون نہیں دیکھنے  
 چاہئیں۔ پیچھے ایگریو ہونے لگتے ہیں۔“  
 ”ہاں صحیح کہہ رہی ہو..... مگر بچوں کو بھلا نا اسی  
 طرح آسان لگتا ہے..... دیل پلیز تم بس آ جاؤ.....  
 پھوپھو جان اب ٹھیک ہیں ناں.....“

”کیا.....؟“ مٹی کی بات پر وہ حیران ہوئی۔  
 ”آپ نے کیا کہا.....؟ میں آج ہی تو آئی ہوں۔“  
 ”یار..... نہیں سن سکیں۔ یہ شیطان مجھ  
 سے۔ یونوکل فن لینڈ جانے کے وعدے پر بڑی مشکل

بہن کو ظاہرہ کے جھگڑے کا قصہ سنایا تھا۔  
 ”بد بخت شوگر بھی کوئی بلا ہے، ڈاکٹر بھی تو  
 ڈراستے رہتے ہیں۔ خیر..... دفع کرو میری بیماری  
 کو..... اب تو میں بھلی چکی ہوں، تم بتاؤ ثعلب تمہاری  
 نانو سب ٹھیک ہیں۔“

”سب خیریت سے ہیں پھوپھو..... نانو تو بہت فکر  
 مند تھیں۔ انہوں نے ہی مجھے اصرار کر کے بھیجا ہے۔  
 ورنہ میں تو بچوں کی چھٹیوں میں آ جاتی۔“  
 ”ہاں تو پھر آ جانا چھٹیوں میں، تمہارا اپنا گھر  
 ہے، ابھی کتنے دن رکوگی؟“ سعیدہ خانم نے اس کا  
 کندھا تھپتھا کر جیسے اپنے ساتھ کا احساس دلایا۔  
 ”دو تین دن کا کہہ کر آئی ہوں پھوپھو.....“

”صرف دو تین دن.....؟ اتنی جلدی ہم تمہیں  
 نہیں جانے دیں گے۔“ مٹی آپنی نے اس کی طرف  
 بلسکٹ بڑھاتے ہوئے خاصی اپنائیت سے کہا تو سعیدہ  
 خانم بھی تائید ابولیں۔

”ہاں بالکل..... کچھ دن تو رکو..... میں کریم کو  
 بھی فون کرتی ہوں۔ وہ بھی تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔“  
 ”بابا جان سے بھی مل لوں گی مگر مجھے دو دن بعد  
 ضرور جانا ہے۔ میری غیر موجودگی سے بھی ڈسٹرب  
 ہوں گے..... سنی، گولڈی تو مجھے آنے ہی نہیں دے  
 رہے تھے۔“

”بچوں کو مٹی سنبھال لیتا ہے، تم فکر مت کرو۔  
 میں خود بات کروں گی..... پہلی دفعہ میکے آئی ہو..... آرام  
 سے رہو۔“ مٹی آپنی نے اس کی ایک ٹیس سنی.....  
 فی الحال وہ بھی خاموش ہو گئی تھی۔ جانے کا پروگرام پہلے  
 سے بنا کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

☆☆☆

دانیہ رات کے کھانے کے بعد لان میں نکل آئی  
 تھی۔ مٹی بہن سمیٹ رہی تھی اسی لیے اسے ٹی وی  
 دیکھنے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ لان میں چلی آئی تھی۔ اسے  
 بچوں سے بات کرنی تھی۔ ثعلب کا نمبر ملا کر اس نے  
 کان سے لگایا تو اگلے ہی لمحے اس کی کال کاٹ دی



”تم جو چاہے سمجھو..... مگر یہ میری محبت ہے۔“  
 دونوں دیر تک اسی طرح چھینر چھاڑ کرتے رہے۔ شہود  
 کافی دیر سے کھڑکی کا پردہ ہٹائے سگار پیتے ہوئے لان  
 کا نظارہ کر رہے تھے۔ کھڑکی سے ذرا فاصلے پر بیچ پر  
 ٹینسی وائپ کے چہرے پر پڑتی پولیسپ کی روشنی اس  
 کی اندرونی ویرانی خوشی کو چھلکانی اسے بے حد حسین  
 دکھا رہی تھی۔

”وائپہ کو دیکھ رہے ہیں.....؟“ غمی سے بات کر رہی  
 ہے۔ ”صحنی ذرا دیر میں متوجہ ہو کر دیکھنے لگیں۔  
 ”ہوں.....“ شہود نے گہری سانس لے کر پلٹ  
 کر بیڈ تک آتے، آتے اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔  
 ”شکر ہے، ہمارا فیصلہ درست رہا۔“ سچ پوچھو تو امی جان  
 نے جب یہ ذمے داری اپنے سر لی تو میں زیادہ مطمئن  
 نہیں تھا۔ غمی کی رومانہ سے نمٹت تھی..... مجھے زیادہ  
 یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کسی دوسری لڑکی کو دل  
 سے جگہ دے گا۔ مگر وائپہ کو خوش دیکھ کر لگتا ہے کہ  
 دونوں میں اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“

”صرف انڈر اسٹینڈنگ ہی نہیں..... دونوں میں  
 بے حد محبت اور ایک دوسرے کے لیے احترام بھی ہے اور  
 مجھے یقین ہے دونوں کی یہ محبت ہمیشہ قائم رہے گی۔“  
 ”آمین.....“ شہود نے بے ساختہ کہا تو صحنی  
 نے بھی دل سے تائید کی۔

☆☆☆

کریم احمد، سعیدہ خانم کے بچانے پر آفس  
 ٹاسنگ میں وائپہ سے ملنے آئے تھے..... سعیدہ باپ،  
 بیٹی کو تنہا چھوڑ کر ظہر کی نماز کے بہانے اپنے کمرے  
 میں چلی گئی تھیں۔ جبکہ صحنی دوپہر کے کھانے کے  
 انتظام میں لگی ہوئی تھی..... کریم احمد کو سمجھ نہیں آ رہی تھی  
 کہ وہ بیٹی سے کیا بات کریں۔ وائپہ کو بھی ان کی  
 خاموشی کھل رہی تھی آخر اس نے ابتدا کی۔

”بابا جان..... کیا آپ مجھ سے یہ بھی نہیں  
 پوچھیں گے کہ میں کیسی ہوں..... اپنے گھر میں خوش  
 ہوں یا نہیں..... اور.....؟“

سے مانے ہیں۔“

”سچ، سچ بتائیں، بچے نہیں سنبھل رہے  
 یا..... آپ.....“ وائپہ نے بھرپور شرارت سے کہا تو غمی  
 نے یک دم بے ساختہ تہققبہ لگایا۔

”نیا..... یہ تم ہی ہوتا.....؟“ آئی کانت  
 بلیو.....“ غمی کافی محفوظ ہوا تھا۔ ”very  
 pleasant change یہ سارا اکمال میری

صحبت کا ہے نا؟“

”لے لیں آپ سارا کریڈٹ.....“ وائپہ نے  
 مصنوعی خفگی ظاہر کی۔

”میں کیا غلط کہہ رہا ہوں.....؟ شادی سے پہلے  
 تمہیں بولنا بھی نہیں آتا تھا، کچھ یاد ہے جب میں آپلی  
 کی طرف آیا تھا تو محترمہ کی بولتی بھی بند تھی۔“  
 ”وہ تو میں شرم سے نہیں بول پاتی تھی..... ورنہ  
 اپنے کالج کی بیسٹ ڈیپٹر رہی ہوں۔“

”بھئی میں تو ہوں ہی تم سے اسپر میں..... مزید  
 ضرورت نہیں ہے، بس یہ بتاؤ کل آ رہی ہوتا.....“  
 ثعلب نے بہ اصرار پوچھا تو وہ یک دم سنجیدہ ہو کر  
 معمول کے انداز میں بولی۔

”ثعلب..... اتنی جلدی؟ ابھی تو میں بابا جان  
 سے بھی نہیں ملی ہوں..... اور صحنی بھابی تو مجھے کافی دن  
 روکنے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہیں۔“

”ان کے پروگرام ان کے ساتھ رہنے دو، تم کل  
 اپنے بابا سے مل لو اور پلیز پرسوں تک آ جاؤ۔“ وہ ہلکی ہوا۔  
 ”میں دیکھتی ہوں..... اگر پھپھو اور بھابی نے  
 اجازت دے دی تو..... میں آ جاؤں گی ورنہ.....“

”اب زیادہ سرنہ چڑھو..... اتنی خفیں کوئی شوہر  
 نہیں کرتا..... معلوم ہے ناں تمہیں دیکھے بنا صبح  
 نہیں ہوتی میری..... یہ کرا، یہ بستر کاٹ کھانے کو دوڑ  
 رہے ہیں مجھے..... میں نے کہہ دیا ہے پرسوں تم واپس  
 آ رہی ہو بس.....“ اس کی محبت کا احساس وائپہ کی  
 سرشاری میں اضافہ کر گیا۔

”اچھی دھونس ہے۔“ وہ بے ساختہ کھٹکھٹائی۔

”بیٹا..... یہ باتیں پوچھی نہیں جاتیں۔ نظر آجاتی ہیں۔ محسوس ہو جاتی ہیں..... ماشاء اللہ تم خوش ہو..... مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ آخر باپ ہوں تمہارا..... اتنا تو جان سکتا ہوں ناں.....“ انہوں نے سنجیدگی سے بولتے ہوئے پاس بیٹھی دانیہ کا سر تھپتھپایا۔

”مگر بابا جان مجھے آپ بہت کمزور اور اداس محسوس ہو رہے ہیں۔ کیا آپ اپنا خیال نہیں رکھ رہے..... اپنا چیک اپ تو کروا رہے ہیں ناں.....“

”تمہاری امی کے بعد میرا خیال رکھنے والا کون رہا ہے بیٹا۔“ کریم احمد نے بے ساختہ کہا تو عرصے بعد ان کے منہ سے اپنی ماں کا ذکر اسے حیران کر گیا۔

”بڑی امی آپ کا خیال نہیں رکھتیں؟“

”اس عورت کو میرے ساتھ لڑنے بھگڑنے سے فرصت ملے تو وہ کچھ اور سوچے ناں..... بس گڑے مردے اکھاڑ کر خود بھی پریشان رہتی ہے اور مجھے بھی پریشان رکھتی ہے۔“

”بابا جان..... آپ انہیں اطمینان دلا دیں کہ اب امی تو اس دنیا میں ہی نہیں رہیں..... اور میں بھی آپ کی ذمے داری نہیں رہی..... وہ بے فکر ہو جائیں..... میں کبھی ان کی زندگی میں مخل ہونے نہیں آؤں گی۔“ دانیہ رسائییت سے بولتی آخر میں آزر وہ ہو گئی..... تو کریم احمد نے ایک بار پھر شفقت و محبت سے بیٹی کو تھپکا۔

”مجھے یہی تو دکھ ہے کہ میری بیٹی اپنے باپ کے گھر میں ایک دن کے لیے بھی نہیں آسکتی جبکہ بیٹیوں کا تو مان ہی باپ کا گھر ہوتا ہے۔“ کریم احمد آبدیدہ ہو گئے..... دانیہ سے باپ کی رفیقہ انقلبی دیکھی نہیں گئی فوراً تسلی آمیز لہجہ میں گویا ہوئی۔

”میرا مان تو اب بھی آپ ہی ہیں ناں..... بس آپ زیادہ نہ سوچا کریں، سچ پوچھیں تو مجھے تو خود کہیں بھی رہنے کی فرصت نہیں ہے۔ صرف پیچو جان کی خاطر اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔ سب گھر والے بے حد مس کر رہے ہیں مجھے..... ہو سکتا ہے میں آج رات کو

ہی چلی جاؤں.....“ دانیہ اپنے احساسات ظاہر کر کے اپنے بابا کو مزید پریشان نہیں کر سکتی تھی۔ پیچو نے اسے بتا دیا تھا کہ کس طرح طاہرہ نے ان کا جینا دو بھر کر رکھا ہے۔ اب بھی وہ اس سے ملنے چوری چھپے آئے تھے۔ کریم احمد مزید کیا کہتے بس بیٹی کو دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

”ابھی ابھی شعب کا فون سن کر ناراض ہوئی تھیں۔ ان کی جھنجھلاہٹ ان کے رویے سے واضح تھی۔ وہ خفگی سے بولتی ساس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ اس وقت دانیہ بھی وہاں تھی۔

”عجیب لڑکا ہے، دو دن نہیں ہوئے تمہیں آئے ہوئے اور کہہ رہا ہے کہ تمہیں واپس بھیجا دوں..... شادی کے بعد پہلی بار آئی ہو تم..... اس طرح کیسے جانے دوں تمہیں۔“

”وہ بھالی دراصل سنی، گولڈی بہت یاد کر رہے ہیں..... ہم سب نے ایک ساتھ آنے کا پروگرام بنایا تھا تو اس لیے وہ زیادہ ہی پریشان کر رہے ہیں۔“ دانیہ نے اپنے طور پر صفائی دینے کی کوشش کی تو وہ مزید جھلا گئیں۔

”بچوں کا کیا ہے، ضد کرتے ہیں پھر بہل جاتے ہیں۔ اب اتنی دور آئی ہو تو چار دن تو رہو..... امی جان بھی تمہارے آنے سے کافی بہتر نظر آ رہی ہیں۔ ماسوں جان بھی یہاں تم سے ملنے آسکتے ہیں..... اپنے گھر میں تو وہ ممانی جان کی وجہ سے نہیں بلا سکتے۔“

”بھابی جان! بابا جان کو مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے بھی میرا جانا بہتر ہی ہے..... میں جتنے دن یہاں رہوں گی وہ مجھ سے ملنے آئیں گے اور پھر بڑی امی ان سے بھگڑتی رہیں گی۔ میں نہیں چاہتی بابا جان کے گھر کا سکون میری وجہ سے خراب ہو۔“ دانیہ نے بڑی رسائییت سے بات ختم کرنا چاہی تو صہمی بھابی قدرے رنج ہو کر بولیں۔

”ممانی جان کے جھگڑے تو تاحیات رہیں گے۔ تم ماسوں جان کی جائز آواز دو..... اس طرح اپنا حق چھوڑ کر اپنی ہی زندگی مشکل بناؤ گی..... اور کسی وقت

”ٹھیک ہے میں پھر بھی احتیاطاً ڈرائیور سے کہتی ہوں کہ وہ بھی تیار رہے۔ دس منٹ میں ہمیں نکل جانا چاہیے۔“ صہبی بھائی سے لاؤنج میں چھوڑ کر گئیں تو اس نے پھر سے کال ملائی۔ اسی اثنا میں سعیدہ خانم بھی وہاں چلی آئیں۔ نکل سلسل جاری تھی مگر..... کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا..... اسے فکر لاحق ہو گئی۔

☆☆☆

وانیہ کی فلائٹ صبح گیارہ بجے کی تھی۔ کریم احمد کا ارادہ تھا کہ وہ ناشتا کیے بغیر وانیہ کو لینے نکلیں گے مگر ان کے ارادوں پر طاہرہ نے پانی پھیر دیا تھا۔ انہیں جانے کیسے سن گئی تھی۔ وہ صبح سے شوہر کا سیل فون سائلنٹ پر کرنے کے بعد فون بھی غائب کیے بیٹھی تھیں۔ دونوں میں کافی دنوں سے بات چیت بند تھی اسی لیے کریم احمد خود ہی پریشان ہو کر فون ڈھونڈنے کی کوشش کے ساتھ جھنجھلا تے، بڑبڑاتے پھر رہے تھے۔

”ہزار بار منع کیا ہے، میری چیزوں کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ رات کو سر ہانے رکھ کر سویا تھا کہاں چلا گیا میرا فون..... راتوں رات اس کے پیر لگ گئے یا پر نکل آئے تھے۔“ وہ اب ملازموں کو جمع کیے ان پر چلا رہے تھے۔ ”جس کا بھی یہ کام ہے مجھے بتادے ورنہ پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

”صاحب..... ہم سے قسم لے لیں..... ہم سب نے آپ کا نمک کھایا ہے، ہم کیوں چوری کریں گے۔ ہم نے تو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی کسی چیز کو نہیں دیکھا۔“ شرفو میاں سب ملازمین کی گواہی دیتا کھٹکھٹا کر بولا۔

”شرفو میاں، جاؤ اپنا کام کرو..... انہیں تو اپنی چیزیں رکھ کر بھولنے کی عادت ہو گئی ہے۔ فون گھر پر لاتے تو گھر پر ملتا..... کل گئے ہوئے تھے خاص ملاقات پر وہیں چھوڑ آئے ہوں گے۔“

”تم..... تم میری جاسوسی کرتی رہی ہو.....؟“

طاہرہ بیگم نے درمیان میں مداخلت کی۔ طاہرہ کے ہلے کئے انداز پر وہ ایک دم چونک کر سڑے۔

پر پچھتاؤ گی..... ارے بیٹی باپ سے نہ ملے اس کے گھر نہ جاسکے یہ کہاں کا انصاف ہے۔ میں تمہاری جگہ پر ہوتی تو شادی کے اگلے دن ہی ان کے سر پر پہنچ جاتی۔“

”بھابی جان، جہاں دل سے قبول نہ کیا جائے وہاں مسلط ہونے کا فائدہ..... میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ سبھی نے مجھے دل سے قبول کر کے اپنی محبتیں اور مان دیا ہے۔ بابا کی مجبوری اگر میں نہیں سمجھوں گی تو مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے۔“ سعیدہ خانم جو بالکل خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھیں اسے سراہتے ہوئے بولیں۔

”بالکل صحیح کہہ رہی ہو..... بیٹیاں ہی والدین کی مجبوریاں سمجھتی ہیں۔ تم دل پرست لو ایک دن طاہرہ کو بھی عقل آ ہی جائے گی۔ ٹھیک ہے بھی اگر ثعلب تمہیں بلارہا ہے تو جاؤ..... اپنے گھر میں خوش رہو، آباد رہو، میں اب بالکل ٹھیک ہوں.....“ سعیدہ خانم نے اسے اجازت دے دی تھی۔ صہبی کچھ کہتا چاہتی تھی..... مگر انہوں نے اشارے سے منع کر دیا۔

☆☆☆

کریم احمد نے وانیہ کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ وہ اسے خود اتر پورٹ چھوڑنے جائیں گے۔ وانیہ نے منع بھی کیا تھا مگر وہ بضد تھے۔ سو وہ اپنا سامان پیک کیے انہی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

”وانیہ! ماموں جان آرہے ہیں یا میں تمہیں ڈراپ کراؤں؟“

”میں نے کال تو کی تھی مگر انہوں نے ریسیو نہیں کی..... شاید بابا جان راستے میں ہوں۔“ وہ ایک دم سنبھل کر بتانے لگی صہبی نے بھی غور نہیں کیا ورنہ اس کی..... آنکھوں کی نمی انہیں پریشان کر دیتی۔

”ایک بار پھر ٹرائی کر کے پوچھ لو..... ایک گھنٹا تو راستے میں لگ جائے گا۔ اگر رش ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔ کہیں فلائٹ مس نہ ہو جائے۔“ صہبی نے فکر مندی سے مشورہ دیا تو وہ سر ہلانے لگی۔

”میں فون کر لی ہوں۔“



”جوانی میں تو تم پر نظر نہ رکھ سکی، اب بڑھاپے میں تمہاری کیا جاسوسی کرواؤں گی۔ ویسے بھی تم جیسے کھٹے مرو اپنے پکڑائی دیتے کہاں ہیں۔“

”تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی ناں..... شرافت سے میرا فون لا دو..... وانیہ کا فون آ رہا ہوگا..... مجھے اسے اتر پورٹ چھوڑنے جانا ہے۔“ کریم احمد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فون پر ہرہ کے پاس ہے۔

”کبھی اپنی باقی اولاد کی ذمہ داری بھی اس طرح اٹھائی تھی۔ جس طرح اپنی چیتا کے لیے بے چین ہو رہے ہو۔“ طاہرہ کا زہر خند لب دلچہ کریم احمد کو بھی زہر لگ رہا تھا۔

”ساری زندگی تمہاری اولاد ہی کی تو ذمہ داری اٹھائی ہے، اس مسکین کو تو میں چار دن اپنے گھر میں نہ رکھ سکا۔ تمہاری اولاد کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، آج دونوں بیٹے تنہا چھوڑ کر گھر اور کاروبار الگ کر کے بیٹھے ہیں۔ صرف اور صرف تمہاری شہ پر۔“

”اچھا..... اب سارا الزام میرے سر پر رکھ دو..... وہ بھی تمہاری اولاد ہی ہیں۔ انہیں جب پتا چلا کہ باپ نے ایک اور حصے وار پیدا کر رکھا ہے تو وہ اپنا اپنا حق لے کر الگ ہو گئے۔ تو کیا برا کیا۔“

”اس حصے دار کو میں نے کیا دیا.....؟ اپنی محبت تو میں اسے دے نہیں سکتا۔ دیکھو طاہرہ میرے ساتھ اس معاملے میں خدمت لگاؤ ایسا نہ ہو تم اپنی ضد کے ساتھ تنہا رہ جاؤ۔“ کریم احمد بھڑک کر بولتے، بولتے یک دم سرد لہجے میں کہہ کر وہاں سے چلے آئے۔ طاہرہ کے تن بدن میں آگ سلگ اٹھی۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وانیہ ان کے سامنے آئے اور وہ اسے خاکستر کر دیں۔ اپنے جوش میں وہ کمرے میں آئیں اناری سے فون سیٹ نکال کر وانیہ کا نمبر نکال کر ڈائل کرنے لگیں۔ وانیہ اور صہبی پورچ میں کھڑی تھیں۔ ڈرائیور اس کا سامان ڈکی میں رکھ رہا تھا۔ بھی وانیہ کے سیل فون کی ٹیون بجنے لگی۔ صہبی بھی متوجہ ہو گئی..... وانیہ فون سننے لگی۔

”اسلام علیکم بابا جان.....! آپ ٹھیک تو ہیں، آپ کال ریسیو کیوں نہیں کرتے؟“ وانیہ کی بے چینی دیدنی تھی۔ دوسری طرف طاہرہ کاٹ وار انداز میں جودل میں آ رہا تھا بولے جارہی تھیں۔

”بات سنو لڑکی! آئندہ کریم احمد کو فون کرنے کی یا ملنے کی کوشش مت کرنا..... سمجھ لو کہ جس طرح تمہاری ماں مر گئی اسی طرح تمہارا باپ بھی..... سن رہی ہو ناں میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ وہ مزید کچھ کہہ رہی تھیں مگر وانیہ نے فون بند کر دیا تھا..... وہ جیسے شدید صدمے کے اثر میں تھی۔ صہبی اس سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ بتا رہی تھی مگر وہ تو کم صم سی ہو گئی تھی۔ صہبی نے اسے بازو سے پکڑ کر گاڑی میں بٹھایا۔

کریم احمد ڈرائیور کے ساتھ گھر سے نکلے غصے سے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو جیسے ماؤف کر دیا تھا۔ گھر سے ڈرا دور جانے کے بعد ان کے ذہن نے کام کیا پھر انہوں نے اپنے ڈرائیور سے اس کا سیل فون لے کر وانیہ کا نمبر ملایا تو اس کا سیل فون بند جا رہا تھا۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اتر پورٹ کے لیے نکل چکی ہوگی۔ انہوں نے پھر بھی اپنی تسلی کے لیے سعیدہ خانم کے گھر کا نمبر ملایا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ ان کا انتظار کرتے، کرتے صہبی کے ساتھ جا چکی ہے۔ کریم احمد عجیب سی گفتگوں کر رہے تھے۔ وانیہ سے محبت فطری تھی..... طاہرہ ان کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی جو ان سے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

ہلہ ہلہ

صہبی کے اصرار پر آخر روتے ہوئے وانیہ نے طاہرہ بیگم کی باتیں دہرائیں تو صہبی بھی دنگ رہ گئی۔

”ممائی نے تم سے یہ سب کہا.....؟“ آف کتنی بے حس عورت ہیں..... تم فکر نہ کرو..... میں امی جان سے کہوں گی..... خوب خبر لیں گی۔ استغفار..... اپنی ضد میں اپنے ہی شوہر کو مردہ کہہ دیا۔“ صہبی کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔ جبکہ وانیہ کا روٹ کم نہیں ہو رہا تھا۔ صہبی نے بڑی مشکل سے اسے کندھے سے لگا کر



تھی۔ اگر ہوش دو بار اس کے پاس آکر چہ جاسنے کی کوشش کر چکی تھی۔ وہ سرور کا کہہ کر ٹال گئی تھی۔ ساتھ بیٹھی معمری خاتون نے بڑی شفقت سے پوچھا تھا۔

”بیٹا اگر آپ براندہ مانیں تو میں جان سکتی ہوں آپ کے رونے کی وجہ۔“ ”وانیہ ایک دم چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔ بے اختیار اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔ اسے اپنے دکھ میں موقع مل کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

”نہ۔ نہیں۔ اچھو علی۔ وہ بابا۔ میرا مطلب ہے سسرال جاری ہوں ناں۔“ ”وہ خجالت سے بوٹی خاتون کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

”آئی سی۔ ہرینڈ نے جلدی آنے کے لیے کہا ہوگا اور آپ ابھی اپنے پیرنس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں گی۔“

”نہیں۔ یہ بات نہیں ہے آنٹی جی۔ میرے ہرینڈ نے مجھے نہیں کہا میں خود اپنے گھر کو مس کر رہی ہوں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے، آپ اپنے گھر اور ہرینڈ کو مس کر رہی ہیں۔ ورنہ تو بچیاں زیادہ میکے کو مس کرتی ہیں۔“ خاتون نے اسے سرائتی نظروں سے دیکھا۔

خاتون کو بھی اس کے گریز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اصل بات بتانا نہیں چاہتی۔ وہ اس سے دوسری باتوں میں لگ گئیں۔ وانیہ بھی ان کے ساتھ باتوں میں لگی تو اس کے ذہن سے بہت سارا بوجھ ہٹ گیا۔ ثعلب اسے۔

ایئر پورٹ لینے آیا ہوا تھا۔ وانیہ اسے دور سے دیکھ کر ہی مٹھنجل گئی تھی۔ بھائی نے اسے پہلے ہی سمجھایا تھا کہ میکے سے متعلق شوہر سے کوئی بات نہ کرے۔

”بھینکس آلات مالی ڈیر۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میری بات نہیں ٹالو گی۔“ سامان کی ٹرال اس کے ہاتھ سے لے کر پارکنگ کی طرف بڑھتے ثعلب نے بڑی وارستگی سے دیکھ کر کہا تو وہ مسکرا دی۔

”میرے پاس آپ کی بات ٹالنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔“

”ماشاء اللہ۔ سبحان اللہ۔ بڑی تابعداری دکھائی جا رہی ہے۔ خیر تو ہے۔“

”ہاں۔ آپ کی محبت نے وہاں ٹھہرنے ہی نہیں دیا۔“ ”وانیہ دھیمے لہجے میں اسے یقین دلاتے ہوئے اسے مزید حیران کر رہی تھی۔

”ایک منٹ۔ ایک منٹ۔“ ”مھی ایک دم اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔“ ”تم۔ وانیہ ہی ہوتاں۔؟“

”نہیں، میری روح آپ سے ہم کلام ہے۔“ ”وہ قدرے مسکرا کر ایک طرف سے آگے بڑھی۔

”بالکل۔ تمہاری روح ہی ایسا اعتراف کر سکتی ہے۔ ورنہ تم تو اس معاملے میں بے حد سنجوس ہو۔“ ”مھی نے بھی مذاق میں بات بڑھائی۔

”اور آپ تو جیسے بہت دریا دل ہیں ناں۔“ ”دونوں نوک جھوک کر تے گاڑی تک آگئے۔ اتفاقاً وانیہ کے ساتھ سفر کرنے والی خاتون کی گاڑی بھی ساتھ ہی پارک تھی۔ بیس اکیس سالہ نوجوان ان کا سامان گاڑی میں رکھتا بات چیت کر رہا تھا۔ وہ خاتون،

وانیہ اور مھی کو قریب آنا دیکھ کر دونوں کی طرف بڑھی چلی آئیں۔

”اوہ۔۔۔ تو بیٹا یہ ہیں آپ کے ہرینڈ۔۔۔ جنہیں آپ جہاز میں بیٹھی مس کر رہی تھیں۔“ ”ثعلب کا جواب منہ کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ وہ معمر خاتون کو حیرت سے دیکھنے کے بعد وانیہ سے آنکھوں میں استفسار کر رہا تھا۔

”یہ۔۔۔ آنٹی۔۔۔ میرے ساتھ جہاز میں تھیں۔ اپنی بیٹی کی طرف آئی ہیں تو اسی کی شادی کے سلسلے میں۔“ ”وانیہ نے تفصیلی تعارف کروایا۔

”اور میں نے وانیہ بیٹی سے وعدہ لیا ہے کہ آپ دونوں اپنی فیملی کے ساتھ شادی میں ضرور شرکت کریں گے۔ میں فون پر انو۔ بیٹھن سینڈ کر دوں گی۔ بیٹا آپ نے ضرور آنا ہے۔“ ”وہ بڑے خلوص سے دعوت دے رہی تھیں۔ وانیہ صرف تائیدی طور پر سر ہلا رہی تھی۔

”آپ بھی ضرور آئیے گا ہمارے گھر۔۔۔ ایک ہی تو ایریا ہے۔“ آخر وانیہ مرد و ناہولی۔



اچانک موڈ بدل کر اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا تو دانیہ بھی قدرے سنبھل گئی۔

”پھوپھو اب ٹھیک تھیں۔۔۔ سوری۔۔۔ واقعی مجھ سے غلطی ہو گئی۔۔۔ مجھے آپ سے اجازت لیے بغیر کسی کو بھی نمبر وغیرہ نہیں دینا چاہیے تھا۔“

”بس اب اس ٹاپک کو چھوڑو۔۔۔ دراصل ان کی انٹری سے میرا love scene تو خراب ہو گیا تھا ناں۔۔۔ میں کیا کہنا سننا چاہ رہا تھا تم سے۔۔۔ دہلی رات کو سنوں گا قصہ بھر۔۔۔ اور سناؤں گا بھی۔“ مٹی نے اس کا ہاتھ لبوں سے قریب کر لیا۔

”رات کی رات کو دیکھی جائے گی۔ ابھی روٹیلنگ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ دھیان سے ڈرائیو کریں۔“ وہ جیسٹ کر ہاتھ سمجھ کر بولی۔

”ایک تو تم۔۔۔ ہمیشہ مجھے غلط وقت پر ٹوکتی ہو۔۔۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ میں نے کیسے یہ دو دن گزارے ہیں۔۔۔ you know what

مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں تم سے اتنی شدید محبت کرتا ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ ساری دنیا خالی ہو گئی ہے۔“ وہ بول رہا تھا اور دانیہ کی روح سرشاری کی نئی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ زندگی تو ثعلب کے ساتھ ہی سے خوب صورت تھی۔ بڑی امی کی باتیں اور رویے تو بے معنی اور بے حقیقت سے نکلنے لگے۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا تو اسے اب کسی اور رشتے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ بات اسے جلد ہی سمجھ آ گئی تھی۔

ثعلب اسے گھر چھوڑ کر خود بچوں کو اسکول لینے چلا گیا تھا۔ کیونکہ یہ بھی اس نے وعدہ کیا تھا کہ آج وہ انہیں خود اسکول سے پک کرے گا۔ نا تو اسے غیر متوقع طور پر دیکھ کر خیران رہ گئی تھیں۔ مٹی نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا وہ آج واپس آ رہی ہے۔ دانیہ سیدھی ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

”السلام علیکم یا نو۔“ محبت احترام، اپنائیت بھی کچھ اس کے کچھ سے عیاں تھے۔ وہ ان کے

”ہاں کیوں نہیں۔۔۔ اگر یہ میرا باڈی گارڈ لے آیا تو۔۔۔“ انہوں نے منہ بتائے کھڑے نواسے کو دھپ لگائی تو وہ جلے بھنے انداز میں بولا۔

”اتنی عزت افزائی کی ضرورت نہیں ہے نا تو۔ صاف کہیں یہ ڈرائیور لے آیا۔“

”باسط۔۔۔!“ انہوں نے نواسے کو سرزنش کی پھر مسکرا کر بولیں۔ ”اکھوتا ہے۔۔۔ چار بہنوں کا بھائی۔۔۔ بڑی ذمے داری ہے میرے بچے پر آپ برا نہیں مانتا۔“

”آئی انڈر اسٹینڈ۔۔۔ اکھوتوں پر واقعی بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔ اوکے۔۔۔ ہم چلتے ہیں۔ بچوں کو اسکول سے پک کر رہا ہے۔“ ثعلب نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے معذرت کی۔۔۔ دونوں الوداعی سلام کر کے بیٹھے تو ثعلب نے خاصی سنجیدگی سے پوچھا۔

”ان خاتون کو تم پہلے سے جانتی ہو؟“

”نہ۔۔۔ نہیں کیوں۔۔۔؟“ دانیہ نے اپنا بیگ اپنے پہلو میں لگایا۔

”تو وہ اتنی فریگ کیوں ہو رہی تھیں؟“ ثعلب کی سنجیدگی میں ایسی بات ضرور تھی جو دانیہ کو چونکا گئی۔

”وہ۔۔۔ آج ہی تو پلین میں۔۔۔ ملاقات ہوئی ہے۔ ایکچو نیلی میں کچھ اپ سیٹ تھی تو انہوں نے مجھے کافی مورل سپورٹ دی۔۔۔ اپنی بھی باتیں کیں۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔۔۔“

”یار۔۔۔ تم اتنی بے وقوف ہو تو نہیں۔۔۔ اپنا ایڈریس، اپنا نمبر تک انکس دے دیا؟ جانتی نہیں ہو، دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔“ ثعلب نے ڈرائیونگ کرتے کرتے اسے اسی ٹون میں سمجھانے کی کوشش کی تو دانیہ مزید حیران ہوئی۔ مٹی پہلی بار اتنا سنجیدہ ہوا تھا۔

”وہ اچھی خاتون ہیں۔ اچھی فیملی سے تعلق لگ رہا تھا ان کا۔ آپ نے دیکھا تھا کہ۔۔۔“

”ہر کسی پر ٹرسٹ نہیں کرتے میری جان۔۔۔ اوکے چھوڑو اور مجھے بتاؤ تم اپ سیٹ کیوں تھیں۔ پیپو کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں تھی کیا۔۔۔؟“ مٹی نے

سامنے جھکی کھڑی تھی۔

”علیکم اسلام۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ یوں اچانک۔۔۔۔۔؟“

”آپ کو انہوں نے بتایا نہیں۔۔۔۔۔؟“

وانیہ کو تانوک حیرت مسکرانے پر مجبور کر گئی۔ عی نے یقیناً انہیں بے خبر رکھا تھا۔

”یہ لڑکا بھی من موعی ہے۔ ہمیں بتا دو۔۔۔۔۔“

تصہیں بھی وہاں سکون نہیں لینے دیا۔۔۔۔۔ خود بھی یہاں منہ بسورے رہا ہے۔ ایک وقت بھی کچھ ڈھنگ سے کھایا ہو۔۔۔۔۔ آنے دو ذرا۔۔۔۔۔ بچی چاروں کو میکے چلی گئی تھی تو رہ لینے دیتا۔“

”تاناو آپ انہیں کچھ مت کہیے گا۔ میں اپنی مرضی سے اپنے گھر میں آئی ہوں۔ وہاں زیادہ دن رہ کر کیا کرتی۔۔۔۔۔ پھوپا کافی بہتر ہیں۔“

”پھر بھی بیٹا تمہاری پھوپا کیا سوچتی ہوں گی کہ۔۔۔۔۔“ تانو نے رواداری سے کہا تو وہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی شرمندگی دور کرنے لگی۔

”انہیں معلوم ہے میرا دل اپنے گھر کے علاوہ نہیں لگتا۔۔۔۔۔ آپ ٹیشن نہ لیں۔۔۔۔۔ یہ بتائیں آپ کی طبیعت تو ٹھیک رہی؟“

”شکر ہے بیٹا میں بھی ٹھیک رہی۔۔۔۔۔ اور تم جیسی بیماری بچی کے ساتھ رہنے کے لیے ٹھیک رہتے کودل چاہتا ہے۔ اللہ میرے بچوں کی خوشیاں سلامت رہیں۔“ تانو کی پُرزم آنکھوں میں اس کے لیے وہ جذبے وہ دعائیں تھیں جو دنیا بھر کے خزانوں کے عوض بھی نہیں مل پاتے۔ وانیہ نے انہیں مسنون نظروں سے دیکھا۔۔۔۔۔ اسی لمحے ہنسی بوا بھی۔۔۔۔۔ ”آمین“ کہتی اندر داخل ہوئیں۔

”شکر ہے بیٹا تم آگئیں۔۔۔۔۔ ورنہ بچوں نے تو میرا۔۔۔۔۔ ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اب اسکول سے آنے والے ہیں اور سمجھ نہیں آرہی کیا بناؤں؟“

”آپ چلیں۔۔۔۔۔ میں آکر ان کے لیے نوڈلز بنا لیتی ہوں۔ آپ روٹیاں بنا لیں۔ ٹھیک بچوں کو لینے

گئے ہیں وہ بھی آج گھر پر پہنچ کریں گے۔“ وانیہ انہیں کہہ کر ان کے پیچھے ہی نکل گئی۔ تانو جان اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ ان کے لبوں پر اس کے لیے دعائیں ہی دعائیں تھیں۔ بچے گھر میں آئے تو وانیہ فوراً کچن سے نکل کر دروازے میں چلی آئی۔ بچے اسے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئے پھر ایک دم چلا تے ہوئے اس کی طرف لپکے۔

”ہر۔۔۔۔۔ رے۔۔۔۔۔ ہماری چاچی آگئیں۔ چاچو، چاچی آگئیں۔ آہ۔۔۔۔۔ اب مزہ آئے گا۔“ دونوں ہی آکر اس سے لپٹ گئے۔ وانیہ نے جھک کر دونوں کو اپنے دائیں بائیں پہلوؤں میں سیٹ کر پہلے چوما پھر قدرے غفلت سے بولی۔

”یہ کیا۔۔۔۔۔؟ پہلے آکر سلام کرتے ہیں ناں۔۔۔۔۔“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر اس کی جانب دیکھا۔ چاچی کی ناراضی سے دونوں ہی ڈرتے تھے فوراً ایک زبان ہو کر بولے۔

”سوری چاچی السلام۔۔۔۔۔ علیکم۔۔۔۔۔“

”علیکم اسلام۔۔۔۔۔ چلو اب جلدی سے پہنچ کر نے چلو۔۔۔۔۔ پھر آکر کھانا کھاتے ہیں۔“

”ہاں بھئی جلدی سے آؤ، مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے۔“ ٹعلب نے اندر آتے ہوئے کہا۔ وانیہ تائیداً مسکرا کر دیکھتی بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی جبکہ عی بھی فریش ہونے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

”میرے جانے کے بعد تم دونوں نے چاچو کو بھی تنگ کیا اور ہنسی بوا کو بھی۔۔۔۔۔؟“ گولڈی کی شرٹ اتار کر پہناتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا تو گولڈی بڑی معصومیت سے بولی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ چاچی۔۔۔۔۔ ہم نے تو تنگ نہیں کیا۔۔۔۔۔ بے ناں سنی۔۔۔۔۔“

”جھوٹ بولنا بری بات ہے۔۔۔۔۔ پتا ہے ناں جھوٹ بولنے والے بچوں کی زبان کالی ہو جاتی ہے اور منہ سے بیز اسمیل بھی آنے لگتی ہے۔“ وانیہ نے بڑی

کے دل میں جذبات مزید گہرے ہو گئے تھے۔ دو دن کی دوری نے اس کی اہمیت کا احساس تو پہلے ہی دل دیا تھا۔ وہ گھر میں بھی تو ہر شے میں اس کی جھٹک نظر آتی تھی۔ وہ گئی تو سب کچھ ادھورا، بھرا، بے قرار محسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

رات کو وہ اس سے تجدد پر عہدِ محبت کر رہا تھا۔ وانیہ اس کے پہلو میں نیم دراز اس کی محبت کی جدت سے نئی توانائی پاتی خود کو مزید مضبوط محسوس کر رہی تھی۔

”نیا..... تمہارے جانے کے بعد میں نے جس طرح دو دن گزارے ہیں، اس کا اندازہ صرف تم ہی لگا سکتی ہو۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا کچھ گم ہو گیا ہے۔ سب کچھ تھا مگر تمہاری کمی پلیرز آئندہ، مجھے چھوڑ کر مت جانا..... درنہ.....“

”آپ تو ایسے بے قرار ہو رہے تھے جیسے میں ہمیشہ کے لیے آپ کو چھوڑ کر چلی گئی ہوں.....“

”شٹ اپ.....“ وانیہ کی مسکراہٹ سے واضح تھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے مگر مٹی کی سنجیدگی نے اسے حیران کر دیا تھا۔

”آئندہ مذاق میں بھی مت کہنا یہ بات.....“

اب بچھ میں کسی کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے..... پلیرز ایسا مت کہنا.....“ ثعلب شدتِ جذبات میں بولتے ہوئے اس کے ہاتھ اپنی گرفت میں لیے وانیہ کو مزید حیران کر رہا تھا۔ ”یو لو.....“ سب کہتے تھے شادی کے بعد اپنی بیوی سے ہونے والی محبت بچی اور کھری ہوتی ہے۔ میں نہیں مانتا تھا..... مگر.....“

”ر..... و..... مانہ کی وجہ سے.....؟ میرا..... مطلب.....“ وانیہ کو نہ جانے کیسے رومانہ کا خیال آ گیا تھا اور وہ بے ساختہ کہہ بھی گئی تھی۔ ثعلب ایک دم ایسے چونکا تھا جیسے کسی نے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔

”وہاٹ..... کیا مطلب سے یہاں اس کا کیا ذکر.....؟“ مٹی کے تاثرات فوراً بدل گئے تھے۔ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ وانیہ سے بات کرنا مشکل ہو گئی۔ اسے

نری سے سرزنش کی۔

”چاچی..... گولڈی نے سب کو بہت تنگ کیا۔ میری چاکلیٹ بھی کھائی تھی اور میری اسٹوری بک پر لائنز بھی لگا دی تھیں۔“ سنی بڑی چالاکی سے بولتا سامنے آیا۔ اس کی شکایت پر گولڈی کھلی۔

”چاچی سنی نے بھی میرا ڈول ہاؤس توڑ دیا.....“

چاچو نے پراس کیا ہے۔ وہ مجھے نیا اور بڑا ڈول ہاؤس لے کر دیں گے۔“

”جھوٹی ہوتی.....؟“ سنی تقریباً چیخا۔

”تم جھوٹے ہو..... ڈرلی ہوئے ہو.....“ چاچی تمہیں کچھ نہیں لے کر دیں گی۔ چاچو بھی نہیں لے کر دیں گے۔“ وانیہ نے دونوں کو پہلے حیرت سے دیکھا پھر تقریباً خفگی و غصے سے بولی۔

”تم دونوں کو ہی اب کچھ نہیں ملے گا..... اس لیے کہ تم دونوں میری بات نہیں مانتے ہو..... تم دونوں نے مجھ سے پراس کیا تھا کہ دونوں کبھی نہیں لڑو گے مگر..... اوکے اگر تم دونوں کو لڑنا ہے تو میں واپس چل جاؤں گی اپنی پھوپھو کے پاس۔“

”چاچی..... آپ نہیں جائیں ناں..... ہم نہیں لڑیں گے۔“ دونوں ہی ایک دم سہم سے گئے تھے۔

چاچی انہیں چھوڑ کر جائیں یہ انہیں منظور نہیں تھا۔ سنی فوراً ہی اس کے کندھے پر آکر جھول گیا۔ اس کا منانے کا یہی انتہا تھا۔

”سوری..... میں بھی نہیں لڑوں گی۔ پلیرز چاچی.....“ گولڈی نے معصومیت سے کہتے اپنے کان پکڑ لیے تو وانیہ کو بے اختیار اس پر پیار آیا۔ خود سے چمٹاتے ہوئے بڑی محبت سے بولی۔

”اوکے..... اگر آپ دونوں اب نہیں لڑے تو میں نہیں جاؤں گی..... اور جس نے اب اپنا پراس توڑا تو میں اس سے بات نہیں کروں گی۔“ وانیہ نے دونوں کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا یا تو دونوں نے ہی وعدہ کر لیا۔ درمیانی دروازے سے جھانکتے ثعلب نے خاصی دلچسپی سے سارا منظر دیکھا۔ وانیہ کے لیے اس



احساس ہو گیا تھا کہ وہ نادانستگی میں اس کے جذبات کو نہیں لگا بیٹھی ہے۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم مجھ سے یہ بات کہو گی۔“ وانیہ کے چہرے پر شرمندگی، خجالت، سبے کی سبکی کچھ تھا۔

”ہم..... میں شرمندہ ہوں..... واقعی میں اس طرح بات نہیں کرنا چاہتی تھی..... وہ تو بس اچانک۔“

”اچانک.....؟ اچانک تم نے مجھے احساس دلادیا کہ تمہارے دل میں میرے لیے کتنی بدگمانی اور شک ہے اب تک..... میں نے کب سے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں اور.....“ وانیہ نے اس کے ہوتنوں پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

”کہہ رہی ہوں ناں مجھ سے غلطی ہو گئی میں آپ سے بدگمان ہوں نہ ہی میرے ذہن و دل میں کسی قسم کا شک ہے..... میرا تو اس بات پر ایمان پختہ ہے کہ اصل محبت تو شادی کے بعد ہی ظاہر ہوتی ہے..... اور آپ کی محبت بھی صرف میرے لیے ہے..... پلیز میری پہلی غلطی سمجھ کر معاف کر دیں۔“

بولتے بولتے وانیہ کی آنکھیں چھٹک پڑیں، ثعلب کو بھی احساس تھا کہ اس نے جان بوجھ کر نہیں کہا تھا۔

”جرمانہ دینا پڑے گا۔“ کچھ توقف کے بعد اس کا موڈ ذرا بدل گیا تھا۔

”ج.....ی.....؟“

”نیکسٹ ویک اینڈ پر نہیں میرے ساتھ ایک پارٹی میں چلنا پڑے گا..... میرے سارے فرینڈز تم سے ملنا چاہ رہے ہیں۔“

”مگر..... میں بچے..... بھی ساتھ ہوں گے ناں.....؟“ وہ ڈرتے، ڈرتے پوچھ رہی تھی کیونکہ بچے اس کے ساتھ جانے کی ضد کرتے تھے اور اسے انہیں چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

”نو..... ناٹ ایٹ آل..... صرف ہم دونوں..... اور تمہیں میری چوٹس پر ڈریس اپ ہونا پڑے گا۔“ بچوں کو بھی خود ہی ہنڈل کرنا ہو گا..... کہو

منظور ہے؟ ورنہ پھر میں ناراض ہوں تم سے۔“ ثعلب نے بچوں کی طرح اس کی طرف سے رخ موڑا تو وہ بے بسی سے فوراً ہائی بھر بیٹھی۔

”مجھے منظور ہے، آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں..... آپ جیسا کہیں گے میں ڈریس اپ بھی ہو جاؤں گی پلیز.....“ وانیہ نے اس کے سامنے ہو کر ہاتھ جوڑے تو ثعلب بے اختیار ہو کر قہقہہ لگا اٹھا۔ اور اس کے ہاتھ گرفت میں لے کر ہنستے، ہنستے بولا۔

”یار دیکھا کیسے تمہیں نریپ کیا ہے..... ورنہ کیا تم مان لیتی میری بات..... ہر بار بہانہ ہر بار بہانہ.....“

”خیر..... بہانہ تو نہیں کرتی میں..... آپ جانتے ہیں..... بچے میرے پتار رہتے نہیں ہیں اور انہیں چھوڑ کر جانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ وانیہ نے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے نکال کر چہرے پر آئی لٹ کو ہٹایا تو ثعلب شرارتی ہوا۔

”رہ تو میں بھی نہیں سکتا تمہارے پتا..... پھر مجھے کیوں چھوڑ کر گئی تھیں۔“

”اب نہیں جاؤں گی.....“ ممی اس کی طرف جھکا تو وہ جھینپ کر بولی۔

”اور میں جانے بھی نہیں دوں گا۔“ وہ مزید رو میٹھک ہوا..... وانیہ کو اور کیا چاہیے تھا..... وہ خود بھی کب اس کی محبت کے دائرے سے باہر جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

زندگی کے معمولات میں وانیہ کے ذہن و دل سے جلد ہی بڑی امی کی باتیں تقریباً محو ہو گئی تھیں۔ بچوں کے ساتھ ان کی شرارتوں میں ان کا ساتھ دینا..... عصی کو چھوٹی بہنوں کی طرح روزمرہ کی باتوں میں زندگی کے اتار چڑھاؤ پر صبر و قناعت کا سبق پڑھانا..... مانو کی خدمت گزاری میں راحت و سکون پانا..... جیسے اس کی زندگی کا مقصد بن گیا تھا۔ خصوصاً ثعلب کے آرام و سکون اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا تو اس کا نصب العین تھا، ممی آدمی رات کو بھی کوئی فرمائش کرتا تو وہ اپنی نیند، اپنا آرام قربان کر کے اس

کے کمرے میں آگئی۔ اس کی عجیب سی طبیعت ہو رہی تھی۔ ماما نے اسے تیار رہنے کے لیے کہا تھا جبکہ وہ سرے سے جانتی نہیں چاہ رہی تھی۔

”نانو..... آپ سے ایک بات کہوں.....؟“  
چائے کا کپ ایک طرف رکھ کر وہ ان کے قدموں میں وکیل چیر کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”ہاں، ہاں ہو میرے بچے..... میری جان..... کیا بات ہے؟“ نانو نے بڑی نرمی و شفقت سے اسے پچکارا تو وہ سر اٹھا کر کچھ گفتگو میں بولی۔

”نانو..... وہ دراصل میں آج پارٹی میں جانا نہیں چاہتی..... پلیز آپ مجھے روک لیں..... میرا بالکل بھی دلی نہیں چاہ رہا۔“

”تو تم اس سے خود کہہ دو..... وہ زبردستی تھوڑی کرے گا۔“ نانو نے ذرا الجھن سے اس کی طرف دیکھا..... وہ صبح سے ہی تھکی تھکی سی نظر آ رہی تھی۔

”نانو آپ کو چاہتا تو ہے ان کا.....“  
”نہ جانے کی کوئی وجہ ہے؟“ انہوں نے پاس بیٹھی وانیہ کے کھڑے بال ہاتھ سے سنوارے۔

”بس کہیں بھی جانے کو جی نہیں چاہ رہا..... گھر پر رہنا چاہ رہی ہوں۔“  
”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری.....؟“ انہوں نے خاصی تشویش سے اسے دیکھا بھی اور پوچھا بھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں..... میں ٹھیک ہوں، بس یونہی.....“

”بیٹا جب طبیعت ٹھیک ہے تو پھر چلی جاؤ..... ویسے بھی تم لوگوں کو تنہا کہیں جانے کا موقع ہی کب ملتا ہے، اس کے دوست نے پوچھ کر بلایا ہے اب نہیں جاؤ گی تو کیا سوچے گا..... وہ سمجھے گا کہ تم دونوں میں کوئی ان بن رہی ہے جو تم کہیں بھی جانے سے انکار کر دیتی ہو۔“ نانو نے کافی رسائی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ایسا کیوں سمجھے گا کوئی..... میں بیمار بھی تو ہو سکتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر کاؤچ پر جا بیٹھی۔

کی خواہش پوری کرنے پر کمر بستہ ہو جاتی۔

دیکھ اینڈ تھا، ٹھلب آفس جانے سے پہلے اسے یاد دل رہا تھا۔

”یاد ہے ناں آج حسن (دوست) کی طرف پارٹی میں جانا ہے۔“ ماما اپنی ٹائی کی ٹاٹ سیدھی کرنا اس کی طرف پلٹا تو کمالی اداکاری سے انجان بن کر بولی۔

”اچھا..... آج جانا ہے..... میں بھی ٹیکسٹ دیکھ اینڈ پر.....“ ماما نے اسے مزید بولنے سے پہلے ٹوکا۔

”بس..... نو ایکٹنگ..... میں مان ہی نہیں سکتا کہ تمہیں یاد نہ رہا ہو کہ آج جانا ہے..... میں نے تمہارے لیے جو ساڑی لی تھی آج وہی پہنی ہے، اوکے؟“ ٹھلب نے اس کے چہرے پر پھیلی مصنوعی بیزاری کا ذرا بھی ٹوٹس نہیں لیا۔

”آج میرا سوڈ نہیں ہے ساڑی پہننے کا..... میں کوئی شلوار سوٹ پہنوں گی۔“ وانیہ نے اس کا تو لیا وغیرہ بیڈ سے اٹھاتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”ہرگز نہیں..... میں کہہ رہا ہوں ساڑی پہنی ہے تو ساڑی پہنی ہے بس..... اور میرے آنے سے پہلے ریڈی رہنا..... چلو اب میرے لیے ناشتا بناؤ.....“

ٹھلب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لے جاتے ہوئے کچھ دھوٹس سے کہا..... تو وانیہ مصنوعی خفگی سے اسے دیکھ کر بولی۔

”اب ہر معاملے میں آپ کی مرضی نہیں چلے گی۔“ ماما نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔ اسی لمحے شہنی بوا کچن سے نکل کر آئیں۔

”بیٹا..... سب کے لیے چائے تو تم ہی بناؤ..... ورنہ میاں کل کی طرح چائے سے بغیر چلے جائیں گے۔“

”ہاں تو بوا جی آپ بھی تو چائے میں جو شائدہ ملا دیتی ہیں جیسے.....“ بوا اور ماما کی نوک جھوک جاری تھی۔ وانیہ انہیں وہیں چھوڑ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

بچے ٹیوٹر سے پڑھ رہے تھے..... وانیہ معمول کے کام نمٹا کر اپنے اور نانو کے لیے چائے بنا کر ان

”اللہ نہ کرے..... جو تم پر پڑو.....“ مانو نے بے ساختہ اسے ٹوکا۔

”سمجھنے میں کیا حرج ہے مانو.....“

”بس میرے بچے..... بری بات منہ سے نہیں نکالتے..... تم تو روتی ہو ہمارے گھر کی..... تمہاری وجہ سے تو ہمیں زندگی کا احساس ملتا ہے۔“

”مانو..... آپ کو نہیں پتا..... کتنا بوری ہوتی ہوں میں پارٹیز میں جا کے..... نہ مجھے فیشن کا پتا ہے، نہ مجھے جیولری ڈیزائن پر باتیں کرنا آتی ہیں۔“

”تو بیٹا سیکھو ناں تم بھی دنیا داری کے تقاضے..... ویسے بھی دانیہ بچے..... تم مٹی کو سمیٹ رہی ہو..... ابھی سے اس سے پہلو بچاؤ گی تو وہ بکھر سکتا ہے، بھٹک سکتا ہے اسے اپنی گرفت سے نکلنے مت دو..... مرد

کو بیزاری نہیں دکھاتے، یہ میرا تمہیں مخلصانہ مشورہ ہے۔“ مانو اور بھی مفید مشوروں سے اسے نوازا رہی تھیں اور دانیہ بڑی سعادت مندی سے سننے میں مصروف تھی۔

”جیجی اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ وہ تو عرصی نے کمرے میں جھانک کر اسے احساس دلایا۔

”بھابی، بھالی آگے ہیں۔ آپ کا پوچھ رہے ہیں۔“

”اتنی جلد ی.....؟“ دانیہ کی نگاہ دیوار گیر گھڑی پر گئی..... اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتی..... مٹی خود ہی مانو کے کمرے میں چلا آیا۔

”السلام علیکم..... تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟“ اسے کھڑے دیکھ کر مٹی نے ذرا غصے سے پوچھا۔

”بس جارہی ہوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

”ناؤم دیکھو..... تمہاری تیاری میں بھی دیر لگے گی۔“

”صرف ساڑھے چھ..... اور وہاں نو بجے سے پہلے کوئی نہیں پہنچے گا..... میں چندرہ منٹ میں تیار ہو جاتی ہوں۔ آپ تب تک چائے پی لیں میں بھجواتی ہوں۔“ وہ اس کا غصہ ٹھنڈا کرتے کے لیے نورانگل مٹی۔ وہ جھنجھلا تا ہوا مانو کے سامنے آ بیٹھا۔

”دیکھ لیں آپ اپنی لاؤلی کے غرے..... صبح کہہ کر گیا تھا کہ میرے آنے سے پہلے تیار رہنا..... مگر

نہیں..... اپنی مرضی چلائیں گی محترمہ.....“ ثعلب نے اپنی بجز اس نکالی تو مانو نے جھٹ اس کا دفاع کیا۔

”تیار ہونے تو گئی ہے، غصہ کیوں کرتے ہو..... صبح تو کہہ رہی ہے اتنی جلدی کون پہنچے گا..... شکر کرو وہ جارہی ہے حالانکہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کچھ..... سستی ہے کل سے۔“

”آپ کو بتا دیا اس نے..... کوئی طبیعت و بیعت خراب نہیں ہے، آپ نہیں جانتیں ساری لڑائی و اسٹ

ساڑی کی ہے..... کہتی ہے ساڑی نہیں..... سوٹ پہنے گی۔“ ثعلب واقعی جھنجھلایا ہوا تھا۔ مانو نے اسے تعجب سے دیکھا۔

”تم دونوں میں لڑائی ہوئی ہے؟ اور اس نے مجھے بتایا ہی نہیں..... مٹی تم ہمیشہ اپنی منواتے ہو..... کبھی اس کی مرضی کا بھی خیال کیا کرو..... اس کی بھی کوئی پسند ہوگی۔“ انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی..... وہ مزید جھنجھلایا۔

”تو پہن لے وہ سوٹ، کر لے اپنی مرضی..... میں کیا کہہ رہا ہوں..... آپ ہمیشہ اسی کی سائنڈ لیں گی..... دیکھتا ہوں جا کر کتنی تیاری رہ گئی ہے۔“ وہ

جانے لگا تو مانو اس کے بچکانہ رویے پر مسکرا دیں۔

”اب اس کے سر پر جا کے سوار مت ہو جانا کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں..... بات سنو جانے سے پہلے مجھے مل کر جانا، میں بھی تو دیکھوں اس سفید

ساڑی میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم میری بیٹی سے اچھ پڑے ہو۔“

”میری لائی ہوئی ساڑی میں کوئی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ ساری خصوصیات تو آپ کی بیٹی میں ہیں۔“ وہ بچوں کی طرح روٹھ کر چلا گیا تو مانو مسکرا دیں۔ چانچ تھیں اس کی ناراضی چند لمحوں کی ہوگی۔ دانیہ خود اس کے لیے چائے بنا کر لائی تو مانو نے اسے کمرے میں جانے کے لیے کہا۔

”اُف..... آج میری خیر نہیں ہے۔“ وہ وہاں سے کمرے کی طرف آئی شکر کیا سنی، گولڈی اس سے

258



سے پر اس کر لیا تھا۔ اس لیے ہمیں جانا ہے۔“  
 ”تو آپ ہم سے بھی پر اس کریں۔ آپ ہم کو بھی کل لے کر جائیں گے۔“ گولڈی نے اسے بڑی معصومیت مگر چالاکی سے گھیرا تو مٹی قہقہہ لگا اٹھا۔

”ہونہ۔۔۔ تو اصل چکر یہ تھا۔۔۔ او کے میری جان۔۔۔ ہم سب کل چلیں گے۔ مگر ابھی تو ہمیں تیار ہو کر جانے دو۔۔۔ جاؤ آپ دونوں جا کر کھیلو۔۔۔ ہم جلدی گھر آ جائیں گے۔“ مٹی نے دونوں کو باری باری چوم کر لپٹایا۔ دونوں چسے گئے تو ثعلب انھہ کر ڈریسنگ روم میں آ گیا۔ وانیہ ڈریسنگ روم میں نصب آئینے کے سامنے کھڑی اپنے گھٹنوں تک لمبے بالوں کو سمجھانے میں مصروف تھی۔

”کیوں مجھے تنگ کر رہی ہو۔“ مٹی اس کے پاس جا کر اس کے بالوں کی ایک مٹ مٹھی میں لے کر کھینچتے ہوئے بولا۔

”آؤ۔۔۔ میں آپ کو کب تنگ کر رہی ہوں۔ چھوڑیں ناں۔۔۔ اسے درد ہوتا۔۔۔ مت کھینچیں۔“

”صبح سے منہ بنا کر پھر رہی ہو۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کر رہی ہو۔“ مٹی نے آئینے میں دیکھتے ہوئے ذرا فحشی سے پھر اس کے بال جھٹکے۔ وہ اس کے جھوٹ پر حیران ہوئی۔

”میں۔۔۔ ہاں۔۔۔ نہیں تو؟ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ پیڑ میرے بال نوٹ رہے ہیں۔“ وانیہ نے کراہتے ہوئے بال چھڑانے کی کوشش کی مگر مٹی کے ارادے کچھ اور تھے۔ اس کے مزید قریب ہو کر اپنے ہاتھ پر اس کے بال پینتے ہوئے ایک دم سوڈ بدل کر بولا۔ ”جب میں نے ہاتھ کہ تیار رہنا تو۔۔۔ سوچا تھا تمہیں تیار دیکھ کر ساری ٹھکن اتر جائے گی مگر تم۔۔۔ آج ارادے کیا ہیں؟“

”ارادے تو آپ کے خطرناک نظر آرہے ہیں۔ میرے بالوں کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔۔۔ پارٹی میں جانا بھی ہے یا۔۔۔ نہیں۔“

”جانا ہے۔ جانا ہے مگر پہلے بتاؤ کیا پہنوں گی۔“

پہلے کمرے میں جا رہے تھے اسے ذرا تسلی ہوئی ثعلب ان کے سامنے فحشی نہیں دکھا سکتا تھا۔ اسے دروازے سے اندر آتے دیکھ کر وہ قدرے برہمی سے بولا۔  
 ”تم۔۔۔! میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم ڈریسنگ روم میں ہو؟“

”اتنی جلدی کس بات کی ہے۔۔۔ ابھی آپ کو بھی تو فریش ہونا ہے۔ گرم، گرم چائے پیئیں اور فریش ہو جائیں، میں بھی بس ابھی آئی۔“ اسے کپ تھما کر اس نے چٹکی بھائی اور فوراً ہی ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ پشت پر مٹی کی گھورتی نگاہیں تھیں۔۔۔ سنی اور گولڈی نے فوراً اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”چاچو! آپ چاچی کو لے کر کہاں جا رہے ہیں۔“ گولڈی نے بڑے رعب سے پوچھا تو چائے کے گھونٹ بھرتے ثعلب نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

”اپنے دوست کے گھر پارٹی میں، حسن انکل ہیں ناں ان کے گھر۔“ بات کرتے ہوئے مٹی نے اسے ایک بازو میں سمیٹا۔

”انہوں نے ہمیں نمک بڈیا۔“ اس کی معصومیت میں بھی بڑی سنجیدگی سی تھی۔

”نہیں۔۔۔ میری لعل فیری۔ حسن انکل نے مجھے اور تمہاری چاچی کو ہی بلایا ہے۔“ مٹی نے کپ سامنے فیمل پر رکھتے ہوئے اسے اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر اس کی پیشانی پر بکھرے بال ہٹا کر محبت سے چوما تو سنی کو جلن سی ہوئی۔

”چاچو۔۔۔ یہ گولڈی کہہ رہی تھی، چاچو کے دوست بہت گندے ہیں۔ ہم بچوں کو پارٹی میں لے نہیں بلائے۔“ اس بار گولڈی انھنے کے بجائے تائید آہولی۔  
 ”ہاں، وہاں کتنے بڑے ہیں حسن انکل۔ ان کے بچے بھی تو ہمارے گھر آتے ہیں، ہمیں کیوں نہیں بلایا۔“

”بڑی بات ہے سنی، گولڈی۔ بڑوں کو ایسا نہیں کہتے۔ آپ کو اچھا نہیں لگتا ناں کہ میں آپ کی چاچی کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں تو ٹھیک ہے آئندہ نہیں لے کر جاؤں گا مگر آج تو چاچو نے اپنے فرینڈز

مھی نے آخر اس کے ہاں جھنکا دے کر چھوڑ دیے۔  
وانیہ بھی اس سے چند قدم دور پہنچے ہوئے آنکھوں میں  
شرارت بھرے ہوئی۔ "بتا تو دیا تھا۔۔۔ اب تو رابا ہر  
لکھیں اور مجھے تیار ہونے دیں۔۔۔" وانیہ نے میٹر  
اسٹینڈ سے اس کا رائل بلیوڈ نرسوٹ اتار کر اسے تھمتے  
ہوئے مڑید اسے تپایا۔

"آئی تھنک آپ بھی پیسج کر رہی ہیں۔ اب یہ  
اچھا تو نہیں لگے گا کہ میں بنی سنوری چوں اور آپ اس  
باسی تاجی چلیے میں۔" وانیہ کی شوخی پر وہ میٹر لے  
ایسے خفگی سے حور تا باہر نکل گیا۔ صرف بیس منٹ میں  
وہ مکمل تیار ہو کر ڈریسنگ روم سے باہر آئی تو غضب خفگی کا  
اظہار لیے اسی طرح آفس ڈریس میں آنکھیں بند کیے  
دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر ایڑی پر نیم دراز تھا۔

"ار۔۔۔" رے آپ ایسے ہی بیٹھے ہیں اب تک  
اور مجھے ڈرا رکھا تھا۔" وہ بوٹی، بوٹی قریب چلی آئی۔  
دُفرب مہک غضب کی سانسوں کو مہکا گئی۔ اس نے  
آنکھیں کھول کر دیکھا تو مہوت رہ گیا۔ وانیہ اس کی  
پسند کردہ سفید شیٹون سلک کی ساری میں بیویں اس پر  
بکھیاں گرا رہی تھیں۔ ساری پر بنا کام اسے لا جواب کر گیا  
تھا اور مزید لا جواب وانیہ نے زریب تن کر کے کر دیا  
تھا۔ لگتا تھا یہ ساری اس کے متناسب جسم اور لائے قد  
کے لیے بنی تھی۔ پرل کی جیولری اس کے حسن کو مزید  
لکھا دیکھ گئی تھی۔ غضب کے یک نکل دیکھنے پر اس کی  
آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرا کر قدرے جھینپ کر اس کی  
محویت توڑی۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں۔ کب سے شور مچا  
رہے تھے، اب خود ایسے ہی بیٹھے ہیں۔ اب دیر نہیں  
ہو رہی؟" غضب کے تاثرات یک دم خوشگوار ہو گئے  
تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیوٹی فُل، ایکسیلنٹ، میرے تصور سے بھی  
زیادہ حسین لگ رہی ہو۔ کیا خیال ہے، حسن کو منع  
کر دوں؟" اس کی نظروں میں وارفتگی اور سنج  
میں شرارت تھی۔

"جی نہیں۔ اب آپ کی کوئی بات نہیں مان  
سکتی۔ جلدی پہنچ کریں، تب تک میں عاص سے  
بالوں میں گھرے گلوالوں۔" وہ جانے کے لیے مڑی۔  
"فلز کرنے کے پورے انتظام کرو گی آج۔"  
غضب نے مڑ کر جاتی وانیہ کے کھٹے بالوں کو پھر سے  
گرفت میں لیا۔ وہ سامنے سے بالوں کو اٹھا کر کھپ لگا  
کر باقی بالوں کو کھلا چھوڑے ہوئے تھی۔

"یہ آج آپ میرے بالوں کے پیچھے کیوں پڑ  
گئے ہیں؟" غضب نے اسے کھینچ کر اپنے قریب کیا۔  
"تم تو اپنی پسند سے کپڑے پہننے والی تھیں  
پھر ارادہ اتنی جلدی کیسے بدل دیا۔"

"کیا کرتی۔ آپ کا مر جھایا منہ دیکھا نہیں  
جدا ہوا تھا، یہی سوچا کہ میرے علاوہ آپ کی پسند پوری  
کون کر سکتا ہے۔ ایک ہی تو یہی ہوں آپ کی۔"  
وانیہ کی شوخ دانے مھی کو بھی محظوظ کیا۔

"تم اجازت دو تو۔ میری مرضی پوری کرنے  
کے لیے دوسری بھی آسکتی ہے۔"

"کہ۔ کیا؟" وہ ایک دم اس کے  
سامنے ہوئی۔ "میں مگر بھی اجازت نہیں دوں گی۔  
ایسا سوچنے کا بھی مت ورنہ قتل کر دوں گی دوسری  
کو۔" وانیہ بھی اس کی شرارت سمجھ گئی تھی۔ اس کے  
اس طرح بگڑنے پر غضب بے اختیار رقبہ لگا اٹھا۔

"آج معلوم ہوا کہ میرے لیے کتنی پوزیشن ہو  
تھیں۔ اپنی بات منوانے کا گرا آ گیا ہے مجھے۔"

"آپ کھڑے باتیں کرتے رہیں گے یا تیار بھی  
ہوں گے ورنہ پھر میں بھی پیسج کر لوں۔" وانیہ نے  
اسے دھمکایا تو وہ فوراً بولا۔

"نہ۔ نہ۔ ایسا غضب مت کرنا۔ میں  
بھی بس یوں گیا اور یوں آیا۔" مھی نے ہنستے ہوئے  
چنسی بجاتی۔ "اب تو مجھے بھی شو، شایانی پڑے گی ورنہ  
یار جوگ نیگم صاحبہ کا ملازم بنیں گے۔"

"ایسے ہی۔" وانیہ نے جھینپ کر اسے پیچھے  
کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ (باقی آئندہ)

# سائیکھڑ مبارک

پاکستان بھینس

ایک تو آپ لوگ فوراً غلط اندازے لگا لیتے ہیں۔ اصل بات عام کمانے کی ہی ہوتی ہے باقی تو ایویں۔۔۔ چلیں اب تھوڑا سا تعارف سرگودھا کے لوگوں کا بھی کروادیتے ہیں۔ نہایت اکھر، بد مزاج، خوشامی، جھگڑالو، قویہ گندے پر اعتقاد رکھنے والے۔۔۔ ہر کوئی نہیں یہاں ہماری طرح کے معصوم سیدھے سادے ہیں لوگ۔ یہاں ایک عدد یونیورسٹی کے علاوہ میڈیکل کالج بھی ہے اور اسکولوں کی تو بہتات ہند یوں کہیں کہ اسکولوں اور اسپتالوں کا گڑ ہے سرگودھا۔ یہ تو تھا پاکیزہ سالگرہ کے لیے ہمارے سرگودھا کا تھوڑا سا تذکرہ اب ہمارا ہو جائے تو جناب چار عدد شریں بچوں کی اماں جو اپنی ساری چوکڑی بھول گئی ہے۔ کوانٹیکیشن بی ایس سی ایم اے پو لیٹیکل سائنس + ایل ایل بی ہیں۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ہیں گھر کی عدالت میں بوقت بند ہے۔ بچے موقع ہی نہیں دیتے ہیں مجھ سے زیادہ کراس کو سمجھتے ہیں بچے کرتے ہیں۔ آج کل وزن کم کرنے کے چکر میں بہت بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ اس دوران ملتان کی فیس سے بھی گپ لگاتے ہیں۔ سالگرہ منانے میں تو میں کر بڑی ہوں، نقش بھی لیتی ہوں یہ اور بات کہ صرف ہسینڈ سے گفت لینا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے گفت لینا کیش سے سخت نفرت ہے۔ اپنے بچوں کی بھرپور سالگرہ مناتی ہوں اور انہیں سر پر از گفت بھی دیتی ہوں۔ جس کی برتھ ڈے یاد ہو اسے ضرور دس کرتی ہوں۔

اس بار بھی خزاں میں چتے بکھر گئے ہیں  
انجام لگتا ہے سے ہم لوگ ڈر گئے ہیں

سرگودھا ہماری جہنم بھومی ہے۔ جہاں کے کینو ایکسپورٹ کوالٹی کے ہیں۔ سرگودھا کے اطراف میں کوٹ موئن، بھلوال، جہاں کا کینو خاص شہرت رکھتا ہے۔ سلاٹوالی جوکڑی کے کام کے حوالے سے مشہور ہے۔ خوشاب، جہاں کا ڈھوڑا پورے ملک میں پسند کیا جاتا ہے۔ میانوالی بہت نامور لوگوں کی وجہ سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ اور شاہ پور جہاں کے شیر کمال کے ہوتے ہیں، انانے میں نہیں کھانے میں اور ان



ادب کے حوالے سے اتنی سرگودھا کی زمین بڑی زرخیز ہے، بڑے، بڑے معروف شعرا اس دھرتی سے وابند ہیں جن میں سرفہرست مشہور و معروف شاعرہ سعدیہ ہاشم ہیں (یہ تو خیر مذاق ہے) میرے فیورٹ شکیلہ جلالی، سرگودھا کے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا، احمد نیر، قاسمی، آصف مرزا، ممتاز عارف، وحی شاہ سبھی سرگودھا کے شاہین ہیں۔ جو خوب کما رہے ہیں نام



دل میں ہے کوئی جذبہ نہ ہا چاہتیں ہیں  
دریا چڑھے ہوئے تھے آخر اتر گئے ہیں  
سعد یہ ہاشخ، سرگودھا

☆☆☆

بیاری، بیاری پاکیزہ بہنوں! میرا نام عصمت  
اختر ہے، میں ضلع سرگودھا کی تحصیل کوٹ موہن کے  
نزدیک ایک گاؤں چک 19 جنوبی میں پیدا ہوئی۔  
میرا پیارا گاؤں کینو... اور کینو... کی فیکٹریز کے لیے  
بہت مشہور ہے۔ میں نے ابتدا کی تعلیم گاؤں سے اور  
بی اے کی ڈگری گورنمنٹ گرلز کالج سرگودھا سے  
حاصل کی۔ ہم چھ بہن، بھائی ہیں، میرا نمبر تیسرا ہے۔  
میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سرور چوہدری بچوں کے  
اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہیں۔ جون 75ء میں میری شادی  
اوکاڑہ کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ میرا تعلق پاکیزہ  
سے شادی سے پہلے کا ہے، میں نے اس کا بھی کوئی  
شمارہ من نہیں کیا۔ پاکیزہ میں لکھنے والی ساری  
بہنیں مجھے بہت پسند اور عزیز ہیں۔ انجم انصار اور ذکیہ  
بگرا می سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ ان سے دعاؤں  
کی درخواست ہے۔ میں بہت سادہ مزاج اور سادگی  
پسند ہوں۔ کپڑوں میں شلو اور قمیص، رنگ سفید، کالا اور  
بادامی پسند ہے۔ کوئنگ میں خود کرتی ہوں اور  
سادے، سادے کھانے بناتی ہوں۔ مثلاً ساگ، قیر  
کر لیے، گو بھی گوشت، گز کے چاول بہت پسند ہیں۔  
مجھے اپنے بہن، بھائی اور ان کے بچے بہت پیارے  
ہیں۔ خاص طور پر قاسم، عبداللہ اور حمزہ۔ میری  
بہت سی دعائیں پاکیزہ کے ہر فرد کے لیے... اور  
خاص طور پر معراج رسول اور عذرا رسول۔ انجم  
انصار اور ان کے بال بچوں کے لیے سنا ہے نایاب  
جیلانی بھی میرے گاؤں کی ہیں۔

میرا سلام تمام پاکیزہ بہنوں کو پہنچے

عصمت اختر، اوکاڑہ

☆☆☆

مابدولت کو غبر و سیم کہتے ہیں۔ چونکہ پورا نام  
نہیں لکھ سکتے کہ اپنی بھاری بھر کم شخصیت کی پہچان نہ  
ہو جائے۔ نہیں... نہیں ڈریں مت... ابھی اگر  
پہلوانوں کے شہر سے تعلق ہے تو اس کا یہ مطلب تو  
نہیں کہ ہم بھی ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔  
البتہ کھانا اتنا کھاتے ہیں جتنا کہ معدہ برداشت  
کرے... تعلیمی قابلیت کے کیا کہنے کہ یہ کسی ڈگری  
کی محتاج نہیں... البتہ اتنا ضرور کہتا ہے کہ ابھی طفل  
مکتب ہیں... عبداللہ بن وسیم اور حریم فاطمہ اور نور  
فاطمہ جیسے پیارے، پیارے چنوں منوں کی اماں  
جان ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ بفضل خداوند  
کریم کھاتے میں دریائی، پائے، دبی بڑے، آکس  
کریم بہت پسند ہیں۔ مشاغل میں، مہانی، بک  
ریڈنگ اور بچوں کو ڈانٹنا (کہ آج کل یہ کام بڑے  
زور شور سے جاری ہے جیسے عبد اللہ چوٹ نہ لگ  
جائے، نور فاطمہ سیرھیوں پر نہ چڑھو اور حریم فاطمہ  
ضد مت کرو وغیرہ وغیرہ) پڑھنا، پڑھانا چونکہ  
ہماری فطرت میں شامل ہے اس لیے چاہتے ہیں کہ  
عبداللہ، حریم، سارا دن بس کتابیں سینے سے لگائے  
رکھیں اور ہمارا نام خوب روشن کریں مگر بحال ہے کہ  
آج کل کے بچوں کی... عبداللہ بول دن میں ہے  
اور حریم موسیقی میں... مگر ناک میں دم کر رکھا  
ہے۔ ماما ogy دیکھنے ہیں... ماما کائیٹ بنانی ہے  
اور حریم فاطمہ تو سارا دن بکس اور کاپیاں کلرر اور  
پنسلو سے بھرتی رہتی ہے۔ اسے گزیہ کے ساتھ نہیں  
کھیلنا مگر اپنی بکس پر کلر کرتی رہتی ہے کہ اس میں  
مستقبل کی آرٹسٹ ہونے کے جراثیم پائے جاتے  
ہیں۔ اور نور فاطمہ چونکہ سو سال کی ہے... سارا  
دن ناک میں دم کیے رہتی ہے۔ سادون مجھے بے حد  
انریکٹ کرتا ہے اور بارش میں بھینگنے کو بے تحاشا من  
مچھلنے لگتا ہے۔ بہت حساس ہوں... کمری ایٹو کام  
کرنے کی لگن ہر سورتی ہے۔ شاعری اور آکس کریم

نہ سمیٹ زندگی کی رعنائیاں دلکشیاں شاد  
یہ تو فانی ہے یہ تو فانی ہے  
شبنم کنول، پاپاگری

☆☆☆

میراثہ سمیرا احمد ہے اور تک نیم ایس اصول  
ہے۔ ماشاء اللہ ہم دس بہن بھائی ہیں۔ مابہ دولت کا  
سب سے پہلا نمبر ہے۔ ہم سب بہن بھائیوں میں  
کافی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ امی جان، ابو جی، دادی  
ماں، میں، آسیہ احمد، صائمہ احمد، صاعقہ جہیں، نور  
فاطمہ، (سسرز) اے آر چاند ساگر اور محسن رضا  
آفتاب (برادر) اور میری جان سے پیاری بہنیں



مریم احمد، تانکہ احمد، عزا احمد اور کرن مارون عباس ہم  
سب مل کر رہتے ہیں۔ پاکیزہ سے وابستگی 2008ء  
سے ہے اور پاکیزہ سے بہت کچھ سیکھا ہے جس کے  
لیے میں پاکیزہ فیملی کی شکر گزار ہوں۔ میں سب سے  
پہلے انجم آئی کا ادارہ پر پڑھتی ہوں جو ہمیشہ سبق آموز  
ہوتا ہے اور جلت رنگ میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔ خوبیوں  
اور خامیوں کا حسین امتزاج ہوں۔ خوبیاں یہ ہیں،  
سادہ مزاج اور خوش اخلاق ہوں۔ غرور نام کو  
نہیں..... حسد بالکل نہیں کرتی..... کسی کی انسلٹ

اور ہارش کا کبھی نمیشن تو جان نکال لیتا ہے۔ عظیم  
کتاب قرآن پاک اور عظیم ہستی حضرت محمد ﷺ پسند  
ہیں کہ زندگی کے تمام کرائسز اور ایونٹس میں ان کی  
ذات پاک کو توجہ نظر رکھ کر انہیں ترتیب دینے کی ادنیٰ  
سی کوشش کرتی ہوں۔

عنبر وسیم، گوجرانوالہ

☆☆☆

ٹھک، ٹھک، ٹھک دروازہ تو کھولے پاکیزہ کی  
جان شبنم کنول تشریف لارہی ہے۔ 20 اپریل کی  
شام کو مابہ دولت نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ میرا  
تعلق حافظ آباد کے چھوٹے سے خوب صورت گاؤں  
پاپاگری سے ہے۔ کتابوں سے دوستی ہے اور بہت  
سنجیدہ کر رکھتی ہوں اسی لیے تمام پاکیزہ بالکل نئی  
حالت میں میرے پاس موجود ہیں۔ شاعری کرتے  
اور پڑھنے کا بہت شوق ہے، میرے فیورٹ شاعر  
پروین شاکر، وحسی شاہ، بشری اعجاز ہیں۔ پاکیزہ  
میں لکھنا شروع کیا ہے، آنٹی نے کافی حوصلہ افزائی  
کی ہے۔ انشاء اللہ ایک اچھی لکھاری بنوں گی۔  
کوکنگ کا بڑا شوق ہے، میرے فیورٹ کلر فیروزہ  
اور بلیک ہیں، کھانے میں دال چاول اور بریانی پسند  
ہے۔ جیولری میں لاکٹ، رنگ اور چوڑیاں پسند  
ہیں۔ نماز پابندی سے قائم کرتی ہوں۔ بہت شوخ و  
چٹکل لڑکی ہوں۔ رونے والوں کو ہنسا دیتی ہوں۔  
سالگرہ کے تحفے میں کتابوں کا لین دین مجھے بہت  
پسند ہے۔ اپنی ماں سے بہت محبت کرتی ہوں۔  
رات کو سوتے وقت دوسری بہت سی دعاؤں کے  
ساتھ یہ دعا کرتی ہوں کہ خدا میری ماں کو سلامت  
رکھے، آمین۔ آخر میں چھوٹا سا پیغام..... بہتر زندگی  
وہ ہوتی ہے جو آپ اپنے، لیے گزارتے ہیں اور  
بہترین وہ جو دوسروں کے لیے گزارتے ہیں۔  
زندگی بہترین گزارنی چاہیے..... شعر کے ساتھ  
اجازت.....

نہیں کرتی اور دوسروں کی پرائیوی میں انٹرفیر نہیں کرتی۔ (جج کہہ رہی ہوں یا۔۔۔۔۔) اور خامیاں۔۔۔۔۔ دوسروں پہ بہت جلد اعتبار کر لیتی ہوں اس وجہ سے کئی مرتبہ نقصان بھی اٹھا چکی ہوں۔ چھوٹی، چھوٹی باتوں پر اداس ہو جاتی ہوں۔ مجھے منافقت، جھوٹ اور طنز پر گفتگو پر بہت غصہ آتا ہے۔ بے ہودہ مذاق بالکل پسند نہیں۔ مجھے اپنی عزت بہت عزیز ہے، اس لیے دوسروں کی عزت کا بھی خیال رکھتی ہوں۔ میں باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہوں اور اپنی ہر بات اللہ تعالیٰ سے شیئر کرتی ہوں۔۔۔۔۔ کسی سے زیادہ دیر ناراض نہیں رو سکتی۔

مجھے چھوٹے بچے بہت اچھے لگتے ہیں اور خوب صورت گھر بہت اٹریکٹ کرتے ہیں۔ گفٹ لینا اور دینا دونوں پسند ہیں اگر کوئی گفٹ میں کتاب دے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے۔ تعارف میں اپنی آنٹی کا ذکر نہ کروں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔۔۔ آنٹی تسمیرہ کو دیکھ کر مجھے پردے کا خیال آیا۔ پردے کی اہمیت کا پتا چلا۔۔۔۔۔ میرے نزدیک رشتوں کی بہت اہمیت ہے اپنی ذات سے وابستہ ہر شے کا خیال پوری ایمانداری سے کرتی ہوں۔ میری نظر میں قابل احترام اور خوب صورت رشتہ ماں اور لائف پارٹنر کا ہے۔ میری فیورٹ کتاب قرآن مجید اور فیورٹ شخصیت نبی کریم ﷺ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق دے، آمین اس کے بعد مولانا۔۔۔۔۔

بدلتار ایڈھی اور ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایڈیٹر ماہنامہ سفید چھتری سرگودھا سے بہت متاثر ہوں۔ مطالعہ کرتے میرا فیورٹ مشغلہ ہے، ماہنامہ پاکیزہ۔ سسپنس، تعلیم و تربیت اور ماہنامہ سفید چھتری رنگولر پڑھتی ہوں۔ انجم انصار میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ فیورٹ شاعر وہی شاہ اور ڈاکٹر آصف۔۔۔۔۔ میری شدید خواہش ہے کہ خانہ کعبہ کی زیارت کروں اور اپنے ملائے میں غیر فعال بچوں کے لیے اسکول کھولوں اور دنیا میں

ایسے کام کر کے جاؤں کہ لوگ میرے مرنے کے بعد بھی مجھے یاد رکھیں۔

کھانے پینے کے معاملے میں زیادہ نخرے نہیں کرتی، دال، سبزی جو بھی ہو شوق سے کھا لیتی ہوں۔ چائے نہیں پیتی اور میٹھی چیزیں کچھ خاص پسند نہیں۔ بریانی، پلاؤ اور گوشت فیورٹ ہیں۔ سبزیوں میں بھنڈی اور گو بھی زیادہ پسند ہیں۔ فیورٹ پھل آم اور انار۔۔۔۔۔ مشروب میں دودھ، میٹوھیک اور سوٹ ڈرنک پسند ہیں۔ لباس میں شلوار قمیض پسند ہے۔ بلیک، پنک اور ڈائنٹ کلرز فیورٹ ہیں۔۔۔۔۔ موسم سارے ہی اچھے ہوتے ہیں مگر سردیاں اور بارش مجھے بہت پسند ہیں۔ نومبر اور دسمبر میرے فیورٹ مہینے ہیں۔ پسندیدہ وقت شام کا۔۔۔۔۔ شام کے وقت چھت پر کھڑے ہو کر غروب آفتاب کا منظر دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جیولری میں برسلیف اور رنگر بہت پسند ہیں۔ مہندی اور چوڑیاں بھی پسند ہیں۔ خوشبوؤں میں بلیو لیدی فیورٹ ہے۔ پسندیدہ ملک پاکستان ہے، اللہ تعالیٰ میرے پیارے وطن کی حفاظت فرمائے۔

پسندیدہ شہر کے بارے میں کیا بتاؤں یا رہا بڑا بھی ٹھیک سے نہیں دیکھا ہوا (بچی میں) اسلام آباد اور کوئٹہ دیکھنے کی شدید خواہش ہے۔ اب بات آج جائے دوستوں کی تو دوستی ایک مقدس رشتہ ہے مگر کچھ لوگ اس پاکیزہ رشتے کو بدنام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔

آخر میں فرینڈز کے لیے ایک نصیحت ہے کہ انسان ہو کر ایسے کام نہ کرے جس سے انسانیت کا دامن داغدار ہو جائے۔

اس شعر کے ساتھ اجازت۔۔۔۔۔

یاو رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم

بھول جاؤ تو فاصلے ہیں بہت

ہمہماں ہمارے سر ہمارے سر ہمارے سر ہمارے سر

سب سے پہلے تو میرے خوب صورت پاکیزہ کو



نہیں ہوتا بلکہ اندر کی آدھی محض ختم ہو جاتی ہے۔  
خوب صورت اور حسین ترین لمحات جو کہ ٹرپ کی  
صورت میں خوب صورت مناظر کے بیچ بلند و بالا پہاڑ  
بالکل نیلے آکاش کو چھوتے ہوئے جھیلوں کے کنارے،  
اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں اور اپنے بنانے  
والے رب کا شکر ادا کرتی ہوں، عبادت سے بے حد  
لگاؤ ہے، صبح پانچ سے لے کر آٹھ بجے تک اپنے رب  
کے ساتھ رہتی ہوں، کوئی دن چھوٹ جائے تو اندر سے  
تشنگی رہ جاتی ہے، میرے پسندیدہ شہر اسلام آباد ایبٹ  
آباد ہیں، ملک سوئٹزر لینڈ اور مارشلشس میں...  
بروین شاہ فرحت عباس احمد، فراز اور رائی انجم الصاوی،  
عظمیٰ آفاق، فرحت اشتیاق، صائمہ اکرم، مایا ب  
جیلانی، نمر احمد، نسیم احمد، نسیم امید، نگہت سیما ہیں۔  
میں مہوش سمرن راجپوت، سیالکوٹ

☆ ☆ ☆

ماں، باپ نے تو نام رکھا گمشدہ مگر کیا اسکول و  
کالج، گھر، خاندان، محلے، غرض ہر جگہ جانی، جانو کہلائی،  
شاید کہ میں واقعی سب کی جانی ہی تھی کہ ہر جگہ بے  
تخشا پیار ملا کہ کوئی تشنگی نہ رہی۔ اسکول و کالج میں والی  
بال کی نیم کی کھلاڑی رہی کہ 5.5 کے قد کا کچھ تو فائدہ  
ہوا۔ چٹنگ بازی بھی جی بھر کے کی، گرمیوں کی لمبی  
دوپہروں کو جب گھر والے سو جاتے تو میں چٹنگ لے کر  
چھت پر بیٹھ کر ادنیٰ ہوتی۔ مطالعے کی عادت بچپن  
سے تھی کہ بچوں کا کوئی رسالہ ایسا نہیں جو نہ پڑھا ہو۔  
پاکیزہ سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ پہلے پڑوسن آنٹی سے  
لے کر پڑوسن شروع کیا۔ پھر دوسرے کا خریدنا شروع  
کر دیا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ پاکیزہ میں بھی  
نقصیں، غز میں نقصیں۔ تبصرے بھی بہت کیے۔

لکھنے کا شوق بھی بچپن سے تھا۔ آٹھ پاکستان  
مقابلہ مضمون نویسی میں انعام حاصل کیا۔ خواتین کے  
موضوع پر لکھ کر سیکند پرائز حاصل کیا۔ اپنا ایک شعر  
مجھے اچھا لگتا ہے۔

سالگرہ مبارک ہو اور جو اسے ہمارے لیے سنوارتے  
ہوں گے وہ ہاتھ کیسے ہوں گے ان خوب صورت  
ہاتھوں کو اللہ تعالیٰ اور تندرست اور خوب صورت  
بنائے۔ مجھے مہوش کہتے ہیں 15 مئی کو اس پیاری سی  
دنیا کی رونق بڑھانے کے لیے اس دھرتی پر قدم رکھا۔



بی اسے پاس ہوں اور اپنے بچونا سا بڑا ہوں۔  
پڑھنے کا اور لکھنے کا کریز ہے۔ غزل لکھی اور بے شمار  
مشاعروں میں شرکت کی۔

میرا اشار ثور ہے اور اپنے اشار کی ساری  
خوبیاں میرے اندر موجود ہیں۔ حد سے زیادہ صاف  
گو ہوں ادب سے بے انتہا لگاؤ ہے، مجھے کلیاں پسند  
ہیں کیونکہ کلیاں صبح ہیں اور پھول دوپہر۔ صبح کے  
بعد زندگی آگے بڑھتی ہے اچھی کتابیں میری دوست  
ہیں خوشبو بہت پسند ہے اور ہر کوئی مجھے کتابوں اور  
پرفیوم کا گفت و منا ہے۔ مجھے برستی بارش میں لاٹک  
ڈرائیو پہ جانا، چاندنی رات کا انتظار کرنا اچھا لگتا ہے  
موسم بہار پسند ہے۔ جب ہر طرف پھولوں کی بہارات  
ہوتی ہے اور خوشبو ہی خوشبو ہوتی ہے۔

میوزک کا بے حد شوق ہے۔ کشور کی میکیشن بے  
انتہا خوب صورت ہے جس کو سنتے ہوئے ڈپریشن

جاتے ہوئے کتنا مکھڑا ہوا لگتا تھا وہ شخص جس کو سینے میں مجھے ایک عمر لگی اپنے خاندان کی پہلی گریجویٹ ہوں کہ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو زیادہ نہیں پڑھایا جاتا تھا مگر مجھے تو خود کو منوانے کا جنون تھا۔ لی اے کے بعد اسٹیٹ لائف انشورنس میں بطور آفس ٹیکر جاب کی۔ ساتھ ہی انشورنس کا کام بھی کیا کہ کسی کو اپنے سے آگے



نہیں جانے دیا۔ آفس میں فرسٹ پوزیشن پر میری تصویر لگی رہتی تھی۔ پیسہ بھی بہت کمایا کہ پتروں کا جنون تھا۔ خود ہی ڈیزائننگ کی، خود ہی سلائی اور ڈرہ درست سوٹ تیار۔ ٹیلی ویژن سینٹر اول پنڈی سے کانج لائف سے وابستہ رہی کہ تقریر کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اور میرے اس شوق کو ٹیلی ویژن سینٹر والوں نے خوب پورا کیا۔ پھر ایک تنظیم عدالت گھر کی کئی سال صدر رہی۔ بحیثیت تنظیم کی صدر ریڈیو پاکستان سے انٹرویو نشر ہوا۔ جس کا چیک چالیس روپے ملا جو آج تک پیش نہیں کر لیا۔ میرے اندر کچھ کرنے کا جذبہ بہت تھا بلکہ اب بھی ہے۔ 1986ء میں امر ہوسٹس کے لیے ایلائی کیا۔ کامیاب انٹرویو کے بعد خاندان والوں کی باتیں ابو کو نہ سنی پڑیں۔ اپنے اس شوق کو بھی مار دیا۔

کانج میں ہمارا گروپ بہت پاپولر تھا۔ فری پیریڈ میں گراؤنڈ میں کمر سے کمر جوڑ کر ہمارا گروپ بیٹھ جاتا، گانے کے لیے اور پھر پورا کانج ہمارے چاروں طرف ہوتا۔ اور الحمد للہ ہماری کانج کی دو سی بلکہ پورا گروپ آج بھی اکٹھا ہے۔ ہم دوستوں کے دوست ہیں۔ اسی لیے آج تک بچپن کی تمام فرینڈز سے رابطہ ہے۔

14 دسمبر 1990ء کو اپنے کزن ڈاکٹر نذیر خان سے شادی ہوئی پھر ڈاکٹر صاحب نے اتنا چاہا کہ چاہے جانے کی خواہش ہی نہیں رہی۔ مگر 14 اکتوبر 2008ء میں ڈاکٹر صاحب مجھے اکیلا چھوڑ کر چھ مہینے کبھی نہ آنے کے لیے۔ جو شخص میرے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتا تھا وہ میرے بغیر ہی لمبے سفر پر چلا گیا۔ میرے دل کو ویران کر کے۔ اللہ تعالیٰ نے تین بیٹوں سے نوازا ہے، بڑا بیٹا شہر یار خان BS کر رہا ہے۔ اسفندیار، منترگ کے پیپر ز دے رہا ہے اور وقار خان سکسٹھ میں ہے۔ شادی کے بعد مری آگئی اور یہاں سے کشمیر کے بہت ہی خوب صورت قصبے ریڈھ میں اپنا گھر بنا کے شفٹ ہو گئی۔ جس کو اپنے پیار و شوق سے واقعی جنت بنا دیا کہ لوگ مجھ سے ملنے اور گھر کو دیکھنے کے لیے دور دور سے آتے ہیں۔ میں نے اپنے علاقے کی ترقی خاص کر خواتین کے لیے بہت کام کیا اور اپنا ایک مقام بنایا کہ ڈگ میر سے کام کی وجہ سے میری اتنی عزت کرتے ہیں کہ داد کی عمر کے لوگ بھی نام نہیں دیتے بد جاتی باجی کہتے ہیں۔

میں نے اپنے علاقے میں سب سے پہلے لڑکیوں کے لیے کونگ کلاسز شروع کیں پھر نان آئیڈمی کے نام سے سلائی سینٹر شروع کیا۔ رڈز کے بعد ہمارے علاقے میں بہت این جی اوڈ آئیں تقریباً سب کے ساتھ کام کیا۔ سب سے زیادہ اسلامک ریف کے ساتھ کام کیا۔ نئی روشنی کے نام سے سات اسکول قائم کیے جس میں بڑی عمر کی خواتین کو تعلیم دی جاتی تھی۔

گھٹا نذیر، کشمیر

# ہفت سیر محبت پاکیزہ ڈائجسٹ قارئین پاکیزہ کی نظر میں

شائستہ زریں

کے رضوانہ برنس کے ہلکے پھلکے انداز میں لیے فنون لطیفہ سے متعلق شخصیات کے انٹرویوز اور سماجی موضوعات کا احاطہ کرتی مجھ ٹاچیز کی "سروے رپورٹس" قارئین کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ پاکیزہ کی آن اور شان "بہنوں کی تحفل" کا آغاز کسی انجمنی اہم موضوع پر انجمن ہاجی کی قارئین بہنوں سے جامع گفتگو سے ہوتا ہے، اسے آپ پاکیزہ کا ذیلی ادارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد مین مرتبہ درود ابراہیکی اور آیت کریمہ پڑھنے کی تلقین مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں، دعائے صحت کے لیے التماس، انتقال پر ملاں کے بعد مہووظ اور ان کے جواب۔ پاکیزہ کی سالگرہ کے موقع پر پاکیزہ کی دنیا سے رخصت ہو جانے والی مصنفات، شاعرات اور قارئین بہنوں کو یاد کرتے ہوئے دعاؤں کے گجرے پیش کرتا بھی پاکیزہ کی ویرینہ اور اچھی روایت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اوروں کے ساتھ، ساتھ بحیثیت قاری و افسانہ نگار اور صحافی میں نے بھی پاکیزہ سے بہت کچھ سیکھا۔ بے حد ممنون ہوں عذرا ہاجی کی حوصلہ افزائی، انجمن ہاجی کی رہنمائی اور بے لوث محبت۔ سروے رپورٹ کے سوال تیار کرنے سے تیاری تک کے مراحل میں مشاورت کے ضمن میں نہایت معزز کے مخلصانہ تعاون کی۔ پاکیزہ... بلاشبہ تمام بہنوں کے لیے تربیت گاہ کے مانند ہے جہاں سے تربیت حاصل کرنے والے شاد کام رہتے ہیں۔

مطالعہ نہایت کم سنی سے بیک وقت میری کمزوری ہی نہیں طاقت بھی بنارہا۔ خواتین کے لیے شائع ہونے والے ڈائجسٹوں میں سب سے پہلے پاکیزہ ڈائجسٹ پڑھا۔ سروے سے پس ورق تک پڑھنے کے بعد پہلا تبصرہ یہی تھا کہ واقعی پاکیزہ اسم باکسی ہے اور یہ تاثر آج تک قائم ہے۔ ماضی سے حال تک کا سفر طے کرتے ہوئے یہ احساس اور فخر ہو رہا ہے کہ بڑھتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ پاکیزہ خوب سے خوب تر کی جانب رواں دواں ہے۔ اس کی شادابی اور جاذبیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ باعتبار مجموعی قارئین اور بالخصوص صنف تازک کے لیے پاکیزہ کی انسائیکلو پیڈیا سے کم نہیں کہ اس میں شامل مختلف النوع تمام مواد خواتین کے لیے رہنما ثابت ہوتا ہے۔ "اداریہ" جو کسی بھی رسالے کے لیے ریزہ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گروہ، نسیرت افروز، باکمال اور قارئین کے دل میں گھر کرنے والا۔ اگر "دین کی باتیں" اور روحانی مشورے قلب و رون کو تقویت بخشتے ہیں تو شعری و نثری تخلیقات سے ذوق مطالعہ کی تسکین ہوتی ہے، افسانوی ادب کے چشم کشا حقائق قارئین کو ذہنی بیداری کی سوغات دیتے ہیں۔ حسن و صحت کے بارے میں آج بھی ہو جاتی ہے۔ "جلترنگ" کے ساز بہتے ہیں تو بصارت ہی نہیں سماعت بھی منور و معطر ہو جاتی ہے۔ "وہ" کے بزم میں "نزہت اصغر کے لٹریٹری رٹھ اور "افسانہ نہیں حقیقت ہے"۔



۳: ہر وہ شاہکار افسانوں میں سے ایک منتخب افسانہ شائع کریں۔

### ڈاکٹر شہلا عامر

۱: پاکیزہ سے جو بھی سیکھا اس نے اپنے مثبت اثرات مجھے برچھوڑے۔ مثلاً ”مجھے کچھ کہنا ہے“ جسے پڑھ کر زندگی گزارنے سے متعلق چھوٹی، چھوٹی مگر بہت کارآمد باتیں سیکھیں۔ ان کو اپنی زندگی میں



ڈاکٹر شہلا عامر

شامل کر کے صرف میری زندگی ہی نہیں سنوری بلکہ اللہ، اللہ آخرت بھی سنور جائے گی، آمین۔ جزاک اللہ... انجم پائی۔

۲: ”بہنوں کی محفل“ جس کا کوئی جواب ہی نہیں اور جسے میں نے ”پاکیزہ کی فیس بک“ کا نام دیا تھا۔  
۳: اگر پاکیزہ میں کوئی انعامی سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا جائے تو اس خوب صورت پرستے میں مزید چار چاند لگ جائیں گے۔

### شازیہ افتخار خان

۱: ”جلت رنگ“ میں مجھے طرح، طرح کی ایشیائی بالخصوص پاکستانی عورتیں نظر آئیں، ان کے رویے

ڈائجسٹ کا ادب تفریحی ادب کے زمرے میں آتا ہے لیکن پاکیزہ ڈائجسٹ سے مقبولیت حاصل کرنے والی مصنفات بشری رحمن، سیما سراج، شکیلہ رفیق، عنفت گل اعزاز اور نرگس احمد بشیر اولی جرائد کی کامیاب قلم کار ہیں۔ خواتین کے دیگر رسائل کو مد نظر رکھیں تو پاکیزہ کو ایک نہیں کئی ایک امتیاز حاصل ہیں۔ اس گرم کے لیے ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں اس دعا کے ساتھ کہ اپنی رحمتوں اور برکتوں کے سائے میں اپنے شکر گزار بندوں میں شام رکھے اور پاکیزہ ڈائجسٹ کی آب و تاب میں ماہ بہ ماہ اضافہ ہوتا رہے، آمین

اسی مناسبت سے ہم نے چند قاری بہنوں سے معلوم کیا کہ....

- ۱- پاکیزہ سے آپ نے کیا سیکھا اور آپ کی زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟
- ۲- پاکیزہ کا وہ کون سا خاص وصف ہے جو اسے خواتین کے دیگر رسائل سے ممتاز بناتا ہے؟
- ۳- پاکیزہ میں کون سی دلچسپ تبدیلی کی خواہشمند ہیں؟

### ڈاکٹر ممتاز ضیا

۱: پاکیزہ کا ادب میرا ساتھ پاکیزہ کے پہلے شمارے سے ہے۔ اس کا معیار ہمیشہ سے اچھا ہے اور انجم کی ادارت نے اس میں چار چاند لگا دیے۔ میں تو پاکیزہ سے بہت کچھ سیکھا لیکن سب سے بڑھ کر یہ سیکھا کہ کیسے غیروں کو اپنا بنا دیا جاتا ہے اور اس کو کس طرح بھلا دیا جاتا ہے؟ عذرا اور انجم کا دیا ہوا یہ احساس بہت خوشی کا باعث بنتا ہے کہ ہم ان کے اپنے ہیں۔ پاکیزہ کی تحریروں سے حقوق العباد کی اہمیت کو نہ صرف سمجھا بلکہ جہاں اس میں کمی رہ گئی اس کو پورا کیا۔

۲: نئی مصنفات، قارئین، تبصرہ نگار سب کو یکساں اہمیت دی جاتی ہے اور نئی مصنفات کی بھرپور حوصلہ افزائی سے نیا نیلٹ سامنے آ رہا ہے۔

## غزل

میں انتظار کروں گی سحر ہونے تک  
میں سانس بھی نہیں لوں گی سحر ہونے تک  
رقم کروں گی مسلسل ستم کی تحریریں  
تمام ظلم سہوں گی سحر ہونے تک  
تو آئینہ نہ سہی آئینے سے کم بھی نہیں  
میں تیرا عکس پڑھوں گی سحر ہونے تک  
جسے چراغ تو سوچوں گی روشنی کیا ہے  
کسی سے کچھ نہ کہوں گی سحر ہونے تک  
ہوا میں تیز چلیں یا چمن میں پھول کھلیں  
میں اپنے گھر میں رہوں گی سحر ہونے تک  
سحر ہونے کے بعد آئینہ میں دیکھوں گی  
فرقی میں سب کی سنوں گی سحر ہونے تک  
کلام: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

طالب صبی کے سنہری زمانے میں جب کچے  
ذہن پہ پکی سوچوں کا راج تھا اس وقت زندگی کے  
اتار چڑھاؤ میں جذباتی، احساساتی اور نفسیاتی...  
ترہیت میں پاکیزہ ڈائجسٹ نے ناپختہ ذہن کو ایسا رخ  
دیا کہ کم عمری میں ہی فہم و ادراک کے دروازے کھلتے  
گئے اور میں عقل و شعور کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی  
لیکن ان اثرات کا اندازہ اس وقت ہوا جب سب  
نے ہاشعور اور سمجھ دار بچی کا لیبل لگا دیا۔

۲۔ ڈائجسٹ کی دنیا اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ فی  
زمانہ اسے ڈائجسٹوں کا جمود بازار بھی کہہ سکتے ہیں  
لیکن اس بازار میں بھی اپنا مقام بنائے رکھنا، پاکیزہ  
ڈائجسٹ کا ایک خاص وصف ہے۔ کہتے ہیں کہ لفظ  
میں قوت ہوتی چاہیے کہ وہ نہ صرف دل و دماغ بلکہ  
سنگلاخ تحریری معیار جو صرف اور صرف مدبرہ اعلیٰ  
اور معادہ بین کی فکر و کاوش کا آئینہ دار ہے۔ خوب سے  
خوب تر بنانے کے لیے تمام تحریروں کو اس طرح  
جانچا جاتا ہے کہ حقیقت اور تخیل میں کوئی بُعد نظر نہیں  
آتا۔ مثنوی اور اچھوتے موضوعات کے پردے میں

نظر آئے۔ جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور اس  
کے مثبت اور خوشگوار اثرات ہی مرتب ہوئے۔ مجھے  
یہ معلوم ہو گیا کہ کس قسم کے لوگوں سے کیسا برتاؤ کرنا  
چاہیے۔ راستوں کا تعین کرنا سیکھا اور پھر اس پر عمل  
بھی کیا۔

۳۔ ”جلترنگ“ جس میں مزاح کے توسط سے  
زندگی اور معاشرے کے بہت سے سبق مل جاتے ہیں۔



## شاز یہ افچرخان

یہ سبق تو خواتین کے دیگر رسائل میں بھی مل جاتے  
ہیں لیکن اس طرح ہلکے پھلکے انداز سے نہیں یہ صرف  
اور صرف پاکیزہ میں ہے۔

۳۔ ادبی جرائد میں چھپنے والی کہانیوں کے لیے  
دو تین صفحات مختص کر دیے جائیں۔ نئی چھپنے والی  
کتابوں پر تبصرہ بھی ہر ماہ شائع ضرور کریں۔

## عمرانہ شہناز

۱۔ پاکیزہ ڈائجسٹ جب میرے ہاتھ میں آیا تو  
یہ شعر میرے ذہن پہ دستک دینے لگا۔

چہرہ ہوا میں اور میری تصویر ہوئے سب  
میں نفل ہوا مجھ میں زنجیر ہوئے سب

اور پھر پاکیزہ وہ پہلا خواتین کا رسالہ جو میں نے پڑھنا شروع کیا میری زندگی پر اسی لیے پاکیزہ کے اثرات گہرے ہیں کیونکہ پاکیزہ میں ایسی کہانیاں شائع ہوتی ہیں جو زیادہ تر حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ خوابوں خیالوں سے ذرا دور زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرانے کا سہرا پاکیزہ کے ہی سر ہے اور ادبی دنیا میں میری پہلی پہچان ہے۔

۲: میں تو بر ملا یہی کہوں گی دوسرے رسائل سے ممتاز بنانے میں سب سے اہم کردار پاکیزہ کی مدیرہ کا ہے جنہوں نے ہر خاص و عام کو ایک لڑی میں



ایڈووکیٹ سعدیہ ہاشمی

پرور رکھا ہے۔ فی زمانہ خود کو پیچھے رکھ کر دوسروں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا انجم انصار کا ہی وصف ہے۔ تنقیدی خطوط لگانا، سب سے برابری کا سلوک کرنا۔ سچ پوچھیں تو ہماری مدیرہ کو تو تنظیم انصاف کی چیر پر سن ہونا چاہیے۔ پاکیزہ سب کی تحریروں سے انصاف کرتا ہے۔

۳: ابھی ہم Aquarian تو ہیں؟ ہمیں یہی تبدیلی کا سائن کہ محبوب ہر حال میں ہی اچھا لگتا ہے۔



میرا ند شہباز

زندگی کی تلخیوں کو ایک ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرنا اور قارئین کو اپنے سحر میں جکڑے رکھنا صرف پاکیزہ کا ہی طرہ امتیاز ہے، اسی لیے فنون لطیفہ میں ادب کا جو مقام ہے پاکیزہ ڈائجسٹ اس کا عکس ہے جو زمینوں کو بھی سیراب کر دے اور اس خوبی کے لیے تحریر کا معیار بہت ضروری ہے۔

۳: پاکیزہ کے تمام سلسلے اپنی، اپنی جگہ اس طرح فن ہیں کہ جیسے ایک مرصع انگوٹھی مختلف آبدار قیمتیوں سے مزین ہو اور اس میں کم اور نہ بیش کی گنجائش ہو۔ فی زمانہ ہم جدید تحقیقات، ایجادات اور مفروضات سے آشنا ضرور ہیں لیکن اپنی اسلامی تاریخ سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں اگر کوئی اسلامی تاریخی سلسلہ شروع کر دیا جائے تو یقیناً ایک عظیم اضافہ ہوگا۔

### ایڈووکیٹ سعدیہ ہاشمی

۱: اگر میں یہ کہوں کہ میں نے رشتوں کو برتنا پاکیزہ سے سیکھا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ رسالوں کی چاٹ اپنی مدد سے ملی بچوں کے رسالوں سے اخبار جہاں



## سروے

اور میزبانی کرتی ہیں اس سے تمام مصنفات کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ ایک مثال ہے۔  
۳: پاکیزہ میں انعامی کہانی کے سلسلے سے صحت مند مقابلے کا رجحان سامنے آ سکتا ہے۔ اور پھر یہی اعتماد ہر فیلڈ میں ترقی کے لیے مفید ہے۔

## شمالیہ سہیل جاوید

۱: میری اولین تربیت گاہ، میرا حوصلہ، میری خود اعتمادی، میری لگن، میری جستجو، تخیل کی پرواز، صلاحیتوں کا قدردان۔ میری پہچان۔ ان سب کا نام ہے ”پاکیزہ ڈائجسٹ“ ہے۔  
سب سے زیادہ مثبت اثر تو یہ ہوا کہ میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔



## شمالیہ سہیل جاوید

۲: ”بہنوں کی محفل“ جس کے توسط سے انجم انصار صاحبہ نے تمام قرین، مصنفات، تجربہ نگاروں اور شاعرات کو باہم ایک لڑی میں پڑوایا ہوا ہے۔ اس مالا کو صرف اور صرف انجم نے طریقے اور قرینے سے سنبھال رکھا ہے۔ اس محفل میں ہم سب ایک گھر کے کینوں کے مانند ایک دوسرے سے اپنے

مگر ہم شاعروں کے لیے تھوڑی تشنگی ہے۔ ایک دو صفحات شاعرات کے لیے مخصوص کر دیے جائیں تو لمبے لمبے دوسرا وہی پرانا مطالبہ ایوارڈ حاضر کیے جائیں ورنہ ہم غمناک رسول کے گھر کے سامنے دھڑنا دیں گے۔ آپ سب میرے ساتھ ہم آواز ہیں ناں۔

## صائمہ قیصر ہاشمی

۱: سچ تو یہ ہے کہ پاکیزہ میری پرائمری کلاس ہے۔ جہاں سے میں نے اڑان بھری اور پھر چل سو چل۔ انجم آپ کی جلتنگ سے متاثر ہو کر لکھنا



## صائمہ قیصر ہاشمی

شروع کیا۔ پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا تک کا سفر کامیابی سے طے کیا۔ پاکیزہ سے شروع ہوئے سفر اور بنیاد نے میری زندگی کو اعتماد اور معاشی سہارا دیا۔ پاکیزہ میری تحریر کا سرچشمہ ہے۔

۲: خواتین کے جذبات و احساسات کا بہترین نمائندہ پاکیزہ ہے۔ نئی مصنفات کو پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے، جہاں وہ اپنی صلاحیتوں کو آزماتی ہیں۔ غمناک آپنی، انجم آپنی اور نزہت اصغر جس بیٹھے لہجے، محبت اور اپنائیت سے بات کرتی ہیں، مدعو کرتی ہیں

کی پیچان کروائی۔ پاکیزہ میں شائع ہونے والی ہر تحریر ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور ضرور کرتی ہے۔ پاکیزہ کے اثرات مجھ پر یوں مرتب ہوئے کہ اب میں منظم طریقے سے زندگی بسر کرنے لگی۔ مجھ میں پڑھنے کا جذبہ اور شعور بیدار ہوا۔ میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔

۲. پاکیزہ اپنے نام کی طرح پاکیزہ سے اس میں کبھی کوئی غیر اخلاقی تحریر نہیں پڑھی، بہنوں کی مفصل جسے انجم باجی نے اپنے اخلاق اور محبت سے بہت وسعت دی ہے۔

۳. انعامی سلسلے اور ایوارڈ دوبارہ جاری کیے جائیں تاکہ قارئین اپنی پسندیدہ مصنفات سے ملاقات کر سکیں۔

### عاصمہ طارق

۱: سسرالی رشتے نباہنا اور ایڈجسٹ کرنا اور ہونا سیکھنا۔ اس سے زندگی میں اچھی تبدیلی آئی جس کی بنا پر زندگی زیادہ پرسرت اور خوشگوار ہو گئی۔  
۲: روحانی مشورے جو اور کہیں نہیں۔  
۳: بیوٹی کیلنک اور فیشن کے رنگین صفحات دوبارہ



عاصمہ طارق

دکھ سکھ بانٹتے ہیں، انجانے لوگ بھی اپنے اپنے گتے ہیں۔ ایک دوسرے کا احوال، سماجی زندگی، سرگرمیاں بھی ہم گھر بیٹھے ہی جان لیتے ہیں۔

۳. انعامی سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ ہماری وہ قلم کار جو اب ہمارے درمیان نہیں ان کا کوئی افسانہ یا کلام ہر ماہ پاکیزہ کی زینت ضرور بنائیں۔

### ریحانہ حسن

۱: پاکیزہ نے مجھ میں لکھنے کا شعور اور چھپنے کا حوصلہ دیا۔ میرے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ اجاگر کیا۔ اس کا اثر مجھ پر یہ پڑا کہ میں ہمت نہیں ہارتی بلکہ کامیابی کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی ہوں۔



### ریحانہ حسن

۲: جلتیگ جس میں معاشرے کی تلخ سچائیوں کو مزاح کے پردے میں بیان کیا جاتا ہے۔ بہنوں کی محنت کے آغاز میں کی جانے والی گفتگو، مصنفات اور قاری بہنوں کی سرگرمیاں۔  
۳: ہر ماہ ایک راکٹر کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

### نگینہ ضیا بنگش

۱: پاکیزہ نے اپنی پاکیزہ تحریروں سے اچھے برے

## رائی بھابی

کچھ لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو دنیا سے جانے کے بعد بھی یادوں کے اتمت نقوش و نول میں چھوڑ جاتے ہیں۔ انہی میں شمار میری رائی بھابی کا بھی ہوتا ہے۔ نندہ بھابھ کا رشتہ ہمیشہ ہی منفی شمار ہوا ہے۔ بلکہ محاورہ مشہور ہے نندہ افضل گند۔ مگر اللہ کا شکر ہے ہمارے درمیان اس کی توبہ کبھی نہیں آئی۔ میری امی، بھائی جان کو شہزادہ کہتی تھیں، لمبے چوڑے سرخ سفید تو رائی بھی ترو تازہ گلاب کا پھول۔ بھائی جان نے انٹر کیا اور رائی بھابی نے تھوئیں پاس اور شادی ہو گئی کیونکہ آپس میں گزرتے تھے۔ دونوں میں ایسی مثالی محبت اور یکجہت کہ دیکھی اور نہ سنی مگر اس محبت کی عمر اتنی مختصر تھی کہ چار بچوں کے ساتھ صرف آٹھ سال بعد رائی بھابی ساکن سے دیوہ ہو گئیں۔ جس عمر میں آج کل لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔ صابر و شاکر، شرم و حیا کا پیکر بھائی جان سے محبت ایسی بھائی کہ کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا۔ نہ کسی کو انگی اٹھانے کا موقع دیا۔ اللہ نے اتنی نیک اور مہارت گزار بھابی کو اتنی مہلت ضرور دی کہ اپنے چاروں بچوں کو اپنے گھروں میں خوش آباد رکھے ہیں۔ نیک اتنی کہ اپنی ہی خواہش نے بھتیگیوں کے ہمراہ نبھاتے ہوئے کہا۔ اتنا پاکیزہ اور مقدس جنازہ... ان کو آب زم زم میں ڈوبا ہوا کفن ہم اپنی طرف سے پہنا میں گئے۔ بھی، بھی میں سوچتی ہوں اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا صرف آزمائش کے لیے ہی دنیا میں بھیجا تھا۔ جس پر وہ پوری امتیں اور چودہ دسمبر 2014ء کو بغیر کسی کو تکلیف دینے دنیا سے منہ موڑ گئیں۔ ان کی زندگی پر پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے جو جوان پیواؤں کے لیے مشعل راہ ہو مگر نجات کی کمی مانع ہے۔ پاکیزہ بہنوں سے ان کی مغفرت اور درجات کی بندی کے لیے دعا کی درخواست۔

تحریر سہلی غزل آراچی

شروع کریں۔ انٹرویوز اور سروے میں رہنمائی تصویریں شائع کریں ساتھ ہی کوئی انعامی سلسلہ بھی۔

✽ ✽ ✽

قارئین! آپ نے پاکیزہ کے حوالے سے سروے کے شرکا کی آرا پڑھیں بلاشبہ جلت رنگ اور بہنوں کی محفل پاکیزہ کی امتیازی صفات ہیں اور یہ اعزاز مدیرہ پاکیزہ انجم انصار کے حصے میں آتا ہے۔ مدیرہ اعلیٰ عذرا رسول صاحبہ نے گزشتہ برس پاکیزہ بہنوں کو پیغام دیجے ہوئے کہا تھا کہ "ہماری یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ ایسی تحریریں شائع کی جائیں جو خیر کی نمائندہ ہوں اور جس سے ذریعہ زندگی پاکیزہ اصولوں کے تحت گزاری جائے۔" بلاشبہ عذرا باجی اپنی مصنفات کے تعاون سے اپنی اس کوشش میں کامیاب رہیں۔

سال رواں بھی محترمہ عذرا رسول نے اپنے پیغام میں کہا کہ "پاکیزہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم ایسی تحریریں شائع کریں جو نہ صرف عورت کے مقام کو بلند کریں بلکہ اس کے توسط سے خاندان کی تعمیر و تشکیل بھی مثبت انداز میں ہو۔ الحمد للہ ہماری تمام مصنفات بڑی محنت، توجہ اور انتہائی محبت اور چاہت کے ساتھ پاکیزہ کے لیے مہیتی آ رہی ہیں۔"

اور اس کا ثبوت تو آپ کو سروے میں شامل جوابات سے بھی مل گیا ہو گا کہ کس طرح پاکیزہ، خواتین کی گھریلو اور سماجی زندگی میں رہنما ثابت ہوا۔ پاکیزہ کے لیے ہماری دعا یہی ہے کہ...

خدا کرے کہ چھوٹا سا انجم تم جو ہر سو کردے اچال وہ آفتاب رہو پڑھے جو تم کو وہ تم کو نہ بھونے پائے مقبوتوں سے جو تمکے وہ تم گلاب رہو (آمین)

بشیرہ





# بہنوں کی محفل

مدیر

ہر عزیز نے جان بہنو! اسلامیکرمت لے رہا تھا

ہر حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو جوہر بخشا اور روزِ اول اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر

بہنوں نے ولیہ میں حق کا بول بٹایا۔

ہر پیاری بہنو! آج میں چند چھوٹی، چھوٹی باتیں آپ سے کرتی ہوں۔ آپ بہ بہرہ لوگوں سے دشمنیاں مت پائیے اور

نہی ہے چھوٹی کو سناٹے میں سر دھڑکی بازی لگا لیں کہ یہ درجہ عات اور اہمیت اپنے ذاتِ صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اگر

آپ باقی کسی پر بہتان لگائیں گی تو اللہ کے غضب و آواز دیں گی۔ ہم یہ تو اکثر دیکھتے ہیں کہ اب لڑکھرائیوں میں، میں

اپنی بیٹیوں سے مشورے کیا کرتی ہیں اور یہ مٹی کی مٹیاں بھی گرتی ہیں بہت سی ماؤں کے بسبب یہ کہہ سکتی ہیں کہ

عزیز بننے تو کیا ان کی بیٹیاں تک کرتی ہیں تو بی بی صدمہ ہوں، بی بی مائیں جوں ازمادہ شکایت ہوں، بہت کر کے کی کچھ نہ

ہو، سب بھی اولاد دہی مٹی کی مٹیاں گرتے گا وہی حق نہیں۔ اب سب ماں نے مجھے یہ بتایا کہ وہ بی بی ایک بیٹی کی مرضی کے بغیر

اپنی شادی شدہ بیٹیوں کو اپنے گھر میں جا بھی نہیں سکتی تو سن کر سخت رنج ہوا کہ تم کس سمت جا رہے ہیں اور اس کے بسبب اولاد

اپنے والدین کو جو جھگڑے ہوتے ہیں تو وہ جانتے نہیں ہیں کہ قدرت اپنے ہاتھوں میں جو کچھ دیتی ہے جس کو مانا اور اس سے اپنے آپ کو

نہ لگائیں اور بھروسہ نہ کرے۔ وہ لوگ بہت خوش قسمت ہیں جن کے والدین بہت ہیں اور بیٹی کو اسے خوش بھی ہیں۔ اس لیے

آج ایک چھوٹی سی بات آپ سے کہوں گی۔ اپنی خوشیوں میں مسرت ہو کر یہ آپ کو اتنا دل ہے کہ آپ کی ماں بھی خوشی سے ان

خوار ہو گئی ہے اور آپ کے والد بھی آپ سے بات نہیں کر سکتے۔

ہر اب سرگرمیوں پر غور کرنا اس سے پہلے کہ آپ ہمارے دور و دراز کی زندگی پر غور کریں جو یہ قدر میں پڑھا جاتا ہے اس سے

بہت حد تک فائدہ ملے گا۔ آپ کو یاد رہے کہ یہ اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پیشانیوں کو روشن کرنے

کے لیے ضرور دیا جائے گا۔

مصنفات اشعارات اور قاریائیں پاکستانی بہنوں کی کاروبار و سرگرمیاں

ہر پاکستانی تھوڑا سا ایسا ایسا کرے گی ان دنوں اور ملتی ہوئی ہیں۔

ہر مصنفہ اشعار ایمان قاری، موت پر غور کر کے ان کے اشعار لکھتی ہیں۔ (مبارک)

ہر پاکستانی مستحق ہے ہر شرف و تکریم، ان کے اشعار لکھتے ہیں اور پھر ان کے اشعار کو سن کر دل میں آسانی

پیدا ہوتی ہے۔ (مبارک)

ہر پاکستانی تھوڑا سا ایسا ایسا کرے گی، ان کے اشعار لکھتے ہیں اور پھر ان کے اشعار کو سن کر دل میں آسانی

پیدا ہوتی ہے۔ (مبارک)

ہر پاکستانی تھوڑا سا ایسا ایسا کرے گی، ان کے اشعار لکھتے ہیں اور پھر ان کے اشعار کو سن کر دل میں آسانی

پیدا ہوتی ہے۔ (مبارک)

ہر پاکستانی تھوڑا سا ایسا ایسا کرے گی، ان کے اشعار لکھتے ہیں اور پھر ان کے اشعار کو سن کر دل میں آسانی

پیدا ہوتی ہے۔ (مبارک)

ہر پاکستانی تھوڑا سا ایسا ایسا کرے گی، ان کے اشعار لکھتے ہیں اور پھر ان کے اشعار کو سن کر دل میں آسانی

پیدا ہوتی ہے۔ (مبارک)



بیتیا سیف اللہ رحمہ اللہ اور ان کی بھانجی فائزہ کی شادی ہوئی۔ (مبارک)

✓ مصطفیٰ غزالی اپنے بھائیوں کے پاس امریکا جا رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

✓ پائیزہ کی مستقل تبصرہ نگار رانیل شاہ کے ہاں بیماری کی بنی ہوئی ہے جس کا ہمارا ہوں نے

انتہائی غلّی رحابے اور اس دور رانیل شاہ کی شادی کی سائلہ بھی ہے۔ (مبارک)

✓ پائیزہ کی مستقل قاری مس زبیرہ مبارک نے بیورو انکوائسٹ میں ایک مہر کلب بنایا

ہے۔ (ماشاء اللہ مبارک)

✓ پائیزہ کی مستقل تبصرہ نگار گلینہ ضیا بگٹش، کراچی اپنی شاعری کا مجموعہ جلد لے کر آئیں

گی۔ (انشاء اللہ)

✓ گلشن و نذر میری ان دنوں اپنی دو داستانیں جمع کر کے ان کو شائع کرے والی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

✓ مصطفیٰ رفاقت جاوید اسلام آباد کی اس ماہ دو کتابیں آئی ہیں اور آئندہ ماہ ایک اور آئے

والی ہے۔ رفاقت ترقی تو تحریروں کی سپر مارکیٹ، بولسید۔ (ماشاء اللہ مبارک)

✓ مصطفیٰ اختر شجاعت اپنے گھر کو جانے اور ستارے میں مصروف ہیں۔ (ماشاء اللہ)

✓ مصطفیٰ اقبال بانو کانی کی سوپ سسرال میری بہن کا بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ (مبارک)

✓ مصطفیٰ سیما من ف، اشکا کو سے واپس کراچی آ چکی ہیں اور جوں سالہ بھانجی کی رحلت پر انتہائی

غمزہ ہیں۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

✓ پائیزہ کی بول نگار رفاقت جاوید اسلام آباد ان دنوں ہسپتال پر ہیں۔

✓ پائیزہ کی مستقل تبصرہ نگار المیس جبار، آزاد کشمیر کی آنکھوں کی روشنی کمزور ہوئی ہے۔

✓ مصطفیٰ شاعرہ عالیہ بشیر، اسلام آباد ان دنوں طویل ہیں۔

✓ پائیزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر، کراچی کو مستقل چکر آتے ہیں اور معدے کی بھی پرانی ہے اور ڈپریشن بھی۔

✓ ناول نگارہ ذرا نگار اقبال بانو کی چھوٹی بہن جمیرا عباس بیمار ہیں۔

✓ شاعرہ مصطفیٰ نیر رانی شوق، ڈی جی خان بیمار ہیں۔

✓ پائیزہ کی مستقل قاری عصمت، لاہور کے بازو کی ہڈی کرکٹ ہو گئی ہے۔

✓ پائیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ اجیتہ عندلیب، سلاوالی ان دنوں شدید طویل ہیں۔

✓ پائیزہ کی مستقل قاری عذرائی بی، راولپنڈی ہنوز طویل ہیں۔

✓ پائیزہ کی مستقل تبصرہ نگار کل شامین، ڈی جی خان کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔

✓ مصطفیٰ شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور کی طبیعت ماساز ہے۔

انتقالِ میرِ ملال

✓ پائیزہ کی تبصرہ نگار وکیڈا یوب، کراچی کی لاہور میں شہر چھوٹی بہن راحت مسیح انتقال کر گئیں۔

✓ پائیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسرت رانی حسیل، کراچی کی جوں سالہ بھانجی طوبی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔

✓ اس ماہ عذرائی بی کے شوہر جناب سید خالد جیلانی کی بری ہے۔

✓ ڈاں اتیلا اچیز جو پشاور سینٹر لی وی کی آرٹسٹ بھی ہیں انتقال کر گئیں۔

✓ معروف بی بی سی براؤز کا سر شاہدہ احمد کراچی میں انتقال کر گئیں۔

✓ مصطفیٰ سیما مناف کی شکاگو میں مقیم جوں سال بھانجی حرارومی راہی ملک عدم ہو گئیں۔

✓ مصطفیٰ غزالہ رشید کی بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں غزالہ گزشتہ دنوں پنجاب گئی ہوئی تھیں۔

✓ نوت کے تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی ہندی کے





لیے دعا کریں۔

آئیے اب ایک نظر اپنے کھلے خطوط پر ڈالتے ہیں

بھیرو اب وہ سیم فنیکی صنعت لوہراں سے۔ پائین وہ بے حد پسند ہے اور اس کی تحریروں سے اور خصوصاً انجم یا جی کی باتوں سے بہت کچھ سیکھتی ہوں مجھے اپنی بہنوں سے یہی کہنا ہے کہ مقدر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ جو مقدر میں ہوتا ہے وہ ضرور ملتا ہے۔ آپ زندگی کی تکلیفوں کو مسکرا کر جیتنا سیکھیں۔" (بہت پیارنی بات بتائی ہے آپ نے)

بھیرو عصمت، اوکاڑہ سے۔ "میں اپنے گھر میں رہتی۔ وراثت میں چوتھی ہے مگر پھر بھی پائیزہ پڑھا۔ مہذراز رسول کا پیغام بہت پیارا لگا اور بہنوں کی محفل اس دفعہ خوب بڑی تھی اور میں اس محفل کو بہت زیادہ پڑھتی رہی۔" (عابر ہے آپ کی اپنی محفل جو بھی)

بھیرو تاجید بنت نور، وہاں سینٹ اور کس سے۔ "بے حد مصروفیات ہیں اور زندگی نے بہت کچھ دکھایا ہے اور میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم نہیں سکتی۔ خاص طور پر جب میرے بچے کا کیڈٹ کالج میں داخلہ ہوا۔ سامرو اور میری خاص نظر اس مرتبہ کا جلتیگ رہا ہر سطر پر مزاج تھی۔ ہمیں عقلی اتفاق کے اندر نے کا اظہار ہے اور شادی کے احوال کا بھی۔" (اس کا آپ شادی کا آنکھوں دیکھا حال پڑھ رہی ہیں)

بھیرو کل شاہین، ڈی جی خان سے۔ "اب تک پڑھنے والے انٹرویوز میں مجھے عزیز و سید کا انٹرویو بہت زیادہ درست لگا ہے۔ پڑھ کر بہت لطف آیا ہے۔ مہذراز رسول جی کا پیغام تو کوزے میں دریا بند تھا انہوں نے بہت پیار سے انداز میں سب بہنوں سے خطاب کیا اور سب کو عزت دی۔ اس ماہ بہنوں کی محفل خوب بڑی تھی بہت ساری سینیٹس شامل تھیں اس لیے طلب بھی زیادہ آیا۔ انجم یا جی اس ماہ سب کو ایوارڈ دے کر سب کو خوش کر دی۔ واقعی اب کوئی بہن ناراض نہیں ہوگی۔ عقلی اتفاق کی تحریر ہمیں بہت پسند آتی ہے اور اس کی کتاب بھی ضرور خریدیں گے۔ دیگر تحریروں میں ہمیں رضوانہ پرنس کی تحریر بہت پسند آئی۔ ماشاء اللہ باتی تحریریں آہستہ آہستہ پڑھ رہی ہوں۔" (آپ کی پرمیت رائے پہنچانی جاری ہے اور معذرت شکر یہ کہتی ہیں)

بھیرو سبکی رضوی، کراچی سے۔ "شادی سے پہلے تو بڑی بات چیت کی تھی پھر اب گاہے گاہے ہی پڑھ پاتی ہوں۔ دو بیٹوں کی مامان بن چکی ہوں مگر جب بھی پائیزہ پڑھتی ہوں وہی محبت اور جاہلیت ملتی ہے جس طرح ابھی آپ سے فون پر بات کر کے مجھے ایسا لگا کرتا تھا کسی بے حد اپنے سے بات ہوئی ہے اسی طرح بہنوں کی محفل پڑھ کر اب بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ اپنے میکے میں آگئی ہوں۔ جلتیگ کی وجہ سے جہاں سسرال کی باتوں پر مجھے رونا چاہیے وہاں بھی آتی ہے اور آگئی ایسا

سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ لڑکیوں کی سسرال کے ماحول معاشرتی میڈیا کی ترقی کے باوجود ویسے وہی ہیں۔ جب میرے شوہر مذاق میں مجھ سے کہتے ہیں کہ تم ایک مختلف ماحول میں اس وجہ سے آئی ہو تاکہ زندگی کے سبق حاصل کرو تو میں ان سے اسی ٹیون میں کہتی ہوں آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں سب کو سبق دیتے آئی ہوں تاکہ ان لوگوں کو بھی تبدیلی کا کچھ احساس ہو۔" (گڑبڑ مذاق میں ہے شک سب کچھ ادا کر دیے کچھ نہ کہو اسے گیت پر عمل کرتی ہوں اطمینان کی گئی ہے)

بھیرو قمر النساء، گوجرانوہ سے۔ "جہلی مرتبہ آپ سے رابطہ کر رہی ہوں۔ میں سب رسائل پڑھتی ہوں۔ سب بچوں کی شادیوں سے بھی فارغ ہو چکی ہوں میں۔ مگر مہذراز رسول کے پیغام کی حمایت کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گی کہ پائیزہ کا حراج علیحدہ ہی ہے اور اس میں محبت کا ہر رنگ موجود ہے۔ مجھے آپ کی تحریریں دل سے پسند ہیں۔" (اس محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں اپنے ہر قاری کی شرکت بھی دل سے پسند ہے)

بھیرو فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ "اب تو عرصہ دراز ہو گیا ہے پائیزہ کو پڑھتے ہوئے اور اس میں تبصرہ دیتے ہوئے۔ اس کو بہنوں کی محفل، جلتیگ اور پھر روحانی مشوروں کی وجہ سے پڑھا اور پھر اس کے گرد یہ ہو گئے۔ گزشتہ ماہ روحانی مشورے کے صفحات قابل تھے اور بہنوں کی محفل میں شبلا کا خط پڑھ کر آپ سے اور مہذراز رسول سے یہ کہنا چاہوں گی کہ آپ مارکیٹ سے تمام رسائل لے کر دیکھ لیں کبھی کسی ایڈیٹر یا مصنف کے لیے اس طرح کے جٹک آمیز خطوط شائع نہیں کیے جاتے تو آپ لوگ کیوں شائع کرتے







ہیں۔ اگر کسی کو کسی وجہ سے ولی جنس ہو رہی ہے تو وہ خود طبعی ہمیں ایسی تکلیف میں پلیر جلا نہ کریں (بہتر) میری دعاؤں میں نہ صرف پاکیزہ کی تمام بینش بندہ ہوئے ولی بینش یعنی عروج و طرحانہ تازہ شادی ہو جوری چاندنی عمران وغیرہ سب رکتی ہیں۔ (جزاک اللہ)

بہتر گلزار محبوب، کراچی سے۔ "پاکیزہ کا ساتھ نمبر بہت خوب صورت لگا۔ اس کی فحش تو صرف روحانی مشورے نہ کہنے کی تھی۔ ہم یہ صفحات نوٹو اسٹیت کروا کے آگے بھی تقسیم کیا کرتے ہیں۔ میری فرمائش ہے کہ بتائیں ایسی ہی کا انٹرویو کیا جائے اور انٹریز کے انٹرویو میں سوالات ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی پوچھے جائیں۔" (بہتر بہتر انٹریز ذاتیت کے بارے میں جواب دینا نہیں چاہتیں تو ہمزیادہ صبر اور نہیں کرتے)

پیارا بابا بلوچ، میرپور خاص۔ گریبا اپنی تکلیفیں اور مراسلات ایک ساتھ بھیج دو۔ میں انہیں شامل کرتی رہوں گی۔ ہاں تمہاری دلہن بنی ہوئی تصویر نہیں لکے پر بھی بھیجی بہت پیاری تھی۔

پیارا بابا، کیرہ جان و پشاور۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اپریل 1998ء کے پاکیزہ کے سرورق کی واٹس ایلا ایڈز کے انتقال کی خبر دی۔ ہمیں دلی دکھ ہوا اور ہم سب پاکیزہ قارئین ان کی مغفرت کے لیے ضرور دعا بھی کریں گے۔

سید فرخندہ لطیف، دھیم یار خان سے۔ "ساتھ نمبر ملا اور تمام مصروفیات کو پس پشت ڈال کر رسالے کا جائزہ لیا۔ سرورق کو سراہا پھر مجھے کہتا ہے کی پڑا اور حقیقت پر مبنی آپ کی تحریر پر مبنی۔ لفظ لفظ سچائی پر مبنی اور پڑا۔ محترمہ ہزاروں صاحب کا یہ قیام صورت کے حوالے سے جو تحریر کیا وہ متاثر کریں اور ہزاروں آپ نے بالکل ٹھیک کیا کہ انجم آئی و اللہ پاک نے ایسا محبت بھرا دل دیا ہے کہ بہت جلد

دوسروں کو اپنا کر دیدہ کر لیتا ہے۔ نئے آنے والوں کو کچل سے ذرا بھی جواجنہیت کا احساس ہو اور شادی کا احوال وہ بھی عظمیٰ جی کے قسم سے مجھے تو سوچ کر ہی مزہ آ گیا ہے۔ اعتبارہ قاضی حال کے ساتھ ہاشمی سے مناسباتی ہوئی۔ ارتقا کا رواج عجیب ہے وہ اتنی چھوٹی نہیں ہے جو رشتوں کی پیچیدگی نہ کر سکے۔ رفعت سراج صاحب کی تخلیق کی دلکشی تو مجھے بیحد ہی متاثر کرتی ہے۔ اچھی تھی تحریر۔ مستاحول میں مارہ نے شاہ زیب کو ٹھیک سے کاٹھ کا الو بنایا ہے۔ گہمت اٹھنی لے ایک تلخ حقیقت سے پردہ اٹھایا۔ واقعی ہمارے معاشرے میں کالے رنگ کی وجہ سے انسانی ذات کے بقید تمام پہلو اور خوبیاں فراموش کر دی جاتی ہیں۔ تم میرے کون ہو میں راجیل اور اس کی بیوی کا فیصلہ درست تھا کیونکہ عورت اپنے شوہر کی بے وفائی کو بھی معاف نہیں کرتی۔ صبیحہ شاہ کی خواب ڈاوی سے متاثر کیا۔ جلد رنگ میں آپ کی فحش بھی تحریریں بہت مزہ دیتی ہیں۔ اس بات پر اتنا مزہ آیا کہ بتاؤں کتنی۔ کمال بدل جائیں گے۔ سی سی سی۔ پاکیزہ ڈائری عظمیٰ جی نے خوب صورت نگہ سے کی طرح سچائی جس میں ہر رنگ اور خوشبو کا پھول تھا۔" (بہتر بہتر کا شکریہ)

بہتر حسینی غزل، کراچی سے۔ "سب سے پہلے بہنوں کی محفل پر مبنی سب سے زیادہ بہنوں کے تھمرے اور آرا بھی لگتی ہیں پھر آپ کی جھڑنگ جھڑنگ کا تو جواب ہی نہیں۔ میں خود 33 مئی کو امریکا جا رہی ہوں اس لیے اس کی تیاریاں پھر دونوں بیٹوں کی فرمائشیں۔ میاں صاحب تو صرف آؤ روئے دیتے ہیں اور بندی بازروں میں دوڑتی رہتی ہے اوپر سے شدید گرمی لیکن زندگی کا حسن یہی ہے۔ مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ غم بھی ہوا کہ لوگ کسی کی خوشی میں خوش نہیں ہوتے حسد کرنے والے کو گویا خدا اب دنیا میں موت کا انگینہ اندک کے گھر بھی خدا اب۔ دیئے بیٹی سے کہتے کہ بھی ایسا تو ہوتا ہی ہے اس طرح کے کاموں میں بقول شاعر ہوئی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ فحش کو بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ ان راہوں میں پھول کے ساتھ خار بھی ہیں اور نادیہ اور انجائے لفظوں کے تھ بھی (اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں) رفعت سراج کا میں شانزے ہوں مختصر اور بلکی پھلتی تحریر لیکن اس میں رفعت سراج کی تحریریں جھٹکتی ہیں۔ محبت اٹھنی لے بھی خوب لکھا ہے حقیقتاً گور رنگ خوب صورتی کا معیار نہیں مگر ہماری آدمی سے زیادہ دنیا گور سے رنگ پر مبنی ہے۔" (ہاں یہ تو ہے۔ گور سے رنگ کو پسند کرنے والے بہتر زیادہ ہیں)

بھہ تھڑیلہ زاہرہ افضل، زہور سے۔ "اس کا پائیزہ تو دیکھا ہے مگر پڑھا ابھی صرف مثنوی۔ یہ کانٹو دیوی ہے جو خاصا دلچسپ تھا۔ آپ میں ایک افسانہ بھیج رہی ہوں اس کا موضوع اور مختلف ہے اس سے ذرا دوری ہوں۔ جس نے آپ سے شاعری کر لی یا نہ کر لی یہ حساس نوعیت کا ہے کیونکہ ہم خدائے پرست سے کہے اور روشن خیال ہونے کے باوجود انکس اعلیٰ دنیا کے معاملے میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو برسوں ان کے دل میں کانٹن طرح پہنچی رہتی ہے۔ ایک حقیقی دانشور دنیا، دنیا پر یہ افسانہ میں نے تحریر کیا ہے کچھ تبدیلیاں، نسبت کی ہیں۔ آپ نے ملنے والوں کو شادی موقع پر یہ کہہ دیا بھی کہ جو اپنے نیا کا اٹھارہ گھر میں کمرہ میں تو سبکی کہوں گی کہ ضروری نہیں کہ ہر نیا کہتے ہیں۔ خاموشی تھی اور اس کا مہم جو بھی تھا افسانہ اور بعد وہ ہوا۔ اگر یہ تمہارے مختصر خط کے ساتھ تمہارا افسانہ بھی پڑھا اور مجھے بہت اچھا لگے ہے۔ تمہارے اندر ایک بہت اچھا افسانہ نگار چھپا ہوا ہے تم مختصر افسانے جلدی، جلدی بھیج سکتی ہو افسانہ اس کتاب میں ہے۔

مجھے کتنی زہری، دوست محمد سے۔ "جی مائل خاصہ دلچسپ لگی۔ مثنوی بھی دیکھی آپنی یہ الفاظ بھی پڑے جاؤں تو ہوتے ہیں اپنا بھر پور اثر چھوڑ جاتے ہیں جیسا کہ آپ کا پتہ کہتا ہے جو ہمارے دلوں پر بہت خاص اثر چھوڑ جاتا ہے ابھی کی کا دل بڑھ جاتا ہے تو کتنی کسی کو آئینہ بھی دکھا دیتا ہے پھر مختصر مدد دار رسول کا بیچ میں بھی زندگی سے بھرپور وابستہ اچھا لگانے کے بیٹے کی شادی کا احوال جاننے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف اظہار وفاق سے لے کر معصوم تک ایک ساتھ سب کی تعریف کرتی ہوں۔ محبت، رفاقت، جاوید، تہذیب، ابرار، اعلیٰ الفجر، درخشاں، پریم، زمر، نعیم، زاہدہ، پروین، رفعت، سراج، نگہت، اعلیٰ، نوشین، ناز اختر، غزالہ فرخ، صبیحہ شاہ، قرۃ العین خرم، شیریں حیدر، فرحین عثمان، ہاجرہ، رحمان آپ سب کا کیسے شکر یہ ادا کروں اس بار آپ سب نے حقیقت میں میرا دل جیت لیا۔ میں پوری طرح سے خدا ہوئی اس پر آپ سب نے پھر اس انداز میں لکھا ہے کہ تعریف کے لیے دل کرتا ہے میں وہاں پہنچ جاؤں۔ مثنوی سید سے ملاقات بہت بھائی دلی کو دل مجھ میں تھا کہ ہم گھر بیٹھے، بیٹھے خاص لوگوں سے ملاقات کر لیتے ہیں میرے خیال میں ان راز اور آپ کی وجہ سے پائیزہ کا میاں ہے اور میں بھی اپنی رائے دینے کا پورا پورا حق دیا ہے۔" (پائیزہ کی پسندیدگی کا شکر اور اب یہ ساگر و نمبر 2 بھی آپ کو پیشکش کرنا چاہتا ہوں) مجھے سنیسم رضاؤ و الفقار، قیصل آباد سے۔ "قرۃ العین کی بچی نہیں کی، ارے اوپنی جب عزت نفس کی پامالی ہو تو اچھے سے اچھا سجادہ سر خان اور دیگر سہولیات کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا بھی دل نہیں کرتا۔ میں رضا کی اب صبح ہونے کو ہے اگر میرا حوا کی بیٹی مای جی جرات کر لے تو عزت کے کتنی سوئی کی حفاظت کرتا کچھ بعد نہیں۔ ام جی کی بلانوں جو کارڈ پر دی گئی ہے میں ایک ہی بیٹی کی مختلف رشتوں کی نوعیت سے مختلف سوچ پڑھی ہے تحریر حقیقت پر مبنی تھی۔ سنی غزل کی کہانی میں سونیلی ماں کے سوک سے مراد اور عورت کے ظرف کا موازنہ کیا جاتا چلا کہ عورت کا دل محبت سے لبریز ہوتا ہے۔ بہت حوا کی ہر دن نیا دن واقعی انسان کی لائیں خیر و شر تو عسیرت کی طرح منہ کھولے کھڑی ہوتی ہیں۔ جاوید اور چار دیواری آج کی بیٹی کو بظاہر خوب اوزہ دیا اور ہاتھ میں موبائل اسے کرکھ لیا کہ بیٹی پردے میں کھڑی ہے۔ اچھا جے یوں نے اچھا فیصلہ کیا۔ جے اے تھے اللہ حیرا چلوں کرکھ کو پتا چلا کہ اتنی بڑی بڑی باتیں کرنے والے اصل میں بڑے نہیں ہوتے۔ شیریں حیدر کی آئینہ نے یہ سبق دیا کہ کسی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔" (فصلی تبصرے کا شکریہ)

مجھے اقبال بانو، بڑے والا سے۔ "پیسے تو پائیزہ کی ساگرہ مبارک ہو۔ اللہ سے دعا ہے کہ یونہی ذخیروں ساگرہ منے رہو آمین (خیر مبارک) سب سے پہلے حسب سابق میں نے ادارہ پڑھا جو ہمیشہ ذہن کی کئی کھڑکیاں کھول دیتا ہے۔ مجھے آپ کا ادارہ بہت پسند ہے اور پھر بہنوں کی محفل سب بہنوں کی خیر خواہ رہتی ہے۔ تال دو نوں اچھے چار سے ہیں۔ دولت تینوں پسند آئے اور زمر نعیم کے دل کی دوسری قسط بھی اچھی لگی۔ رفعت سراج بھی بلکے پھٹکے افسانے کے ساتھ حاضر ہیں مزہ آیا۔ نگہت، اعلیٰ، نوشین، ناز، قرۃ العین خرم، شیریں حیدر اور ہاجرہ رحمان نے بھی بہت اچھا لکھا۔ صبیحہ شاہ عرصے بعد خواب زادی لے کر آئیں لطف آگیا۔ زینی اور مرثیٰ نفرت کے راستے بھی پسند آئے۔ شائستہ زمر میں سروے بہت اچھے کرتی ہیں۔ خاصہ محنت کرتی ہیں جو نظر آتی ہے اور جناب اب بھرتے ہیں اس بزم میں جو ہماری رائے راز کے















بڑھ کر دل کو تسلی ہوئی کہ ساگر ہیر 2 میں بہان کے صاحبہا کی شادی کا اعلان پڑھ سکیں گے۔ منظر ہیر سے ملاقات بہت  
 اچھی تھی وہ اپنی تحریر کی پختگی کی وجہ سے مجھے بہت پسند ہیں۔ شائستہ زور کے لیے سراسر میں شائستہ خان کی باتیں اچھی تھیں۔  
 اس مرتبہ پاکیزہ ڈائری اور سندیت دونوں نے دل میں تھر تھرا کر فریادیں کی کہ ان کو یہ کہیں۔ انہوں نے مکمل جوش و خروش  
 طرح ذوق شوق سے پڑھا میں عندیہ سے دلی افسیت محسوس ہوئی ہے اللہ تعالیٰ شفق کے کامد ملاحظہ فرمائے، آمین۔ بہت ہی  
 حاسدین پنکس عظمیٰ اور آپ کی تعریف انہیں نہیں کر پاتیں جو کہ ہر چیز میں بہت سراں گزرتی ہیں ان کے لیے اتنا ضرور کہوں گی  
 کہ انہیں چیز کی کشادہ دلی سے تعریف کرتے ہیں انہیں خواہ وہ آپ کا مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ محبتوں کے جواہر میں ہمیشہ نکلتی ہی جاتی  
 ہیں۔ آپ سے بات کرنے مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی بہت اچھے عزت مند۔ یہ میری ہی کیفیت نہیں تحریر یا مشترکہ تحریر کے احوال  
 کی یہی آواز ہے۔" (تحریر یہ آپ کی محبت ہے۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہیں اور ہر طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی بات نہیں  
 کسی کو دکھ دے کر بھی خوش ہوئی ہے تو کیا کہہ سکتے ہیں)

سید بشری باجوا، اداکارہ سے۔ "سب سے پہلے پاکیزہ کی ساری بہت بہت مبارک ہو اللہ تعالیٰ پاکیزہ کو دن رات  
 چمکتی ترقی دے، آمین۔ عذر و رسول کی شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ عظمیٰ شوق دانہ اچھا سفر تمام غصے کی بھی مبارک  
 ہو۔ اپریل میں ہی میری سارگرم ہوئی ہے اور اس اپریل ہی میں میری شادی کی بھی مبارک ہو ہے۔ آپ کا ازالہ ملاقات چلا گیا میرا  
 افسانہ لگا ہے۔ جی کی پیدائش کی وجہ سے ذرا غصہ نہ لے سکی اب یہ ہے۔ اللہ نے ہی اشد امت پر آپ کا شکر ہے۔ سندیت میں اپنی  
 کاوش خواہش دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مارچ کے پاکیزہ میں تمام افسانے لکھے تھے جن جن سکرڈ نے میری تحریر کو پسند کیا ان کا یہ  
 حد شکر ہے۔ اپریل کا پاکیزہ کچھ پڑھا ہے کچھ نہیں پڑھا ہے اچھا جو رہا ہے جبکہ رشتہ خشن ہو گا ضرور مت ڈریں گے۔ اسیر و فانی  
 آئندہ دیکھ کر کوفت ہوئی۔ عزیز ہیر سے ملاقات خوشوار رہی۔ آپ اشعار والا سلسلہ پہلے کی طرح اعلیٰ کر دیں تو بہتر  
 ہے۔ جلتے رنگ پڑھ کر موز خوشوار ہو گیا جو جو پنکس بیمار ہیں اور پریشان ہیں ان کے لیے دعا ہے کہ اللہ عزوجل ان کو صحت و تندرستی  
 دے اور ان کی پریشانیوں اور فرماے، آمین اور خاص طور پر امینہ عندیہ کے لیے بہت ہی دعا میں۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

سید امینہ عندیہ، سلاٹوالی سے۔ "ادارہ پڑھا آپ نے ہاگل جی کسے۔ تجوئی، ذہنی انتشار، انہوں نے بے بسی، اللہ تعالیٰ  
 نیک، اگر خلوص کے لوٹ لوگوں سے یوں ملتا ہے کہ ہم اپنے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ہاگی عذر و رسول ہمیشہ کی طرح سارگرم ہیر  
 میں سب کو خوش کرتی ہیں۔ محترم پیار دی باجی انجم انصاری کی کاوش اب لوٹ محبت کو ہم اپنا ہر افسانہ ہر انشور ہر انکار ہر شاعرہ  
 بہنوں کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ بہت بہت شکر ہے۔ ہاگی عذر و رسول۔ ہا قائل فرسوش جنم دن، معروف شخصیات  
 سے ہماری شائستگی مزاج بہن شائستہ زور نے ملاقات کر لی۔ نیو فرم جی صلیب بہت اچھا لگا۔ شائستگی  
 زوریں بہن کی والدہ محترمہ آج کل بیمار ہیں۔ اللہ تعالیٰ شفقت کے کامد ملاحظہ فرمائے، آمین۔ محترمہ عزیز ہیر سے  
 بہت سے بعد طویل ملاقات اچھی تھی۔ نعمت رسول قبول فرمائے ذکیہ بیگم امی کا کلام اب حد خوب صورت تھا۔  
 شکستہ تفتیش کی شاعری، جلتے رنگ، تبدیلی بہت اچھا لگا۔ روحانی مشوروں کی کمی رہی۔ ساگر ہیر کے اس موقع پر  
 آپ نے انتہائی سادگی، منفرد انداز، دلی دواؤں، پیار سے سب بہنوں کو خوش کیا۔ بس ایسا ہی آئندہ کرنا۔  
 اب کسی بہن کو کوئی گلہ نہیں رہے گا۔ محفل میں شہد کے فہرے بہت دلچسپی رہا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی لاہور والے  
 لوگ میری باجی انجم انصاری کیلئے کیوں پیچھے پڑ گئے ہیں؟ (سب کو تو نہ کہو۔ لاہور والے شہر میں سبھی رشتہ  
 مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں) انہوں نے اس بات کا بغیر سوچے سمجھے ایسے مضامین لکھنا اذیتناک پر تنقید کرنا مجھے  
 لوگوں کا شیوہ نہیں۔ (اگر یہ واقعی کوئی سوچتی سمجھتی ہے تو صرف یہی کہہ سکتی ہو کہ اللہ سب کو ہدایت دے  
 مگر مجھے کسی کی بات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی ہے کہ سب شک اللہ کا کرم میرے ساتھ ہے) میں اپنی پہلی  
 نوٹیشن ساگر کو ملنے لاہور گئی تھی۔ میری پڑائی کئی خوشی نے میری خدمت و محبت میں کوئی کسر نہ  
 چھوڑی۔ میرے کھانے پینے، آرام کا اس طرح خیال نہ رہا جیسے ماں بچوں کا کرتی ہے۔ نہ صرف نوٹیشن نے  
 بلکہ ساگر بھائی نے اپنے مظلوم ساگر، سارو ساگر، امینہ، ساگر نے بھی بے حد خیال رکھا۔ واقعی سفر کے دوران  
 طبیعت خراب ہوئی ابھی تک سنبھل نہیں سکی۔ 21 مارچ کو ہارٹ کی تکلیف سے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

















## پاکستان کے لئے قرآن کریم کی عظمت کی آفاق وسعیت

میں دیوانہ آؤں گا رہا ہوں، رہوں گا  
زمانہ نہ بنے گا مگر میرے آقا  
مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا  
مجھے اپنے قدموں میں رکھ لیجیے گا  
از: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

### قرآن کریم

یہ کتاب اللہ کا فضل ہے، مذاق نہیں ہے جس ظالم  
نے اس کو چھوڑا اللہ نے اس کو تباہ ویران کر دیا۔ جس نے  
اس کے سوا کسی اور سے ہدایت چاہی اللہ نے اس کو گمراہ  
کر دیا۔ یہ اللہ کی مضبوطی ہے۔ یہ ذکر حکیم ہے۔ یہی  
مراط مستقیم ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس سے خواہشات  
میں بگاڑ نہیں آتا۔ علما اس سے سیر نہیں ہوتے۔ یہ اتنی  
کثرت سے پڑھے جانے کے باوجود پرانا نہیں ہوتا۔  
اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہی وہ کتاب  
ہے کہ جب جس نے اس کو سنا تو وہ یہ کہنے سے باز نہ رہ  
سکے کہ ایک عجیب قرآن ہم نے سنا ہے جو راہ ہدایت کی  
طرف رہنمائی کرتا ہے سو ہم اس پر ایمان لے آئے  
ہیں۔ جس نے اس کے مطابق کیا اس نے بچ گیا۔ جس  
نے اس پر عمل کیا اس کا اجر اسے ملے گا۔ جس نے اس  
کے مطابق فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا۔ جس نے  
لوگوں کو اس کی طرف بلایا اس نے صراط مستقیم کی طرف  
بلایا۔ اسے امور اسے تمام لو۔

(جامع ترمذی: ۱۱۸/۲)

مرسلہ: ام ایمان قاضی، کوٹ چٹھہ

### خوش نصیب

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے

### حمد باری تعالیٰ

ہے واحد و یکتا تمہاری ذات  
سجائی ہے خوش رنگ یہ کائنات  
محمدؐ ہوں گوتم ہو عیسیٰؑ کہ اور  
کبھی کی زباں پر ہے تیری بات  
رحیم و کریم و غفور تو  
ذرا اب منادے میری مشکلات  
مجھے اپنی یادوں میں رہنا سکھا  
مخالف لگائے ہوئے ہیں گھات  
یہی روز محشر کرم چاہیے  
کہ اعمال نامہ ہو دائیں ہات  
شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

### نعت رسول مقبول

اگر چھوڑ دے مجھ کو سارا زمانہ  
ملے جب نہ مجھ کو کہیں بھی ٹھکانہ  
تو عاصی پہ اپنا کرم کیجیے گا  
مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا  
میں عاشق نبی کا بتا دوں گا سب کو  
فن میں بقاء ہے دکھا دوں گا سب کو  
میں سہ لوں گا ہر غم مگر پیارے آقا  
مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا  
گناہوں کی چادر میں لپٹا ہوا ہوں  
چھپایا ہے چہرہ کہ سہا ہوا ہوں  
مجھے دستہ شفقت عطا کیجیے گا  
مجھے آپ اپنا بنا لیجیے گا  
مدینے کی گلیوں میں پھرتا رہوں گا

میری ازان بھی ہو پروانہ وار یا نصیب  
عشقِ نئی میں ہوش نہ آئے ابھی مجھے  
محبوب کا سار قصہ دیا نہ وار جو نصیب  
شاعرہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

### ماں

ماں کے لیے سب کو چھوڑ دینا لیکن سب کے  
لیے ماں کو مت چھوڑنا کیونکہ ماں جب روتی ہے تو  
فرشتوں کو بھی رونا آجاتا ہے۔

### باپ

باپ کی موجودگی سورج کی طرح ہوتی ہے۔  
سورج گرم ضرور ہوتا ہے لیکن یہ اگر نہ ہو تو اندھیرا چھا  
جاتا ہے۔

از: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

### میری ماں کی دعائیں

اپنی بیمار ماں سے  
فون پر بات کرتے ہوئے  
اکثر میں یہ سوچتی ہوں  
ان کی دعاؤں کی یہ تسبیح  
ابھی نہ ٹوٹے

شاعرہ: غلطی آفاق

مرسلہ: نوشین ساجد، ڈی جی خان

### ذرا سی بات

ذرا سی بات کہنے کو تو ذرا سی بات ہوتی ہے مگر  
اکثر لوگوں کی زندگی میں ہلچل مچا جاتی ہے، کوئی اپنی  
زندگی ذرا سی بات کے لیے ختم کر لیتا ہے تو کوئی ذرا  
سی بات سننے کے لیے برسوں انتظار کرتا ہے۔

از: منور شہزادی، گوجرانوالہ

### غلطی

ڈاکٹر نے پہلوان سے پوچھا: ”جناب آپ کا  
کدھا کیسے اتر گیا؟“

فرمایا: ”اللہ کے بندوں میں کچھ ایسے خوش نصیب  
بھی ہیں جو نبی یا شہید تو نہیں ہیں لیکن قیامت کے  
دن بہت سے انبیاء اور شہداء ان کے خاص مقامِ قرب  
کی وجہ سے ان پر رشک کریں گے، صحابہؓ نے عرض  
کی: یا رسول اللہ ہمیں بتا دیجیے کہ وہ کون بندے  
ہیں؟ آپ نے فرمایا: ”وہ لوگ ہیں جنہوں نے بغیر  
کسی رشتہ اور قربت کے اور بغیر کسی مالی لین دین  
کے محض خوشنودی خداوندی کی وجہ سے باہم محبت کی،  
پس قسم ہے خدا کی ان کے چہرے قیامت کے دن  
نورانی ہوں گے بلکہ سراسر نور ہوں گے اور نور کے  
بندوں پر ہوں گے۔“

(سنن ابی داؤد، معارف الحدیث)

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلاوالی

### رحمت کا سایہ

جب آپ کے ماں باپ بڑھاپے کی طرف  
ماں ہوں تو ان سے اپنی طاقت اور ساتھ ملکہ نہ کر جا،  
ان کے لیے رحمت کا سایہ بنے رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ  
ہر چیز حاصل ہو جائے لیکن یہ حسرت رہ جائے کہ ان  
کی خدمت نہیں کی پھر اس کا مداوا نہیں ہوگا۔

داصف علی واصف

از: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

### بانصیب

حسرت ہے نئی جی ترا دیدار ہو نصیب  
مرقد پہ حاضری مجھے ہر بار ہو نصیب  
شہرِ نبی کے موسم ہیں جیسے کل جہان سے  
جا کے وہاں پہ روح بھی سرشار ہو نصیب  
دنیا کے جھمیلوں سے فرصت جو پاؤں میں  
پھر حاضری وہاں کی ایک بار ہو نصیب  
نظروں سے لوں میں گنبدِ خضریٰ کی بلا میں  
حسرت مری ہو جائے شمر بار یا نصیب  
پنچھی ازان بھرتے ہیں گنبد کے آس پاس

پیلوان نے شرمندگی سے کہا۔ ”جناب میں نے غلطی سے بچے کے اسکول کا بستہ اٹھا لیا تھا۔“  
از: شہزادی، فیصل آباد

### وجہ خاص

ایک شخص میڈیکل اسٹور پر گیا اور بولا۔ ”مجھے زہر چاہیے۔“

میڈیکل اسٹور والا بولا۔ ”میں آپ کو اس وقت تک زہر نہیں دے سکتا جب تک کہ آپ کے پاس اجازت نامہ نہ ہو۔“

آدمی نے اسے اپنے دو تاج مامے دکھائے۔  
تب میڈیکل اسٹور والا حیرت سے کہنے لگا۔ ”پو پتر وڈی بول دے پائی نوں۔“

از: شہناز جاوید، کراچی

### سب کے سب

ان کی کالی آنکھوں میں ہیں اتھر مٹر سب کے سب  
چوتو دانو جھریاں وریں خنجر انجر سب کے سب  
جس دن سے دور دھڑے مجھ سے یہ بھی روٹھے، روٹھے ہیں  
چادر وادر، تکیہ ہلکے ہنر و ہنر سب کے سب  
مجھ سے پھلنے کے وہ بھی کہیں اب یہاں پہلے جیسا ہے  
پھلنے کے کپڑے و پڑے، زور شور سب کے سب  
آخر میں کسی دن ڈوبوں گا فکرین کرتے رہتے ہیں  
دریا دریا، کشتی کشتی، لنگر و لنگر سب کے سب  
دکھ کے شہر کے باقی ہیں یہ درد شہر کے باقی سب  
محسن و حسن، غالب و الب، ساغر و افراس سب کے سب  
مرسلہ: تازنین آفریدی، پشاور

### محبت

ایک کنیز آدھی رات کو کھڑی دعا کر رہی تھی۔  
”اے اللہ! اس محبت کے صدقے جو تجھ کو مجھ سے ہے، میری دعا قبول کر لے اور میرے گنہ معاف کر دے۔“  
مالک کی آنکھ کھل گئی۔ اپنی کرخت آواز میں

کہا۔ ”تو یہ کیسے دعا کر رہی ہے کہ اللہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔“

کنیز نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”مجھ سے محبت نہ کرتا تو مجھے رات کو نماز تہجد پڑھنے کی توفیق نہ دیتا۔ میں بھی تیری طرح سو رہی ہوں۔“

مرسلہ: سہما ممتاز عباسی، لاہور

### بیٹیاں

بیٹیاں تو وہ ہیں تم جس کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ  
وے دو آف کیے بغیر تمہاری پگزیوں، داڑھیوں کی  
لاج رکھنے کے لیے ساتھ ہو جیتی ہیں۔ سسرال میں  
میسے کی یاد آئے تو چھپ، چھپ کے رو جیتی ہیں۔ ابھی  
دعویٰ کے بہانے تو بھی پیاز کاٹنے کے بہانے آنسو  
بہا کر جی بکا کر لیا تو کبھی آتا ہوتا دھتے بہتے آنسو آنے  
میں جذب ہوتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ ان  
نعمتیں رونے میں ان بیٹیوں کی آنکھوں کا بھی کتنا  
پانی شامل ہوتا ہے سو ان کی قدر کرو کہ یہ آنکھیں  
بڑے نازک ہیں۔ باہل کے گھر میں نازک  
آگنیوں، کول منہ بند کلیوں، ازلی پھرتی رنگ برنگی  
تختیوں جیسی بیٹیاں ماں، باپ کی خدمت کرتی یہ  
کلیاں جب سسرال چلی جائیں گی تو تمہیں بہت یاد  
آجائیں گی۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

### نظم

اے بیٹ بیٹ فرینڈ سید حافظ طلحہ نعیم ہاشمی  
(مرحوم) کی سالگرہ پر لکھی گئی نظم آپ سب کی نذر۔  
سبھی دوست مل کے

تمہارے لیے  
ایک کیک بناتے  
اپنی اپنی دعاؤں کی  
کینڈل سے اس کو سجاتے  
شرارت سے مھر پور



## ماں

میں  
میرا ہست  
میری کاپی  
میرا فنن  
میرے کپڑے  
کچھ بھی نہیں چھوڑا  
یہ کیسے درندے تھے  
اسے بھی مار ڈالا تھا  
مجھے بھی مار ڈالا تھا  
سبھی دیواریں کالی ہیں  
سبھی دیواریں سرخ بھی ہیں  
سبھی ہیں خون میں رنگی  
میں تو سانس لے رہا ہوں  
مگر جو

میرے اوپر تھا وہ اب رہا نہیں باقی  
میں بے آواز رہتا ہوں  
میں اب رو بھی نہیں سکتا

شاعرہ: صائمہ سجاد بگلش، کوہاٹ

## سنہری باتیں

ہم کمزور ہے وہ شخص جو دوست نہ بنا سکے اور  
اس سے بھی کمزور ہے وہ شخص جو بنا ہوا دوست  
کھو دے۔

ہم دوستی پیاز کی طرح ہوتی ہے جس کا ہر پردہ  
دوسرے پردے کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اس کو جدا  
کرو گے تو صرف آنسو ملیں گے۔

ہم احساس ہمیشہ وہ انسان کرتا ہے جو خود غرض  
نہ ہو کیونکہ احساس ہی وہ چیز ہے جو رشتوں کی بنیاد  
ہوتی ہے۔

از: مہرین ضیا بگلش، کراچی

ہم دوستی پیاز کی طرح ہوتی ہے

ڈراک چاکلیٹ سے بنا

ایک پھول آتشیں

تمہارے لیے اس پر سجاتے

اس پھول کے علاوہ

سارا ایک ہم خود ہی

کھا جاتے

اسے کاش ہم تمہاری سالگرہ

کچھ اس طرح مناتے

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

## اندازہ

عورت کی دیریری کا اندازہ مرد کو اسی وقت  
لگ لینا چاہیے جب ایک بندہ اسے لینے 500 آدمی  
کی بارات کے ساتھ جاتا ہے اور ادھر سے وہ شیرنی  
اکیلے ہی آ جاتی ہے۔

از: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤ الدین

## غزل

اب آیا ہے خوشیاں منانے کا موسم  
بساطِ محبت بچھانے کا موسم  
گلستاں، گلستاں چمکتی ہیں کلیاں  
یہ موسم ہے غنچے کھلانے کا موسم  
فضاؤں میں مستی سی چھائی ہوئی ہے  
ہے پھولوں سے آگن سجانے کا موسم  
بڑی نرم رو ہے یہ باؤ بہاری  
سے صحرا میں سبزہ اگانے کا موسم  
کھنکتے ہیں رنگن بھرے بازوؤں میں  
ہے پاؤں میں پائل سجانے کا موسم  
میں آہٹ پر تیری سٹ سی گئی ہوں  
ہے گستاخیوں سے بیتانے کا موسم  
میں چن، چن کے کلیاں شفق رکھ رہی ہوں  
پھر آیا ہے گجرے بنانا کا موسم

شاعرہ: نیرانی شفق

مرسلہ: صبا نور علیہ

# جلت رنگ احسن انفسار

## آپ کی اپنی

”پیارے میاں جانی!“

محبت بھر اسلام!

یہ کیا کہ جاتے ہی آپ نے مجھے ڈرافٹ بھجوا دیا۔ ایسا نہ کریں پیسہ اپنے پاس ہی جمع رکھیں بعد میں کام آئے گا۔ آپ مجھے ڈرافٹ بھیجتے ہیں تو سب کو ہرا، ہراساں جیسے لگتا ہے۔ آپ کی آپ ادھار مانگنے آ جاتی ہیں اور بھائی فوری ضرورت کا پورہ اٹھا لیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے خرچ کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لیے آپ میری امی کے گھر پر ڈرافٹ بھیجا کریں اور اس کا کسی سے تذکرہ بھی نہ کیا کریں۔ آپ جو جانے سے پہلے پلاٹ خرید گئے تھے، وہ میں نے بیچ دیا ہے۔ میرے بھائی کی شادی تھی سونے کے سیٹ خریدنے میں گھر میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ میں نے کہا میں خرید کر دے دیتی ہوں۔ پلاٹ کا ہمیں کیا کرنا وہ تو ویسے بھی آپ کی آپا کے پڑوس میں تھا بعد میں ہمیں بہت مصیبت ہوئی۔ کل میں اپنی بھانجی کی سالگرہ میں جاؤں گی۔ چار جوڑے اور ایک سونے کی انگوٹھی دے رہی ہوں۔ آخر وہ مجھے پیاری خالہ کہتی ہے۔ آپ کی جانب تحفہ ادھار رہا۔ آپ جو دل چاہے میری بھانجی کو دے دیجیے گا۔

آپ اس سال جب چھٹیوں پر گھر آئیں تو یہ سوچ کر آئیے گا کہ اسلام آباد میں رہنے کے بجائے ہم جہلم شفت ہو جائیں۔ کراچی سے جتنے بھی رشتے دار گرمیوں میں گھومنے کے لیے مری جاتے ہیں ان کا پہلا اسٹاپ اسلام آباد میں ہمارا گھر ہوتا ہے۔ جس کی شادی ہوتی ہے وہ بھی مون منانے مری کی

سڑک پر بعد میں قدم رکھتا ہے پہلے وہ ہمارے گھر آتا ہے۔ گھر کا بجٹ سنا زخمی رہتا ہے۔ اس کا تو آپ کو کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ آپ نے جا کر مجھے ڈرافٹ بھیجا تھا۔ اس کو دیکھ کر تو میں گھول ہی گئی تھی۔ اتنے خرچے پر یہ اونٹ کے منہ کا زیرہ آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔

گزشتہ نصف آپ کے رشتے دار پندرہ دن کے لیے آئے تھے۔ ان میں چھینچ آیا ہو یا نہیں اس کا پتا نہیں مگر مجھ میں چھینچ ضرور آ گیا ہے۔ ڈھیروں ڈھیر روٹیاں پکانے سے ہاتھ شل ہو گئے ہیں اور کمر میں درد رہنے لگا ہے۔ ڈرائنگ ٹیبل کا شیشہ ان کی چھوٹی پچی توڑ گئی ہے، گاڑی کا دروازہ پہلے ہی بیمار تھا اب وہ ختم ہو گیا ہے۔ آپ کی چار شرٹس آپ کے کزن کو پسند آ گئی تھیں وہ لے کر چلتا بنا ہے اور بھی گھر کی چھوٹی موٹی چیزیں گھر سے غائب ہیں وہ یا تو ماسی لے گئی ہے یا مہمان بھولے سے اپنے بیگز میں رکھ کر لے گئے ہیں۔

مجھے سمجھ میں یہ بات نہیں آتی جب آپ گھر میں نہیں ہوتے تو آپ کے رشتے دار میرے پاس کیوں آتے ہیں؟ اب آپ آئیں تو سب کو بتادیں کہ ہم اسلام آباد سے شفت کر رہے ہیں۔ ہاں جہلم کا فون نمبر بھی کسی کو دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ پائی روڈ آنے والے مہمان ہمارے گھر کو ہوٹل سمجھ کر جہلم میں ٹھہرے لگیں گے۔

میں ج کہہ رہی ہوں اگر مجھے پہلے پتا ہوتا کہ آپ کا خاندان ایسے سیاحوں کا ہے جو دوسروں کے گھروں پر وزن رکھ کر سیاحت کرتا ہے تو کبھی آپ

بڑے جوائنٹ فیملی سسٹم میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کی مالی حالت بہت زیادہ اچھی نہیں ہے اس لیے اسے ایک اسکول میں جاب بھی کرنی پڑتی ہے (مگر اسے اپنا جاب کرنا کبھی مشکل نہیں لگتا اور نہ ہی وہ اس کا احسان اپنے میاں پر دھرتی ہے) اس کے باوجود اس کا ذہن بہت شارپ ہے وہ ٹیلی فون کرتے ہوئے کروڑوں کی تیل بھی بنتی رہتی ہے۔ پیر سے اپنے دو بچوں کو مار بھی لیتی ہے۔ ٹی وی کے پروگرام کا بھی مزہ لیتی ہے۔ اس کے کان دور صحن میں باتیں کرتی خندوں کی جانب علیحدہ لگے ہوتے ہیں کہ اس وقت وہ کس کی برائی کر رہی ہیں۔ گھر کا کوئی فرد اس سے اس سچوٹن میں کوئی بات پوچھے تو ان کو بھی تسلی بخش جواب دیتی ہے۔ منہ میں پان چبانے کا عمل علیحدہ چل رہا ہوتا ہے۔ پاس رکھے جامن یا پیر ہوں تو پان کی گھوری کو وہ دوسرے کٹے میں رکھ کر ان سے بھی خوب انصاف کرتی ہے۔ کروڑوں کی انگلی روک کر دوران فون کسی کے ایمر جنسی لپ اسٹک بھی لگا دیتی ہے۔ (مجھ سے زیادہ خوش مزاج اور مجھ سے زیادہ خوش اخلاق میری بڑی بہن ہے جسے لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں)

اور فون پر اس کا دماغ بھی غائب نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ اس کی باتوں میں ایسے، ایسے قہقہے لپٹے ہوتے ہیں جو مجھے کئی دن تک باغ و بہار رکھتے ہیں۔ تب میں سوچتی ہوں ایسا چوس دماغ رکھنے والیاں بڑی عظیم ہوتی ہیں۔ جن کا دماغ ایک مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ وہ کسی بھی ماحول میں ہوں کسی بھی ہوں وہ خود بھی خوش رہتی ہیں اور اپنے وجود سے دوسروں کو بھی خوش رکھتی ہیں۔ مجھے جیسی شخص عورتیں نہ خوش رہنا جانتی ہیں اور نہ ہی کسی کو خوش رکھنا کہ مجھ جیسی عورتیں ہر کام میں مختلف تاویل میں جوڑھوٹی ہیں اور سب سے بڑی بات کہ ناشکری بھی ہوتی ہیں اور جو ناشکرا ہو وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔

سے شادی نہ کرتی۔ باں ایاجی کی گاڑی بننے کے لیے مکینک کے پاس بھی ہوئی ہے اس لیے آپ کی کروڑا ان کو دے رکھی ہے۔ چھوٹے ماموں کینیڈا جہاں ہے ہیں۔ آپ کا سوٹ کیس انہیں دے دیا ہے۔ آپ کے کپڑے ایک بڑی سی چادر میں باندھ کر اسٹور روم میں رکھ دیے ہیں۔ آپ کہہ رہے تھے کہ اگر اس سال گھر کا چکر نہ لگائیں تو میرے لیے ڈائمنڈ کے بڑے والے ٹاپس نکال سکتے ہیں۔

سینے اگر آپ دو سال نہ آئیں تو پورا سیٹ ہی آجائے گا ناں؟ دیکھیں میں کیسی قربانی دینے والی بیوی ہوں۔

ڈائمنڈ کے سیٹ کی شدت سے منتظر آپ کی اپنی شگفتہ حیات!

### ناشکری

کاش میری شادی کسی امیر کبیر گھرانے میں ہوئی ہوتی تو میں خوش رہتی مگر افسوس۔۔۔۔۔!

میری عمر پچیس سال ہے۔ دو چھوٹے بچے ہیں۔ ہاؤس وائف ہوں بچوں کو سنبھالنا اور گھر کے کام کاج اسی طرح کرتی ہوں جیسے عام خواتین کرتی ہیں۔ شوہر بھی بس اچھا ہی ہے اور ساس سسر بھی بس ہمدرد سے ہیں۔ میرا اور میرے بچوں کا خیال رکھتے ہیں اس کے باوجود میرا دماغ اتنا نہیں چلتا ہے۔ وقت پر بھی جواب نہیں سوچتا کوئی چیز زیادہ سنبھال کر رکھ دوں تو بھول جاتی ہوں۔ فون پر کسی سے بات کروں تو مجھے مکمل خاموشی چاہیے۔ دوسرے کمرے کا ٹی وی تک بند کر دیتی ہوں۔ اس کے باوجود بات کرنے کے درمیان اگر کوئی گھر میں کسی سے مخاطب ہو تو منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کر دیتی ہوں وجہ یہ ہے کہ میں ایک وقت میں ایک سے ہی بات کر سکتی ہوں۔ میرے برعکس میری بڑی بہن ہے، پچیس سال اس کی عمر ہے چار اس کے بچے ہیں۔ اس کا شوہر ایک مشکل شخص ہے۔ وہ ایک



## وجوہات

جہاں دیدہ آنکھیں چہرہ دیکھتے ہی بھانپ جاتی ہیں کہ ظاہر و باطن میں کتنا تضاد ہے مگر مسز تو قیر کا چہرہ تو بالکل ساٹ سا ہو جاتا تھا۔ کبھی ان کے چہرے کا ہر زاویہ ٹھکے لگا رہا ہوتا اور دوسرے سے ایسی حسرت و مایوسی کے نرطر نظر آتے کہ گھٹا ابھی یہ چیخ مار کر رونے کا آغاز کریں گی مگر ان کی یہ حسرت و مایوسی ملی بھرم میں غائب بھی ہو جاتی اور قوس قزح سے چہرہ گلزار سا ہو جاتا اور تجربہ کار نگاہیں شیشی جاتیں۔

”پتا نہیں کس تلاش کی عورت ہے یہ۔ مجاں ہے کہ کسی کو اپنا چہرہ جو پڑھنے دے۔“ بڑی خالہ جو نفسیات کی کئی ڈگریاں سمیٹے بیٹھی تھیں ان کو دیکھ کر جھنجھلا سی جاتیں۔ مسز تو قیر جب بھی رقیہ منزل میں آتیں۔ ہرے گھرانے میں شادمانی کا سا احساس چھا جاتا۔

”مجھے آپ کی شگفتہ بہت پیاری لگتی ہے۔ ہنسی کہتے اچھے انداز میں ہے۔ گال کے اوپر کا عمل کتنا نمایاں ہو جاتا ہے۔“

”شگفتہ جیسی خوب صورت کانچ جیسی آنکھیں میں نے کہیں نہیں دیکھیں۔ اندازتے لمبے بال بھی ہوا کرتے ہیں۔ بچی میں نے تو آج تک نہیں دیکھے۔ شگفتہ تو خوب صورتی کا مرقع ہے۔“ وہ مجھے دیکھ کر سرشار بچے میں ہمیشہ کہا کرتیں۔

”آنتی آپ تو بس یونہی اتنی زیادہ تعریف کر دیتی ہیں۔“ میں زبردستی شرماتے ہوئے ہنسی۔

”نہیں جان، میں خواہ مخواہ میں تعریف نہیں کرتی ہوں۔ بس تم مجھے حد سے زیادہ پسند ہو۔“ وہ قدرے بلند آواز میں کہتی۔

تب اماں ان کی خاطر بدارت مزید امی کر دیتیں اور وجہ بھی خاص الخاص بھی وہ اپنے ڈانٹر بیٹے کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ مسز تو قیر جب بھی آتیں گھر والے یہی سوچنے لگتے کہ اب وہ رشتہ

دیں گی تب وہ دیں گی مگر وہ منہ سے کچھ نہ کہیں مگر گھر والے اچھی آس کے سہارے ان کے آنے کو اپنے بھگ جاگ اٹھے سمجھا کرتے پھر یوں ہوا کہ اباجی رشوت لینے کے الزام میں پکڑے گئے۔ گھر میں سوکھی تنخواہ آئی تو خاطر بدارت کی منزیں بھی ڈھے سی گئیں۔ تب مسز تو قیر ہرے بڑے ماموں کے ہاں جانے لگیں۔ ان کی راشدہ انہیں اچھی لگنے لگی اور وہ جان کر بلند آواز میں کہنے لگیں۔

”مجھے آپ کی راشدہ حد سے زیادہ پسند ہے۔“

بعد میں وجوہات معلوم کی گئیں تو پتا چلا کہ ماموں جان کا ذہنی کردار کا انعام نکلا ہے۔ اب وہ کم از کم اس قابل تو ہو گئے ہیں کہ اپنے ڈانٹر داماد کو کیٹنگ سکھوائیں۔

## میری ہم جولیال

شارفہ میری بچپن کی دوست ہے۔ اسکول، کانچ میں ہم ایک ساتھ پڑھے ہیں۔ ہم دونوں ہی اوسط ذہن کے تھے۔ زیادہ پڑھنے اور نوٹس بنانے کے شوقین بھی نہیں تھے۔ میں ہمیشہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوتی تھی۔ شارفہ کی ڈویژن بھی یہی ہوتی تھی مگر ہمیشہ اس کے دس بیس نمبر مجھ سے زیادہ آتے تھے۔ اس لیے اگر کوئی اس سے رزلٹ پوچھتا تو وہ یہی جواب دیتی تھی۔

”ماصرہ کی سیکنڈ اور میری گڈ سیکنڈ۔“

شادی ہوئی تو یہ بھی عجیب اتفاق رہا۔ ہم دونوں ایک ہی علاقے میں بیاہ کر آئے۔ شادی کے بعد اس میں چالاکی اور مکاری کے اثرات اتنے بڑھے کہ میں اس سے کٹنے لگی پھر میل ملاپ صرف فون تک ہی رہ گیا اور اب حالات کی ترقی یا تنزلی کچھ بھی سمجھیں۔ شارفہ کا فون جب بھی آتا ہے میں اسے رسیو کرنے سے ہچکچاتی ہوں۔ میری یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس سے بات نہ کی جائے حالانکہ وہ جب بھی فون کرتی ہے تو یہی کہتی ہے کہ





کلیت قبل



صغریٰ زیدی



ایمان چو ہداری ..... فیصل آباد

تم نے زمانے کے دُور سے دوست ہمیں چھوڑ دیا  
ہم بھی تو دنیا والوں کی ہر بات گوارا کرتے تھے

ہم شہانہ ملک ..... ذبیحی خان

میری خواہش ہے کہ لوگوں کی چرا کر آنکھیں  
اپنی آمد کا تماشا سرِ محفل دیکھوں

ہم نرگس نسیم ..... صابہ موہڑہ

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے  
دھوڑا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کر

ہم ارم کمال ..... فیصل آباد

تجہا سمجھ رہا ہے میرے دل کو چارو گر  
دنیا بکی ہے اس میں کسی کے خیال کی

ہم اریبہ آرزو ..... سکھر

اے مضمون تجھے استاد جنہی مانوں گا  
درد بھی کھینچ لے تو میری تصویر کے ساتھ

ہم سیما ممتاز عباسی ..... لاڑکانہ

محبت کا سفر ہے اور میں ہوں  
اک ابھی راہ گزر رہے اور میں ہوں

کہاں لے جاؤں اپنے خواب سارے  
کہ پتھر کا ٹکڑا ہے اور میں ہوں

ہم عرشہ جنید ..... کراچی

ہوا ہے تجھ سے پچھڑنے کے بعد اب معلوم  
کہ تو نہیں تھا تیرے ساتھ ایک دنیا تھی

ہم فردوس شاہی ..... لاڑکانہ

نوٹ جاتا ہے ذرا سی جو ہوا تیز چلے  
تیرا وعدہ بھی تو خوشبو کا بدن ہو جیسے

ہم صبا کمال ..... فیصل آباد

عمر بھر کا حساب کر ڈالا  
اس نے پھر لا جواب کر ڈالا

ہم خزاں کا اجاز منظر تھے  
چھو کے اس نے گلاب کر ڈالا

ہم جبین نیاز ..... مٹان

غم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو  
تم مرے ساتھ چل سکو تو چلو

دور تک تیرگی میں چلنا ہے  
صورتِ شمع جل سکے تو چلو

ہم نرگس جبین منیا ..... کراچی

بے ساختہ نکالیں جو آپس میں مل گئیں  
کیا منہ پہاں نے رکھ لیے آنکھیں چرا کے ہاتھ

ہم حرا بتول ..... نواب شاہ

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایاں شوق  
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اُن کے حضور  
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

ہم ثوبیہ ظہور ..... ضلع انک

محرابیوں کا ہم نے گلہ تک نہیں کیا  
لیکن یہ کیا کہ دل میں یہ ارمان بھی نہ ہو

روتا یہی تو ہے کہ اسے چاہتے ہیں ہم  
اے سعد جس کے ملنے کا ارمان بھی نہ ہو

ہم نگہت زیدی ..... اسلام آباد

یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ جدہ لے آیا  
کہ آج اپنی جہیں، اپنی جہیں معلوم ہوتی ہے



☆ حمیرا نوشین..... منڈی بہاؤ الدین  
خواہشوں کا بھی کوئی معیار ہوا کرتا ہے  
کسی خواہش ہے کہ مٹھی میں سمندر ہوتا

☆ فصیحہ صف خان..... ملتان

وہی چھن گیا ہم سے جس کی تمنا کی  
کچھ اپنی قسمت کچھ لوگوں کی رضا تھی  
☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ

جگر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں  
آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں  
رنگ سے خوشبوؤں کا ناتا ٹوٹتا جاتا ہے  
پھوں سے لوگ خزاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں  
☆ کوثر خالد..... جڑانوالہ

اے دوست اک غریب سے اتنا خفا نہ ہو  
شاید تو کل بلائے تو یہ بے نوا نہ ہو  
☆ بشری رضوی..... کراچی

تلاؤ نئے سب سے نہ کھلیں دیکھا ایک نے بھی  
کس کی آنکھ سے آنسو پکا کس کا سہارا ٹوٹ گیا  
☆ طیبہ عبید..... کراچی

سرخ آنکھوں کی قسم کا پتی پلوں کی قسم  
تھر تھراتے ہوئے آنسو نہیں دیکھے جاتے  
☆ ماریہ فراز..... لاہور

دل تو کہتا ہے نہیں مفت میں جاں بھی دے دوں  
اتنے معصوم خریدار سے کیا لینا ہے  
☆ نسیم قیصر..... نیویارک

میں گرا تھا تو بہت لوگ رکے تھے لیکن  
سوچتا یہ ہوں کہ آئے تھے اٹھانے کتنے  
بھینر لگ جاتی ہے جلتے ہوئے گھر کے آگے  
لوگ آتے ہیں مگر آگ بجھانے کتنے  
☆ صبا سجاد..... دہلی

اب نہ کوئی بھی برا ہم کو زمانے میں لگا  
جب سے ہم اپنی خطاؤں پہ نگاہ کرنے لگے

☆ کائنات حلیم..... میرپور خاص  
گھر چھوڑ کے جاتے نہیں خود اپنا پرندے  
سازش کوئی اس نقل مکانی میں ملے گی  
☆ ماہم مراد..... لاڑکانہ

بھگی ہوئی اک شام کی دلیر پر بیٹھے  
ہم دن کے سگنے کا سبب سوچ رہے تھے  
☆ عروہ تاز..... کوٹلی

نوح کا طوفان بھی اس کو غرق کر سکتا نہیں  
جو برائے خلق جیتا ہو وہ مر سکتا نہیں  
☆ عمر وسیم..... گوجرانوالہ

جن میں خصوص و جذبہ ایثار بھی نہیں  
ہم ایسے دوستوں کے طلب گار بھی نہیں  
☆ محمد یحیٰ نورین..... برہائی

میری تو عمر اسی کے خیال میں گزری  
میرا خیال جسے عمر بھر نہیں آیا  
☆ ناز ہمایوں..... دہلی

ہماری جان جائے گی تو پھر تم جان جاؤ گے  
کہ وصل کچھ نہیں ہوتا کسی کو آزمانے سے  
☆ یحیٰ یحیٰ..... چکوال

ہزاروں عیب تھے مجھ میں مجھے معصوم تھا یہ بھی  
گمراہ شخص تھا تاواں مجھے انمول کہتا تھا  
☆ مسرت گہت غفار..... کراچی

میری محبت اک گوہر ہے تیری وفا بے کرم سمندر  
تو پھر بھی مجھ سے عظیم تر ہے کہل ہے گوہر کہل سمندر  
یقین ہے جو کہ میں آخر تل چھاپا مپنی کی سڑن میں پر

بلندیوں سے دکھائی دیتا ہے ہو ہوا آسمان سمندر  
☆ حمیرا طارق..... کراچی

اس زندگی کے حسن کی تابندگی نہ پوچھ  
جو وہ دٹوں کی دھوپ میں تپ کر نکھر گئی  
☆ ☆ ☆



## بارہ مسالے کا مرغ

اشیا کھ گوشت، مرغی، ایک کلو۔ (بڑے ہیں) بنا سیتی تھی، ایک پیالی۔ پیاز، ایک درمیانی۔ دہی، ایک باؤ۔ اورک، لہسن، پپا ہوا دو چائے کے چمچ۔ بادام، گھو پر، گل، خشخاش، دھنیا، سفید زیرہ، یہ سب مسالے تین، تین چائے کے چمچ۔ زعفران، چٹلی بھر۔

ترکیب کھ پہلے گوشت کو صاف کر کے خشک ہونے رکھ دیں۔ سارے خشک مسالے بھون کر چیں میں اور دہی میں ملا دیں۔ مسالا طے دہی کو مرغ میں اچھی طرح ملا کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ ایک دیکھی میں تھی گرم کر کے پیاس لپھوں میں کاٹ کر بادامی رنگ پر تل لیں۔ جب پیاز تل جائے تو مرغ کا گوشت اس میں ڈال دیں اور اتنا بھونیں کہ مسالے میں سرخی آ جائے پھر ایک پیالی پانی ڈال کر اسے گلنے کے چھوڑ دیں۔ جب گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو چٹلی بھر پیس ہوئی زعفران ڈال دیں۔ اب اسے گرم اوون میں کچھ دیر دم کے لیے رکھ دیں تاکہ تھی اوپر آ جائے۔

نوٹ: مرغ بھونتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ مسالا بالکل سوکھ نہ جائے۔ اوون نہ ہو تو دیکھی گرم تو سے پر رکھ کر ہلکی آنچ کر دیں۔ پانچ منٹ بعد اتار لیں بہترین مرغ تیار ہے۔ چاہے تو ثابت مرغ بھی اسی ترکیب سے بنالیں۔

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

## خوشبو دار پسندے

اشیا کھ مگائے یا مرغ گوشت ایک کلو، سبز الائچی، دس عدد۔ آدھی کا پاؤڈر بنالیں۔ گرم مسالا، (دو روپایہ ہیں)

لیں) آدھی چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ و نمک، حسب ذائقہ۔ پپا دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن، اورک، ایک، ایک چائے کا چمچ۔ پپا ہوا۔ بادام کا پیسٹ بنالیں۔ ذرا سے دودھ میں دو چائے کے چمچ جاتل جاتری پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ پیاز، براؤن کر کے چیں لیں۔ ایک کپ۔ دہی، ایک کپ۔ ملک پیک کریم، آدھا کپ۔ تیل، حسب ضرورت۔ عرق کیوڑا، ایک چائے کا چمچ۔

ترکیب کھ پسندوں میں نمک، مرچ، لہسن، اورک دھنیا، دہی میں ملا کر لیپ کر دیں۔ گائے کا گوشت تین سے چار کھنٹے اور مرغی کے پسندے آدھا گھنٹا میرینٹ کر کے رکھ دیں۔ دیکھی میں تیل گرم کر کے آدھی الائچیاں کر دیں ان میں پھر پیس پیاز دہی اور پانی کا مسالا ڈال کر بھون لیں اور اب پسندے۔ ایک، کپ پانی ڈال کر پکٹے رکھ دیں۔ جب گوشت پک جائے، پانی خشک ہو جائے تو کریم اور کیوڑا ڈال کر دم کرنے رکھ دیں۔ دس منٹ بعد اتار لیں، مزیدار خوشبودار پسندے تیار ہیں۔

مرسلہ: فاضلہ، تول، بہارہ کبو

## انڈا اسیگنی

اشیا کھ اسیگنی، دو سو گرام۔ مکھن، دو کھانے کے چمچ۔ نمائو پیسٹ، چار کھانے کے چمچ۔ چلی گارلک ساس، آدھا کپ۔ لہسن کے جوے، چار سے چھ چوب کر لیں۔ نمک، سیاہ مرچ، حسب پسند۔ اور گینگو پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ۔

ترکیب کھ ساس چین میں مکھن گرم کر کے لہسن ڈال کر فرائی کر لیں۔ نمبر اہونے پر نمائو پیسٹ ڈالیں اور چمچ چلائیں۔ روغن الگ ہو جائے تو اہلی ہوئی اسیگنی، چلی گارلک ساس، نمک، کالی مرچ اور لیکا نو شامل کر

آنے پر آٹھ بج چکی کریں۔ آخر میں روز وائز اور کیوڑ اڈال کر چو لھا بند کر دیں۔ بیکنگ ٹرے کو اسے وقت پر نکال کر ٹھنڈا کر لیں اور سر ونگ ڈش میں نکال کر اس کے اوپر شوگر سیرپ اچھی طرح پھیلائیں اور الگ سے شہد اور کریم کے ساتھ سرو کریں۔ مزید ڈالنے کے لیے ڈرائی فروٹ کاٹ کر ڈال دیں۔

مرسلہ: نیلو فرخان، بہارہ کبوتر

## کو کونٹ بریڈ یدنگ

اشیا: کھن، دو کھانے کے پیچ۔ آکٹنگ شوگر، ایک تہائی کپ۔ کیسٹ شوگر، ایک کپ۔ انڈے، چار عدد۔ انڈے کی زردی، ایک عدد۔ کوکونٹ ملک، دو کین۔ وار چینی پاؤڈر، ایک چائے کا پیچ۔ جانفل پاؤڈر، ایک چوتھائی چائے کا پیچ۔ نمک، ایک چوتھائی چائے کا پیچ۔ کوکونٹ آئسنس، دو کھانے کے پیچ۔ کھوپرا (کدو کش کیا ہوا) ڈیزھ کپ۔ تازہ ناریل، آدھا کپ۔ فرنیج بریڈ، ایک عدد۔ (ایک ایک آٹھ کیوڑز میں کاٹیں)

ترکیب: چینی، اور انڈے کی زردی، جانفل پاؤڈر، کوکونٹ آئسنس اور نمک کو ایک ساتھ ملا کر اچھی طرح میں کریں۔ اب ایک کپ کدو کش کیا ہوا کھوپرا اور آدھا کپ تازہ ناریل لے کر اس آمیزے میں دھیرے دھیرے فرنیج بریڈ میں ڈال دیں۔ اس کے بعد ایک بیکنگ ڈش کو پکنا کر دیں اور اس میں تمام آمیزہ پھیننے کے بعد آکٹنگ شوگر چھڑک کر آدھے گھنٹے کے لیے ایک جانب رکھ دیں۔ اب پہلے سے گرم کیے ہوئے اوون میں بیکنگ ڈش رکھیں اور 165 ڈگری سینٹی گریڈ پر 25 منٹ کے لیے بیک کریں۔ اب باقی بچا ہوا آدھا کپ کھوپرا اوپر چھڑکیں اور مزید 25 سے 30 منٹ بیک کریں۔ درمیان سے پھول کر گرم ہو جائے تو نکالیں۔ مزید ار کوکونٹ بریڈ پزنگ تیار ہے۔

مرسلہ: نیلو فرخان، بہارہ کبوتر

کے چلائیں اور کچھ دیر میں چولھے سے اتار لیں۔ سر ونگ ڈش میں نکال کر ابے اندوں کو لمبائی میں کاٹ کر سجادیں۔ ٹماٹو کچب کے ساتھ پیش کریں۔

نوٹ: اسٹیکنی یا پاستا بہترین طور پر ہالنے کے لیے پانی میں نمک اور آٹھ ڈال کر گرم کریں پھر یہ چیزیں ڈالیں، گل جانے پر جالی، (چھنا) میں چھان میں اور چھنا ٹھنڈے پانی میں رکھ دیں کہ یہ تیرتے رہیں۔ اس طرح جڑیں گے نہیں۔ اور استعمال کرتے وقت چھان کر نکال لیں اور بلکے سے آٹھ بلکھن میں فرالی کریں۔

مرسلہ: رابعہ شاہد، راس الخیمہ

## بیک اونتھالی سیمولینا کریم

اشیا: دو دو، دو کپ۔ سوچی، آدھا کپ۔ (آدھے دو دو میں بھجوا دیں) ملک، پیک کریم، ایک کپ۔ پف، خوشمیری ڈو، dough، چار سو گرام۔ (یہ بازار سے منڈھے ہوئے آٹے کی شکل میں ملے گی مگر موٹی و موٹی پٹیوں کی صورت) گھی، آدھا کپ۔ کنڈنڈ ملک، ایک کپ۔

## شوگر سیرپ کے لیے اشیا

چینی، دو کپ۔ پانی، ایک کپ۔ لیموں کا رس، ایک کھانے کا پیچ۔ عرق گلاب، ایک کھانے کا پیچ۔ کیوڑا، چند قطرے۔

ترکیب: پف، خوشمیری کو دو حصوں میں تقسیم کر کے گہری بیکنگ ٹرے سے ریزے مطابق نٹل میں اب ٹرے کو کھن اگا کر پکنا کریں اور اس ڈوکو بھجائیں۔ ایک برتن میں دو دو گرم کریں اس میں بھجوا دی ہوئی سوچی ڈالیں اور پیچ چانی رہیں۔ اب گرم شامل کریں۔ آمیزہ گاڑھا ہونے لگے تو بیکنگ ٹرے میں ڈو کے اوپر پھیلا دیں۔ تھوڑا گھی ڈالیں پھر اس پر کنڈنڈ ملک ڈالیں اور نیلی ہوئی ڈو کے دوسرے حصے کو اس پر ڈال کر آمیزے کو اچھی طرح کور کریں۔ تھوڑا گھی اس کے اوپر بھی لگا دیں۔ اب اس ٹرے کو گرم اوون میں 200 سینٹی گریڈ پر 15 منٹ تک بیک کریں۔ شوگر سیرپ بنانے کے لیے بتائی گئی اشیا ایک ساس چین میں ڈال کر گرم کریں۔ اہل





### پاکیزہ کے نام

نئے برس کا آغاز ہو چلا جاناں  
تمہیں مبارک ہو سالگرہ کا دن اپنا  
سدا رہو محبتوں اور مسرتوں کے بیچ  
یہی دعا ہے، یہی آرزو یہی پسنا  
مرسلہ: ایندھن علیہ السلام، سلا نوالی

### بھول

میں اور میرا خدا  
روز بھول جاتے ہیں  
میں اس کی عطاؤں کو  
وہ میری خطاؤں کو  
مرسلہ: نور افشاں، شکار پور

### وجہ خاص

لڑکی: "میں جب بھی تمہیں فون کرتی ہوں تم  
شیو گرہ رہے ہوتے ہو۔ آخر تم دن میں کتنی بار شیو  
کرتے ہو؟"

لڑکا: "تمہیں چالیس مرتبہ۔"

لڑکی: "کہیں تم پاگل تو نہیں ہو؟"

لڑکا: "نہیں میں تو نائی ہوں۔"

مرسلہ: تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد

### ماں جیسی

ناکھ گرد اپنے حفاظت کی لکیریں کھینچو  
ایک بھی ان میں نہیں ماں کی دعاؤں جیسی  
از: کوثر خالد، جڑانوالہ

### اپنے بھائی ملک جید پرویز کے نام

آپ کی زندگی کی خوشیوں کے لیے

### بیاری بات

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔  
ہذا اس سے ضرور معافی مانگو جسے تم چاہتے  
ہو۔

☆ اسے مت چھوڑ دو جو تمہیں چاہتا ہے۔  
ہذا اس سے کچھ نہ چھپاؤ جو تم پر اعتبار کرتا  
ہے۔

از: ممتاز خانم، کراچی

### دیکھو تو سہی

ماں کی دعا خالی نہیں جاتی  
اس کی بد دعا بھی ٹالی نہیں جاتی  
برتن نہ تجھ کر بھی ماں  
تمہیں چار بچے پال ہی لیتی ہے  
مگر تمہیں چار بچوں سے  
ایک ماں پالی نہیں جاتی

از: نجمہ اصغر، کراچی

### اپنے ڈاکٹر کے نام

تشخیص بجا ہے کہ مجھے عشق ہوا ہے  
سنجے میں لکھو ان سے ملاقات زیادہ  
از: مجید ضیا بخش، کراچی

### حقیقت

ہم بہت سے رشتوں کو ٹوٹنے سے بچا سکتے  
ہیں۔ اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ لوگ غلط نہیں  
ہوتے بس وہ مختلف ہوتے ہیں ان توقعات سے جو  
ہمیں ان سے ہوتی ہیں۔

مرسلہ: فریحہ شہیر، شاہ کڈر





خاتمہ بالخیر کے لیے بھی ہر عالم دین، امام مسجد  
بمقام مسلمان کو نماز کے بعد اس دعا کا پڑھنا ضروری  
ہے اور جو شخص ہر نماز کے بعد ایک مرتبہ اس دعا کو علم  
نہر پڑھتا رہے تو اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔

بزرگان دین اور اولیاء کے معمول کے مطابق  
اگر کوئی شخص اس دعا کو عشاء کی نماز کے بعد گیارہ  
مرتبہ اول آخر و درود شریف اکتالیس روز تک پڑھے تو  
اس کی ہر وہ مشکل آسان ہو جائے گی جس کا وہ  
خواہشمند ہوگا۔

### حضرت یوسف کی دیگر دعا

ترجمہ: ”اے میرے رب! قید مجھے اس سے  
تیرا وہ محبوب ہے جس کی طرف وہ مجھے دلاتی ہیں اور  
اگر تو مجھ سے ان کے مرنے نہیں پھیر دے گا تو میں ان کی  
طرف جھک جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں  
گا۔“ (پ ۱۲، یوسف، آیت ۳۳)

حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت زلیخا سے  
بچنے کے لیے جب یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی  
اس دعا کو قبول فرمایا اور اس دعا کے پڑھنے سے حضرت  
زلیخا کے مکر کے اثرات ختم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس  
دعا کی خیر و برکت سے عصمت نبی کی حفاظت کی۔

اسرار: صوفیاء اور اللہ کے فقیروں نے اس دعا  
کے بارے میں کہا ہے کہ جب کوئی نیک اور پاک باز  
مرد یا عورت ایسے لوگوں کے فریب میں پھنس جائے  
تو اس نیک باز کو زبردستی رتا، شراب، جوا یا کسی اور  
کبیہہ گندہ میں مبتلا کرنا چاہیں تو اس صورت میں ان  
خالمیوں کے مکر و فریب اور ظلم سے بچنے کے لیے یہ دعا

### حضرت یوسف کی دعا

قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کا  
پورا قصہ سورہ یوسف میں بیان ہوا ہے اور اسی سورہ  
میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی اس  
دعا کے الفاظ بھی بیان کیے ہیں جو انہوں نے مانگی  
تھی۔ اس دعا کا موقع محل یہ تھا کہ جب حضرت  
یوسف علیہ السلام مصر میں حکومت کے سربراہ بن گئے  
اور آپ کے والد جب عرصہ دراز کی جدائی کے بعد  
مصر میں آپ سے ملے تو آپ نے اس وقت اللہ  
تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اللہ کے حضور یہ دعا مانگی۔

ترجمہ: ”اے آسمانوں اور زمین کے بنائے  
والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارساز حقیقی  
ہے۔ (پس تجھ سے اتنی غرض ہے کہ) مجھے مسلمان  
ہوتے ہوئے وفات دے اور نبیوں سے جائز۔“  
پارہ ۱۳ سورہ یوسف آیت ۱۰۱

اسرار دعا: حضرت یوسف علیہ السلام کی اس  
دعا کے بھی بے شمار فوائد ہیں اس کا سب سے پہلا  
فائدہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی سالک جو روحانی منزل پر  
رواں دواں ہو تو وہ اس آیت کو کثرت سے پڑھے تو  
خواب یا مراقبے میں اس پر زمین اور آسمان کے  
اسرار ظاہر ہوں گے۔ آسمانوں کے اوپر اللہ کی جو  
مخلوق رہتی ہے اس کا دیدار ہوگا اور جس طرح  
آخرت برپا ہوگی اس کے مشاہدات نظر آئیں گے  
لیکن اس آیت کے ان اسرار کے حصول کے لیے  
مرد کا دل کی باطنی توجہ کا ہونا از حد ضروری ہے کیونکہ  
توجہ کے بغیر بات نہیں بنتی۔







شوابعے  
ہومیوکلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتہ اور جو کام کر رہے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے اور گیس خارج ہوتی ہے۔ میں نے انٹراساؤنڈ کرا دیا تو ڈاکٹر نے بتایا کہ پتے میں پتھری ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہومیو پیتھک میں پتے کی پتھری کا علاج ہے۔ پلیز آپ میری مدد کریں۔ میری عمر تقریباً 70 سال ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھے علاج بتائیں گے۔

جواب: کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں اور کھانے کے ساتھ پانی، شربت یا گولڈ ڈرنک کا استعمال نہ کریں۔ آردانتوں کا مسئلہ ہے تو روئی کو سالن میں ڈبو کر یا اگر بھٹنا سالن ہے تو اس میں پانی یا دہی شامل کر کے روئی کو بھگو کر نرم کر لیں۔ پھر اس کو میٹش کر کے کھائیں گیس نہیں ہوگی۔ انٹراساؤنڈ کی رپورٹ بھیجنی چاہیے تھی تاکہ پتا چلتا کہ پتھری کتنی بڑی ہے۔ آپ 3 ماہ تک ڈاکٹر ولما شوابعے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ تک استعمال کریں پھر انٹراساؤنڈ کرا کر دوبارہ اپنا حال بتائیں۔  
Carbo veg30, Lycopodium-30  
کے 5-5 قطرے جبکہ Chelidonium-Ø کے

گیس دپتے کی پتھری

مسز آغا شاہ رخ۔ راولپنڈی

عرض ہے کہ مجھے تقریباً 5 سال سے گیس کا مسئلہ

ٹوکن

برائے شوابعے ہومیوکلینک

جون 2015

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

م: \_\_\_\_\_  
پ: \_\_\_\_\_



اکتوبر میں میری شادی ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا مگر جواب نہیں ملا۔ اس دفعہ آپ مہربانی کر کے ضرور جواب دیں۔ آپ برائے مہربانی میرا سوال اور جواب نام کے ساتھ ضرور شائع کریں تاکہ میری مشکل دور ہو جائے۔ سدا خوش رہیں آپ۔

جواب: ہوا کی کے متعلق نہیں لکھا کہ وہ کیسی ہے؟ لیکوریا کی شکایت تو نہیں ہوتی؟ قد کتنا ہے؟ کوئی اور جسمانی بیماری تو نہیں؟ بارموز کی خرابی کو بھی جانچتا ہے۔ آپ لوگ اشتہار بڑھ کر یہ سمجھتے تھے ہیں کہ بس ہم اب اس مرض سے متعلق بتائی ہوئی دوا استعمال کریں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ نہیں سوچتے کہ سبب جانے بغیر ایک دوا سب پر کیسے کام کرے گی؟ متوازن غذا استعمال کریں، ورزش کریں اور ذاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ استعمال کے بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ ہمیں پہلی بار آپ کا خط ملا ہے۔ Thyroidine-30, Sabal serrulata-30 کے 7-7 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

چہرے پر دانے اور بالوں کا گرنا

شمن خان۔ بدین

عرض یہ ہے کہ میں نے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھا جس کی وجہ سے مجھے اپنا مسئلہ پیش کرنے کا خیال آیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی کے ڈیڑھ سال پہلے چہرے پر لال لال مولے مولے دانے نکلنے شروع ہوئے اور ساتھ ہی بالوں نے بھی گرنا شروع کر دیا۔ اس کے بال جو بالکل سیاہ کالے اور ٹھنڈے تھے، نیچے تک اس کی چٹائی تھی اب شانوں تک پال رہ گئے ہیں۔ چہرہ بد نما لگتا ہے۔ دانوں اور بالوں کی وجہ سے خوبصورتی متاثر ہو رہی ہے۔ ہم نے بدین میں ہومیو پیتھک اور ایلو

10 قطرے آدھے گلاس پانی ڈال کر دن میں 3 مرتبہ کسی بھی وقت پئیں۔

نسوانی کمزوری اور عمر میں کم نظر آنا

فائزہ عرفان۔ راولپنڈی

میری بیٹی دیکھنے میں 15 سال کی لگتی ہے۔ اس کی ڈائنٹ بھی اچھی ہے بس جسم کو نہیں لگتی ہے۔ اس میں نسوانی کمزوری ہے۔ آپ پلیز کوئی دوا تجویز کریں کہ نسوانی خوبصورتی آجائے میں ہر مہینے پاکیزہ شوق سے پڑھتی ہوں۔ میرا پیٹ بڑھ رہا ہے اس کے لیے بھی کوئی دوا تجویز کریں۔ میری عمر 50 سال ہے۔

جواب: عمر لکھ دی قد لکھو یا وزن نہیں لکھا کہ کتنا ہے؟ ہانہ ایام کے متعلق بھی نہیں لکھا کہ اس کی کیا حالت ہے؟ ویسے جتنا آپ نے بیان کیا ہے اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں بارموز کی خرابی، ڈپریشن، ٹھریلو ماحول، خوف یا بہت زیادہ ڈنٹے داریاں۔ کوئی بیماری جسمانی تو نہیں ان سب چیزوں کا صحیح علاج کرنے کے لیے رول آؤٹ کرنا ہوگا۔ اس تفصیل تک پہنچنے کے دوران آپ بیٹی کو متوازن غذا، اچھا ماحول دیں۔ صبح سویرے ورزش کرائیں اور ذاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی Natr. mur-30, Iodine-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ ایک ماہ بعد تفصیل سے لکھیں۔ آپ کے پیٹ بڑھنے کی بھی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ وزن اور قد بھی آپ نے نہیں لکھا۔ اپنے بارے بھی تفصیل سے لکھیں۔

نسوانی کمزوری

مروا۔ پاکپتن

محترم! میں پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا نسوانی حسن بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے جس وجہ سے مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔





From Nature.  
For Health.

جینٹل دونوں ڈاکٹروں سے علاج کروایا ہے لیکن فرق نہیں آیا ہے۔ دانے چہرے پر لال لال اور اس میں پیپ بھی ہوتی ہے۔ پہلے چھوٹا اور بعد میں بڑا ہو کر

چہرے پر بد نما گڑھا چھوڑ دیتا ہے۔ ان دونوں مسائل کا علاج بتائیں یقیناً آپ کا ہم پر احسان ہوگا۔

جواب: صبح سویرے سورج نکلنے ہوئے 15 منٹ کے لیے بچی کو دھوپ میں لینے یا بیٹھنے کو کہیں۔ اس طرح کہ جسم کا زیادہ سے زیادہ حصہ دھوپ کے اثر میں آئے۔ تازہ ہوا میں چل قدم کریں۔ اللہ سے دعا بھی کریں۔ شفا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ ایک دن چھوڑ کر بالوں کو ہمارے والے شیپو سے دھوئیں اور ہمارے والے فیس واش سے منہ 5 مرتبہ دھوئیں۔ دونوں کو کھجائیں نہیں بلکہ کاشن کے کپڑے سے ہلکے ہلکے سہلائیں۔ کھانے میں تیز مرچ مصالحوں اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ شور بہ چپاتی بہتر رہے گا۔ مہزیوں اور پھلوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ مرغی بالکل بھی استعمال نہیں کرنی۔ خصوصاً فارم کی۔ کوئی کولڈ ڈرنک اور کسی بھی قسم کا کوئی شربت استعمال نہ کریں۔ ستو، لٹی اور تازہ پھلوں کا جوس لے سکتی ہیں۔ ڈاکٹر وٹمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیے گا۔  
Calc. sulph-30, Belladonna-30 اور Graphites-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

چربیلی گلٹیاں

عقیدہ فاطمہ شیخوپورہ

سب سے پہلا مسئلہ میری امی کا ہے۔ ان کو تقریباً 12 یا 13 سال پہلے اپنے بازوؤں پر گلٹیاں ہی محسوس ہوئیں۔ گلٹیاں گوشت کے اندر ہیں۔ مطلب ہڈیوں میں نہیں ہیں۔ پہلے وہ صرف بازوؤں میں تھیں

پھر تقریباً سارے جسم میں بن گئیں اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑی ہوتی گئیں۔ ان کو دبانے پر کوئی درد محسوس نہیں ہوتا لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ برائے مہربانی یہ بتا دیجئے کہ ان کے بننے کی کیا وجہ ہے؟ دوسرا... مسئلہ میرا ہے۔ میرے بہت سے چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں۔ پچھلے کچھ مہینوں سے میرے بائیں بازو پر گلٹی بن گئی ہے اور اس وقت وہ آہستہ آہستہ اوپر کو ابھر آئی ہے۔ اب بائیں کے ساتھ دائیں بازو میں بھی چھوٹی چھوٹی مزید گلٹیاں بن رہی ہیں۔ مجھے ان کے متعلق بتائیے کہ ان کے بننے کی وجہ آخر کیا ہے؟ اور ان کا علاج بھی تجویز کر دیں۔ مجھے لیکوریا کا مسئلہ ہے جو کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ تقریباً 5 سال سے ہے۔ میں گوشت بہت ہی کم کھاتی ہوں۔ صرف چکن کبھی کبھار۔ میرے ہاتھ، پیروں اور باقی جسم بہت جلدی سن ہو جاتا ہے اگر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہوں۔ 2 سال پہلے تک میری جلد (Skin) بہت فریش ہوا کرتی تھی لیکن اب ہر وقت خشک رہتی ہے اور عجیب سی الرجی سی رہتی ہے چہرے پر۔ بال بھی بہت خشک رہتے ہیں اور خشکی کی وجہ سے گرتے بھی ہیں۔ برائے کرم مجھے تفصیلاً علاج بھی بتائیں اور غذا کے بارے میں بھی رہنمائی کریں۔

جواب: ہمارے جسم میں چربی بعض اوقات گلٹیوں کی صورت میں جمع ہونے لگتی ہے جسے Adipose Tissue کہتے ہیں۔ اگر ان میں درد نہیں ہے تو ایک اچھی بات ہے۔ یہ سائز اور تعداد میں بڑھتی بڑھتی رہتی ہیں۔ چکن خصوصاً فارم کی نہ ہونے کے برابر استعمال کریں جبکہ گائے بکرے اور مچھلی کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔ مہزیوں اور فروٹ کا استعمال زیادہ کریں۔ کھانے میں آئیوڈین والا نمک ضرور استعمال کریں۔ لیکوریا کے متعلق یہ نہیں لکھا کہ وہ کب زیادہ ہوتا ہے اور اس کی حالت کیسی ہوتی ہے؟ تفصیلات لکھیے تاکہ صحیح دوا تجویز کی جاسکے۔ فی الحال گلٹیوں کے لیے والدہ اور آپ Calc. lod-30 ڈاکٹر وٹمار شوابے



آپ ڈاکٹر ولیمار شوابہ جرمنی کی  
ادویات ایک ماہ تک استعمال  
کریں پھر انٹراسونڈ کی  
رپورٹ کے ساتھ

Urine Berberis DIR کی رپورٹ کرا کر بھیجیں۔  
Chelidonium-0.vulg-0 کے 10-10  
قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور  
Mere-cor-30 کے 5 قطرے آدھے گلاس پانی  
میں دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ پانی کم از کم 12 گلاس  
پلائیں۔ پیشاب فوراً کریں روئیں نہیں۔ پتھریوں کی  
وجہ سے گردے و مثانہ خراب ہو رہے ہیں۔ یہ معاملہ  
کنٹرول ہو تو پھر پراسسٹ و بکتر کو بھی دیکھیں گے۔

نظر کی کمزوری

لبنی رشید۔ کراچی

گزشتہ دس سال سے 4 نمبر کے گلاسز استعمال  
کر رہی ہوں۔ نمبر میں کمی یا بیکنگ سے چھٹکارا ممکن ہے تو  
پلیز دو تجویز کر دیجئے۔ میرے ہونٹ سیاہی مائل ہیں  
اور ابھی تو بالکل کالے نظر آتے ہیں جبکہ خوراک مارل لیتی  
ہوں۔ پیٹ بھر کر کھانا میسر ہے مگر روزانہ پھل کھانا ممکن  
نہیں۔ میں نشہ نہیں کرتی ہوں۔ رنگت گندمی اور چہرے  
پالکی ہے۔ میرا بنیادی مسئلہ چہرے پر اضافی بالوں کا  
ہونا ہے۔ ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کی طرح زیادہ اور  
موٹے بال ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹھوڑی پر بھی  
موٹے بال ہیں اور قمقمیں لمبی ہیں اور سر میں 12،10  
ٹھیکہ بال ہیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا  
ہے۔ اپریٹس کے لیے اسکن اسپیشلسٹ کے پاس گئی  
تھی۔ انہوں نے رپورٹ کروانے کے بعد لیزر ٹریٹمنٹ  
کے لیے کہا تھا جو کہ نہیں کروایا انہوں نے کوئی دوا نہیں دی  
تھی۔ رپارٹس بھیج رہی ہوں۔ میری صحت مجموعی طور پر  
اچھی ہے مگر قبض رہتا ہے۔

جواب: متوازن غذا کا استعمال کریں، ورزش

جرمنی کی 5-5 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھے کپ پانی  
میں ڈال کر پیئیں۔

گردے و بکتر کی خرابی اور

بچے و مثانے کی پتھریاں

زریب النساء۔ راولپنڈی

میں عرصہ دراز سے ماہنامہ پاکیزہ کی قاری  
ہوں۔ آپ ہر ماہ مریضوں کو مشورہ دیتے رہتے ہیں  
اور لوگ شفیاب بھی ہو رہے ہیں۔ میرے والد بھی  
ضعیف ہیں۔ عمر 86 سال ہے۔ مثانے میں پتھریاں  
ہیں۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے چھوٹی چھوٹی تھیں  
مگر اب بڑی ہو گئی ہیں۔ ایلیمنٹری میں علاج آپریشن  
ہی ہے۔ کئی سول اور فوجی ہسپتالوں میں گئے۔ مگر  
دل کی کمزوری کی وجہ سے آپریشن نہیں ہو سکا۔ اب  
ہومیو علاج یا یونانی علاج رو گیا تھا۔ یونانی علاج سے  
کوئی فائدہ نہ ہوا تو ہومیو کا شروع کر دیا ہے۔ سات  
سال سے ہومیو علاج کر رہے ہیں۔ پتھریاں نہ نکلتی  
ہیں اور نہ رکتی ہیں، بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں لہذا بہت  
مشنگر ہیں۔ کوئی ایسی دوا تجویز فرمائیں جس سے  
پتھریاں ریت بن کر نکل جائیں۔ اگر یہ نہ ہو تو رک  
جائیں زیادہ بڑی نہ ہوں۔ طبیعت سردی کو برداشت  
نہیں کرتی، گرمی میں خمیک رہتے ہیں۔ خوراک میں  
میںضی اور خشکین دونوں غذا میں پسند کرتے ہیں۔  
بزرگوں میں کسی کو یہ تکلیف نہیں رہی۔ مہربانی فرما کر  
کوئی مناسب دوا تجویز فرمائیں۔ میں نوازش ہوگی۔

جواب: تمام جو زمین نوٹ کریں کہ رپورٹس  
بہترین کے ساتھ بھیجنے کا کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ زریب  
آپ نے صرف مثانے کی پتھریوں کا ذکر کیا تھا جبکہ  
رپورٹ کے مطابق انہیں بکتر و گردے کا بھی مسئلہ  
ہے۔ پراسسٹ بھی بڑھا ہوا ہے۔ گردے میں بھی  
پتھریاں ہیں۔ علاج ان کا آپریشن قطعاً نہیں بلکہ ہومیو  
بھی نہیں سکتا۔ علاج کی ڈائریکشن بھی صحیح نہیں ہے۔

تب سے ان کا ماہانہ نظام خراب ہے۔ 4 سال پہلے چیک اپ کے بعد پتا چلا کہ یوئیرس میں رسولی ہے۔ کچھ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ رسولی نہیں ہے۔ لیکن ان کے پیرینڈ کا دورانیہ ڈیڑھ ڈیڑھ ماہ تک چلتا ہے۔ تب کچھ دوائیں لیں تو دو سال گزر گئے مگر اب چھ ماہ سے پھر وہی حال ہے۔ اب دوائی لینے سے بھی فرق نہیں پڑتا جس دن دوائی کا ٹاڈہ ہو جائے اسی دن طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ ان کا بلڈ پریشر بھی بہت لو تو کبھی بہت ہائی ہو جاتا ہے اور ان کا معدہ جلتا رہتا ہے۔

جواب: علاج کے سلسلے میں بے پروائی اچھی نہیں۔ باقاعدگی سے علاج کرانا چاہیے۔ اسی وجہ سے آپ اور والدہ اب تک بیماریوں کا شکار ہیں۔ مروجہ طریقہ علاج سے فائدہ نہیں ہوا تو بہت پہلے ہی ہومیو پیتھک علاج شروع کر دینا چاہیے تھا تا کہ جسم بیماریوں کا گھرنہ بننا۔ علاج کے سلسلے میں سب سے پہلے تمام دوائیوں کا استعمال ترک کر دیں۔ کھانے کو اچھی طرح چبا کر کھایا کریں اور کھانے کے ساتھ یا آخر میں پانی نہ پیئیں۔ پانی ہمیشہ کھانے سے پہلے یا کھانے کے دو گھنٹے بعد پیا کریں۔ کھانے میں مرغن چیزوں سے پرہیز کریں۔ مریض، مصالحے، تھکی، تیل کا استعمال کم کریں۔ صبح سویرے یا شام کو چہل قدمی کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ تک استعمال کریں۔ Pulsatilla 30, Calcarea carb 30, Kali Phos 30, 5-5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں کسی بھی وقت۔ امی کی مکمل علامات کی تفصیل رپورٹوں کے ساتھ بھیجیں۔

\*\*\*\*

کیا کریں، ذہنی وباؤ سے نجات حاصل کریں، خون کا ٹیسٹ Blood Hb% کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں یا آکر ملیں۔ Natr. mur-30, Calc flour-30, Calc. phos-30 Physostigma-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

## نسوانی مسائل

### راحت اکرم۔ ضلع خانیوال

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے 12 سال کی عمر سے سر کے درد کی بیماری لاحق ہے۔ نظر کمزور ہے لیکن اس کے لیے (1.75) پونے دو نمبر کا چشمہ لگاتی ہوں۔ مسلسل دوائیاں کھا کھا کر معدہ خراب ہو چکا ہے۔ کھانے کے بعد اچھارا ہو جاتا ہے۔ پیٹ میں اور آنتوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ پیٹ اور کولے بڑھتے جا رہے ہیں۔ چہرے اور پورے جسم پر کالے موٹے بال آگئے ہیں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ یادداشت بہت کمزور ہے جو بھی یاد کرنی ہوں.... سب بھول جاتی ہوں۔ سر کے بال جڑ سے نکل رہے ہیں۔ چہرے پر پھنسیاں بنتی ہیں اور رنگ روز بروز کالا ہوتا جا رہا ہے۔ دونوں گردوں میں درد رہتا ہے اور ہلکا کھنچاؤ تو ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ ماہواری کا نظام بھی خراب ہے۔ اس کی وجہ سے ٹانگوں میں درد رہتا ہے۔ ہر وقت سستی، گھبراہٹ ہوتی رہتی ہے۔ نسوانی حسن بالکل نہیں ہے۔ ہڈیوں میں درد اور اچانک کرنٹ دھڑکتا ہے۔ دوسرا مسئلہ میری امی کا ہے۔ ام چار ماہن بھائی ہیں۔ چھوٹے بھائی کی پیدائش چودہ سال پہلے بڑے آپریشن سے ہوئی تھی



**Dr. Willmar Schwabe Germany**

**Available at All Medical & Homoeopathic Stores**

شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیو پیتھی